





# تحریک آزادی

پس منظر — نظریہ — تحریک

۱۲۲

اشاعت دوم

صلاح الدین ناسک

عزیز پبلشرز — چوک اودو بازار — لاہور

سارا

U/Pali  
954 0317  
NAS

## جبلہ حقوق محفوظ

اشاعت اول ————— ۱۹۴۷ء  
اشاعت دوم ————— زمبر ۱۹۴۵ء  
طابع ————— عزیز پبلشرز  
مطبوع ————— علی پرنٹر پریس  
قیمت ————— روپے

Price 75/103

SV02

16/5/51

99595

16 2 83

Ab

۱۔ محترم آزادوں - مندر متعلقہ

۲۔ مندر متعلقہ تاریخ -

نویس

عزیز پبلشرز — چوک اردو بازار — لاہور



# انتساب

والدہ مرحوم  
سید خلیل شاہ  
کے

نام  
جن کی تربیت اور عزم راسخ  
نے  
مجھے اس قابل بنایا



# فہرست

۷۴	جنگ آزادی کی اہمیت	۹	مقدمہ
	باب	۱۸	فکر پرشان
۷۶	عابدین آزادی		باب
۷۶	سرسید احمد خان	۱۲	طلوع اسلام و ظهور اسلام
۸۲	نواب حسن الملک		باب
۸۵	مسلم لیگ کی تشکیل	۲۹	نموار نہیں اخلاق
۸۶	مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب		باب
۸۷	مسلم لیگ کا قیام	۳۲	دور پر آشوب
۸۸	جمال الدین افغانی	۳۳	مجدد الملت ثانی
۹۳	نواب فقار الملک	۳۳	شاہ ولی اللہ
۹۵	مسلم لیگ کی تشکیل	۳۵	سید احمد شہید
۹۶	سید امیر علی	۳۶	تہذیب
۱۰۰	پہلی مسلمان تنظیم	۳۷	قرآن ہی تحریک
۱۰۱	سبیل نغانی	۳۸	ہندو ازم کا احیاء
۱۰۶	مولانا عبید اللہ سندھی		باب
۱۱۰	گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ	۴۰	ہندوستان میں قزاقوں کی آمد
۱۱۲	علامہ اقبال	۴۲	ایسٹ انڈیا کمپنی
۱۱۸	شیر بنگال غزوی فضل الرحمن	۴۳	فرانسیسی
۱۲۵	مولانا حسرت موہانی		باب
۱۲۹	محمد علی جناح	۴۶	ہندو اور انگریز کا متحدہ محاذ
۱۳۷	پرنس آغا خان	۴۷	ہندو اور مسلمانوں میں اضافہ
۱۴۱	مولانا محمد علی	۴۸	مسلمانوں سے نفرت
۱۵۱	نوابزادہ بیات علی خان	۵۱	انگریز کی مدد
۱۵۶	جو دھری رحمت علی	۵۳	تعلیم پالیسی
	باب		باب
۱۶۵	ہندوستان کا آئین ارتقار	۵۴	برطانوی سامراج اور اس کی وسعت
۱۶۷	ایکٹ ۱۹۶۷ء کی اہمیت	۵۵	پنجاب
۱۶۷	انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۳ء	۵۶	حیدر علی
۱۶۹	منشور مورے اصلاحات ۱۹۰۹ء	۵۹	ٹیمپل سلطان
۱۶۹	اعتراضات	۶۲	ہوش محمد قزاقی
۱۷۰	گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء		باب
۱۷۱	جنگ عظیم کے اثرات	۶۸	انگریز استعمار کے خلاف جنگ
۱۷۱	دینی حکومت کی تحریک	۶۹	اسباب
۱۷۲	خاص خاص باتیں	۷۴	الکاجہ کے اسباب

۲۲۲	ریشی رومان سازش	۱۷۴	دو عملی کا طریق کار
۲۲۳	معاہدہ لکھنؤ	۱۷۷	کورنشٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء
۲۲۷	پہلی جنگ عالمگیر	۱۷۷	سائنس کیشن
۲۲۸	وطنی حکومت کا نفرو	۱۷۸	گول میز کانفرنس
۲۲۹	جناح مظاہرہ - پالیسی کا اعلان	۱۷۸	ایکٹ کی نمایاں باتیں
۲۳۰	رولٹ ایکٹ	۱۸۱	ایکٹ کا صوبائی حصہ
۲۳۱	سیٹہ گرہ تحریک	۱۸۲	ایکٹ کا دفاعی حصہ
۲۳۲	جلپانوار باغ کا حادثہ		باب ۱
۲۳۳	مارشل لاء کا نفاذ	۱۸۵	مسلم قومیت کا آغاز
	باب ۱۳	۱۸۷	برٹش انڈیا ایسوسی ایشن علی گڑھ
۲۳۴	تحریک خلافت و عدم تعاون	۱۸۷	برہمن سماج
۲۳۸	وزیر اعظم سے ملاقات	۱۸۸	آریہ سماج
۲۳۹	کشکش کا آغاز	۱۸۸	انڈین ایسوسی ایشن
۲۴۱	تحریک عدم تعاون	۱۸۸	مسلمانوں کے شبہات
۲۴۲	نظریاتی تفریق	۱۸۹	ہندو مسلم اتحاد
۲۴۳	تحریک خلافت کا انجام	۱۹۰	اردو ہندی کا تنازعہ
۲۴۵	تحریک خلافت اور اعتراضات	۱۹۱	مسلم قومیت پر یقین
	باب ۱۵	۱۹۲	علی گڑھ تحریک
۲۴۷	ہندوستان کی سیاست	۱۹۳	انڈین نیشنل کانگریس کا قیام
۲۴۷	ہندو مسلم فسادات اور شدھی	۱۹۵	دو عمل
۲۵۱	مسلم لیگ کا اجلاس لاہور	۱۹۶	نیشنل کانفرنس کیوں؟
۲۵۷	اتحاد کانفرنس	۱۹۸	کانگریس سے مسلمانوں کی علیحدگی
۲۵۷	مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی		باب ۲
۲۵۸	آل پارٹیز کانفرنس	۲۰۱	مسلم لیگ کا قیام
۲۶۳	مسلمانوں کا اتحاد	۲۰۳	ملاقات
۲۶۵	مسلم لیگ کا اجلاس علی گڑھ	۲۰۴	تقسیم بنگال
۲۶۷	اصلاحات کی تحقیقاتی کمیٹی	۲۰۶	شملہ وفد
۲۷۰	سائنس کیشن	۲۱۲	غٹو مورے اصلاحات
۲۷۰	کانگریس کا بائیکاٹ		باب ۳
۲۷۱	مسلم لیگ کی قرارداد	۲۱۳	تشیخ و تقسیم بنگال
	باب ۱۶	۲۱۵	ترکی اور دیگر مسائل
۲۷۳	نہرو رپورٹ اور تجاویز دلی	۲۱۶	علی گڑھ کالج اور کانپور مسجد
۲۷۷	کانفرنس اور نہرو رپورٹ	۲۲۰	مسلم لیگ - ایک نیا دور

۳۶۷	مسلم بڑی بورڈ	۲۸۰	کلکتہ کنونشن
۳۶۷	نئے آئین پر بحث	۲۸۳	جنان کے انتخابات
	<b>باب ۲۲</b>	۲۸۴	آل پارٹیز مسلم کانفرنس
۳۶۹	مسجد شہید گنج کا ہنگامہ	۲۸۶	گرد بندی کرنے کی کوشش
۳۵۲	محمد علی جناح کی آمد	۲۸۷	مسلم لیگ کے اجلاس میں ہنگامہ
۳۵۳	جناح پر شاد بات چیت	۲۸۸	بڑے نکات
	<b>باب ۲۳</b>		<b>باب ۱۸</b>
۳۵۴	مہوبائی انتخابات کانگریس حکومت	۲۹۱	۱۹۲۹ء ایک ہنگامہ پر دور سال
۳۵۵	کانگریس اور انتخابات	۲۹۲	اسیلی پریم
۳۵۷	محمد علی جناح کی مساعی	۲۹۳	ایک اور ہنگامہ
۳۵۹	کانگریس کا نیا ہتھیار	۲۹۴	انقلابی سرگرمیوں کا آغاز
۳۶۱	پرنسپلٹ وزارت کا قیام		<b>باب ۱۹</b>
۳۶۱	جناح سکریٹریٹ	۲۹۶	کونونیز کانفرنس
۳۶۲	محمد علی جناح سے قائد اعظم	۲۹۶	کانڈھی بطور نمک ساز
۳۶۳	تصویر کا دوسرا رخ	۲۹۸	پہلی گول میز کانفرنس
۳۶۵	شرط وفاداری	۳۰۲	بنیادی مسائل
۳۶۷	کانگریس حکومت میں نفوذ کے مہاسب	۳۰۴	کانڈھی کی رہائی
۳۷۰	حاشیہ برداروں سے سلوک		<b>باب ۱۹</b>
۳۷۱	دارودھاکسیم	۳۰۷	مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد و سرحد
۳۷۲	اقتصادی تعصب	۳۲۱	رد عمل
	<b>باب ۲۴</b>	۳۳۰	مارشل لا کا نفاذ
۳۷۳	سری عالمگیر جنگ کانگریس وزارتوں کا خاتمہ	۳۳۱	صوبہ سرحد - ۱۹۳۰ء میں
۳۷۴	کانگریس وزارتوں کا خاتمہ		<b>باب ۲۰</b>
۳۷۶	حکومت کی نئی پیش کش	۳۳۳	کیمپنل ایوارڈ، دوسری گول میز کانفرنس
۳۷۸	مسلم لیگ کا یوم نجات	۳۳۳	صرف ہندوؤں کا باپو
۳۷۹	بات چیت کا نیا دور	۳۳۴	مشرط بات چیت پر اصرار
	<b>باب ۲۵</b>	۳۳۷	سول کانفرمانی
۳۸۲	قرار داد پاکستان	۳۳۹	کمیونل ایوارڈ
۳۸۴	قائد اعظم کا خطبہ صدارت	۳۴۱	مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار
۳۸۵	جنگ کے اثرات	۳۴۱	تیسری گول میز کانفرنس
۳۸۷	ہندو کی بوکھلاہٹ		<b>باب ۲۱</b>
	<b>باب ۲۶</b>	۳۴۳	مسلم لیگ کی تنظیم نو
۳۸۸	کانگریس اور مسلم لیگ: نئی شکلیں	۳۴۶	محمد علی جناح کا بلا حلقہ انتخاب

۴۴۰	مسلم لیگ کا فیصلہ	۳۸۹	مسلم لیگ کا رجسٹر
۴۴۲	نئی تجاویز	۳۹۱	۸ اگست کی پیش کش
	<b>باب ۳</b>	۳۹۱	کانگریس کا رد عمل
۴۴۴	عبوری حکومت	۳۹۲	کانگریس اور رسول نافرمانی
۴۴۶	راست اقدام کا فیصلہ	۳۹۳	قابل غور باتیں
۴۴۸	آئین ساز اسمبلی کے نتائج	۳۹۴	رد عمل
۴۴۹	باقاعدہ پیش کش		<b>باب ۲۷</b>
۴۵۰	۱۶ اگست	۳۹۵	کونپس مشن
۴۵۱	کانگریس کی عبوری حکومت	۳۹۸	وجہ اوجھے ہتھیار
۴۵۲	حکومت میں مسلم لیگ کی شرکت	۴۰۰	کونپس کا بیان
۴۵۳	کانگریس — اقلیتیں	۴۰۰	میں نہ مانوں
۴۵۴	لندن میں بات چیت		<b>باب ۲۸</b>
۴۵۶	مسلم لیگ کی قرارداد	۴۰۳	گاندھی جناح بات چیت، راجہ غلام
	<b>باب ۳۲</b>		<b>باب ۲۹</b>
۴۵۸	انتقال اقتدار کا اچانک اعلان	۴۰۸	ویلر منصوبہ، شملہ کانفرنس
۴۶۰	کانگریس کا اقدام	۴۰۹	سیاست دیوانی معاہدہ
۴۶۲	نئی تجاویز	۴۱۱	ویلر منصوبہ
۴۶۳	منصوبہ تقسیم ہندوستان	۴۱۲	شملہ کانفرنس
۴۶۵	راز و نیاز	۴۱۵	مسلم لیگ کا موقف
۴۶۶	۳ جون کا منصوبہ	۴۱۶	انشائے راز
۴۶۸	سندھ، صوبہ سرحد	۴۱۶	برطانوی کابینہ میں تبدیلی
۴۶۹	برطانوی بلوچستان — آسام		<b>باب ۳۰</b>
۴۷۰	آئین ساز اسمبلیوں میں نمائندگی	۴۱۷	عام انتخابات ۱۹۴۵ء کا بین مشن منصوبہ
۴۷۱	دیاستیں، سرحدی قبائل	۴۱۸	انتخابی سرگرمیاں
۴۷۱	مجلت، فوری انتقال اختیارات	۴۲۰	صوبائی انتخابات
۴۷۲	مزید اعلانات — رہنماؤں کی کانفرنس	۴۲۰	وزارت سازی کا مرحلہ
۴۷۸	صوبوں کی تقسیم	۴۲۲	محصول پاکستان کا عزم
۴۷۹	بل کی منظوری	۴۲۳	کابینہ مشن
۴۸۰	تقسیم کے مسائل	۴۲۷	دوسری شملہ کانفرنس
۴۸۱	حد بندی کمیشن	۴۲۸	کانگریس کی شرائط مصفاہیت
۴۸۳	سکھ اور قتل و غارت	۴۲۹	مسلم لیگ کی شرائط مصفاہیت
۴۸۴	رسم انتقال اقتدار	۴۳۱	کابینہ مشن رپورٹ
۴۸۵	نمون کی جولی	۴۳۶	کابینہ مشن منصوبہ
۴۸۶	کشمیر کا تنازعہ	۴۳۹	رد عمل
	<b>باب ۳۳</b>	۴۴۰	کانگریس کی قرارداد
۴۸۸	ہندو پاکستان ہی کیوں؟		

ارتقاء کے کسی بھی نقطہ نظر سے زندگی کا کل سرسبد یا مکمل و  
 آخری کڑی انسان ہے۔ قرآن کریم میں اس حیاتیاتی نمود کو  
 خلیفہ کا لقب دیا گیا ہے یعنی مخلوقات میں سب سے آخر میں  
 آنے والا۔ (LATEST) تخلیق کی مثال تراویح آج  
 کڑی لیکن یہ انسان کی جسمانی جمیں اور اس کا جسمانی نمود تھا،  
 جس کے فوراً بعد اس کے ذہنی ارتقاء لہذا قانونی ارتقاء کا آغاز  
 ہو گیا۔ اسی لئے

جب ہم قرآن کریم کے مطابق کہتے ہیں کہ قوم نوح کے بعد  
 خلافت دہا نشینی، قوم ماد کو مل اور عاد کے بعد قوم ثمود کو، تو  
 اس سے دراصل قرآن کا اشارہ اپنی وقانونی ارتقاء کی طرف  
 ہی ہے کہ جب ایک قوم آگے بڑھنے اور باندہ تر قوانین کو قبول  
 کرنے کے قابل نہیں رہی تو دوسری قوم نے جو اس سے بہتر تھی  
 اس کی جگہ لے لی اور قانون کے اتباع و تعمیل سے انسان کو اگلی منزل تک پہنچا دیا۔

نیز قرآن میں اس سلسلہ انبیاء و رسل کے ذریعہ جاری رہا اور انسان ذہنی ارتقاء کے  
 مدارج طے کرتا ہوا اس منزل تک پہنچ گیا جہاں انسانیت کے کلی سرسبد رسول آخر الزماں  
 اور قانون کے کل سرسبد قرآن کا نمود ہوا اور خلافت — یا قرآنی حکومت —  
 امت محمدیہ کے ہاتھ میں آگئی۔ لیکن خلافت کے ضمن میں اب قصہ ذہنی اور قانونی ارتقاء کا بھی نہیں  
 رہا تھا۔ کیونکہ ذہن بالغ اور قانون مکمل ہو چکا تھا۔ بلکہ انسانی زندگی کے بڑھتے بڑھتے  
 مدنی و معاشرتی تقاضوں کے مطابق اس قانون کے استعمال کا تھا جس کا حق امت محمدیہ نے  
 بے شک ایک حد تک ہی ادا کیا مگر خود رسول اللہ اور اولین خلفاء رسول اللہ نے بہر حال یہ  
 ثابت کر دیا کہ ایک مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے کسی بھی شعبہ حیات میں ان قوانین کی  
 تعمیل و تشکیل استعداد کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ نیز یہ کہ خلافت اس حکومت اور قوت کا نام ہے  
 جو خود ان قوانین کی مطیع نیز عامل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی مقتدر ترین حکومت ہو۔

لے "مقتدر ترین" میں "ترین" کا مفہوم خود لفظ خلیفہ یا خلافت میں مضمر ہے (باقی آئندہ صفحہ پر)

مقتدر ترین ان معنوں میں دنیا بھر کے لئے خدائی قوانین کی تعمیل کے لحاظ سے مثالی رہنا ،  
سلوک اور تعلقات کے لحاظ سے امن کی ضمان اور طاقت کے لحاظ سے نوع انسانی کے امن  
میں خلل ہونے والوں کے غیر جانبدارانہ مناسب اور سرکاری کے قابل ہر ادریہ قابلیت موثر ہو۔

اس قابلیت کی سطح تک پہنچنے کے لئے ظاہر ہے پہلے مسلمان معاشرے قرآنی قوانین  
کے مطابق اپنی اصلاح کریں ، اپنی تنظیم اور اپنی حکومت قائم کریں اور جب بحیثیت جماعت اور  
اقلیت حکومت نمودار عمل بننے کے قابل ہو جائیں تو انہی قوانین کے بل پر جن سے غیر مسلمان  
معاشروں کی تربیت اور نشوونما ہوئی تھی۔ نوع انسانی کی خدمت اور فلاح کا فرض ، مقتدر اور  
با اثر عنصر کی حیثیت سے انجام دین تاکہ قرآنی مقصد آگے بڑھے۔ قرآنی مقصد یہ کہ زیادہ  
سے زیادہ انسان خدائی ضابطہ حیات کو ایماناً و عملاً قبول کر کے زیادہ سے زیادہ وحدت ،  
یکجائی ، ہم نظری اندازے غنی ، امن و اطمینان اور فارغ البالی کی زندگی سے ہم کنار ہوں  
تاکہ رُوح کا جوہر ابھرے اور نکھرے اور ہر فرد اپنے رب سے قریب ہوتا چلا جائے۔  
بد نصیب ہند کے مسلمانوں کے پیش نظر یہی مقصد تھا !

ہر فرد بشریہ ضابطہ حیات جسے خدا نے اسلام کا نام دیا ہے بغاوت و بغت اختیار کریگا  
وہ مذکورہ لائحہ عمل کا پابند ہوگا۔ ذاتی ، اجتماعی ، حکومتی ، ہر حیثیت میں ، ہر مخالفت کے

(بقیہ ماحشہ ص ۳۱) جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہے کہ اولاً تو تخلیقی ارتقاء کی آخری کڑی کی  
حیثیت سے انسان کو خلیفہ کہا گیا ہے۔ پھر ذہنی و قانونی ارتقاء کی ہر آخری (LATEST)  
کڑی یعنی اپنے دور کی ترقی یافتہ تر قوم خلافت کی مستحق ہوئی اور پھر ذہنی بلوغ و مستوفی  
تعمیل کے بعد اس قانون کا بہترین استعمال کرنے والی قوم کو شرف خلافت کا ثرہ سنایا گیا۔  
رہا اس لفظ میں اقتدار کا مفہوم تو وہ ترقی یافتہ تر عنصر کا قدرتی لازم نیز قوانین الہی کے  
اتبات و تعمیل کا ناگزیر نتیجہ ہے۔

لے قرآن کریم نے امن کی ضمانت کے لئے مومن ، غیر جانبداری کیلئے اُمّۃً و سَطَطا، محاسبہ  
کے لئے شہد اعلیٰ الناس اور سرکاری کے لئے اشد اعلیٰ الکفار کا مشورہ دیا ہے۔  
لے اس اصلاح میں سرپرستی ، نگرانی اور تعمیل قوانین کی ذمہ داری حکومت پر ہوگی بمطابق  
یصون الرسول علیکم مہیدا۔



علی المرتضیٰ، بر سرِ شیبانے کو چھوٹک کر اور ہر وقتی سکون کو اجازت کر اس دستور کو اپنایا کرام اور ان کے رفقاء نے، رسول آخر الزماں اور آپ کے اصحاب نے اور ہر دور کے سچے مسلمانوں نے اپنایا ہے اور خدائی قانون کی آبرو کے یہ محافظ خدا کے دست و بازو اور خدا کی آیات میں گرفتار رہے ہیں اور اس وقت تک متعارف ہونے رہیں گے جب تک "یہ دین تمام اویان پر غالب نہ آجائے۔" (۱/۱۱۱ ۱/۱۱۲ القرآن)

ہاں! "برصغیر کے مسلمانوں کے پیش نظر یہی مقصد تھا" جس کے لئے بے پناہ جانی مالی اور جبہ باقی قربانیوں اور مدتوں کی ہاں گسل جنگ کے بعد پاکستان وجود میں آیا۔ یہ مطالبہ علیحدگی یا مطالبہ آزادی دوسری اقوام کے مطالبہ آزادی کی طرح نہیں تھا۔ بلکہ اپنی منفرد حیثیت میں قوانین خداوندی کی غلامی کے لئے آزادی کا مطالبہ تھا، جس کا سب سے جامع اور سب سے مختصر نعرہ تھا "پاکستان کا مطلب کیا ہے؟ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" اور اگر ہر فرض محال ایسا ہوتا بھی کہ برصغیر کے مسلمان اپنی آزادی اور علیحدگی کی بنیاد قرآنی غلامی کے دعوے پر نہ رکھتے اور دوسری عام قوموں کی طرح مطالبہ آزادی کرتے تب بھی اپنی آزاد ریاست مل جانے کے بعد مومنین و مسلمین کی حیثیت سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا کہ جس ذات اور جس کتاب کے ساتھ وہ انفرادی حیثیت میں وفاداری کے دعوے دار ہیں اس کے احکام کے سامنے تسلیم خم کوئے ہوئے اپنے معاشرتی، ریاستی اور عالمی کردار کی تعمیر کے لئے تن من دھن سے جت جائیں ورنہ اسلام کے ساتھ نام نہاد، مبین بین وفاداری کو ختم کر دیں جسے اس نے فسق، شرک، ظلم اور منافقت کا نام دیا۔ مگر ہم لوگوں نے دونوں میں سے کوئی قدم بھی نہیں اٹھایا اور ۲۵ برس گزر چکے اس دم تک اور خلی کی حکمت علی پر گمازن ہیں۔

جس معاشرے اور جس حکومت کا نصب العین عالمی سطح پر انسانوں کے درمیان اختلافات مٹانا (۱/۱۱۱) اور انسانوں کو ایک وحدت کی طرف بڑھانا ہو خود اس معاشرے میں کسی بھی شعبہ حیات میں اختلافات کی موجودگی غیر منطقی اور مضحکہ خیز ہے۔ اسی لئے قرآن نے اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست میں کسی بھی شعبہ حیات میں، کسی بھی سطح پر فرقہ اور پارٹی سازی کی اجازت نہیں دی۔ اس نے بر ملا اور واضح الفاظ میں تاکید کی ہے کہ "پاکستان کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے گروہ بندیاں کیں اور اختلافات کو ہوا دی حالانکہ

کے پاس واضح دلائل آپکے تھے نتیجتاً وہ عذابِ عظیم میں گھر گئے۔ (۳/۱۳) مشرکین میں سے جو اوجھڑوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہو گئے۔ ہر گروہ اپنے نظریات میں اندرونِ شمس تھا۔ (۳۶) جن لوگوں نے اپنے دین کے ٹکڑے کئے، تفرقہ بازی کی پارٹیاں بنالیں ان سے آپ کا (یعنی حکومتِ خداوندی کا) کوئی واسطہ نہیں۔ (۶/۱۵۹) کھلے احکام کی موجودگی میں پاکستان کے ابتدائی بجرائی دور کے فوراً بعد مذہبی فرقوں کی ت کا خاتمہ سب سے پہلے کرنے کا کام اتحادِ اسلامی حکومت کے دعوے داروں کا فرض تھا کہ فی حکم کے حوالے سے تمام فرقوں سے اپنا رشتہ توڑ کر (۱۵۹/۶) ان کی بیخ کنی کا اہتمام کرتے یوں اسلامی آئین کی بنیاد رکھ دیتے۔

اسی طرح سیاسی و خانچہ مشترک قرار فی اصولوں کی بنیاد پر بنیاد ہوتا ہے کہ ان قوموں کی لی اور گراگری پر جو خود مشترک اصولوں اور مستقل قدروں سے محروم اور حالات کی رکوں سے زخمی ہیں۔ مروجہ مغربی جمہوریت کے اصولوں اور محرکات کے بارے میں یہ قطعی ہے کہ یہ اصول مخصوص احوال و نظریات کا انسانی ردِ عمل ہیں، ان کی پرورش خاص مادی می ماحول میں ہوئی ہے اور ان کا اتحاد محض سائنسی پس منظر کے ویج و تاب اور تغیرات و ظہور میں آیا ہے۔ انسان نے گزشتہ چند صدیوں میں اس مسئلہ کے حل میں جس قدر ت کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ ستائش سہی مگر کیا کیا جائے کہ یہ محض انسانی کوششیں تھیں تھی ہی ناکام ثابت ہوئیں جتنا عقل محض کو ہونا چاہئے۔

مغربی جمہوریت کے اصولوں اور ہمارے عقائد و احکام میں سب سے پہلا بنیادی دیکھئے کہ ان کے ہاں اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ حوام ہیں اور ہمارے ہاں اللہ تعالیٰ ہے ہمارے ہاں قانون کا سرچشمہ انسانوں کا بنایا ہوا آئین نہیں، قرآن کی پیش کردہ مستقل اور سہی اقدار ہیں۔ ان اقدار کے سرچشمہ سے قانون و آئین کی تدوین ہوتی ہے اور اس تدوین مستقل اقدار سے ایک انچ بھی انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ مغربی تصورِ جمہوریت کی رو سے طرح قانون کی تدوین و تنفیذ کے لئے فوراً اقتدارِ اعلیٰ کے سرچشمہ (یعنی عوام) کی طرف

مسلم لیگ حصولِ پاکستان کے لئے غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمین ہند کی نمائندہ عت متی ذکرِ مسلم معاشرے میں اپنوں کے مقابلے میں۔

نظر استیجاب اٹھتی ہے بالکل اسی طرح اسلامی تصور حکومت میں تشکیل آئین کے لئے اقتدار اعلیٰ کے سرچشمہ (یعنی اللہ تعالیٰ) اور قانون کے سرچشمہ (یعنی قرآنی مستقل اقتدار) پر جا کر نگاہیں رک جاتی ہیں۔ یہاں سے دوسرا فرق شروع ہوتا ہے۔ جدید مغربی جمہوریت میں عوام اپنے معتدلیہ نمائندے (یعنی اقتدار اعلیٰ کے سرچشمہ کے معتدلیہ نمائندے) امپیلوں میں بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ تشکیل و تنفیذ قانون کا کام سرانجام دیں اور وہ بغیر کسی مستقل، اعلیٰ وابدی بنیادوں کے اپنی اور روایات کی صوابدید کے مطابق انسانی فکر کے ساختہ آئین کے تحت اپنا قانون مرتب اور رد و نکر لیتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی حکومت میں چونکہ اقتدار اعلیٰ عوام کو حاصل نہیں نیز قانون کا سرچشمہ قرآنی اقتدار ہیں۔ اسی لئے ایسے قانون کی تدوین اور تنفیذ کے لئے ان مخصوص افراد کی (پارٹیوں کی نہیں) احتیاج ہوتی ہے جو اس سرچشمہ کی روح سے واقف اور مشروط صلاحیتوں کے حامل ہوں۔ ان افراد کو حکومت میں لانے کے لئے کسی طریق کار کی پابندی نہیں لیکن نمائندہ افراد پر ہر سال ایسی پابندیاں لگائی جاتی ہیں جو ان کی پوری زندگی کو محیط ہیں اور اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں ان سے تذکرہ اور دوسری متعلقہ صلاحیتوں کی ضمانت مانگتا ہے۔ اس ضمانت کے بغیر کوئی فرد قانون سازی اور تنفیذ قانون کے مقدس دائروں میں قدم رکھنے کا مجاز نہیں۔ اسی وجہ سے طریق انتخاب کوئی بھی ہو

لے مخصوص اور مشروط امیدوار کی پابندی سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انتخاب میں شرکت کے لئے جن امیدواروں کو حکومت اجازت دے ان کی متعلقہ و مطلوبہ صلاحیتوں کی آخر کس معیار پر اور کس طریق سے جانچ پڑتال ہو۔

اسلامی حکومت میں جہاں تک اس نازک ذمہ داری کا تعلق ہے یہ بات بالکل عیاں اور صاف ہے کہ قرآن کے مطابق قوانین سازی کوئی بازیچہ اطفال نہیں کہ ہر کس و نا کس اس سے حمدہ برا ہو سکے۔ اس کے لئے قرآنی تعلیمات پر مکمل عبور کے علاوہ اجتہادی استعداد اور استخراجی فراست سے کما حقہ بہرہ ور ہونا ضروری ہے اور اس تعلیم و تربیت کا انتظام اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس مقصد کے لئے یونیورسٹی سطح پر ایک تدریسی نصاب کے مطابق تیاری اور امتحان کا اہتمام ہونا چاہئے جس میں داخلہ کے لئے:

۱۔ کسی بھی تعلیمی سند کی پابندی نہ ہو بلکہ قابلیت کے ثبوت کے لئے (باقی اٹھ صفحہ پر)

رائے عامر شامانی حیثیت میں چلی جاتی ہے کیونکہ جب سب ہی امید وار مشروطہ صلاحتوں کے حامل ہوں گے تو آراء انتشاری کا کردار معنی تبدیلی حکومت کے طریق کا تک موثر رہے گا جس سے مزایہ ہے کہ رائے دیہی میں کوئی بدعنوانی (اگر ہو جائے تو) خطرناک نہیں ہوگی۔

۱۔ بقیہ حاشیہ مسئلہ آزمائشی وقفہ دیا جائے۔

۲۔ داخلہ کے لئے عمر کی کوئی قید نہ ہو۔

۳۔ تعلیمی فیس بانٹل نہ ہو۔

۴۔ امتحانات پرچوں اور زبانیں پکڑ پر مشتمل ہوں۔

۵۔ ڈگری کی توثیق صدر مملکت کی طرف سے ہو۔

۶۔ صدر مملکت کے لئے بھی یہ ڈگری حاصل کرنا لازمی ہو۔

۷۔ امیدوار کی امتحان میں ناکامی پر تادان وصول کیا جائے۔

یہ نصاب قرآنی تحقیقات کے علاوہ تمام ضروری متعلقہ علوم پر حاوی ہو چونکہ اسلامی مملکت کی اسمبلی دوسری اقوام کی اسمبلیوں سے مختلف اور سرچشمہ قوانین کے تقدس کی نسبت سے مقدس ہے اس لئے نصاب کا ایک جزو اس اجتماع کے شایان شان آداب پر مشتمل ہو اور اس سرچشمہ قوانین کی کما حقہ اور براہ راست تفہیم کے لئے اس کی زبان یعنی عربی کے لئے دو پرچے مختص ہوں۔ مضامین کی وسعت اور گہرائی کی نسبت سے نصاب کم از کم تین سال کا ہو اور پہلے سے خصوصی قابلیت رکھنے والوں کے لئے کم مدت میں نصاب مکمل کروانے کی علیحدہ کلاسیں ہوں۔ دیگر امتحانات کی شرائط نیز ملازمتوں کی شرائط میں اس اعزاز کو جہاں جس نسبت سے موزوں ہو ملحوظ رکھا جائے۔

میری ناقص رائے میں اگر اس پروگرام پر عمل شروع ہو جائے تو مطلوبہ مقصد کے حصول کے علاوہ

یہ ادارہ عام تربیت میں بھی تیز ترین کردار ادا کرے گا اور معاشرہ بڑی سرعت اور متانت سے بند مقاصد کی طرف بڑھے گا۔

اس قوم رسولِ ہاشمی کے لئے جو اپنی ترکیب میں خاص اور اقوام مغرب سے مختلف ہے موجودہ صورت حال جو بے مقصد، لطفلاذ اور غیر مؤثر اور ناپائیدار ہے۔ محض تباہی اور رسوائی کا راستہ ہے جس میں آدھا گھروڑ عزت ٹٹ جانے کے بعد کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا۔

مغربی جمہوریت میں انتخاب کا فلسفہ یہ ہے کہ عوام تمدن کا قانون میں بالواسطہ شامل ہوں  
 اہل کسی خاص نسل کے حاملین کا قانون اور مخصوص افراد یا گروہ کا اقتدار عوام پر مسلط نہ ہو جبکہ اسلامی  
 تصور حکومت میں یہ چیزیں (یعنی قانون کا بنیادی فکر اور مقتدر اعلیٰ کا تصور) پہلے ہی موجود ہیں  
 کہ ارکان حکومت کے پاس عوام کا ووٹ بالفرض کسی وقت نہ بھی ہو تب بھی قانون سازی کا حشر یہ  
 مسئلہ و متفقہ بلکہ معتقد علیہ ہونے کی وجہ سے قانون ساز اور قانون کا نافذ بر شہرہ ہی کی اس مشترک  
 رچنے کے واسطے سے نمائندگی کرتا ہے اور عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ اس سرچشہ  
 میں کوئی منتخب یا غیر منتخب رکن رد و بدل کا مجاز نہیں ہوتا نیز اقتدار اعلیٰ مخصوص افراد یا طبقہ کو  
 نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی تصور حکومت میں انتخاب کا فلسفہ صرف اس قدر  
 ہے کہ کسی وقت بھی ملکیت کا غلبہ نہ ہونے پائے اور عوام حکومت کسی عائدان یا کسی طبقے کی  
 طرف مشغول ہو کر نہ رہ جائے جس سے ان کو مکرم عند اللہ اتقوا کہ کا قرآنی نظریہ متاثر ہو۔  
 اسلام میں فلسفہ انتخاب کو فحش نمائندگی سے برا و راست کوئی تعلق نہیں۔

اس تمام تجزیے سے بخود بخود ثابت ہو گیا کہ مغربی جمہوریت میں پارٹی بازی جس قدر  
 اور ضرورت کے تحت ہوتی ہے وہ تقاضا اور ضرورت ہی ہمارے ہاں موجود نہیں و ہاں عوام مقتدر  
 اعلیٰ ہونے کی وجہ سے خود قانون سازی کے حقدار ہوتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں تک پہنچنے والی  
 قانون ساز آراء کو سمیٹنے کے لئے پارٹیاں بنتی ہیں سہارے ہاں سو فیصد عوام اور سو فیصد نمائندے  
 مشترک، مستقل قانون و اقتدار کی وساطت سے ایک دوسرے سے اس قدر متفق ہوتے ہیں کہ  
 انسان کے ہاتھوں میں قانون سازی محض ذیلی اور جزوی و فروعی ہوتی ہے جس میں کوئی قانون ساز  
 ان مشنیک اور مستقل اقتدار کے منافی قانون سازی کا حق نہ رکھنے کی وجہ سے کسی ایک بھی فرد ملکیت  
 کی بنیادی تناؤں سے بچاؤ نہیں کر سکتا، جبکہ اُدھر — مغرب میں — اکثریتی پارٹی، اقلیتی  
 پارٹی پر اور اس کے تمام رائے دہندگان اور جمناؤں پر ان کی مرضی اور منشور کے خلاف حکومت  
 کرتی ہے۔ گویا جمہوریت کے پردے میں آمریت کا دور دورہ ہوتا ہے اور اختلافات بجائے  
 ملنے کے پھٹتے ہیں اور علماء حزب مخالف اور حزب اقتدار کی کشمکش سے تعمیر کاموں میں

نے خدا کی نظر میں تم میں سب سے زیادہ قابلِ تمکیم وہ ہے جو قوانینِ خداوندی کا سب سے زیادہ  
 پابند ہے۔ (القرآن)

الجھاؤ اور رکاوٹ اور دلوں میں نفرت و عداوت اور تعصبات کی آبیاری ہوتی رہتی ہے۔ اور حزب مخالف کی حریمیں نکالیں ہر وقت اقتدار کی کرسیاں الٹنے اور اپنا اختلافی منشور زیر عمل لاسفہ پڑھتی رہتی ہیں جبکہ اسلامی تصور حکومت میں حزب مخالف نفعاً اور اپنے کردار کے لحاظ سے بھی کافی سے بڑھ کر بہت، جسے قرآن نے مفصلہ ————— FIFTH COLUMNIST

لہذا مستوجب مذکر کرنا ہے۔ اسلامی حکومت میں اسے حزب معاون کہہ جاتے تھے اور یہی اس کا عملی کردار بھی ہوگا۔ قرآن اختلافات کو مٹانے کے لئے آیا ہے اس لئے جس کا اس کی تعلیمات پر یقین ہے اس کے لئے رحمت اور رہبر حیات ہے۔ (۱۶/۱۶) اور اختلافات کا مٹ جانا رحمت خداوندی ہے۔ (۱۱۹-۱۱۸) گویا قرآن کی رو سے حزب اختلاف مٹ چنے کر دار اور مخالفہ کے عذاب خداوندی ہے۔

ان احکام خداوندی کی روشنی میں جو برا و راست ہمارے سامنے ہیں ہمارا گذشتہ سالہ کردار و عمل اور بر ملا منافقت کا وہ شاہکار ہے جس کی مثال تاریخ کے صفحات میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اسلامی جمہوریہ اسلامی آئین اور اسلامی مملکت کے نام سے ہم نے اسلام کی اور اپنی رسوائی کا جو سامان کیا تھا اس کی تکمیل کا آخری منظر دسمبر ۱۹۷۱ء میں دنیا کے سامنے آگیا۔ قرآن کے مطابق یہ وہ مذابِ عظیم ہے جو پارٹی بندی اور اختلافات کا لازمی نتیجہ ہے (۱۶/۲) یہ ہماری مذہبی فرقہ واریت اور سیاسی پارٹی بندی ہی کا انجام ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی مسلمان مملکت۔ بلعسدی میں اپنا ایک متفقہ آئین تیار نہیں کر سکی اور جب تک یہ اختلافات اور گروہ بندیوں نہیں مٹیں گی اس وقت تک مشترک آئین نہیں بنے گا یا جب تک کوئی آئین ان فرقوں اور پارٹیوں کی محنت سے امت مسلمہ کو نجات نہیں دلائے گا اس قوم کا حقیقی اور مشترک آئین کھلانے کا مستحق نہیں ہوگا۔

ہماری اس طویل لامرکزیت اور بے آئینی ہی کی وجہ سے ہمارا کوئی بھی شعبہ حیات، اختلافات اور تفاوت کی ممکنہ ذرہ سے بچ نہیں سکا اور ہماری معیشت بھی طبقہ داری کی لعنت سے موشِ جگر کی حال کہ قرآنی آئین کی تشکیل و تنفیذ کی صورت میں قرآنی معیشتی خطوط پر چل کر ہماری قوم افلاس کے شرمناک داغ سے بچ سکتی تھی اور سرمایہ دار بھی اس رسوا کن داغ سے بچ سکتا تھا جو اس کی دولت کو آگ میں تپا کر اسے لگایا جائے گا۔

اب دیکھا کہ کی حکومت نے لاوینی حکومت کا اعلان کر کے قرآن کی حاکمانہ استعداد کو کھل

و جیلغ کیا ہے اور ہم نے اسلام کے بارے میں دنیا کو پھر ایک بار دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے (چہ) جو قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان کو اس نے ظالم (چہ) اور فاسق (چہ) کہا ہے۔ یہ تو مطلق مشفق با نورو کا نوحہ ہوا

اور مغربی پاکستان میں،

نشبِ بجاں کے جاننے واو  
کیا کرد کے اگر سحر نہ ہوئی!

بجوات

۱۹ اپریل ۱۹۷۱ء

زے نصیب۔ کہ ایک آزاد اور نظریاتی حکمت کے حصول کی جدوجہد پر قلم اٹھا۔ نہ جانے کب سے یہ خواہش کروٹیں لے رہی تھی۔ مگر سدبزار افسوس کہ یہ شرف حاصل بھی ہوا تو کس موڑ پر۔!

اسلام اور پاکستان کی تاریخ کے اند دہاک موڑ پر، جب پاکستان ایک بازو سے محروم، ایک لاکھ پاکستانی سرخرو شدہ ترین دشمن کی قید میں، ان کے اندازاً ۵ لاکھ افراد زندہ گریہ کنوں، مغربی پاکستان کا وجود اندرونی اور بیرونی سازشوں کے باعث شدید خطرات سے دوچار اور عالم اسلام اپنی سب سے زیادہ معتد علیہ مسکن کی اس حالت پر غمزدہ۔!

ہمت اور جوش کے باوجود شدت احساس کا عالم یہ کہ ہونٹوں پر مسابٹ کا تصور بھی عفتا۔!

اولاد بری پیاری برتی ہے۔ مگر یہ کون جانتا ہے کہ والدین کا نام روشن کرے یا.....  
یہیں تصنیف۔ ہر مسکن کی وہ اولاد برتی ہے جو نام روشن نہ کر سکے ترقیاً چکر بھی نہیں لگاتی۔  
اس اولاد کی پیدائش پر صنعت کی خوشی کا اندازہ کچھ اسی کا دل کر سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود۔  
آج دکھ غالب ہے، مسرت کو سوس دور ہے۔ اور سقوط شرقی پاکستان کے بعد ان کانوں میں ہر لمحہ جہزہ بگھولا جا رہا ہے۔ اس کا اثر روح کی گہرائیوں تک ہے۔ یہی زہر کہ:

”مشرقی پاکستان کی شکست نے ثابت کر دیا کہ نظریۂ پاکستان بھی شکستہ و بے بنیاد تھا۔“  
پاکستان خالصتاً اسلامی نظریے کے تحت معرض وجود میں آیا۔ لیکن آج اسی اسلامی نظریے کو کتنی آسانی کے ساتھ چیلنج کیا جا رہا ہے، اسے شکستہ، فرسودہ اور بے بنیاد قرار دیا جا رہا ہے۔!

سوچتا ہوں کہ ڈھاکہ کا بیت المکرم تو ہندوؤں اور لاویوں کے تسلط میں گیا..... لیکن  
پاکستان کے مسلمانوں کے روح و قلب کا بیت المکرم کیوں زمین بوس ہو جاتا ہے؟ وہ کس کے تسلط میں ہے؟ اس کی بنیادوں پر کدال چلانے والے نہایت تندہی سے اپنا مشن پورا کر رہے ہیں اور ہم حالات کی یال بکھنے اور ہواؤں کا رخ جاننے کی بجائے ”نا سمجھی“ میں۔ ”غیر ارادی“ طور پر

صلوات اللہ علیہ  
ناظر





## باب

# طلون شہزادہ و ظہور عرب

پانچویں صدی عیسوی میں قبیلہ قریش میں نضی بن کلاب نے جو چار واسطوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا تھے، اپنے بھروسے ہوئے خاندانوں کو یکجا کر کے مکہ کی حکومت اور کعبہ کی تولیت دونوں پر قبضہ کر لیا۔ اس سے پہلے کعبہ پر بنو خزاعہ کا قبضہ تھا مگر ان کے متوقی کعبہ نے صرف ایک مشکیزہ شراب کے عوض نضی کے ہاتھ کعبہ کی تولیت فروخت کر دی۔ حجاز و مکہ، عرب و اکناف عرب اور یورپ اور ایشیا غرضیکہ کہیں بھی تخت و تاج کے دلاویز لوازمات مثالی تو تھے مگر انسانی روح کا بیش قیمت موتی بے آب و تھا۔

نضی نے جس نظام کی بنیاد ڈالی تھی وہ ان کے جانشین بیٹے عبدالدار کی وفات کے بعد خطہ میں پڑ گیا۔ مصالحت ہوتی اور مناصب خاندان قریش کی دو شاخوں میں تقسیم ہو گئے۔ عبدالمطلب کو اپنی موثر شخصیت کے باعث امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ انہیں اپنے آٹھ بچوں میں عبداللہ سب سے پیارے تھے۔ عبداللہ کی شادی بنی زہرہ کے سردار و جب کی لڑکی آمنہ سے ہوئی۔ مگر شادی کے کچھ عرصہ بعد ۲۴ سال کی عمر میں وہ وفات پائے اور پھر چند ماہ بعد آمنہ نے اس یتیم کو جنم دیا جسے ہچمل کے نام سے پکارا گیا۔ یہی انسان اولیٰ اور جمن انسانیت کا نکل سرسید ہے جسے ہم محمد رسول اللہ کہتے ہیں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کی

تاریخ ولادت بالعموم ۹ ربیع الاول (اتوار) مطابق ۲۰ اپریل ۱۹۷۱ء تسلیم کی جاتی ہے۔  
ابھی آپ ۶ برس کے تھے کہ والدہ آمنہ وفات پائیں، عبدالمطلب کے زیر سایہ آئے۔  
مگر دو سال بعد اس سائے سے بھی محروم ہو گئے۔ پھر حضرت علیؑ کے والد اور اپنے چچا ابوطالب  
کے زیر سایہ آ گئے۔ آپ کی دیانت کا یہ عالم تھا کہ ”الامین“ مشہور ہو گئے۔ یہی شہرت سن کر قریش  
کی متمول ترین خاتون خدیجہؓ نے جو پاکیزگی اخلاق کے باعث ”طاہرہ“ کے لقب سے جانی جاتی  
تھیں، آپ کو اپنا سامان تجارت شام پہنچانے کی پیش کش کی۔ پھر آپ کی دیانت سے اتنی متاثر  
ہوئیں کہ شادی کا پیغام بھیج دیا۔ وہ بیوہ تھیں اور دو شوہروں سے ان کے تین بچے تھے۔

وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی رہنمائی کی۔ حضور اکرمؐ پر یہ انکشاف حقیقت ۴۰ سال  
کی عمر میں رمضان المبارک میں ہوا۔ آپ کے دعویٰ نبوت پر سب سے پہلے آپ کے قریبی دوست  
حضرت ابوبکر صدیقؓ اور تمام گھروالے ایمان لائے۔ جب تین سال کی کوشش سے عیسٰی افراد  
حلتہ نگوش اسلام ہو گئے تو اعلانِ تبلیغ کا آغاز ہوا۔ دعوت اسلام سے جب کعبہ کے بت  
اور اہل مکہ کے آبائی عقائد پر زور پڑی تو حق و باطل میں جنگ شروع ہو گئی۔ قریش تشدد پر اُتر  
آئے کوئی لالچ آپ کو اپنے مشن سے نہ ہٹا سکا۔ آخر آپ نے نبوت کے پانچویں سال مسلمانوں  
کو حبشہ ہجرت کرنے کی دعوت دے دی۔

اس وقت مسلمانوں کی کل تعداد پچاس تھی۔ نبوت کے دسویں سال آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت  
خدیجہؓ اور سرپرست ابوطالب بھی انتقال کر گئے۔ تبلیغ کے عوض طائف میں آپ کا استقبال  
پتھروں سے کیا گیا۔ مکہ میں تبلیغ کے امکانات ختم ہو چکے تھے لہذا وطن عزیز کو آخری سلام  
کہہ کر مسلمانوں کے ساتھ شرب کو ہجرت کی۔ انہی دنوں شرب کا نام بدل کر مدینۃ النبی رکھا گیا۔  
جو بعد ازاں مدینہ رہ گیا۔ نبوت کی ساڑھے بارہ سالہ مکی زندگی میں قرآن پاک کا دو تہائی حصہ  
آپ پر نازل ہو چکا تھا۔ آپ نے مدینہ پہنچتے ہی اس حکومت کی بنیاد رکھی جس کے بغیر دین  
اسلام اذورا بلکہ بے معنی بھی تھا۔ آپ نے مدینہ میں مسجد کی تعمیر، موافات اور معاہدہ دفاع  
کے کام انجام دیئے۔ مکہ کے مہاجر غریب الوطن اور تہی دست تھے۔ لہذا آپ نے ایک ایک  
مہاجر کو ایک ایک مقامی (انصار) کا بھائی بنا دیا۔ مہاجر ان کے گھروں میں رہنے لگے اور  
انصار نے انہیں اپنی ہر چیز کا نصف دیدیا۔ آپ نے یہودیوں سے ایک سیاسی معاہدہ بھی کیا۔  
اطراف مدینہ کے عرب قبائل نے بھی اس پر دستخط کر دیئے۔ یہ دیکھ کر مکہ والوں نے مسلمانوں

پر نہیں مستطو کر دیں۔ ہجرت کے صرف ڈیڑھ سال بعد میدان بدر میں ۳۱۳ پیادہ مسلمانوں کی نیم مسیح نندی کے ساتھ کفار کے ایک ہزار مسلح سواروں سے مقابلہ ہوا پھر بھی فتح مسلمانوں کی ہوئی۔ اس سے ایک سال بعد پھر کفار سے جنگ ہوئی جو غزوہ احد کہلائی۔ آخر کار ۵ ہجری میں ۶۰۰۰ ہزار کفار نے حملہ کر دیا۔ اس کے باوجود ناکام ہوئے۔ ۶ ہجری میں آپ کے اور قریش مکہ کے درمیان معاہدہ حدیبیہ ہوا۔ یہ دس برس تک جنگ بندی کا معاہدہ تھا مگر قریش نے صرف ۳ سال بعد معاہدہ توڑ دیا۔ آخر مکہ والوں نے ہتھیار ڈال دیے اور مکہ اور کعبہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

آپ نے مکہ میں داخل ہوتے ہی کعبہ کا حواف کیا پھر وہاں رکھے ہوئے ۳۶۰ بت گرا دیئے پھر امن عام کا اعلان فرمایا اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔ صرف دو مجرموں کو سزا دے موت دی گئی۔ فتح مکہ سے چند دن بعد جنگ خین ہوئی اس میں بھی مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کچھ عرصہ بعد آپ مکہ سے مدینہ تشریف لے آئے۔

مدنی زندگی کے چھ سال آپ نے دعوت اسلام کے خطوط مختلف سرداران قبائل اور بادشاہوں کے نام لکھے یوں ہزاروں کفار مسلمان ہو گئے۔ ساتویں ہجری میں آپ عمرہ کیا۔ آٹھویں ہجری میں جنگ موتہ پیش آئی اور مسلمانوں کو شاذکار کامیابی نصیب ہوئی۔ آپ کو تحویل دین کی آیت کے نزول کے بعد اپنے سفر آخرت کا علم ہو چکا تھا لہذا انہوں نے ایک لشکر تیار کیا۔ اس کا مطلب رومی سرحدوں پر حملہ کر کے انہیں مرعوب کرنا تھا۔ اس لشکر کی قیادت میں سالہ اسامہؓ آپ کے آزاد کردہ غلام کے ہاتھ میں تھی۔ لشکر کوچ کے لئے تھا کہ آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی مگر آپ کامریض دراصل مرض الموت تھا۔ وفات سے چند روز قبل آپ نے ظہر کی نماز کے بعد زندگی کا آخری خطبہ دیا۔ چار دن بعد اضطراب پیدا ہوا۔ نے ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا۔ بس اب بڑا رفیق درکار ہے۔

یہ کہتے کہتے ہاتھ ڈھلک گئے اور روح..... صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ اس دن بیعہ السلام اور اتوار کا دن تھا۔ دوسرے دن رسول خدا کے غسل اور تکفین کے بعد لوگ گروہ نماز جنازہ پڑھتے رہے امامت کسی نے نہیں کرائی اور اس جگہ جہاں آپ نے وفات پائی حجۃ حضرت عائشہ صدیقہؓ میں نصف شب کے بعد تدفین کر دی گئی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کے منصب خلافت پر

کے منتفی ہو جانے کے اسباب میں واضح سبب یہ گرا دیا جاتا ہے کہ آپؐ نے رضی اللہ عنہ میں نماز کی امامت کے لئے اپنی جگہ حضرت ابوبکرؓ ہی کو مقرر فرمایا تھا اور امامت کا یہ حکم جانشینی کی طرف نہایت روشن اشارہ تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کو زمام خلافت سنبھالتے ہی انتہائی سنگین مسئلہ یہ پیش آیا کہ فتح مکہ کے بعد جن عربوں نے اسلام کی محض شوکت و قوت دیکھ کر اسلام قبول کر لیا تھا انہوں نے حضورؐ کی وفات سے یہ انداز کیا کہ یہ شوکت و قوت ٹوٹ گئی لہذا انہوں نے مرکزی حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ لہذا حضرت ابوبکرؓ نے اسامہؓ کو کمان دے کر رخصت کیا اور مدینہ کا بغیر فوج کے دفاع کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ مسلسل ایک سال تک باغیوں کا مسلح مقابلہ کرنے کے بعد ان کی سرکوبی میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دو سال حکومت کی اور حضرت عمرؓ کو اپنی جگہ نامزد کر دیا۔ حضرت عمرؓ کا دس سالہ دور خلافت بے پناہ قانون سازی اور انتظامی و انصرافی کمال کی وجہ سے تاریخ اسلام کا ممتاز ترین باب ہے۔ کثرت قانون سازی کی وجہ کثرت فتوحات تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے مرض وفات میں خلافت کے بارے میں جو وصیتی تحریر چھوڑی اس کے مطابق چھ افراد پر مشتمل کمیٹی نے اپنے میں سے حضرت عثمانؓ بن عفان کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ کمیٹی میں حضرت عمرؓ کے صاحبزادے بھی شامل تھے مگر حضرت عمرؓ نے انہیں انتخاب کے لئے کالعدم قرار دے دیا تھا۔

حضرت عثمانؓ ۱۳ سال خلیفہ رہے۔ انہوں نے انتظامی نوعیت کی اہم تبدیلیاں کیں اور مملکت کا رقبہ غیر معمولی طور پر وسیع ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت مسلمانوں کے ایک سازشی عنصر کے ہاتھوں ہوئی۔ ان کے بعد مسلمانوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی۔ حضرت علیؓ نے دار الخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کر دیا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے وقت سے شام کے مفتوحہ ممالک میں تمام تر انتظام و انصرام معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھوں میں تھا۔ انہوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کو چیلنج کیا اور اپنے علاقہ میں خود مختاری کو چیلنج کر دیا۔ حتیٰ کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد وہ سب مملکت اسلامی کے امیر مطلق بن گئے۔ یوں دار الخلافہ یا دار الحکومت دمشق ہو گیا۔ امیر معاویہ اسلامی مملکت کے پہلے حکمران ہیں اور انہوں نے انتخاب کے بغیر قوت کے بل پر درپردہ کوششوں سے جانشینی کا انتظام کیا۔ یوں اسلام میں پہلی مرتبہ موروثی بادشاہت کی بنیاد پڑی۔

میں کدال کی ضربوں کو مددِ بد و است کر رہے ہیں بلکہ منافقوں کا شین بھی اپنا تھے بار ہے۔  
سوال یہ نہ یہ "ناکھی" یہ "نارانی" کیوں؟

اس لئے کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ڈیڑھ دو سال بعد ہی سے اقتدار اختیار کی چھینا چھٹی شروع ہوئی۔ وہ کرکٹ میچ ہو کہ وکٹیں اڑتی رہیں۔ سیاسی کھلاڑی ہاٹ کئے جاتے رہے۔ اور دیگر تمام ذمہ داروں سے آنکھیں موند لی گئیں۔ نئی نسل نے مجھ سکی کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے۔ نہ اُسے اپنی منزل کا علم ہو سکا۔ لسانی تنازعات بار بار پیدا ہونے لگے۔ مگر کوئی "مجاہد آزادی" نہ کوئی "سند" محافظِ نظریہ پاکستان یہ بتانا سکا کہ یہاں بر قوم آباد ہے، اس پر رنگ، نسل، ذات، ملائے، زبان کی بنیاد پر اتنا زیادتی تفریق حرام قرار دی گئی ہے۔ شاید اس لئے کہ پاکستان کا سیاستدان "ملا" کہلانے کی بجائے "پیٹر" کہلانے پسند کرتا رہا، وہ "پیٹر"۔ جس کے ایک ہاتھ میں مذہب کی اور دوسرے ہاتھ میں سیاست و حکمت کی تلوار ہے۔ دونوں تلواریں بڑھ جاتی ہیں تو اپنے ہی بازو کاٹ چھینکتی ہیں ورنہ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ناچیل کیوں نہ ہوں؟ اور وہ یہ دونوں تلواریں دو مختلف افراد کو تھما دیتا ہے۔ (شاید درست و گریباں ہونے کے لئے)

نئی نسل نے دو تلواروں والے "پیٹر" ہی کو دیکھا۔ چنانچہ ۲۵ سال میں جب یہ نسل مفتوانِ شباب کو پہنچی تو وہ احتجاج، جلسہ، جلوس اور مظاہرے میں طاق تھی، اسے تہذیبِ مغرب و لسانِ مغرب کا علم تو تھا لیکن اُن "بسیاری اقدار سے کلیتاً بے بہرہ۔ جن سے اس کا خیر اٹھا تھا۔ "اکس بے" فٹ و ملکیت کی پیشانیوں کا "چاند" بنا۔ جن ساحلوں سے ایک مسلمان عورت کی فریادِ تہاج کے کانوں سے جاگرائی تھی، اور جس فریاد پر ہندو کے نخوت و بکتر سے مسلمان ہلکایا تھا، اُنہی ساحلوں پر مسلمان لڑکیاں "مسلمانوں" کے ہاتھوں بے آبرو ہوئیں۔ مگر وہ کس "تہاج" سے فریاد کرتیں؟ بحث اس سانحہ سے ہے نہ اس سزا سے جو طلبہ کو ملی۔ رونا اس سے زعم کا ہے جو ۱۹۴۷ سال تک پلنے کے بعد ناسور بن گیا، جس کا فاسد مادہ اس جسم کے دوسرے حصوں پر قطرہ قطرہ ٹپکا اور انہیں بھی موزوں و ناکاہ کو تاج لگایا۔ ماقم اسی معذوری کا ہے۔ مشرقی پاکستان، موقع پر طور کی جھولی میں جاگرا۔ اس لئے ہرگز نہیں کہ ہمارے نظریئے کی اساس شکستہ تھی۔ یا تھی ہی نہیں۔ اس لئے کہ ہم نے اس اساس کے تحفظ کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ اب اس ناسور کا زہر پلا تاؤ و سندھو بلرچستان اور سرحد پر ٹپک رہا ہے۔

میں کمال دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ اس لمحہ تک اجتماعِ عیسائی بھی چاہنے پر ایسی کسی قسم کی طرف توجہ نہیں دی گئی، جس کے ذریعہ اس مملکت کے حصول کے مقصد، اس کی نظریاتی اساس اور اس کے نئے جدوجہد کی وجوہات کو عوام بالخصوص طلبہ پر آشکار کیا جاسکتا اور ان کے عقائد کو راسخ کرنے کی کوشش کی جاسکتی۔ اگر پاکستان کا مطلب لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تھا۔ تو کیا پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد یہ مطلب ختم ہو گیا یا بدل گیا۔؟

مگر میں سوگ بور اور جم جیسی منائیں۔؟ مشترقی پاکستان پر اغیار کا تسلط ہوگا۔ لاکھوں مہجانبِ وطنی کے غم ہے ہوئی کھیل گئی، لاکھوں عورتوں کے سہاگ ٹٹ گئے، لاکھوں بیٹیاں آبرو اور یتیم ہوئیں، ایک لاکھ بیلے دشمن کے گیمپوں میں پہنچے۔ ڈو بار اُن پر ٹوکیاں برسیں، اُن کے لاکھوں افرادِ خانہ کے آنسوئیں کہ تم نہیں پاتے، سرحدوں پر دشمن کا اجتماع، پاکستان کے وجود کو ختم کرنے کے لئے سامراجیوں کی کارروائیاں۔ مگر ہم نے جتنی منائے، بمشعل بردوار جنوس نکالے، مجنگڑے ڈالے۔ اس لئے کہ کچھ لوگوں سے زمینیں چھین گئیں۔ فطرِ مسرت کا بہ مالہ کہ ملک کا ایک حصہ، ایک لاکھ مجاہد، بیویوں کے سہاگ، بیٹیوں کی آبرو۔ چھین جانے کا غم غلط ہو گیا۔ یہ سب کیا ہے۔ کیوں ہے؟ آنکھوں میں ان ظلمتوں کو چہرے کا دم بنے نہ دل میں اس زہر کے مقابلہ کی سکت۔!

جب احساسِ نیاں جانا رہتے تو احساسِ حیات کی دھجیاں خود بخود فضا میں اڑ جاتی ہیں۔ ختم قلب و روح کے جلاد اور استحکام کے اس اسلامی نظریے سے انحراف کیا جو دنیا و آخرت کو محیط ہے۔ اس کی جگہ "رواقی نظریاتِ مسرت" کو دی۔ نتیجہ۔؟ کہ اس قدر اور شجرِ سرسبز کو آندھیوں اور طوفانوں نے کوٹ لیا۔ جس کی فطرت میں پاک کا عالم یہ ہے کہ کوہِ گراں بھی ٹوٹے تو اس کی کونچیں پھوٹتی رہیں، اس کی شادابی قائم رہی اور کوئی غلبہ اُسے متاثر نہ بننے سے نہ روک سکا۔ قلب و روح کی زندگی و شادابی کا یہ احساس کہاں گیا۔؟

میاستندان کا احساس۔ اقتدار نے چھینا، تاجروں و صنعت کار کا احساس دولت نے ٹوٹا، قلم کی آبرو کا احساس ریکٹوں میں مٹ گیا، ملک کا احساسِ نزاعی مباحث اور جُتہ و عامر میں اُلجھا، متوسط اور غریب طبقہ کا احساس بد عزائیوں، رشوتوں اور معیشتی ابتلا نے مجروح کیا۔ اس افراترزی میں تھی پرو، نئی نسل کو پاکستان کی اساس اور اُن کے فرائض کا احساس کون دلاتا۔؟ رہا، سناو۔ ترو ویکٹو کی، مارکس اور لینن کے افکار میں گم۔ ان کا تاج اور شیدائی اُسے



بتہ سمجھنا کون ؟

— اقتدار کے بھاری یا محراب و منبر کے اجارہ دار ؟

— مربایہ پرست والدین یا اعلیٰ ملازمتوں کے ذریعہ بدعنوانوں کے ولد دادہ ؟

— بیروزگاری اور افلاس کی کچی میں پینے والے لوگ یا صوبائی عصبیت کے غفریت ؟

سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ مادہ و فریاد کیجئے تو کس سے — روئیے تو کس کے سامنے — ؟

آ — اودیت پرچے تو تذبذب ہو کر رہ جاتا ہے — صحرا کی پائیس نہیں گھنٹی، آنسو دریا میں گرے

تو اس کی بیکرائی میں اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے — طوفان پیدا نہیں کرتا — ہاں! دیدہ واد اور

تعب حساس کے سامنے ٹپکے نو گھر کی قدر و قیمت پاتا ہے۔ شرط اتنی ہے کہ ایشک 'جوہر سیتال'

اور شاہد 'جوہر شناس' ہو۔ آج پاکستان کو اس 'جوہر سیتال' اور 'جوہر شناس' ایک وقت

دونوں کی ضرورت ہے — تاکہ پھر ہمیں تذبذب ہو نہ دیر یا کی بیکرائیوں میں گم — بلکہ گھر کی

قیمت پانے لگے اس کے لئے احساس شکستہ نہیں احساس تازہ کی دولت درکار ہے — وہ

دولت — جس کی حفاظت 'قدر مشترک'، نظریہ مشترک اور اساس مشترک کے محافظ کر سکیں۔

۶۔ رمضان ٹریٹ - فلیمنگ روڈ

لاہور



عباسیوں نے ۷۴۹ء سے ۱۲۵۹ء تک اقتدار سنبھالے رکھا۔ ان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد حکومت سے عربوں کا اثر و رسوخ کم ہونے لگا اور ایرانی اثر و رسوخ کا آغاز ہو گیا۔ بنو امیہ کے دور میں عرب و عجم کے درمیان جو امتیاز پایا جاتا تھا۔ بنو عباس کے دور میں اس امتیاز کو اسلامی احکامات کی تطبیق میں برتری حاصل نہیں۔ بنو عباس کے دور میں بہت سے ایرانیوں کو دربار میں اچھے عہدے ملے۔ بنو عباس کے دربار میں ایران کے درباروں ایسی مملکت اور دبدرہ نظر آنے لگا۔ اس دور میں خلیفہ ہارون الرشید کو ستر بن خلیفہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے دور میں پورے ایشیا کے لوگوں کو دربار میں ملازمت دی گئی۔ ترکوں کے ہاتھ میں فوجی قیادت جانے سے ان کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بنو عباس کی حکومت بغداد کے صوبے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ وہ سیاسی اعتبار سے زوال پذیر ہو گئے تاج انہیں مذہبی اور روحانی سربراہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا رہا۔ ۱۲۵۹ء میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کر دیا اور خلیفہ وقت المستعصم کو ہلاک کر دیا۔ یوں خلافت بغداد کا خاتمہ ہو گیا۔

اسلام اور اسلامی اقتدار بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے۔ سب سے پہلے جن مسلمانوں نے ہندوستان کی سرحدوں پر قدم رکھا وہ عرب تھے۔ شام، فلسطین، مصر اور ایران پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد یہ عرب مسلمان مشرق کی طرف بڑھے۔ یہ مسلمان تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام میں بھی مصروف تھے۔ عبداللہ بن عمرو بن رابی، مکران سے ہوتے ہوئے سیستان اور سوستان تک پہنچے۔ قیام امن کے بعد مصر، مکران، لوطے، یہاں سندھ اور مکران کی مشترکہ طاقت نے ان کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ جو مسلمان جنوبی ہند میں تجارت کر رہے تھے۔ ہندو راجہ انہیں کسی۔ واداری کی بنا پر برداشت نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ ان پر ٹیکس عائد تھا۔ ہندو راجہ اس سے خامی دولت سمیٹ رہے تھے۔ سندھ کا راجہ کسے دن مسلمانوں کے خلاف شرارتوں میں مصروف رہتا۔ آخر جب اس نے خلیفہ ولید کے دور میں مسلمانوں کے ایک سمندری قافلے کو لوٹا اور عورتوں بچوں کو قیدی بنالیا تو حجاج نے راجہ دہتر کے خلاف فوج روانہ کر دی۔ دو مہات میں مسلمانوں کو شکست ہوئی مگر میری مم جو محمد بن قاسم کی قیادت میں آئی کامیابی سے ہلکار ہوئی۔ آخر ۳ سال بعد محمد بن قاسم نے سندھ کا وہ تمام علاقہ قبضہ میں کر لیا جس کی سرحدیں اس وقت کشمیر کو چھوٹی تھیں۔ اس موقع پر محمد بن قاسم نے

دہلی میں پہلی جامع مسجد تعمیر کرائی اور چار بنزار غرب تاج آباد کئے۔ سندھ ۳۹ سال تک امویہ خلافت کے زیر انتظام رہا اور قریباً سو سال تک خلافت عباسیہ کے۔ بعد ازاں سندھ کی حکومت ایک مقامی عرب خاندان کے ہاتھ میں آگئی جو ڈیڑھ سو سال تک حکومت کرتا رہا۔ تین سو سال تک مسلمانوں کی حکومت کے بعد وہاں سومرو خاندان کا قبضہ ہو گیا اور اس سرزمین پر پھر کفر و لجاجت کی تاریکیاں چھا گئیں۔

جب سبکتگین غزنوی کا بادشاہ منتخب ہوا اور اس نے بہت اور قزوار کے علاقے بھی فتح کر لئے تو اس کی سرحدیں راجہ جے پال کی سرحدوں سے جا ملیں۔ راجہ کی حکومت لاہور تک پہنچ گئی تھی۔ راجہ کی فوج نے سبکتگین کی فوج سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو اس نے بھی ہوابی کارروائی کی۔ شکست کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور سبکتگین نے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مغان سے پشاور تک اس کی حکومت وسیع ہو گئی۔ ۶۹۷ء میں سبکتگین کے انتقال کے بعد محمود غزنوی سلطان مقرر ہوا۔ راجہ جے پال نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ لہذا محمود غزنوی نے کارروائی کی۔ راجہ جے پال کو اس بار اپنی شکست پر اتنی شرم آئی کہ وہ زندہ جل مرا۔ اور اس کا بیٹا آئندہ پال تخت نشین ہوا۔ جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار ۷۱۲ء میں محمود غزنوی کی حکومت پنجاب تک پہنچ گئی۔ غزنوی خاندان کی حکومت ۱۹۰ سال تک رہی۔ اور اس خاندان کے کل ۱۴ بادشاہ ہوئے۔ غزلیوں نے غزنوی پر حملے کئے۔ اور بہرام غزنوی نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ پھر لاہور کا تخت محمد غوری کے قبضہ میں آ گیا۔ محمد غوری کی جنگ راجہ پرتھوی راج سے ہوئی اور محمد بنک اس کو شکست ہوئی۔ سلطان معز الدین محمد بن سام ہندوستان سے غزنوی لوٹتے ہوئے ہندو راجاؤں کی سازش سے پنجاب کے علاقے میں قتل کر دیا گیا۔ سلطان لادلہ تھا۔ لہذا اس کے ایک غلام قطب الدین ایبک کو ہندوستان کی سلطنت ملی۔ ۷۵۵ جولائی ۱۲۰۶ء کو دلی کے تخت پر براجمان ہو گیا۔ اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت کا آغاز ہو گیا۔ اس کے بعد ہندوستان پر خلجی، تغلق، سید لودھی، سورجی اور پھر خلیفہ حکمرانوں کے ادوار آتے رہے۔

## باب

# تکوار نہیں احسلاق

اسلام پر الزام کیوں؟

اسلام پر غیر مسلم جی اور مشرقی و مغربی کی طرف سے ہمیشہ سے یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ اسلام تموار کے زور سے پھیلا اور مسلمانوں نے ہندوؤں کی آزادیاں سلب کیں۔ اُن پر جزیہ عائد کیا۔ اور ہندوؤں اور دیگر غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کو ترجیح دی اور تمام الزامات کو سمیٹ لیا جائے تو ایک بہت بڑا الزام وجود پاتا ہے اور وہ یہ کہ اسلام اور اس کے ماننے والوں نے انصاف کے تقاضوں کو ہمیشہ نظر انداز کیا۔ حالانکہ اسلام نے انصاف پر جتننا زور دیا ہے۔ اور جس طرح بار بار انصاف کے لئے تاکید کی ہے۔ کبھی دوسرے مذہب میں اس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔ اسلام کا یہ انصاف صرف انہوں کے لئے نہیں بلکہ اس میں اپنے اور پر لئے سبھی شامل ہیں۔ صلوح اسلام اور ہادی برحق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک سے خلفائے راشدین تک اور پھر ہندوستان اور دیگر دنیا کے کونے کونے تک اسلام کے پھیلاؤ اور اسلامی حکومتوں کے قیام کے باوجود تاریخ اس امر پر شاہد ہے۔ کہ کسی صورت میں انصاف کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مسلمان نہ کبھی بربر و مہنگول اور تاتاریوں کے برہنہ ہاتھوں پر ٹوٹا۔ نہ ہی اُس نے اپنے بدترین دشمنوں سے کبھی ظلم و ستم بردار کیا۔



یقینی اور قدرتی بات ہے کہ پھر وہ اپنے لئے کسی دوسرے دامن میں پناہ ڈھونڈے گا۔  
اس طرح جیسے ایک بچہ اگر اپنی ماں کی مانتا سے محروم ہے، تو وہ ہر اُس محرت کے ساتھ پیار کرے گا جس کے سینے سے اُسے مانتا اور پیار کی بو آئے گی اس بولیں اُس خون کی بُو ب جاتی ہے۔ جس  
نوں سے اس بچے نے جنم لیا ہوتا ہے۔ بعینہ جب کوئی شخص اپنے مذہب کی گورد کو چھوڑ دیتا ہے  
تو اس کی درہی وجوہات ہوتی ہیں:

۱۔ کہ اُسے اُس کا مذہب انصاف، وسیع تر مذہب میں نہیں ملے سکا۔ ۲۔ یا اُس کا

عقیدہ راسخ نہیں تھا۔

جہاں تک عقیدے کے راسخ نہ ہونے کا سوال ہے تو اس میں بھی دو چیزیں کار فرما  
ہوتی ہیں۔ ۱۔ اپنے مذہب پر اپنی طرح واقفیت نہ تھی، اور عقیدے میں سلطیت تھی۔ یہ کہ  
دوسرے مذہب میں کوئی ذاتی مفاد نظر آیا۔ لیکن بات پھر یہ ہیں: جانتا ہے کہ اُس کوئی شخص کہ دوسرے  
مذہب پر ذاتی مفادات کی بنا پر ایمان لے آتا ہے۔ تو کسی دن جس وہ سنی تمبر سے مذہب میں بھی انہی  
مفادات کی بنا پر شامل ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے ۔۔۔

کہ ایسے لوگوں کو اسلام تو کیا کوئی بھی مذہب اپنے دائرے میں اخلاق یا جبر سے گھسیٹ  
کر کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟ مذہب کا مقصد اپنے عقیدت مندوں کی تعداد میں محض اضافہ کرنا  
ہے۔ یا انہیں سلامتی کی راہ دکھانا ہے؟ اگر صرف تعداد میں اضافہ مقصود ہے۔ تو عقیدے  
کبھی راسخ نہیں ہو سکتے اور اگر سلامتی کی راہ دکھانا ہے۔ تو عقیدہ ہمیشہ راسخ ہوگا۔

اس تمہید کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ اگر اسلام نے غوار کے بل پر ہی دنیا کے کروڑوں  
اور ہندوستان کے لاکھوں افراد کو دائرہ اسلام میں شامل کیا تو اسلام نے کیا مقصد حاصل کیا اور  
جب ہندوستان میں مسلمان حکومتوں کا زوال آگیا۔ انگریز کا قسط بڑھا۔ اور ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے  
بعد ہندوستان کے تین حصوں میں چھٹے پر ہندو کی حکومت قائم ہو گئی۔ تو وہ لوگ جن کے عقیدے  
اس لئے راسخ نہ تھے۔ کہ اُن کے اباؤ اجداد کو تلوار کے بل پر مسلمان کر لیا گیا تھا۔ دوبارہ  
اپنے اصل مذہب پر واپس کیوں نہ آ گئے۔ یا ایک بار پھر انہوں نے ذاتی مفادات کی خاطر  
اسلام کی راہ کو اپنے دامن سے کیوں نہ بھاڑ دی؟

## باب دور پر آشوب

ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد ہندوؤں کے مذہبی خیالات پر فاسے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ہندو مبلغوں اور مصلحین نے اسلام کی روشنی میں ہندومت میں اصلاحات کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے خدا کی ذات وحید اور تمام مذہبوں میں کیسانیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ انہوں نے بھکتی پر زور دیا۔ اور یہ موقف اختیار کیا کہ ہندومت اور اسلام کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اس تحریک کو انہوں نے بھکتی تحریک کا نام دیا۔ ان نظریات نے ایسے ہندوؤں پر جو ہادری کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اسلام قبول کرنے میں قباحت محسوس کرتے تھے۔ فوہم اثر کیا۔ اور ہندو بڑی تعداد میں یا تو مسلمان ہونے لگے یا انہوں نے میانہ روی اختیار کر لی۔ اسی لئے شہنشاہ اکبر کو بھی دین الہی کی اختراع کی جرأت ہوئی۔ بھکتی تحریک کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مسلمانوں میں بھی ہندوؤں کے کچھ خیالات اور رسم و رواج نشوونما پانے لگے۔ جب صحیح العقیدہ مسلمانوں نے بھکتی تحریک اور دین الہی کی وجہ سے مسلمانوں کو ایک نئی انسانی منزل کی طرف جلتے دیکھا تو انہوں نے۔ جو عمل کے طور پر دیگر تحریکیں شروع کر دیں۔

**مہدوی تحریک**

لیکن اس موقع سے غافلہ اٹھاتے ہوئے کچھ ایسے لوگ بھی سر اٹھائے گئے جو اپنے

مقام حاصل کرنا چاہتے تھے جو پورے ایک سید محمد نے مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا اور یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ لوگوں کو اسلامی فرائض ادا کرنے کی ترغیب دینے اور انہیں مختلف لعنتوں سے نجات دلانے کے لئے آیا ہے۔ مگر جو بوجھ رکھنے والے مسلمانوں نے اس کے اس دعویٰ کو تسلیم نہ کیا لیکن یہ تحریک سید محمد کے ایک عقیدت مند شیخ اعلائی کی وجہ سے تقریباً پائی رہی اور اسی کی کوششوں کے باعث بہت سے لوگ سید محمد کے ہال میں آ گئے۔ لیکن جلد ہی اس مہدی کا خاتمہ شیخ مخدوم الملک کے فتوے کے بعد موت کی صورت میں ہو گیا۔ اس طرح مہدیوں کا پھیلاؤ رُک گیا۔ اس کی موت کے بعد بہت سے مہدی اکبر کے ساتھ مل گئے صرف اس لئے کہ وہ علماء کا زور توڑ سکیں کیونکہ خود اکبر ان علماء کے خلاف تھا۔

### مجدد الف ثانی

ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ اکبر نے ایک نئے مذہب دین الہی کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس مذہب میں ہندو ازم، تصوف اور مقامی لاتعداد عقائد شامل تھے۔ لیکن ادھر اکبر نے آنکھیں بند کیں اور ادھر دین الہی کی موت واقع ہو گئی۔ اکبر کے دین الہی کے خلاف جس شخص نے سب سے پہلے احتجاج کیا وہ سرہند کے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ وہ نقشبندی مدظلہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے جو کام کیا۔ وہ یہ تھا کہ اسلام اور ہندومت میں واضح امتیاز کی تبلیغ کی۔ اور واضح طور پر یہ بات بھی کہی کہ مذہب کے معاملے پر ہندومت یا کسی دوسرے مذہب کا اسلام کے ساتھ بنیادی عقائد کے اختلاف کے باعث سمجھوتہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا انہوں نے اکبر کے دین الہی کے خلاف پُر زور تحریک چلائی۔ اور اس کی شدید مذمت کی۔ جہانگیر کے دور حکومت میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن بعد میں چھوڑ دیا گیا۔

### شاہ ولی اللہ

شاہ ولی اللہ پہلے مذہبی و سیاسی مفکر تھے جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے اور ان میں نئی روح پھونکنے کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ ان کا دورِ نشتر سے ۱۷۰۹ء تک ہے۔ یہ مسلمانوں میں۔ افراتفری کا دور تھا۔ مغل سلطنت کا زوال

ہو رہا تھا۔ اور مرہٹے اور سکھ مسلسل تخریبی کاروائیوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے ان حالات پر قابو پانے کے لئے، اور مسلمان معاشرے کو تباہی سے بچانے کے لئے ایک طرف تو احمد شاہ ابدانی کو بلا دیا اور دوسری طرف مسلمانوں سے دردمندان اپیل کی کہ وہ اسلام کے استحکام کے لئے جدوجہد کریں انہوں نے مسلمانوں میں اسلام کی روح کو سمجھنے پر زور دیا۔ اور سیاسی طور پر منظم ہونے کی ہدایت کی۔

شاہ ولی اللہ کا تعلق دلی کے ایک نہایت معزز خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے لوگ نہ صرف اپنے علم و فضل اور زبردور یا منت اور صداقت میں مشہور تھے۔ بلکہ اکثر سلاطین کے درباروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اسی خاندان سے مشہور عالم عبد الرحیم تھے جنہوں نے دلی میں مدرسہ رحیمیہ قائم کیا۔ شاہ ولی اللہ انہی کے صاحبزادے تھے ان کا اصل نام توقطب الدین تھا۔ جو بعد ازاں لوگوں میں دلی اللہ کے نام سے جاری ہو گیا۔ انہوں نے اپنے والد سے علم حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ حج بیت اللہ کے لئے گئے اور جب ہندوستان واپس ہوئے تو مرہٹوں کی یورش سے ہندوستان کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا تھا احمد شاہ ابدانی شاہ ولی اللہ کی دعوت پر ہی ہندوستان آیا اور پانی پت کی جنگ میں اس نے بیٹھ کے لئے مرہٹوں کی کمر توڑ دی۔ آپ نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان یکجا نگت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی گو اپنی زندگی میں وہ مغلوں اور مسلمان معاشرے کو زوال سے نہ بچا سکے لیکن ان کی سیاسی کا نتیجہ یہ ضرور نکلا۔ کہ مسلمانوں کے اتحاد و اتحاد احمد شاہ ابدانی اور نجیب الدولہ کی وجہ سے مرہٹوں کی کمر توڑ گئی۔ آپ کا انتقال ساٹھ سال کی عمر میں ۱۷۷۲ء میں ہوا۔ آپ کا دور تاریخ ہند کا اتنا بڑا آشوب دور تھا کہ تاریخ ہند میں شاید ہی اس کی مثال ملتی ہو۔ آپ عہد عالمگیری کے آخری ایام میں پیدا ہوئے۔ اور دس سال سلاطین کا رشا پاکر شاہ عالم ثانی کے عہد میں انتقال کر گئے۔ آپ نے سادات کا دور بھی دیکھا اور مرہٹوں کا عروج و زوال بھی سکھوں کی سفالیاں بھی دیکھیں اور دلی میں نادر شاہ کے حملے کے وقت قتل عام بھی — اس وقت ایران اور تورانی امراء کی رسد کشی نے اور مذکورہ بالا حالت نے مسلمانوں کے عقیدے اور ان کی اخلاقی حالت کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کو مستقبل میں جن مصائب سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ ان کی وفات کے بعد صرف نعت صدی کا مدت میں انہی مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۷۷۲ء میں



دلی کی جنگ نے مرہٹوں کی شکست کے بعد برطانوی استعمار کے لئے گنجائش پیدا کی۔  
 انگریزوں نے نابینا تاجدار دلی پر اپنی گرفت رکھی ہوئی تھی اور جب فاتح انگریز جرنیل لیکن  
 نے ذوال دلی کے بعد مقبوضہ علاقوں اور لوٹ مار کی فہرست مرتب کی تو اس نابینا تاجدار کا نام  
 جی فہرست میں شامل کر لیا۔ گویا یہ بد قسمت تاجدار بھی لوٹ مار کے سامان میں شامل تھا۔  
 اسی واقعہ کے بعد شاہ دلی اللہ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے تحریک بھلائی تاکہ  
 مسلمانوں کو ان کے زوال سے سبق دلایا جائے۔ شاہ عبدالعزیز شاہ دلی اللہ کے سب سے بڑے  
 صاحبزادے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریک کو کامیاب کرنے کے لئے نہایت مخلص لوگوں پر مشتمل  
 ٹیم بنائی۔ انہوں نے سب سے پہلے اس تمام سادہ کو دارالحرب قرار دیا جس میں خبر مشعوں کی  
 حکومت تھی۔ ساتھ ہی وہ اپنے والد کے خطوط پر دینی اور سیاسی فلسفے کی تبلیغ میں بھی مصروف  
 رہے۔ انہوں نے اپنا پیغام نہ صرف معززین بلکہ عوام تک بھی پہنچایا، تاکہ ان کے شعور کو بیدار  
 کیا جاسکے اور انہیں بتایا جاسکے کہ وہ کون ہیں، ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اور ان کی عزت  
 نفس کو کس کس طریق سے مجروح کیا جا رہا ہے۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ اور اس کی تکمیل کے لئے  
 موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ وہ ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء میں وفات پا گئے۔ لیکن اپنے بعد ایسے  
 لوگ چھوڑ گئے جو ان کے مشن کو پورا کر سکتے تھے۔ ان میں شاہ اسماعیل شہید، مولانا عبدالحی  
 سید احمد شہید، مولانا محمد اسحاق اور ان کے بھائی مولانا محمد یعقوب قابل ذکر ہیں۔  
 شاہ عبدالعزیز نے پنجاب سے سکھوں کی حکومت کے خاتمہ کے لئے، جہاد کے لئے بھی  
 تحریک شروع کی۔ اس وقت مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم اتنا تک پہنچ چکے تھے۔ بعد ازاں اس  
 تحریک کی قیادت ۱۸۵۹ء سے ۱۸۵۷ء تک سید احمد نے کی۔

### سید احمد شہید

سید احمد شہید رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور پھر ٹی عمر میں ہی شاہ دلی اللہ کے  
 صاحبزادے مولانا عبدالقادر کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لئے دلی چلے آئے۔ اس کے بعد  
 وہ شاہ عبدالعزیز کی ہدایت پر دلی سے ٹانک چلے گئے جہاں انہوں نے امیر خان کی ملازمت  
 اختیار کر لی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب امیر خان کی قوت منتشر ہو گئی تو سید احمد شہید دلی واپس آ گئے۔

سے یاد کیا جاتا ہے، اور شاہ عبدالعزیز کے داماد مولوی عبدالحمید کے ساتھ بل کر کام شروع کر دیا۔ سکھوں کی یہاں شہید کو اتر پردیش، بنگال اور بہار کی طرف سے پیسہ اور مجاہد فراہم کئے گئے۔ کچھ مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد وہ ۱۸۳۲ء میں پشاور پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہی وہ پشاور چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

۱۸۳۱ء میں بالا کوٹ میں سکھوں نے ان کی قوت کو زبردست نقصان پہنچایا اور سید احمد شہید خود بھی لڑتے ہوئے شہادت پا گئے۔ اس مہم کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے لوگوں کی طرح پٹھانوں پر بھی قانون شریعت کا اطلاق کیا تھا لیکن پٹھان ایسے قوانین کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے اسے اپنی حکومت تصور کرتے تھے لہذا انہیں پٹھانوں کی طرف سے متوقع حمایت حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن اس تحریک کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ سید احمد شہید نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے جس مسئلے کو ہوادی تھی وہ آئندہ ساتھ برس تک سنگتار ہا۔

## تیسری

اس تحریک کی کامیابی کی وجہ سے بنگال پر بھی اثر پڑا یہاں تیسری میر زمینداروں کے

نظم و بزم اور حکومت کے خلاف انسانوں کی بغاوت کی قیادت کر رہا تھا یہ تحریک فرید پور، ناویا اور پو میں پرگنہ میں ۱۸۳۱-۳۲ء کے دوران اپنے عروج پر تھی آخر کار یہ تحریک کچل دی گئی اور تیسری میر کو شہید کر کے اُس کے تقریباً ساڑھے تین سو ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

سید احمد شہید کی تحریک اور اس تحریک سے پیدا ہونے والی کچھ مزید تحریکوں کو بعض امور میں مشابہت کے باعث واپسی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ یہ سبھی تحریکیں نجد کے جدوں کی تعلیمات کی مطابقت میں تھیں یہ سب مکمل طور پر اسلامی تحریکیں تھیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی اتحاد و یکجہالت کی بنیاد پر قائم تھیں۔ مسلمانوں کو اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کا زبردست صدمہ تھا۔ اور وہ اپنے علاقوں پر غیر ملکی قبضے اور استبداد کی وجہ سے انگریزوں سے نفرت کرتے تھے علامہ ازیں ان کی مشترکہ و اقتصادی حیثیت کو بھی مزید صدمہ پہنچایا گیا تھا۔ لہذا وہ اپنے مقاصد کے لئے ہائی کمانڈر بھی مول لینے کے لئے تیار تھے گو مسلمانوں کو ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا لیکن برصغیر کی آزادی کے لئے مختلف تحریکوں کی تعریف میں مسلمانوں کی زبردست قربانیوں کو ہمہ جہت سے برطانوی استعمار

کو پوری طرح خوفزدہ کر دیا تھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندو خود بھی غلامی کی زنجیر پہنے ہوئے تھا اس کے باوجود وہ سفید فام آقاؤں کی چالپوسی اور ان کے ساتھ مکمل تقاضوں میں مصروف تھا لہذا قدرتی طور پر نہ صرف انگریز مسلمانوں کے خلاف ہر گز ہلکا بندوبست نہ کیا۔ ساتھ بھی دینے لگا۔

مشہور ہندو اخبار ”ہندو بیٹریٹ“ نے لکھا کہ مسلمانوں میں ولایتی اور فرائضی سخت خطرناک لوگ ہیں اور وہ مختلف لوگوں میں نفرت اور عدم اطمینان کے بیج بوریے ہیں ان کی وجہ سے اس ملک میں غیر ملکیوں کو قدم جما نے میں مدد ملے گی۔

## فرائضی تحریک

۱۹۰۶ء میں بنگال میں بھی ۷۷ قسم کی ایک سیاسی و مذہبی تحریک ضلع فریدپور کے حاجی ثناء اللہ نے شروع کی انہوں نے سب سے پہلے نماز جمعہ ادا نہ کرنے اور دونوں عیدیں نہ منانے کی ہدایت کی۔ بنیاد پر یہ کہ کہ برصغیر برطانوی حکومت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے ”دارالہرب“ ہے۔ اور ہندو زمیندار مسلمانوں میں اُس نئی نسل سے بے حد خوفزدہ نظر آتے تھے جس میں اسلام کی ایک نئی روح بھونکی گئی تھی۔ اور شبہیت مینو میر کی وجہ سے جس نے ہندو زمینداروں کے ظلم و ستم کے خلاف نفرت پیدا کر دی تھی مسلمانوں میں اب اپنے وقار اور عزت نفس کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ لہذا جھگڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور شریعت اللہ کو ڈھاکہ کے موضع نواباری میں بھیج دیا گیا مگر انہوں نے وہاں بھی اپنا منشی جاری رکھا جس میں وہ غاصے کا میاب ہوئے۔

حاجی شریعت اللہ کے صاحبزادے محمد محسن جنہیں عام طور پر دھومیاں کے نام سے جانا جاتا تھا، مگر ظلم فاضل نہ تھے لیکن ان میں انتظامی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں جب وہ جج سے واپس آئے تو انہوں نے اپنے والد کے حقائق کے مطابق اُن کی تحریک کو سنبھال لیا اور اس میں کچھ نئی باتیں بھی شامل کر لیں انہوں نے سب سے پہلے ”فرائضی“ کے نام سے ایک تنظیم کا اہتمام کیا۔ انہوں نے مشرقی بنگال کو مختلف جہتوں میں تقسیم کر کے ہر جگہ کا ایک ضلع مقرر کر دیا۔ اس ضلع کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ مرکزی تحریک کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے رقوم جمع کرے۔ اسی تحریک کے ذریعے محمد محسن نے لاتعداد ہندو کسانوں کو دائرہ اسلام میں شامل کر لیا کیونکہ خود ہندو کاشتکار نہ صرف بڑے زمینداروں کے مظالم سے تنگ آچکے تھے بلکہ ذات

کی اونچ نیچ کی وجہ سے بھی وہ ہندومت سے بیزار ہو چکے تھے زمینداروں کی طرف سے کاشتکاروں پر مختلف قسم کے ٹیکس عائد کر دیئے جاتے تھے محمد مصطفیٰ نے کاشتکاروں کو ہدایت کی کہ وہ ایسے تمام ٹیکسوں کی ادائیگی بند کر دیں اس کے بعد انہوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور کہا کہ زمیندار کی ہے اور کسی کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ زمین پر اجارہ داری قائم کرے یا اس پر ٹیکس عائد کرے۔ ۱۸۵۷ء میں محمد مصطفیٰ پر مختلف مکانات کی ٹوٹ مار کا بے بنیاد اور جھوٹا الزام عائد کر کے مقدمہ چلایا گیا اور ۱۸۵۸ء میں انہیں اس الزام میں سبشی سپرد کر دیا گیا کہ انہوں نے بہت سے بے گناہ لوگوں کو قتل بھی کیا ہے۔ لیکن عدالت نے انہیں باعزت طور پر بری کر دیا۔

### ہندو ازم کا احیاء

برصغیر ہندوپاک میں اٹھارویں صدی مسلمانوں کے زوال اور ان کی ثقافتی نشوونما کے زوال کی صدی تھی۔ اور اب انگریز کی اعانت سے ہندو تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ علاوہ ازیں سکھوں، جاٹوں اور برہمنوں کی فوجی تحریکوں نے بھی اسلام کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا تھا فوجی طاقت زبجئے کے باوجود اس پر آشوب دور میں بھی لائقہ اور ہندو مشرت بہ اسلام ہوتے رہے مغربی اثر و رسوخ اور برطانیہ کی طاقت میں ہندو رجحان وسعت کے باعث ہندوؤں میں امید کی نئی کرنی پیدا ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں بھی ہندوؤں نے اپنے مذہب کی طرف کوئی توجہ مددی بلکہ ان کی تمام تر گریہوں کا مرکز مسلمانوں کی مخالفت تھا۔ حتیٰ کہ ایسے بہت سے سوجھ بوجھ رکھنے والے ہندو جو اسلام قبول کر چکے تھے مسلمانوں کی طاقت سے محرومی کے بعد اور عیسائیوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے پیش نظر اب مسلمان سے عیسائی ہو رہے تھے۔

ہندو ڈھانچے کو جس چیز نے ہلکا کر رکھا دیا وہ یورپی قوم کی صنعتی وراثت تھی یا ان مغربی فاتحین کی دنیاوی کامیابیاں۔ صدیوں پہلے شہنشاہ اکبر نے لادینیت کا جریج بویا تھا وہ ادب اور چھوٹا شروع ہوا لیکن بنگال کی سرزمین اس کے لئے خامی زمین نہ ثابت ہوئی لالہ رام موہن رائے ایک بنگالی برہمن خاندان سے تعلق رکھتا تھا جسے مغلوں سے وفاداری کے باعث رائے کا خطاب ملا تھا لیکن وہ خاندان بھی بنیادی طور پر برہمنوں سے تعلق رکھتا تھا

اب جبکہ مسلمانوں کی طاقت کا مکمل زوال آچکا تھا لالہ رام موہن رائے اور دیگر خاندان اپنی

وفادار یا مسلمانوں کے ساتھ غم کو کچے تھے اور انہوں نے ہندومت اور عیسائیت کے درمیان سمجھوتہ بازی شروع کر دی تھی۔ ادھر دو ہندو تھریوں برہمن سماج اور آریہ سماج نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہندوستان کے بنیاد بنیت رکھنے والے برہمنی مذہبی بیگنوں تھارتوں، صنعتوں اور حکومتوں کے مختلف عقیدوں پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اپنے تمام وسائل سے ہندو تھریوں کو پورا پورا فائدہ پہنچانا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اس دو پر آشوبہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ اسی دور میں ہندو اور شیعہ دونوں مثنیٰ اور دیگر فرقوں کے مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو گئے تھے یہ بات قرین قیاس محسوس نہیں ہوتی یہ ٹھیک ہے کہ اوچک ذیاب عالمگیر کے دور کو شیعہ فرقہ اسلامی دور کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ اس صدی میں ایرانی اور تورانی کا جھگڑا بھی شروع ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود کہ اٹھارویں صدی میں شیعہ مثنیٰ مخالفت بھی زوروں پر تھی اسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ شیعہ فرقے نے عملی طور پر ہندوؤں کا ساتھ دیا ہو۔

گو سیاسی طور پر اٹھارویں صدی افراطی پریشانی مثنیٰ مگر ثقافتی اور مذہبی شعبوں میں یہ تعمیر نو کا زمانہ تھا اسی دور میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کے لئے ایک معیار مقرر کیا گیا جسے فرقوں کے امتیاز کے بغیر پورے برصغیر میں تسلیم کیا گیا اسی دور میں اردو کو تعلیم و تربیت اور ہم استعمال میں اظہار کا ذریعہ بنایا گیا انہی وجوہات کی بنا پر مسلمان معاشرے میں استحکام اور اتحاد کی بنیاد پڑی۔

باب

## ہندستان میں قزاقوں کی آمد

پرتگالی، ولندیزی، جرمن

سپین اور پرتگال نے بالخصوص جغرافیائی دریافت کے ساتھ ہندوستان میں تجارت اور عیسائیت کی تبلیغ کو بھی اپنا مسلک بنایا۔ جہاں تک عیسائیت کی تبلیغ کا تعلق ہے۔ تو اس میں تبلیغ کم اور مسلمانوں پر جبر و تشدد کے عناصر زیادہ شامل تھے۔

۱۰ ہم مشرق میں اور بالخصوص ہندوستان میں مسالے اور عیسائی قوم تلاش کرنے کے لئے آئے ہیں۔

یہ تھے وہ افغانو بخظہ ارض ہندوپاک میں قدم رکھنے والے اولین ملاح واسکو ڈی گاما نے کہے۔

واسکو ڈی گاما نے ہندوستان آنے کا نیا راستہ دریافت کیا۔ تو نہ صرف دنیا بھر کی تجارت اور ذرائع آمد و رفت میں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ بلکہ یورپی لوگوں کے لئے مشرق کے دروازے بھی کھل گئے۔

اب پرتگالی مشرق کے ساتھ براہ راست تجارت میں مصروف ہو گئے تھے۔ واسکو ڈی گاما

نے سب سے پہلے کالی کٹ کے ساحل پر قدم رکھا تھا۔ یہ علاقہ ایک ہندو حکمران زمرین کی ملکیت تھا۔ کالی کٹ میں عرب تاجروں نے واسکو ڈے گاما کی شدید مخالفت کی اور اسے ۱۴۹۹ء میں واپس مانا پڑا۔ اس کے بعد شاویٹنگال نے ایک بہت بڑا بحری بیڑا روانہ کیا۔ عرب تاجروں نے پرتگالیوں کو اڑے ہاتھوں لیا۔ اور انہیں کالی کٹ میں تجارتی نوآبادی قائم کرنے سے روک دیا۔ کچھ عرصے تک مصر کے مملوک سلطان اور گجرات کے لوگوں نے سمندروں میں پرتگالیوں کی شدید مزاحمت جاری رکھی۔ تاہم ۱۵۰۵ء میں پرتگالیوں نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ ۱۵۱۰ء میں الفانسو نے گواپرقبضہ کر لیا۔ جو اس وقت سلطان بیجاپور کی ملکیت تھا۔ ۱۵۱۰ء میں اس نے ملاکا کی بندرگاہ بھی ہتھیالی۔ اس طرح بیشتر جزائر پرتگالیوں کی گرفت ہو گئی۔ پرتگالی لشکار میں بھی آباد ہو گئے۔ اور پھر سولہویں صدی میں ان لوگوں نے چٹاگانگ بھلی اور بنگال کے دوسرے علاقوں میں اپنے تجارتی کارخانے قائم کر لئے۔

پرتگالی، انگریز اور ڈچ تاجروں سے مقابلہ نہ کر سکے۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو زوال آنا شروع ہو گیا علاوہ ازیں لوگ بھی ان سے نفرت کرنے لگے تھے۔ کیونکہ تجارت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے ہندوستانیوں کو جبراً عیسائی بنانا شروع کر دیا تھا۔ مسلمانوں میں ان کے خلاف نفرت کچھ زیادہ ہی تھی۔ کیونکہ پرتگالی اکثر اوقات عربوں کے تجارتی جہاز لوٹ لیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ کچ کو جانے والے لوگوں کو بھی معاف نہ کرتے تھے۔ الفانسو، البورق نے تو گوا کے تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ ان کی عورتیں اور بچے اٹھا کر لے گیا اور پھر انہیں فروخت کر دیا۔ مسلمانوں کے ساتھ اس کا سلوک انتہائی ہست تھا۔

۱۶۳۲ء میں بنگال کے صوبہ دار قاسم خان نے پرتگالیوں کی نوآبادی پر حملہ کیا۔ اور مقابلے کے بعد انہیں شکست دی۔ بہت سے پرتگالی اس مقابلے میں موت کے منہ میں پہنچے اور بہت سوں کو قیدی بنا کر آگرہ بھیج دیا گیا۔

ولندیزیوں نے ملاکا کی بندرگاہ سے پرتگالیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر ۱۶۸۵ء میں انہوں نے لنکا سے بھی ان کا خاتمہ کر دیا۔ اس دوران انگریز جاوا اور پٹورسی جزیروں میں اپنی نوآبادیاں قائم کر چکے تھے۔ لیکن چند سال کے اندر ہی ولندیزیوں نے بعض مقامات پر اپنے انگریز حریفوں کی تجارت پر قبضہ جمالیا۔ شہزادہ شاہ مشباح اور شاہ فرخ سیر نے انگریز تجارتی کمپنی کو جو مراعات دے رکھی تھیں ان کی وجہ سے ولندیزیوں کی تجارت بڑی طرح متاثر ہوئی۔

مشرق کے ساتھ تجارت میں جرمنوں نے بھی حصہ لیا۔ انہوں نے بنگال کے نوآبادی دہلی میں پہلی میں ایک کارخانہ قائم کر لیا آخر کار ۱۸۵۷ء کے اندر میں جرمن شکست کھا کر بھاگ گئے۔

## ایسٹ انڈیا کمپنی

سولہویں صدی میں انگریز تاجر برصغیر کے ساتھ براہ راست تجارت کے لئے سر قوط کو شمش کرتے رہے۔ مگر وہ نئے سمندری راستے سے اس امید کے ذریعے پرتگالیوں کی فوجی طاقت کے باعث آنے سے خائف تھے۔ چنانچہ انہوں نے شمالی راستہ دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ابتدا میں ناکامی ہوئی۔ آخر کار ۱۵۷۷ء میں ایک بحری افسر فرانس ڈریک نیا راستہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

انگریز تاجروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک ایسوسی ایشن قائم کر لی۔ ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو کارولائٹھ نے اس کمپنی کو تجارتی مراعات کے لئے خاص حکم نامہ جاری کر دیا ۱۶۰۷ء میں مغلوں کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کرنے کے لئے خاص طور پر کمپنی ہاکنز کو بھیجا گیا۔ ۱۶۰۹ء میں شہنشاہ جہانگیر نے انگریزوں کو سورت میں آباد ہونے کی اجازت دے دی ۱۶۱۵ء میں شاہ انگلستان نے مغل دربار میں اپنا پہلا سفیر سر تھامس روکوینا کو بھیجا اور اس نے مزید تجارتی مراعات کی درخواست دی وہ تین سال تک دربار شاہی میں رہا اور اس نے شہنشاہ جہانگیر سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے زیادہ سے زیادہ تجارتی مراعات حاصل کر لیں۔ اور پھر ایک سال کے اندر اندر احمد آباد، آگرہ اور بڑوچ میں انگریزوں نے کارخانے قائم کر لئے۔

۱۶۶۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہایت دلچسپ طریق پر بمبئی کی پرتگالی نوآبادی کو بھی حاصل کر لیا۔ یہ نوآبادی شاہ چارلس دوم کی پرتگالی بیوی کیتھرائٹ کو جہیز میں ملی۔ ۱۶۷۳ء میں انگریزوں نے گوئلند کے سلطان سے ایک ”نہری فرمان“ کے ذریعے معمولی سی ادائیگی کے بعد مکمل تجارت کی اجازت حاصل کر لی۔ ۱۶۳۳ء میں انہوں نے مدراس میں ایک کارخانہ بھی قائم کر لیا اور کچھ عرصہ کے بعد یہیں پریسبٹیرین چارچ قلعہ کی تعمیر کرائی۔ ۱۶۵۱ء میں شاہ جہان کی حکومت کے دور میں انہیں بمبلی میں کارخانہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ بعد ازاں بنگال کے صوبہ دار شاہ شجاع کے دربار میں کام کرنے والے ایک انگریز معالج نے صرف تین ہزار روپے سالانہ کی ادائیگی پر بے شمار



تجارتی مراعات حاصل کر لیں۔ چنانچہ ۱۶۵۷ء میں کمپنی نے ڈھاکہ میں اور پھر ۱۶۶۶ء میں مالوہ اور قاسم بازار وغیرہ میں کارخانے قائم کر لئے۔ اس اثنا میں وہ ٹیڈن اور مونگیر میں اپنے کارخانے قائم کر چکے تھے۔

۱۶۸۸ء میں شہنشاہ اورنگ زیب نے کمپنی سے تین ہزار روپے سالانہ کی ڈائیلی پر تجارتی مراعات واپس لے لیں اور ان پر ساڑھے تین فیصد ڈیوٹی عائد کر دی۔ یہ ڈیوٹی دوسرے تمام تاجر حتیٰ کہ مسلمان تاجر بھی ادا کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد انگریز تاجروں نے بھی وہی حرکتیں شروع کر دیں جو پہلے تگلی تاجروں کا خاصہ تھیں۔ انہوں نے ٹوٹ مار آتش زنی اور مسلمانوں پر مظالم کی وارداتیں شروع کر دیں۔ آخر کار جب ان کے خلاف سخت کارروائی کی گئی تو انہوں نے مغلوں سے معافی طلب کی۔ معافی نامہ کے الفاظ یہ تھے۔

”انگریز نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کرتے ہیں کہ وہ شہنشاہ وقت

کی خدمت میں ڈیڑھ لاکھ روپے بطور ہرجانہ پیش کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور

وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ وہ اپنے شرمناک رویے کا اعادہ نہ کریں گے۔ وہ

حضور سے درخواست کرتے ہیں کہ حضور ہماری خطاؤں کو معاف فرمادیں

اور ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ ہم نہایت شریفانہ طریق پر تجارت کریں گے۔“

اس کے بعد انگریزوں کو بنگال میں واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ ۱۶۹۸ء میں انگریزوں

نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کارخانے کی قلعہ بندی کر لی جس کا نام بعد میں فورٹ

ولیم رکھا گیا۔ پھر یہی جگہ وسعت پا کر کلکتہ کی صورت اختیار کر گئی اور چند سال کے اندر اندر ایک

بہت بڑا تجارتی مرکز بن گئی۔ حالات انگریزوں کے حق میں تھے۔ اتفاق یہ ہوا کہ شاہ فرخ پور

بیمار ہو گیا اور ایک انگریز مسیحی جہلشن کے علاج سے صحت یاب ہوا۔ لہذا ۱۷۰۱ء میں

فرخ میر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں صرف تین ہزار روپے سالانہ کے عوض تجارت جاری رکھنے

کی اجازت دے دی۔

## فرانسیسی

فرانسیسی بھی ایک عرصہ سے برصغیر ہندوپاک کے ساتھ براہ راست تجارت کے لئے

تین سو برسے تھے۔ ۱۷۶۳ء اور ۱۷۶۴ء میں کوئی فرانسیسی تاجر ہندوستان میں آتا رہا۔ ۱۷۶۳ء میں ایک فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر دی۔ ۱۷۶۸ء میں فرانسیسی تاجروں کی طرف سے اور اس کے بعد پانڈی چری، چندرنگر، ماہی اور کرکیل میں بھی ان کی نوآبادیاں قائم ہو گئیں۔ اسی کے بعد ہندوستان پر سیاسی تسلط جمانے کے لئے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ انگریزی اور فرانسیسی نوآبادیاں کیونکہ ساحلی علاقوں پر واقع تھیں لہذا ان کی بحری طاقت بھی موجود تھی۔ ان کے مقابلے میں کرناٹک کے نواب اور نظام، اور دکن کے صوبے دار کے پاس کوئی بحری طاقت موجود نہ تھی۔ لہذا وہ کمپنی کے ٹرڈ کنٹرول کو ٹوڑ نہیں سکتے تھے۔ انگریز اور فرانسیسی دونوں ہی مسلمانوں کی اس کمزوری سے بخوبی واقف تھے۔

یہ مغلوں کے زوال کا دور تھا۔ کرناٹک کا نظام مغل سلطنت کے دائرے سے باہر تھا۔ آرکوٹ کا نواب جو کرناٹک کا گورنر بھی تھا۔ قریباً آزاد شخصیت کا مالک تھا اور اس پر نظام کرناٹک کا کوئی اثر و رسوخ نہ تھا۔ آرکوٹ اور حیدرآباد کے درباروں میں جھگڑوں اور سازشوں کی بھرمار تھی۔ مرہٹے بھی ان جھگڑوں سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اور انہی سازشوں کی وجہ سے انگریز اور فرانسیسی دونوں اپنے اپنے سیاسی اقتدار کے لئے کوشاں نظر آتے تھے۔ آخر کار ۱۷۶۸ء میں ایک معاہدے کے تحت فرانس نے مدراس انگریزوں کو دے دیا۔ اور اس کے عوض شمالی امریکہ میں لوئی برگ کا علاقہ لے لیا۔

کیونکہ انگریز اور فرانسیسی دونوں ہی کو رومنڈل کے معاملے پر نواب کرناٹک کی حفاظت میں رہ رہے تھے لہذا ان کی باہمی کشمکش سے نواب کرناٹک کا متاثر ہونا ضروری تھا۔

۱۷۶۸ء میں ریاست حیدرآباد کے بانی نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ناصر جنگ اور نواسے مظفر جنگ کے درمیان اقتدار سنبھالنے کی کشمکش شروع ہو گئی۔ اسی قسم کی کشمکش کرناٹک کی مندرجہ ذیل کے لئے شروع ہوئی ان حالات میں فرانسیسیوں کو بہت اچھا موقع ہاتھ آ گیا اور انہوں نے مذکورہ بالا دونوں گدیوں کے لئے علی الترتیب مظفر جنگ اور حیدرآباد کی حمایت کا فیصلہ کر لیا۔ تاکہ اس طرح ان دونوں کی کامیابی کی صورت میں فرانسیسیوں کو بہتر مواقع فراہم ہوں۔ اور فرانسیسی انگریزوں کے مقابلے میں سیاسی تسلط جمانے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ کرناٹک اور حیدرآباد کی مشترکہ فوجیں فرانسیسی فوجی دستوں کے ساتھ اپنے مقصد پر کامیاب ہو گئیں۔ چندا صاحب کو آرکوٹ کی مندر سے دی گئی اور اس کے عوض فرانسیسیوں نے اس سے

پابندی چری کے نزدیک ۸۰ گاؤں حاصل کر لئے۔ انگریزوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے ناصر جنگ اور محمد علی کے حق میں حمید آباد اور آرکوٹ کی گدیوں پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی ناصر جنگ کو مظفر جنگ کے مقابلے میں تھوڑی بہت کامیابی نصیب ہوئی اور اسی طرح کناٹک کے علاقے میں چندا صاحب کو۔ مگر ۱۸۵۱ء میں ناصر جنگ کو قتل کر دیا گیا اور مظفر جنگ کو ہارنے کے بعد پابندی چری میں دکن کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا۔ مظفر جنگ نے فرانسیسیوں کو انعام کے طور پر دوی اور موسلی پٹم کے علاقے دے دیئے۔ مگر ایک سال بعد مظفر جنگ بھی قتل کر دیا گیا۔ اور اُس کے بعد صلابت جنگ کو گدی پر بٹھار دیا گیا۔ اس طرح کناٹک اور حمید آباد میں فرانسیسیوں کو مسلح طور پر اقتدار حاصل ہو گیا۔ دو سال کے بعد فرانسیسیوں نے کناٹک کا شمالی علاقہ بھی حاصل کر لیا۔ یہ علاقہ چھ سو میل پر مشتمل تھا۔

اب انگریزوں کو بہر طوف خطرہ ہی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ انگریزوں نے تڑپا پل میں محمد علی کو میاں صوبے سے نکالنے کے لئے فوجی دستے اور ساز و سامان روانہ کیا۔ چندا صاحب نے فرانسیسیوں سے تعاون سے محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اس موقع پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک کلرک رابرٹ کلاؤٹ نے تڑپا پل کو آزاد کرانے کے لئے منصوبہ تیار کیا۔ اُس نے چندا صاحب کی توجہ ہٹانے کے لئے آرکوٹ کی طرف فوجیں روانہ کر دیں۔ کلاؤٹ نے ہی اس مہم کی قیادت کی اگست ۱۸۵۱ء میں کلاؤٹ نے آرکوٹ پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ چندا صاحب نے یہ خبر سنتے ہی فوری طور پر اپنی آدمی فوج آرکوٹ روانہ کر دی لیکن کلاؤٹ نے ۵۲ دن تک محاصرہ جاری رکھا۔ میسور کے راجہ اور تاجور کے راجہ نے محمد علی اور انگریزوں کی حمایت کی۔ مرہٹوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں کی مدد شروع کر دی۔ اس طرح ہوا کاؤٹخ فرانسیسیوں کے خلاف ہو گیا۔ جون ۱۸۵۲ء میں چندا صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ اور محمد علی کناٹک کا نواب مقرر ہوا۔ اس طرح کناٹک میں فرانسیسیوں کی ٹیگا انگریزوں نے لے لی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں فیصلہ کن جنگ نہ ہو سکی۔ اور دربار میں بھی انگریزوں کا اثر و رسوخ قائم ہو گیا۔ کچھ عرصہ تک انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان امن قائم رہا لیکن جب یورپ میں ان دونوں طاقتوں کے درمیان جنگ پھڑپھڑائی۔ تو ہندوستان میں بھی دونوں تجارتی کمپنیوں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو گئیں۔ اور اس کے بعد سے ہی فرانسیسیوں کو مسلسل شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

## باب

# ہندو اور انگریز کا متحدہ محاذ

جب ایک انگریز کرنل جی نے جرمنی کے شہنشاہ کو خط میں یہ رپورٹ بھیجی کہ ”مغلوں کی پالیسی بہت خراب اور اُن کی فوج کی حالت ناگفتہ بہ ہے اُن کے پاس کوئی بحری طاقت بھی نہیں لہذا اس ملک کو آسانی کے ساتھ قبضے میں لیا جاسکتا ہے ایک باغی ”علی ویردی خاں“ نے بہار، اڑیسہ اور بنگال کو مغل سلطنت سے الگ کر لیا ہے لہذا حالات ہمارے حق میں سازگار ہیں اس جگہ کو ہتھیانے کے لئے صرف تین جہاز، دو ہزار فوج کے ساتھ کافی ہوں گے۔ اس رپورٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہت حوصلہ دیا اور کمپنی نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی نفرت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے انگریز اور ہندو کو متحد کرنے کا پروگرام بنالیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کرنل سکاٹ نے یہ رپورٹ پیش کی کہ اگر اس علاقے پر قبضہ کرنے کے لئے کوئی بھی اقدام کیا گیا تو ہندو، انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ ہندوؤں کی باقاعدہ حوصلہ افزائی کی جائے اس کے علاوہ دو افراد اومی چند اور نیمو گوسائیں ایسے ہیں جن کا اثر و رسوخ ہندو راجوں اور ہندو سپاہیوں میں بہت زیادہ ہے۔ یہ دونوں بھی انگریزوں کی کارروائی میں بہت معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔“

انگریزوں نے جہاں گیرنگر کے نائب گورنر اور دیوان راج ولہار اور فراب علی ویردی خاں

کی بڑی لڑکی خدیجہ بیگم سے اتحاد کر کے سراج الدولہ کی جگہ شریف جگہ جو، جو اس وقت پورنیا کا نائب گورنر تھا بنگال کی مسند پر بٹھانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

### ہندو اثر و رسوخ میں اضافہ

مُرشد آباد کے نوابوں اور دوسرے مسلمان حاکموں نے ہندوؤں کے ساتھ رواداری کی دلیسی اختیار کئے رکھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں کے سیاسی اثر و رسوخ میں اضافہ ہونا لگیا۔ ہندو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے لہذا ہندوؤں کو فائدے پہنچنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہ آتی تھی۔ بنگال کے مُرشد قلی خاں، شجاع الدین، سرفراز خاں، علی ویردی خاں، سراج الدولہ اور میر جعفر و میر قاسم سبھی نے ہندوؤں کو پوربی آزادی دے رکھی تھی جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو سیاسی اور اقتصادی میدان میں مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے اُن کے پاس اہم ترین سرکاری محکمے تھے۔ ہندو وزیر خزانہ نے اپنے اس محکمے میں تمام ہندو افسر رکھے ہوئے تھے بہت سے ہندو نائب گورنر تھے۔ اور بہت سے جاسوسی کے محکمے میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے جھوٹے راستے، دیپ نرائن، رگھونندن، کیٹیٹ رائے، عالم چند، لاہوری کل اور دیپت سنگھ ہزاری ایسے تھے ہی لوگ موجود تھے جو نواب مُرشد قلی خاں کے دور میں حکومت کے خفیہ امور کے سربراہ نواب سکنے خفیہ امور کے سکریٹری اور اہم فوجی دستوں یا فوج کے کمانڈر تھے۔ اسی طرح چن چن بیروت، بکرت چند اور امید رائے بنگال کے دیوان رہے راجہ جانی رلم اور رام ناراٹھن، دیوان اور نائب گورنر کے عہدوں پر فائز رہے شام سندر پیادہ کا انچارج اور رام سنگھ خفیہ سروس کا سربراہ باغرضیکہ کوئی محکمہ ایسا نہ تھا جہاں ہندو اچھے عہدوں پر فائز نہ تھے بہت سے ہندو تو ایسے بھی تھے جنہوں نے بہت معمولی کاموں پر ملازمت کی تھی لیکن ہندو افسروں نے انہیں اعلیٰ عہدوں پر پہنچا دیا تھا۔ ہندو اس اعتبار سے بالکل بے فکر تھا کہ اعلیٰ عہدوں پر ہندو افسر ہونے کی وجہ سے کوئی شخص اُن کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ نواب علی ویردی خاں نے تو سراج الدولہ اور اپنی بیوی شرف النساء کو فاضلہ علیہ السلام کی یاد کی تھی کہ وہ ہندوؤں کے اعلیٰ عہدوں پر کام کرتے رہنے کی پالیسی ترک نہ کریں۔ لہذا سراج الدولہ نے اعلیٰ پالیسی کو قائم رکھا اور اُس کے دادا کے وقت سے جو ہندو اعلیٰ عہدوں

پہلے آرہے تھے انہیں بالکل نہ چھیڑا۔ اس نے ایک کثیر سی ہندوؤں ہی لال کو ذریعہ اعظم بھی مقرر کیا۔ مہن لال کے چچا جانکی رائے کو دیوان کا عہدہ عطا کیا نیز فاکس چند اور نندکار کو لکھتے اور بیگم کی فوج واریوں کی کمان بھی دے دی۔

ان تمام چیزوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ عملی طور پر بنگال میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو گئی اور ہندو زمینداروں کو بھی ایک طاقت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بنگال میں فوابوں کے دور حکومت میں ہندوؤں کے سیاسی اور اقتصادی عروج نے بعد ازاں جو اہم کردار ادا کیا وہ مندرجہ بیان نہیں۔ مرشد آباد اور ارمی چند کے ہندو سیٹھوں نے ۱۸ ویں صدی کے وسط میں بنگال کے اندر سیاست میں جو کردار ادا کیا وہ ناقابل بیان ہے۔ مرشد قلی خاں کے وقت میں سیٹھ فتح چند کے پاس سرکاری سکے بنانے کی اجازت داری تھی اور محمد شاہ نے اسے جگت سیٹھ کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ جگت سیٹھ کی دولت کا عالم یہ تھا کہ وہ صرف سرکاری کام کے ذریعے ہر سال پالیس لاکھ روپے کماتا تھا اور پھر سود اگر اس شخص سے قرضے لیا کرتے تھے اور پھر یہ وہی جگت سیٹھ تھا۔ جس نے دولت کے بل پر سراج الدولہ کی حکومت کا تختہ الٹنے میں اہم کردار کیا۔

## مسلمانوں سے نفرت

حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے پاس بے پناہ دولت، اعلیٰ سرکاری عہدوں اور سیاسی اثر و رسوخ نے انہیں اس قابل بنادیا تھا کہ وہ جب چاہیں مسلمان حکومت کا تختہ الٹ کر رکھ دیں بل کے مطابق :

”دولت کی سیاسی اثر اور اچھے عہدوں کی وجہ سے ہندو نہ صرف مسلمان حکومت کے خلاف ہر چکا تھا بلکہ وہ مسلمان سے نفرت بھی کرنے لگا تھا۔ ہندوؤں کے غرور اور تکبر کا عالم یہ تھا کہ وہ انگریزوں کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے“  
 ۱۷۵۷ء میں پاسی کی جنگ سے ذرا پہلے کرنل سکاٹ نے اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا کہ  
 ”ہندو ہندو راہ اور زمیندار مسلمان حکومت کو بالکل بے اثر بنا چکے ہیں اور اب وہ  
 خفیہ طور پر ان کو کشمکش میں مصروف ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے مسلمانوں کی غلامی کا جو  
 آثار کریمینیک دیں۔ وہ مسلمان حکومت کو دن بدن کمزور کر رہے ہیں“

مشہور ہندو شاعر راما نندا اس جگہ مسلمانوں سے ہندوؤں کی نفرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :

”ہمارا ملک ان ملیچھوں (مسلمانوں) کے باپ کی بائیدوبی چکا ہے اور قسمت  
بھی دیوبی کشتی ایک معمولی اور کینے خاندان میں ایک زرخیز لونڈی کی طرح پیدا ہو  
گئی ہے۔ میں ان ملیچھوں سے ان کی حکومت زبردستی چھین لینا اپنا فرض سمجھتا ہوں  
تاکہ یہ حکومت برہمنوں کے سولے کر دی جائے“

نادیا کے راج کرشن چندر کے درباری شاعر بھارت چند نے ان مذہبات کا اظہار کیا کہ  
”ہندو افسر، تاجر اور زمینداروں سے اپنے اندرونی مذہبات کو ہمیشہ چھپا کر رکھتے  
کیونکہ مسلمان نواب ان ہندوؤں کی وفاداری پر کبھی شک نہیں کرتے لیکن انگریز  
ہندو کے دل کی بات بڑی اچھی طرح جان گیا ہے اسی لئے انگریز کمپنی کے لوگوں  
نے بہت سے ہندوؤں کو اپنے یہاں ملازم رکھا ہوا ہے۔ اور ہندو بھی یہ سمجھتے  
ہیں کہ انگریزوں کی مدد کے بغیر مسلمان حکومت کا تختہ الٹنا ناممکن سی بات ہے“  
(کے کے دت)

بل کے مطابق ہندو اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ مسلمان کے خلاف ہندو اور انگریز میں  
جو خاموش نفرت پور مشن پاری ہے۔ اور مسلمان کے خلاف ہندو اور انگریز کے درمیان جو خاموش  
سمجھوتہ ہو چکا ہے اس کی وجہ سے اگر کبھی ضرورت پڑی تو ہندوؤں کو انگریزوں کی قلعہ نمائندگی  
کے اندر آسانی کے ساتھ پناہ مل جائے گی۔ لہذا انہوں نے اپنی دیرینہ روایات کو قائم رکھتے ہوئے  
انگریز کے ساتھ مل کر بنگال سے مسلمانوں کا تختہ الٹنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ ہندو مؤرخ کے  
دلت تو اس حد تک تسلیم کرتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں سراج الدولہ کے خلاف جو سازش ہوئی تھی اس  
میں ہندو کو انگریز کی پشت پناہی حاصل تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس تمام کاروائی میں ہندو اور انگریز کے کردار سے قطع نظر، خود  
مسلمان جرنیلوں اور بااثر لوگوں نے بھی مسلمان حکومت کو ختم کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت  
نہ کیا۔

جب انگریز کمپنی نے نواب سراج الدولہ کو مشکلات میں گھاہا تو اسے اپنے سیاسی  
مفادات حاصل کرنے کا شہری موقع ہاتھ آ گیا۔

## ملک کے مطابق

”مشرق کی یہ پرانی رسم ہے کہ جب کوئی نیا شہزادہ مندر نشین ہوتا ہے تو اسے مختلف خیر ملی قوموں کے نمائندوں کی طرف سے تحفے تحائف پیش کئے جاتے ہیں لیکن سرراج الدولہ کے وقت میں پہلی بار اس رسم کو انگریزوں نے توڑ ڈالا جس کے نتیجے میں سرراج الدولہ کے دل میں انگریزوں کے خلاف شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے کلکتہ میں اور بہت سے قلعے بنائے اور ان پر توپیں بھی نصب کر دیں انہوں نے اس سلسلہ میں نواب سرراج الدولہ سے اجازت حاصل کرنا ضروری نہ سمجھی۔ اس کے بعد انگریزوں نے سرراج الدولہ کی باری کردہ تجارتی راہ داریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی طرف سے راہ داریوں کا اجراء شروع کر دیا اور نواب کے خزانے کو خاصا نقصان پہنچایا۔ راج ولید جو جہانگیر نگر کا دیوان تھا، نواب کے خزانے میں غبن کرتا رہا۔ اور جب اسے نواب کی طرف سے اعتساب کا خطرہ پیدا ہوا تو اس نے اپنے بیٹے کرشنا داس اور باقی کنبے کو کلکتہ بھیج دیا۔ اور ان کے ساتھ ہی سرکاری خزانے سے غبن کئے ہوئے پانچ کروڑ تیس لاکھ روپے بھی روانہ کر دیئے۔ انگریزوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ کرشنا داس مجرم تھا اس کی پوری مدد کی سرراج الدولہ نے کمپنی کو بار بار تاکید کی کہ وہ راہ داریاں جاری نہ کرے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ کمپنی یا انگریزوں دونوں کا حکم نہیں بلکہ رعایا ہیں۔ سرراج الدولہ نے انگریزوں سے نئی قلعہ بندیوں بھی منہدم کرنے کو کہا مگر کمپنی نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا نواب نے بار بار کمپنی سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ کرشنا داس کو نواب کے حوالے کر دیا جائے لیکن کمپنی کے گورنر (کلکتہ کے) ڈریک نے نہ صرف یہ کہ نواب کی بات پر کان نہ دھرا بلکہ نواب کے نمائندے کے ساتھ بھی نہایت اہانت آمیز سلوک کیا۔ لہذا ان تمام باتوں سے تنگ آکر نواب سرراج الدولہ نے انگریزوں اور میر جعفر، شاکت جنگ اور اپنی خالہ سے نمٹنے کا عزم کر لیا۔ چار جون ۱۷۸۱ء کو سرراج الدولہ نے قاسم بازار کی انگریزی ٹیکہ دہی کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ کلکتہ روانہ ہوا۔ ۱۶ جون کو کلکتہ کے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا جہاں انگریز گورنر ڈریک مقیم تھا۔ لیکن ڈریک اور اس کے ساتھی بھاگ نکلے۔ ۲۰ جون کو سرراج الدولہ نے فورٹ ولبر پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت انگریز شہر اب کے نئے مین و مسٹ بننے لگے انہوں نے سرراج الدولہ کی توبہی کی اور جب ان سب کو گرفتار کر لیا گیا تو انگریزوں نے مسلمانوں کے علم و رسم کی داستان



گھڑی اور صدف بیک ہول کا انعام لگایا، جس کی کوئی حقیقت ہی نہیں اس کے بعد سراج الدولہ نے لڑائی کے دوران شوکت جنگ کو مرثیہ کے گھاٹ اتار دیا۔

### انگریز کی مدد

اب سراج الدولہ کے خلاف سازشوں کا حال پھیل گیا سب سے پہلے انگریزوں نے اومی پناہ مانگ چندا اور بگت سیٹھ کو اپنی سازش میں شامل کر لیا۔ ان لوگوں کی وجہ سے انگریزوں کو بہت سے دوسرے ہندو افسروں، تاجروں اور زمینداروں کی مدد بھی حاصل ہو گئی راجہ نیاکیش نے ڈریک اور دوسرے انگریزوں کو غنٹا میں خوراک اور دوسرا ضروری سامان فراہم کیا۔ یہاں ان لوگوں نے سراج الدولہ کے ڈر سے پناہ لی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ مانگ چند نے بھی جسے سراج الدولہ لکھتے کا فوجی کمانڈر مقرر کیا تھا۔ ان انگریزوں کی پوری مدد کی۔ اور جب ۱۴ دسمبر کو انگریز فوجیں بنگال میں داخل ہوئیں تو مانگ چند نے کوئی مزاحمت نہ کی اور انہیں غنٹا پہنچنے کے لئے راستہ دے دیا جس کے جواب میں نارڈ کھوٹو نے مانگ چند کی تعریف ایک خط میں یوں کی :

”جب میں مدراس کے علاقوں میں پہنچا تو مجھے یہ بتایا گیا کہ آپ نے انگریز کمپنی کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ہوئے دوستی کا ثبوت دیا جس کے لئے میں آپ کا احسان مانتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں آپ نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ آپ کو انگریز کمپنی کی ملازمت میں لے لیا جائے۔ مجھے آپ کی خواہش کا احترام ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فی الحال اگر آپ اسی حیثیت میں کام کرتے رہیں اور انگریز کمپنی کے مفادات کا خیال رکھتے رہیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا“

اور اس کے جواب میں مانگ چند نے یہ لکھا

”جناب عالی! آپ کے فیضیت تمام ان علاقوں میں پہنچنے کی اطلاع پا کر مجھے بے پناہ مسرت ہوئی میں ایک شخص زادھا کرشن ملک کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں جو آپ کو بسنس نہایت اہم باتوں سے آگاہ کرے گا۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ان پر فوری توجہ مبذول فرمائیں۔“

غرضیکہ قدم قدم پر ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر سراج الدولہ کو نقصان پہنچایا اور انگریزوں کے دست راست بنے رہے۔

انگریزوں اور سراج الدولہ میں پلاسی کی جنگ کے بعد بنگال میں ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر میں انگریزوں کو پوری طرح قدم جما نے کے مواقع نصیب ہوئے۔

۱۷۵۷ء کے بعد جب انگریزوں نے بنگال پر پوری طرح کنٹرول حاصل کر لیا۔ تو انہوں نے بنگال کے مسلمانوں کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مسلمان تو پلاسی کی جنگ کے بعد ہی سیاسی اور اقتصادی طور پر ختم ہو چکے تھے مگر انگریز کی حکومت نے انہیں کہیں کا نہ چھوڑا انگریزوں نے مسلمانوں کی رہی سہی طاقت کو ختم کرنے کے لئے ہندوؤں کو آگے بڑھایا۔ اور ہندوؤں نے انگریزوں سے پورا تقاضا کیا۔ ۱۷۵۷ء میں سر جان ہاکم نے سلیکٹ کمیٹی میں کمیٹی کے اراکین کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے کہا ”ہندوستان کی ہندو آبادی ہی ہندوستان میں انگریزوں کے لئے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئی“ اسی طرح تھامس منرو نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے مطمئن نہیں ہیں تو وہ انگریز کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ ہندو اس حکومت سے مطمئن ہیں اور مسلمان، انگریز اور ہندو کے دو برے اثرات کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے“

برطانیہ کے لوگ مسلمانوں کے جذبات و احساسات سے پوری طرح باخبر تھے لہذا قدرتی طور پر وہ مسلمان کی وفاداری کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا تو انہیں انگریزوں کی آمد سے کوئی فرق نہ پڑا تھا سوائے اس کے کہ مسلمانوں کی جگہ اب ان کا آقا انگریز ہو گیا تھا۔ اور اسی لئے ہندو نے مسلمانوں کے زوال کے بعد اپنی پست ذہنیت کی بنا پر اپنی وفاداریوں اور خوشامد کامرک انگریز کو بنالیا تھا نئے برطانوی حکمرانوں نے مسلمانوں سے دشمنی جیسا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو ایسے تمام عہدوں سے ہٹا دیا جو ملکی کے آباؤ اجداد کے وقتوں سے ان کے پاس چلے آ رہے تھے کمپنی کی حکومت نے مسلمانوں کو کوئی ملازمت بھی نہ دی مسلمان جن کے پاس فوج، عدلیہ اور خزانے کے محکموں میں اعلیٰ عہدے تھے اور جہاں کی وجہ سے مسلمان اقتصادی، ثقافتی اور سماجی ترقی اور استحکام کے راستے پر گامزن تھے، اب یہ عہدے چھین جانے کی وجہ سے پسماندہ لوگوں میں شملہ ہونے لگے صرف بنگال میں سینکڑوں مسلمان فوجی، افسر اور ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان سپاہی ملازمت سے محروم کر دیئے گئے ان سپاہیوں کو در وقت پریٹ بھرنے کے لئے کاشت کاری کا سہارا لینا پڑا لیکن یہاں بھی انگریز اور ہندو دشمنی نے مسلمانوں کے لئے لاتعداد مشکلات اور مصائب پیدا کر دیئے۔ انگریز نے بہت سے

ہندوؤں کو معمولی سہدوں سے ہٹا کر کلکٹر بنا دیا تھا اور ساتھ ہی انہیں اراضی بھی عے دی  
 لہذا ہندوؤں نے ان سہدوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔  
 انتقامیہ میں اتنی بدعنوانیاں پیدا ہو گئیں کہ بابوؤں کی جو نئی قوم انگریزوں نے پیدا کی تھی وہ  
 رشت کے ذریعے حوام اور بالخصوص مسلمان کا خون چوسنے میں مصروف ہو گئی۔ غرضیکہ مسلمان  
 ہر معاملے میں ہندو اور انگریز کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتا رہا۔ خود منظر احترام کرتا ہے کہ  
 ”انگریز افسروں اور تربیت یافتہ ہندو بابوؤں کے پاس رحم قسم کی کوئی چیز نہ  
 تھی انگریز خاموشی کے ساتھ کسی قانون کا نفاذ کرتا اور رعایا اُسے ماننے پر  
 مجبور ہو جاتی اُن دنوں جو سربل بھی اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور یہی  
 وجہ ہے اُس دور میں انگریز کے خلاف جو نفرت پیدا ہوئی وہی نفرت آج تک  
 موجود ہے اور انگریزوں کی آئندہ نسلوں کے خلاف آبی اس نفرت کو کوئی قوت  
 ختم نہیں کر سکتی لہذا باوقار اور معزز کنبوں کو تباہ کر کے رکھ دیا گیا اور  
 تعلیمی میدان میں انگریز کی پالیسی کی وجہ سے مسلمان کو شدید صدمہ پہنچا“

### تعلیمی پالیسی

۱۸۳۳ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کو مزید صدموں پہنچایا۔ کہ انگریزی اور مقامی زبانوں  
 کو فارسی کی جگہ علاقائی زبان قرار دے دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس اچانک تبدیلی سے ہزاروں  
 مسلمان بے روزگار ہو گئے بلکہ یوں کہئے کہ عالم فاضل، غافل بھی راتوں رات جاہل بن کر رہ گیا۔  
 ہندو نے کیونکہ سفید فام آقاؤں کو فوراً تسلیم کر لیا تھا لہذا اُس نے ان آقاؤں کی زبان پیچھے ہی  
 دن سے سیکھنا شروع کر دی تھی چنانچہ جہاں ایک طرف مسلمان ملازمتوں سے محروم ہو کر وہاں ہندو  
 نے اُس کی جگہ لے لی۔ انگریز نے اس حد تک تعصب سے کام لیا کہ اگر کوئی مسلمان کسی اچھی ملازمت  
 کے لئے اپنی صلاحیت کے بل پر منتخب ہو بھی جاتا تب بھی اُس کی جگہ کسی ہندو کو ملازم رکھ لیا جاتا۔  
 یہاں بھی یہی ہو گا کہ جب کسی سرکاری ملازمت کے لئے اخبارات میں اشتہار دیئے جاتے تو ان اشتہاروں  
 میں خاص طور پر لکھا ہوتا کہ یہ اسامیاں صرف ہندوؤں کے لئے ہیں۔ لہذا اب مسلمان سرکاری دفاتروں  
 میں صرف چڑا سیوں، قلیوں کے طور پر کام کر رہے تھے۔

## باب

## برطانوی سامراج اور اس کی وسعت

اودھ کے ساتھ برطانیہ کے تعلق کا آغاز ۱۷۷۲ء میں بکسر کی جنگ سے ہوا تھا۔ اس جنگ میں شجاع الدولہ اور شاہ عالم ثانی انگریزوں کے خلاف میر قاسم کی حمایت میں تہذیب آزمائش کرتے تھے۔ لیکن شجاع الدولہ کے اپنے وزیروں اور فوجی جرنیلوں کی غداری ہی کی وجہ سے انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ وزیر اعلیٰ مینی بہادر نے خفیہ طور پر انگریزوں کو تمام نقل و حرکت کا منصوبہ بتا دیا تھا۔ ایک جرنیل اسد خاں جنگ سے ڈرا پہلے انگریزوں کے ساتھ جالاندہ بنارس کے راجہ بلونت سنگھ نے انگریز فوجوں کو اپنی چوکیوں سے شجاع الدولہ کی فوج پر حملہ کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ مینی بہادر، جنگ کے دوران خاموش تماشائی بنا رہا۔ لہذا انگریز فوجوں کو ریاست میں داخل ہونے سے روکنا ناممکن ہو گیا۔ شجاع الدولہ نے دو ہیلہ سردار حافظ رحمت خان، بگیش حکمران اور نجیب الدولہ کو انگریزوں کے خلاف اپنے ساتھ لانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے خاموشی اختیار کر رکھی۔ صرف تھار راؤ ہلکے نے شجاع الدولہ کا ساتھ دیا۔ مئی ۱۷۷۴ء میں اودھ کا خاصا علاقہ انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ اسی سال اگست میں شجاع الدولہ انگریزوں کو تاوانی جنگ ادا کرنے اور دوا ضلح انگریزوں کے سپرد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بکسر کی جنگ کے بعد اودھ پر علی انگریز فوجوں کا غلبہ تھا۔ ۱۷۷۴ء میں اودھ کے نواب آصف الدولہ کی وفات کے بعد انگریز گورنر جنرل سر جان شور نے تخت نشینی کے معاملہ میں مداخلت شروع کر دی۔ مہذا وزیر علی خاں کی جگہ برطانیہ کے ایک کٹھ پتلی سعادت علی خاں کو تخت نشینی کر دیا گیا۔ آخر کار ۱۷۷۵ء میں برطانیہ نے پوری ریاست پر مکمل قبضہ کر لیا۔ الزام یہ لگایا گیا کہ ریاست میں انتظام بگڑ چکا ہے۔ اور مختلف قسم کی بدعنوانیاں پرورش پا رہی ہیں۔ اسی سال لارڈ کلہوزی نے ایک اعلان

کے ذریعے اودھ کو برطانوی حکومت میں شامل کر لیا اور نواب واجد علی شاہ کو کلکتہ بھیج دیا گیا۔

## پنجاب

پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد کچھ سکھ سرداروں نے صوبہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں اپنے حکمران کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے وارث زمان شاہ نے ۱۷۹۹ء میں خدمات سر انجام دینے کے عوض رنجیت سنگھ کو گورنر مقرر کر دیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے جلد ہی یہاں اپنی حکومت قائم کر لی اور ۱۸۰۱ء میں افغان حکومت کی اطاعت ترک کر دی رنجیت سنگھ نے کشمیر کو بھی زیرِ اقتدار کر لیا۔ اور انگریزوں کی حاشیہ برداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ مر گیا تو ریاست کے حکمران کا درجہ اپنی تنازعہ شریعہ ہو گیا۔ فوجی جرنیلوں نے اس کے شیر غوار اپنے ولیپ سنگھ کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس طرح پنجاب کی حکومت فوج کے زیرِ اثر آگئی۔ ۱۸۳۹ء میں افغانستان میں انگریزوں کی ناکفہ بہ حالت نے سکھوں کو حوصلہ دیا کہ وہ برطانوی علاقوں پر حملہ کر سکیں۔ تاہم انہیں شکست ہوئی۔ برطانوی فوجی دستے لاہور میں داخل ہو گئے اور انہوں نے سکھوں کو معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس معاہدے کے تحت سکھوں کو زمردن بھاری تانان ادا کرنا پڑا بلکہ ہالندہ درآب کا علاقہ بھی ان کے سپرد کرنا پڑا۔ کشمیر بھی سکھوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جبہ بعد ازاں انگریزوں نے صرف ۵ لاکھ روپے کے عوض ڈوگرہ نسل کے گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ علامہ اقبال نے اسی سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ:

تو نے فروختند و چرازاں فروختند

پنجاب میں کم ہونے والے دیپ سنگھ کی طرف سے انتقام و انصرام کی نگرانی کے لئے ایک انگریز کو مقرر کر دیا گیا۔ خالد فوج کو ختم کر کے لاہور میں انگریز فوج مقرر کر دی گئی۔ ۱۸۴۹ء میں ملتان کے سکھ گورنر نے دو برطانوی افسروں کو قتل کر دیا ساتھ ہی وہاں انگریزوں کے خوف بھگتے شروع ہو گئے۔ آخر کار ۱۸۴۹ء میں سکھوں کو گہرات کے مقام پر ذلت آمیز شکست ہوئی۔ سکھ فوجیوں کا تقاب پشاور اور افغانستان کی سرحدوں تک کیا گیا، مارچ ۱۸۴۹ء میں لاہور ڈیپ ہری نے پنجاب کو بھی انگریز حکومت میں شامل کر دیا۔

اس کے علاوہ انگریزوں نے ہندو اور مسیور وغیرہ کے علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل

کرنے کے لئے زہر و دستِ جد و جہد کی جہاں انہیں مسلمانوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا یہاں آزادی کے ان چند عظیم مجاہدین کا ذکر بہت ضروری ہے جنہوں نے نوار سے انگریز کے خلاف جہاد کیا۔ اور جو آج تک تاریخِ اسلام کے اوراق پر زندہ و نابندہ ہیں۔

### حیدر علی ز (۱۷۷۱-۱۸۴۷ء)

ان مجاہدین میں ایک حیدر علی تھا۔ جو بڑے صغیر میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بے بسی پر یکبارہ تھا۔ حیدر علی نے اس بات کا حزم کر رکھا تھا۔ کہ وہ انگریزوں کو اپنی سرزمین سے نکال کر دم لے گا۔ اسی دور میں مرہٹے اپنی حکومت کو وسعت دینے کے لئے بے تاب نظر آتے تھے۔ حیدر علی دو طرف سے خطرے میں گھرا ہوا تھا۔ حیدر علی نے انگریز اور مرہٹوں دونوں سے اپنی جنگ جاری رکھی۔

حیدر علی قریشی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد میں ایک ولی محمد سے بغداد چلے آئے تھے۔ بعد ازاں وہ بغداد سے ایران کے راستے دلی پہنچے۔ چند سال تک دلی میں قیام کے بعد ولی محمد بہتر روزگار کی تلاش میں گلبرگ پہنچ گئے۔ موت کے بعد ان کے رط کے بعد علی دکن میں آباد ہو گئے محمد علی کے چار بیٹے تھے ان میں ایک فتح محمد تھا۔ فوج میں اعلیٰ کارنامے انجام دینے پر اُسے نامک بنا دیا گیا۔ اور ایک دن وہ بھی آیا۔ جب اُسے دس ہزار گھوڑے سوار فوج کا جوئیل بنا دیا گیا۔ فتح محمد کی شادی جمیدن بیگم سے ہوئی۔ وہ ایک عرب نژاد خاتون تھی۔ جمیدن بیگم اولاد نہ بننے کے لئے خاصی پریشان رہتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق وہ حیدر علی درویش کے پاس گئی انہوں نے جمیدن بیگم کو یقین دلایا۔ کہ اس کی دعا ضرور سنی جائے گی۔ اور اُس کا رط کا نمایاں حیثیت اور شہرت کا مالک ہو گا۔ اس درویش کی ہدایت پر ہی اس بچے کی پیدائش کے بعد اُس کا نام درویش کے نام پر حیدر علی رکھا گیا۔ حیدر علی کی پیدائش ۱۷۷۱ء میں بنگلور کے قریب ہوئی۔ بعد ازاں وہ اپنے چچا کے ساتھ بنگلور چلا آیا۔ میسور کے نجارا ج نے حیدر علی کے فوجی کارناموں سے متاثر ہو کر اُسے خان کا خطاب دیا۔ میسور کا کنٹرول نجارا ج اور دیوراج دو بھائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ لہذا ان میں ان بن رہنے لگی۔ اس لئے نظام اور مرہٹوں نے ان کی چپقلش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ جب مالی اعتبار سے میسور کا دیوال بیل گیا تو اس نازک دور میں بھی حیدر علی ہی نے میسور کو بچایا۔

اس دور میں ہندوستان کے مسلمان انگریزوں اور برطانویوں کی طرف سے دو طرفہ خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ اور حیدر علی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ اپنی زندگی آزادی کے ایک مجاہد کی طرح گزار دے گا خواہ اس مقصد کے لئے اسے کتنے ہی مصائب کیوں نہ برداشت کرنا پڑیں۔  
 میں میٹر کے اندر بھی بہت سے غدار پیدا ہو چکے تھے۔ یہ وہ دور تھا۔ جب حقیقی معنی میں حیدر علی میٹر کا ناقابل تسخیر حاکم بن چکا تھا۔ اُس نے مرہٹوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

مشہور انگریز مؤرخ ہنری ٹیٹل اس وقت کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ  
 ”یہ مدراس کی انگریز حکومت بنی تھی جس نے میٹر کے حیدر علی اور دکن کے نظام کو لڑنے پر مجبور کر دیا اس وقت ہندوستان میں ان دونوں سے بڑی کوئی مسلمان طاقت موجود نہ تھی۔ انہی کی وجہ سے مرہٹوں کو مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف سمجھوتہ کرنا پڑا۔ ہمیشہ گنڈ کی چال یہ تھی کہ وہ نظام اور ناگ پور کے مرہٹہ راجہ کی حمایت کرے لیکن حیدر علی کی فوج برطانوی تہذیب پر ہرگز ہانک میں، بجلی کی طرح ٹوٹ پڑی۔“

حیدر علی نے انگریزوں کے بہت سے قلعے قبضہ میں کر لئے اور انہیں ذلت آمیز شکستیں دیں۔ اگر نظام دکن، حیدر علی کا دوست رہتا اور انگریزوں کا آلہ کار بن کر حیدر علی کے خلاف سازشوں میں مصروف نہ ہو جاتا تو حیدر علی یقیناً تاریخ کا رخ بدل سکتا تھا۔ حیدر علی کے بارے میں کیپٹل لکھتا ہے کہ  
 ”حیدر علی کچھ انتہی زیادہ صلاحیتوں کا مالک تھا کہ تاریخ کے اوراق میں ایسی مثال کم ہی ملتی ہے وہ بالکل ناخاندانہ تھا۔ لیکن اتنا ذہین کہ شاید ہی اتنی ذہانت کسی کو نصیب ہوئی ہو دھسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے وہ لائق صد ستائش لیکن دشمن اس کے نام سے کانپ کانپ جاتے تھے۔“

حیدر علی کے بارے میں مزید کہنا ہے کہ  
 ”ہر رسول اور فوجی محکمہ حیدر علی کی ذہانت کی وجہ سے باہم اتنا مربوط تھا کہ بڑے بڑے پلنڈر بھی شاید ہی اس درجہ اتلافی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکیں۔ انصاف کا دور دورہ تھا اور کسی کی جرات نہ تھی کہ وہ انصاف میں خلل پیدا کر سکے۔“

انصاف کا عالم یہ تھا کہ جب حیدر علی اپنے برادر نسبتی مخدوم سے پانڈی چری کی بہم کے مسئلہ پر دل برداشتہ ہوا تو اس نے مخدوم سے پانڈی چری کی بہم اور اس الزام میں کہ اس نے پانڈی چری کا محاصرہ کیا تھا، مخدوم کو جہز کے عہدے سے گرا کر عام سپاہی بنا دیا۔ حالانکہ مخدوم نے

بڑی دیر سے جنگ کی تھی لیکن حیدر علی نے اتنی قریبی رشتہ داری کے باوجود مخدوم کے اس  
 قدم کو معاف نہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد ہی جب پانڈی چڑی ہم کے دوسرے فوجی افسروں اور سپاہیوں  
 نے حیدر علی کو یقین دلایا کہ حالات کے تحت محاصرہ اٹھانے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا  
 حیدر علی اپنے تمام میٹروں کے ساتھ مخدوم سے معافی مانگنے کے لئے اس کے گھر روانہ ہوا  
 مخدوم اسے بازار میں ایک عام سپاہی کی طرح گھومنا نظر آیا۔ حیدر علی ہاتھی سے اُتر آیا اور اُس نے  
 رہار مخدوم کو گلے لگایا۔ اور معافی طلب کی۔ یہ سب کچھ بھی حوام کے سامنے ہوا۔ اس طرح مخدوم  
 دوبارہ جبریل بنادیا گیا۔

جہاں تک انگریزوں کے خلاف جنگ کا تعلق تھا تو حیدر علی نے انگریزوں کو وہ سبق دیا  
 ہے کہ آج تک نہیں بھلا سکے۔ منگلور پر قبضہ کے آٹھ دن بعد حیدر علی نے اپنے لڑکے ٹیپو سلطان  
 مدرسے انگریزوں کے ناک چنے چہرہ دیئے۔ پوری انگریزی فوج گرفتار کر لی گئی۔ جس میں ایک  
 رل، ۴۶ اعلیٰ افسر، ۵۴ دیگر فوجی عہدے دار اور چھ ہزار سے زائد سپاہی شامل تھے۔ ان کا  
 اسلحہ اور دیگر سازوسامان پر قبضہ کر لیا گیا۔ پرتگالیوں نے اس خیال کے تحت کہ جنگ میں  
 یزیدوں کو فتح حاصل ہوگئی، انگریزوں کا ساتھ دیا لیکن جب حالات کا رخ پلٹ گیا  
 ر فتح حیدر علی کو ہوئی تو انہوں نے حیدر علی کے خلاف سازشوں کا حال پھیلانا شروع کر دیا۔  
 مد علی نے یہ سنتے ہی پرتگالیوں کو طلب کر لیا۔ ان میں تاجر بھی تھے اور عیسائی پادری بھی! حیدر علی  
 ان سے پوچھا وہ خود ہی بتائیں ان کی سزا کیا ہونا چاہیے؟ اس پر ایک پرتگالی افسر نے جواب  
 موت سے کم کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن حیدر علی نے جواب دیا۔ ”یہ نہایت قانون ہوگا، اسلام  
 فون اتنا سخت نہیں۔ تم لوگوں نے انگریزوں کی خدمت کر کے اپنے آپ کو بھی پرتگالی سے لگوتے  
 ہے لہذا تمہاری تمام جائیداد بھی انگریز کی جائیداد تصور کی جانی چاہیے۔ اور تمہیں اس وقت تک  
 رہنا چاہیے۔ جب تک انگریزوں سے امن قائم نہ ہو جائے۔“

حیدر علی کے باوجود رشتہ مرزا علی خاں کے ساتھ حیدر علی کے نہایت اچھے سلوک کے باوجود  
 علی خاں نے انگریزوں اور مرہٹوں کے آگے ملنے میں اگر غدار کی۔ آخر ایک دن مرزا علی خاں  
 جو کہ خود ہی حیدر علی سے معافی طلب کرنے کے لئے چلا گیا۔ اس نے حیدر علی سے کہا  
 ”میرا سر آپ کے رحم و کرم پر ہے۔“

حیدر علی نے اسے گلے لگایا۔ اور کہا ”مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا“ اور مرزا علی خاں کو



معاف کر دیا۔

حیدر علی کی تمام زندگی انگریزوں اور مرہٹوں سے لڑتے بھڑتے گزری۔ جنگ کے میدان میں وہ ایک عام سپاہی کی طرح لڑتا رہا جس کی وجہ سے اس کے جسم پر زخموں کے لاتعداد نشانات تھے شاید اسی بنا پر اُس کی کمر میں مستقل درد رہنے لگا۔ لیکن اس کے باوجود انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی ہادی رہی۔ اُس نے موسم کی پروا کی نہ دشوار گزار راستوں کو خاطر میں لایا اور جب بھی اسے آرام کا مشورہ دیا گیا۔ تو اُس نے ہلٹ کر ایک ہی جواب دیا۔

”مسلمان اور مسلمان کی سرزمین نگار کے ہاتھوں خطرہ میں ہے۔ میں نے آرام کیا۔ تو خدا کو کیا جواب دوں گا۔“

نومبر ۱۸۲۲ء میں اس کی صحت جواب دے گئی۔ اس وقت بھی وہ فوج کیپ میں تھا۔ اسے خراب حالت میں آرکوٹ پہنچایا گیا۔ جہاں وہ یکم محرم ۱۲۹۶ھ (مطابق ۶- دسمبر ۱۸۱۸ء) انتقال کر گیا۔

## ٹیمپو سلطان (۱۷۹۹ء تا ۱۸۰۷ء)

۶- دسمبر ۱۷۹۲ء کو حیدر علی وفات پا گیا، ۱۱ دسمبر کو ٹیمپو سلطان کو اطلاع ملی۔ ٹیمپو سلطان اُس وقت بنیادی میں انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار تھا یہ جگہ کالی کٹ سے تقریباً چار میل دور تھی ٹیمپو سلطان فوراً سرنگاپٹم کی طرف روانہ ہو گیا اور ۲۰ تاریخ کو وہاں پہنچ گیا۔ یہاں حیدر علی کی وفات کی بنا پر پوری آبادی غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی تھی گو ٹیمپو سلطان کا ایک اور بھائی کریم شاہ موجود تھا لیکن وہ درویش صفت انسان تھا لہذا ٹیمپو سلطان کو اپنے والد کے تخت اور فوج کی کمان سنبھالنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ جب فروری ۱۷۹۳ء میں انگریزوں نے سرنگاپٹم پر قبضہ کر لیا اور لال باغ کی چڑھائی کے بعد سواروں کو منہدم کر دیا تو ٹیمپو سلطان کو صحت خستہ آیا انگریزوں نے دیکھتے دیکھتے نہ صرف تمام خوبصورت درختوں کو کاٹ ڈالا بلکہ محلات کو بھی ہسپتالوں میں تبدیل کر دیا۔ ٹیمپو سلطان نے اپنے توپ خانے کو حکم دیا کہ وہ انگریزی چوکیوں پر گولہ برسائے۔ سلطان کو سب سے زیادہ رنج اور خستہ اس بات کا تھا کہ انگریزوں نے جنہیں وہ اپنا بدترین دشمن خیال کرتا تھا اُس کے باپ کے مقبرے کو بھی مسمار کر دیا تھا۔

۱۷۹۵ء سے ۱۸۰۷ء تک جب حیدر علی مرہٹوں کے خلاف مسلسل جنگ میں مصروف تھا

تو اُس وقت بھی ٹیپو سلطان اپنے والد کا دست و بازو بنا رہا۔ جولائی ۱۷۸۲ء میں جب حیدر علی کی فوج ایک طوفان کی طرح کرناٹک میں داخل ہوئی اُس وقت بھی ٹیپو سلطان ۲۴ ہزار سے زائد افراد پر مشتمل فوج کی کمان کر رہا تھا اپنے والد کی زندگی میں ٹیپو نے ہر جنگ میں امتیازی حیثیت قائم کی اور جب انگریز کرنل بالی کے ساتھ ٹیپو سلطان کی ٹیکر ہوئی اور سلطان نے اُس کے دانت کھٹے کر دیئے تو اُسے ایک قابلِ تربیت جرنیل تسلیم کر لیا گیا۔

اپنے والد کے جنازے میں شرکت اور آخری رسوم ادا کرنے کے بعد ٹیپو سلطان انگریزوں سے لڑنے کے لئے آکوٹ روانہ ہو گیا پوری فوج کی کمان اُس کے ہاتھ میں تھی۔ ٹیپو سلطان نے باپ کی طرح اپنی زندگی آزادی اور وقار کی حفاظت کے لئے وقف کر دی تھی حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت کو بچانے کے لئے لڑیں بلکہ اُن کا بنیادی مقصد انگریزوں کو غیر ملکیوں سے سرزمین ہند کو پاک کرنا اور ایسے تمام عناصر کو قلع قمع کرنا تھا جو اسلام دشمن ہیں۔ انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اگر انگریز نے سرزمین ہند پر قدم جمائے تو یہاں کے لوگ صدیوں تک غلام برعنائیں گے اور خاص طور پر مسلمان، اسلام کے اذلی دشمنوں یعنی انگریزوں اور ہندوؤں کے ظلم و ستم کا شکار ہو جائیں گے۔

اپریل ۱۷۸۳ء میں ٹیپو سلطان ایک لاکھ فوج کے ساتھ بدور میں انگریزوں کے ساتھ نبرد آزما ہوا۔ انگریز فوجوں کا کمانڈر جنرل مینھیوز تھا۔ سلطان نے بدور کے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور انگریز توپ خانے کو بھی محاصرے میں لے لیا۔ اُس کے بعد انگریزوں کی طرف سے معاہدے کی درخواست کی گئی، جسے ٹیپو سلطان نے قبول کر لیا لیکن بعد میں جنرل مینھیوز کے فریب اور معاہدے کی عدم پابندی کے باعث ٹیپو سلطان نے بہت سے انگریز افسروں اور سپاہیوں کو جیل میں ڈال دیا۔

بدور میں فتح حاصل کرنے کے بعد ٹیپو سلطان منگور کو انگریزوں کے پنجے سے نجات دلانے کے لئے بڑے حایہاں انگریز فوج کی قیادت میں کیمپبل کر رہا تھا اس جنگ میں ٹیپو سلطان کو فرانسیسی فوج کی حمایت بھی حاصل تھی لیکن عین اُس وقت جب جنگ اپنے سروج پر تھی تو فرانسیسیوں نے اُسے دھوکہ دیا۔ یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان اس وقت جو جنگ جاری تھی اُسے بند کرنے کا معاہدہ ہو گیا تھا لہذا ہندوستان میں فرانسیسی فوجوں نے اس معاہدے کی پابندی میں فوری طور پر ٹیپو سلطان کا ساتھ چھوڑ دیا فرانسیسیوں کے اس اقدام سے سلطان کو شدید دھچکا لگا لیکن وہ ایک حوصلہ مند اور بہادر انسان تھا، اُس نے بڑے سے بڑے وقت میں بھی دل نہ چھوڑا تھا

اس موقع پر ٹیپو سلطان کی مشکلات میں یوں بھی اضافہ ہو گیا کہ انگریز جرنیل میجر ڈیوئیٹی سے سمندری راستے بھاری فوج لے کر پہنچ گیا اس کے بعد جنگ اور شدت اختیار کر گئی جیٹی کو مدراس سے سرچارج سٹائنٹس پہنچ گیا اور اس طرح ٹیپو سلطان اور انگریزوں کے درمیان امن کا معاہدہ ہو گیا۔ جب ٹیپو سلطان اپنی سرحدوں سے بے فکر ہو گیا تو اُس نے مرہٹوں کی طرف توجہ دی مرہٹے اب تک میلانوں کے خلاف مسلسل کاروائیوں میں مصروف تھے ٹیپو سلطان نے باوامی اور دراوڑ کے قلعوں پر حملے کے بعد قبضہ کر لیا اس طرح مرہٹوں کے بیشتر صوبے فوجی اعتبار سے ٹیپو سلطان کی نگرانی میں آ گئے۔

۱۷۹۷ء میں ٹیپو سلطان کرگ کی طرف بڑھا یہاں بغاوت ہو گئی تھی۔ تقریباً آٹھ مہینے کے عرصے میں ٹیپو سلطان نے باغیوں کے اسی ہزار افراد اور بہت سے سرداروں کو قیدی بنالیا اور کئی شہروں اور فوجی اہمیت کے مقامات پر قبضہ کر لیا۔ جون ۱۷۹۸ء میں ٹیپو سلطان نے کوچی کے راجہ پر حملہ کر دیا اور اُس کے بہت سے سرداروں کو قیدی بنالیا۔ راجہ نے فوراً انگریزوں سے مدد طلب کی انگریزوں نے اسلام دشمنی میں فوری طور پر ایک مضبوط فوج راجہ کی مدد کو روانہ کر دی اس فوج کی کمان کرنل ہارٹے کر رہا تھا انگریز یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ٹیپو سلطان کو کھیل کر دم نہیں گئے کیونکہ انگریزوں کو پورے ہندوستان میں وہی شخص نظر آتا تھا جو انگریزوں کے سامراجی عزائم کے خلاف نبرد آزما تھا اور جس کی وجہ سے انگریزوں کو ہندوستان میں اپنے راج کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہ آتا تھا انگریزوں نے ٹیپو سلطان کے خلاف مرہٹوں اور نظام دکن کے اتحاد کی بھرپور حمایت کی۔ چنانچہ مرہٹوں، نظام دکن کے اتحاد اور انگریزوں کے خلاف ٹیپو سلطان تنہا رہ گیا۔ وہ ٹراوڑوں سے اپنی فوجیں لے کر سرنگاپٹم لوٹ آیا ٹیپو سلطان کے لئے ایک بڑی مشکل یہ بھی تھی کہ فرانسیسیوں کی طرف سے اُس کی حمایت ختم ہو گئی ۱۷۹۷ء میں ان تمام طاقتوں نے ٹیپو سلطان پر پورا دباؤ ڈالا اس شدید بحرانی دور میں اُس کے خلاف پلا امتیاز مذہب پوری قوم ٹیپو کے ساتھ رجمی حالت یہ تھی کہ تین کروڑ روپے جمع کرنے کے لئے جب نئے ٹیکس لگائے گئے تو ٹیپو سلطان کو تین کی بجائے دس کروڑ روپے وصول ہوئے۔

ٹیپو نے انگریزوں کے ناپاک قدموں سے ہندوستان کو آزاد کرنے کے لئے فرانسیسیوں، ایرانیوں، افغانوں اور نیپالیوں کے علاوہ دیگر کئی حکومتوں سے بھی مدد کی درخواست کی مگر اُس کی کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی۔ اُس کے باوجود ٹیپو سلطان یہ عزم کر چکا تھا کہ وہ اپنی جان کی

قیمت پر بھی وطن کا دفاع کرے گا۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ انسان کو ایک ہی بار مرنا ہے لہذا موت سے خوف کس لئے ٹوہ یہ بھی کہتا تھا کہ گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی کہیں بہتر ہے۔ اپنے والد کی وفات کے وقت ٹیپو سلطان کی ریاست کا اقتباسی ہزار مربع میل تھا لیکن اس نے اُس میں ادونی، سنورہ کرک، اناگوڈی، کرپہ، کرنل اور امتیازگر کے علاقے شامل کر لئے اُس کے خزانے میں اتنی کروڑ روپے تھے نیز سات سو اسی، چھ ہزار اونٹ، گیارہ ہزار گھوڑے چار لاکھ بیل اور گائے، ایک لاکھ بھینسے، چھ لاکھ بھیڑیں، تین لاکھ آٹھی گولے، تین لاکھ دس ہجیرے دو لاکھ تلواریں اور ۲۲ ہزار توپیں تھیں اُس نے پیادہ فوج میں اضافہ کیا اور فوجی احکام کے لئے فارسی اصطلاحات استعمال کیں۔ جو اس سے پیچھے انگریزی اور فرانسیسی میں مروج تھیں، فوج کے ڈویژنوں کے مختلف نام رکھے اور فوج میں دیگر بہت سی اصلاحات کیں۔

ٹیپو سلطان سترہ سال سے ۸ سال کی عمر تک اسلام کے دشمنوں سے برسرِ پیکار رہا۔ ۱۷۹۸ء میں انگریز جنرل ویلزے کو اس مقصد کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن ٹیپو سلطان کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرنے کیونکہ انگریزوں کے دل میں ایک ہی خراب کھٹک رہا تھا اور وہ ٹیپو سلطان تھا ویلزے نے ٹیپو سلطان کے نام کئی دھکی آمیز خطوط روانہ کئے اور اُس پر یہ الزام لگایا کہ اُس نے فرانسیسیوں اور دوسری قوتوں کو انگریزوں کے خلاف لڑنے کی دعوت دے کر بہت بڑا جرم کیا ہے۔ تین فروری ۱۷۹۹ء کو ویلزے نے برطانوی فوج اور اتحادیوں کو حکم دیا کہ ٹیپو سلطان پر حملہ کر دیں۔ ۱۱ فروری کو برطانیہ کی فوج جنرل ہارس کی کان میں ویلور سے روانہ ہوئی۔ اُس کے ساتھ نظام دکن کی فوج بھی شامل تھی ان دونوں فوجوں نے سرنگاپٹم کی طرف بڑھنا شروع کر دیا مارچ کو یہ فوج میسور کی سرحدوں پر جمع ہو گئی۔ ۵ مارچ کو ان فوجوں نے کاروائی شروع کر دی۔ برطانوی فوج کے ساتھ مختلف ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کی فوج اتنی تعداد میں شامل تھی کہ سلطان کی فوج کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو گئی اس کے باوجود ٹیپو سلطان اپنی فوج کی گلی کرتا ہوا سب سے آگے نظر آبلوہ دشمن سے لڑنے کے لئے سرنگاپٹم سے مدد روانہ ہوا ابتدائی کامیابیوں کے بعد ٹیپو سلطان کی فوج کا زبردست جانی نقصان ہوا اس کے باوجود اُس نے جنرل ہارس کی انگریز فوج سے بھی ہتھیار نہ ڈالے۔ ۲۷ مارچ کو شدید جنگ کے بعد ٹیپو سلطان کے بہت سے پسر اور ایک ہزار بہترین سپاہی ہلاک ہوئے۔

مسلحہ ناکامیوں اور دشمن کے زبردست دباؤ کے بعد ٹیپو سلطان کو سرنگاپٹم کے قلعہ بند

غیر میں لوٹنا چاہا جس کا محاصرہ برطانوی فوج نے کر لیا تھا۔ ۹ اپریل کو ٹیپو سلطان نے برطانوی کیمپ  
جنرل ہارس کو ایک خط میں لکھا کہ تمام معاہدوں کی پابندی کے باوجود وہ کیا چیز ہے جس نے انگریز  
فوج کو جنگ کرنے اور پیش قدمی جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔ ۶

۱۲ اپریل کو جنرل ہارس کو بھیجی سے نئی لکھ بلی اور ۲۰ اپریل کو انگریز فوج نے دیا کہ  
جنوبی ساحل پر بھرپور حملہ کر دیا۔ ۲۲ اپریل کو جنرل ہارس نے ٹیپو سلطان کے نام ایک خط بھیجا جس  
میں اس کے لئے شرائط پیش کی گئی تھیں۔ ۲۸ اپریل کو ٹیپو سلطان نے جواب میں لکھا کہ معاملہ کیونکہ  
بہت اہم تھا اس لئے اس پر غور و فکر کی ضرورت تھی ٹیپو سلطان نے اس مقصد کے لئے اپنے دو  
خاندان سے بھی انگریزوں کے پاس بھیجے تاکہ وہ انگریزوں سے بات چیت کر سکیں لیکن جنرل ہارس  
نے ان دونوں سے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ سلطان غیر مشروط طور پر یا تو اس کا معاہدہ کرے  
یا سنگین نتائج کے لئے تیار ہو جائے۔

ٹیپو سلطان اس بات سے ٹھہری طرح باخبر تھا کہ معاہدہ امن باعزت نہیں اور جنگ سے  
بھی بے نزہت ہے لہذا ایسے معاہدے سے بہتر ہے کہ جنگ جاری رکھی جائے خواہ موت کا سامنا کیوں  
نہ کرنا پڑے۔ نتیجہ میں ۱۹ مئی کو جنگ کے شعلے پھر بھڑکی اٹھے اس وقت ٹیپو سلطان قلعہ بندی  
کے آہستہ آہستہ کے ساتھ رہائش پذیر تھا کیونکہ اسے اسی دروازے پر گلے کا سب سے زیادہ  
خطرہ تھا ٹیپو سلطان نے اپنی فوج سے خطاب کرتے ہوئے کہا

”میں اُس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے جسم میں خون کا آخری قطرہ اور آخری سانس باقی  
ہے اگر انسان کو صرف ایک بار مرنے کا خوف کیوں؟ موت کا ایک دن مقرر ہے جو  
کبھی نہیں مل سکتا۔“

ٹیپو سلطان حالات کی سنگینی سے ٹھہری طرح باخبر تھا لیکن وہ قطعی طور پر خوفزدہ نظر نہ آتا تھا  
اس دن بے بسی و غم کیوں کا ایک وفد اُس کے پاس آیا اور انہوں نے سلطان کو بتایا کہ انتہائی مصیبت  
کا وقت ہے اور ایک اندوہناک گھڑی سر پہ گھڑی نظر آتی ہے اس گھڑی کو دھماکوں اور صدقوں  
سے ٹھلا جاسکتا ہے ٹیپو سلطان نے کہا

”وہ خدا سے ہے اور صدقہ بھی خدا کے نام پر ہے تو اس میں کوئی مفاد نہیں۔“

دوپہر کے وقت ٹیپو سلطان اپنے کمرے سے نکلا اُس کی بیٹی کے ایک طرف تلوار تھی اور دوسری  
طرف کار توں! اُس کے دائیں بازو پر قرآنی آیات پر مشتمل دعائیں بندھی تھیں اتنی دیر میں اُسے اٹھ

ہی کہ فوج کا ایک نہایت قابل جرنیل سید غفار شہید ہو گیا ہے۔ ٹیپو سلطان نے اسے ہنگامی سے کہا  
 ”وہ بہت بہادر انسان تھا۔ موت اُسے کبھی خوفزدہ نہیں کر سکی الحمد للہ کہ اُس نے شہادت  
 کا تاج اپنے سر پر رکھ لیا۔“

رات کو وہ کھانا کھانے کے لئے واپس آیا۔ ابھی وہ فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ کچھ خوفناک آوازیں  
 کان میں پڑیں۔ اُسے علم ہو گیا کہ انگریز فوجوں نے تازہ حملہ کر دیا ہے۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ  
 دھوئے اور کمرے سے تلوار باندھ کر تیار ہو گیا۔ میدان جنگ میں ٹیپو سلطان نے مسلسل بہادری کے  
 جو ہر دکھائے اور بہت سے انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کچھ دیر بعد انگریزوں کی پیش قدمی  
 صفت ٹیپو سلطان کے سر پر پہنچ گئی وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس دوران سلطان کے سینے کے  
 دائیں اور بائیں گولیوں کی بوچھاڑ پڑی، گھوڑا گر گیا اور سلطان کی گڑھی زمین پر آ رہی، اب ٹیپو  
 سلطان انتہائی زخمی حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ اس دوران کچھ لوگوں نے انگریزوں کو یہ بتانا چاہا کہ  
 وہی ٹیپو سلطان ہے تاکہ اُس کی زندگی بچنے کی کوئی صورت نکل آئے لیکن خیر اور باوقار سلطان نے  
 سختی کے ساتھ اپنے لوگوں کو ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اس دوران کچھ اور انگریز سپاہی وہاں پہنچ  
 گئے ان میں ایک نے سلطان کی میرے جڑی بیٹی اُتارنے کی کوشش کی لیکن سلطان نے، جس کے  
 ہاتھ میں ابھی تلوار موجود تھی ایک ہی وار میں انگریز سپاہی کے گھٹنے کاٹ دیئے۔ جو اب سپاہی نے  
 مشتعل ہو کر سلطان کی کینٹین پر بے شمار گولیاں داغ دیں یوں سلطان نے جام شہادت نوش کیا۔  
 جنگ کے بعد انگریز کمانڈنگ آفیسر جنرل بیارڈ جب شام کے وقت سلطان کے کچھ  
 ملازموں کے ہمراہ سلطان کی لاش تلاش کرنے پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سلطان کے چہرے  
 پر کرب کے کوئی آثار نہ تھے۔ بلکہ شاہی و بدرہ اور اسلام کے ایک سپاہی کا عزم اور وقار  
 موجود تھا سلطان کی تلوار، بگڑی اور بیٹھناٹا ہو چکی تھی۔ ۵ مئی ۱۷۹۹ء کو جنازہ اٹھا  
 جس میں لاکھوں افراد نے شرکت کی اس موقع پر توپوں کی سلامی دی گئی اور سلطان کو اُس  
 کے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

## ہوش محمد قنبرانی (۱۸۰۳ تا ۱۸۱۸ء)

میر فتح علی خان تالپور نے ۱۸۰۳ء میں سندھ فتح کیا اس طرح سندھ میں کلہوڑوں کا قبیلہ  
 ہو گیا لیکن تالپور نسل کے بیشتر فرمانروا تھے اسان اور عیاش تھے۔ جنگ سے کوئی دلچسپی نہ تھی

حکومت پر ان کی گرفت کمزور ہوتی گئی۔ پھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملنے میں مصروف ہو گئے اور اپنی سرحدوں کی حفاظت بھی ذکر کئے چنانچہ سندھ میں تاپوروں کی حکومت صرف پنجاب اس کے بعد زوال پذیر ہو گئی۔

ہوش محمد قزاقی کو عام طور پر ہوشو کہا جاتا تھا وہ ایک نہایت بہادر شخص تھا اور اس نے ریزوں کے ساتھ روانہ وار بجز لیا اسی لئے اسے ممتاز مقام حاصل ہوا لیکن ہوش محمد کے بارے میں تفصیلات بہت کم ملتی ہیں وہ غالباً ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوا تھا یہ فتح علی خاں تاپور نے لڑکے صوبہ کاہم کو بھجوا دیا اور دونوں میں بہت دوستی تھی۔ صوبہ ارخان اس دن پیدا ہوا جس دن اس کے والد انتقال ہوا اس کی تعلیم اور پرورش شاہی گھرانے میں ہوئی میر فتح علی خاں کی وفات کے بعد سندھ کی صورت اس کے چچاؤں کے ہاتھ میں آگئی۔ ۱۸۲۳ء میں صوبہ ارخان نے اپنے چچاؤں سے اپنے جتنے کی ملکیت کا مطالبہ کیا، جب انکار ہوا تو اس نے بغاوت کر دی اور قزاقی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ تاہم صوبہ ارخان کے ایک چچا نے صلح کرادی لیکن اس کے باوجود صوبہ ارخان کو انتظامیہ کوئی دخل نہ تھا اسی لئے صوبہ ارخان اس ناک میں رہنے لگا کہ وہ اپنے چچاؤں سے انتظامیہ پر موقع اس کے ہاتھ اس وقت آیا جب انگریزوں نے سندھ پر حملہ کیا صوبہ ارخان کو ریزوں کی حمایت حاصل ہو گئی اور اسی موقع پر یہ بات بھی گھل کر سامنے آئی کہ قزاقی کس مرتبہ بہت وطن تھا۔ اس نے صوبہ ارخان سے مسلسل درخواست کی کہ وہ دشمنوں کے ہاتھ میں کلونا بنے اور تمام باتیں بھڑکرا انگریزوں کے خلاف اپنے چچاؤں کے ساتھ جو بائے لیکن صوبہ ارخان نہ مانا۔ صوبہ ارخان میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ اپنے مقصد کے لئے قربانیاں دے سکے وہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ آجائے۔

صوبہ ارخان نے پارس میں ہر کے ساتھ مسلسل خفیہ خط و کتابت میں مصروف تھا۔ صوبہ ارخان نے، انگریزوں کو یہ یقین بھی دیا تھا کہ وہ ان کی مخالفت نہیں کرے گا اور سندھ کے میروں کا ہاتھ نہیں دے گا۔ انگریز تو اپنے مفادات کی خاطر ناہتہا ہی تھا کہ غدار پیدا ہوتے رہیں۔ اور ان کی سرپرستی کی جاتی رہے۔

جب میروں کی طرف سے میان میں انگریز فوج کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تو صوبہ ارخان نے تمام میروں سے طے شدگی اختیار کئے رکھی نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۴۲ء فروری ۱۸۴۲ء کو جب میان کی جنگ کا آغاز ہوا۔ تو صوبہ ارخان حیدرآباد کے نفع میں محض نظر ہو کر بیٹھا رہا۔ جونہی اسے

میرزا علی گڑھ انگریزوں نے جنگ جیت لی تھی اور میروں کی افواج جان بچا رہی ہیں، اُس نے اپنے ایک محترم مشیر منشی آوت رائے کو سرچارلس کی خدمت میں قیمتی تحائف، پھل اور مٹھائیاں لے کر روانہ کیا۔ دراصل یہ آوت رائے ہی تھا جس نے صوبدار خان کو غلامشور سے دئے اور جنگ میں میروں سے علیحدگی رکھنے پر مجبور کیا۔ بہر حال صوبدار خان انگریزوں کی فتح کو اپنی فتح تصور کر رہا تھا۔ اس کے بعد صوبدار خان نے انگریزوں کی مزید خوشامد اور چال چل ہی کے لئے آوت رائے اور مرسل ارمانی کو انگریز جنرل کے پاس بھیجا اور ملاقات کی اجازت طلب کی۔ جنرل چارلس نے صوبدار کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ حیدر آباد کے میروں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی پوری کوشش کئے کہ میر انگریزوں کی مشکل اعانت قبول کر لیں۔ ان کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا جائے گا نیز ان کی شہریت برقرار رکھی جائے گی۔

صوبدار خان کی ان تمام غداریوں کے وقت بھی ہوش محمد قنبرانی مسلسل درخواست کرتا رہا کہ وہ اپنا رویہ ترک کرے، حوصلہ سے کام لے اور انگریز کے خلاف تلوار اٹھائے۔ لیکن صوبدار خان میں تو حسب وطن کے جراثیم ہی نہ تھے۔ کہ وہ ہوش محمد کی بات مان لیتا۔

آخر ایک دن جب ہوش محمد کا دل بھرایا۔ اور اُس نے حسب وطن، عزت نفس اور اسلامی عقائد کے ہاتھوں مجبور ہو کر صوبدار خان کو کھری کھری سنائیں تو صوبدار خان غصہ میں آ گیا۔ اس نے ہوش محمد کی دوستی، موفاداری اور اُس کے تمام گزشتہ اسمانات کو فراموش کرتے ہوئے جلد ہی سزا دینے کا ارادہ ظاہر کیا اور اسے اپنی نظروں کے سامنے سے دور ہو جانے کا حکم دیا۔

برطانوی افسر روزانہ کسی نہ کسی میر کو گرفتار کر لیتے تھے۔ میان کی جنگ کے صرف چار دن کے بعد یعنی ۲۱ فروری ۱۸۴۳ء کو برطانوی سپاہی فوجانہ انداز میں حیدر آباد کے قلعہ میں داخل ہو گئے جہاں وفادار لیکن بد قسمت ہوش محمد بھی مجبور تھا۔ انگریزوں نے داخل ہوتے ہی اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے پرے درجہ کے لیڈر سے ہوسنے کا ثبوت دیا اور وہ تمام فوارات اور قیمتی اشیاء ہنسیا لیں۔ جو میروں کے آباؤ اجداد کی نشانی تھیں۔ پانچ دن کے بعد میر محمود خان اور غلام میر صوبدار خان کو زبردستی ایک پاگل میں بٹھا کر قلعہ سے باہر لے جا کر قید کر دیا گیا۔

ہوش محمد کو اپنے مالک صوبدار خان سے متعلق نہ تھا اور اس کی بے عزتی بھی کی گئی تھی، اس کے باوجود ہوش محمد کو اپنے مالک کی قہر میں کابلے حد مدد نہ تھا۔ وہ اپنے وطن پر غلامی کے چھائے ہوئے خٹ ٹوپ اندھیروں کو محسوس کر رہا تھا۔ اور غداروں کی وجہ سے اس روز سیاہ کی آمد پر اُنک نشانی



تھا۔ کیسے وہ ہمت ہارنے والا شخص نہیں تھا۔ آٹن کا عقیدہ تھا کہ شکست در شکست ہوتی ہی ہوتی ہے لیکن کوئی شکست آخری اور حتمی نہیں ہوتی۔ اس نے تھوار سنبھال لی، اپنے تھوڑے سے افکار اور سپاہیوں کو یکجا کیا اور انھیں ہندوؤں کے خلاف آئندہ محاذ میں شرکت کی غرض سے حیدر آباد روانہ ہو گیا تاکہ میر شیر محمد کا ساتھ ملے سکے۔

میر شیر محمد کو ہوش محمد کی آمد سے بے پناہ مسرت اور حوصلہ ہوا۔ ۱۵ مارچ ۱۸۵۷ء کو سپاہیوں کا یہ چھوڑا سا قلعہ حیدر آباد کی طرف روانہ ہوا۔ سرچارلس نے میروں کی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے اپنے گشتی دستے چھوڑے جو سڑک پر ۲۳ مارچ کو سرچارلس نے اپنی فوج نہر پیکلی کے دوسرے کنارے منتقل کر دیں۔ انگریزوں اور حریت پسندوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ہوش محمد نے میر محمد کو مشورہ دیا کہ وہ ایک دن کے لئے جنگ بند کر دے۔ تاکہ تھکی اسی فوج اگلے دن تازہ دم ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ میر محمد خان نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔

دوسرے دن ہوش محمد شہادت کے نشے میں چڑھ کر بے ہنگامی سے ساتھ انگریزوں سے لڑا۔ وہ اتنی بہادری سے لڑا کہ انگریز بھی اس کی تعریف کے بغیر نہ رہ سکا۔ کہتے ہیں کہ ہوش محمد فوج کے اُن آخری چند سپاہیوں میں تھا جو انگریز کا مقابلہ تعداد کی پروا کئے بغیر کر رہے تھے۔ ہوش محمد نے اسی میدان میں باہم شہادت نوش کیا۔ اور مجاہدین آزادی کی صوفیوں میں شامل ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حیدر علی، پیر سلطان اور ہوش محمد قبضہ انی۔ ان مجاہدین آزادی میں سے ہیں جنہوں نے شمشیر بکھٹ ہو کر جہاد کیا۔ اور تحریک آزادی کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیا۔

## باب

۱۸۵۰ء

انڈیا استعمار کے خلاف

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کو بغاوت اور غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سرسید احمد خاں نے جب ۱۸۵۷ء کے واقعات قلمبند کئے تو انہوں نے بھی انہیں ”اسباب بغاوت ہند“ کا عنوان دیا۔ جبکہ اس کے برعکس یہ کوئی بغاوت نہ تھی نہ غدر۔ بلکہ یہ ہنگامہ آرائی کچھ فطری تقاضوں کا نتیجہ تھی۔

جب کسی آزاد اور حاکم قوم، مفر دیادھی میں کو نیک کر لیا جائے یا اس کے گھر پر قبضہ جما لیا جائے تو اس امر سے قطع نظر کہ انجام کیا ہوگا۔۔۔۔۔ دوبارہ آزادی کے لئے جدوجہد فطری رد عمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات اسی فطرتی رد عمل کا نتیجہ تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس جدوجہد میں اور بہت سے عناصر شامل ہو گئے۔ انگریزوں نے اس کو بغاوت اور غدر کا نام دینا شروع کر دیا اور ہندو اور مسلمان مؤرخین نے بلا سوچے سمجھے گونے خاکوں اور رائے کے ہنرآموز تحروں کی تقلید میں یہی الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیئے۔

انگریزوں نے نہ صرف ایک آزاد قوم کو اپنی قریب کار یوں سے محکوم بنایا بلکہ ایسے طریقے بھی استعمال کئے کہ مسلمانوں کو زندہ گی کے ہر شعبے میں اتنا پیچھے ڈال دیا کہ وہ دوبارہ برائے نام کے قابل نہ رہے۔ ہنرمند نے اس بات کا اعتراف واضح الفاظ میں یوں کیا ہے:

ہم نے مسلمانوں اور ان کے نمایاں لوگوں کو قوت کے بل پر دیا، انہیں اعلیٰ فوجی خدمات سے محروم کیا۔ کیونکہ ہم اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہمارے اپنے تحفظ کے لئے مسلمانوں کا اخراج ضروری ہے مسلمانوں کو اقتصادی اعتبار سے اس طرح تباہ کر دیا گیا کہ ان کی سماجی اور ثقافتی زندگی بھی تباہ ہو کر رہ گئی۔“

بیشتر یورپی مؤرخین، سر جان لارنس کے اس خیال سے متفق نظر آتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات قطعی طور پر الیٹ انڈیا کیپٹن کی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت کا نتیجہ تھے۔ اسی وجہ سے برصغیر ہندوپاک میں اُن معناہ کو بھی ہنگامہ کرنے کا موقع ملا جو برطانوی حکومت کے خلاف تھے۔ لیکن یہ بات کہتے ہوئے سر جان لارنس یا اُس کے معتقدین ان حقائق کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں جن کا تعلق ماضی میں انگریز کی کاروائیوں اور زیادتیوں اور ہندوستانیوں کے خلاف مختلف اقدامات سے ہے۔

انگریز نے ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کو وسعت دینے کے لئے جو اقدامات کئے اور جن ہتھکنڈوں سے کام لیا ان کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے ہندوؤں اور بالخصوص مسلمانوں میں شدید نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ مسلمان کی طرف سے نفرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حکومت اُس کے ہاتھ سے نکل تھی۔ جبکہ ہندوؤں کے لئے صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ وہ ایک حاکم سے نکل کر دوسرے حاکم کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ انگریز کے خلاف مسلمان کی جدوجہد کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات اُس آتش فشاں کی مانند تھے۔ جس کا لاوا ۱۸۱۶ء سے اندھیرے اندر آبل رہا تھا۔ مثلاً ۱۸۱۶ء میں بریلی، ۱۸۳۱ء میں جھڑنا، ۱۸۳۲ء میں چھٹانا، گپور اور پلاوی کے واقعات، بنگال میں فرانسیسی تحریک، میرنصر، نقیو میر کے اقدامات، ۱۸۴۶ء میں بنگال میں دیوبند کی جدوجہد، ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۵ء تک مرہٹوں کی بغاوت اور ۱۸۵۵ء اور ۱۸۵۶ء میں سنال کے واقعات۔!

## اسباب

برطانوی سامراج کو ہندوستان میں وسعت دی جا رہی تھی اس مقصد کے لئے انگریز نے آنکھیں بند کر کے جودل چاہا، سو کیا۔ اُس نے اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑنے کے لئے سازشوں کا حال پھیلایا، ہر معاملے میں مداخلت کی اور اس طرح اُس نظام کار کو کیسر بدل ڈالا جو ہندوستان کے

لوگوں کے لئے مانوس تھا۔ سیاسی، اقتصادی، سماجی، مذہبی اور فوجی اعتبار سے ہندوستان کے لوگوں کی زندگی انگریزی کا شکار ہو گئی۔ لارڈ ولہوزی کی طرف سے مختلف ریاستوں کے فرمانروا، بل کو حق وراثت سے محروم، اور آخری تاجدار دلی بہادر شاہ ظفر کے وراثہ کو قلعہ سے مہر دی منتقل کرنے کے مجذومہ استدام نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یک وقت شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ بہت سے ہندو اور مسلمان ریاستی حکمران کمپنی کی حکومت کے ضد ہو چکے تھے۔ مل محل کرانگریزوں کو شکست دینے پر تیار ہو گئے تھے۔ ان میں اودھ کے سابق حکمران کے ایک مشیر احمد اللہ، مانا صاحب اور مانا صاحب کا بھتیجا راؤ صاحب اور اُس کے ساتھی تانیا تروپی اور عظیم اللہ خاں، رانی بھانسی، کنور سنگھ اور بہادر شاہ کا رشتے دار فیروز شاہ نمایاں تھے۔

بہت سے بڑے زمینداروں کو ان کی اراضی اور متعدد ریاستی حکمرانوں کو ان کی حکومتوں سے محروم کرنے کے باعث لاقعد لوگ بے روزگاری کا شکار ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں حکومت کے خلاف بددلی اور بے اطمینانی پائی جاتی تھی۔ ۱۸۵۲ء میں لارڈ ولہوزی نے بمبئی میں زمینداروں کی اراضی اور جاگیروں کے سلسلے میں جو انعام کمیشن قائم کیا تھا، اُس کی تحقیقات کے نتیجے میں دکن میں بیس ہزار جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ حکومت نے یہ دوسرا اس طرح اس کے غمخواروں میں بہت سی رقم اکٹھی ہو جائے گی لیکن اس بات پر ذرا بھی غور نہ کیا کہ ان اقدامات سے ملک کے اقتصادی حالات میں کتنی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ جن لوگوں کو اودھ کے حکمران کی طرف سے وظائف ملا کرتے تھے یا پیشہ دہی جاتی تھی، وہ بند کر دیئے گئے۔ ریاست کی فوج ختم کر دی گئی اور اس طرح ہزاروں پیشہ ور سپاہی بے روزگار ہو گئے۔

انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی تھی۔ مثلاً ہندوؤں کو یہ دیکھ تھا کہ سنی کی رسم کیوں ممنوع قرار دی گئی، ہندو بیوہ عورتوں کو قانون کے ذریعے دوسری شادی کی اجازت بھی دے دی گئی اور لاقعد ہندوؤں کو عیسائی بنا لیا گیا۔

انگریزوں نے ہندوستان میں رہنے والی قوموں کے بارے میں انتہائی توہین آمیز رویہ اختیار کیا۔ انگریز فوجی اور رسول افسر کھلے بندوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کا مذاق اڑاتے رہے۔ میکالے نے یہاں تک کہا کہ انگریزی کی ایک کتاب مشرق کی تمام کتابوں پر بھاری ہے۔ اُس نے اپنی ماں کو ایک خط میں لکھا کہ ”میرا ایمان ہے کہ اگر ہندوستان میں ہماری تقلیدیں

منصور ہندی کامیاب ہو گئی تو آئندہ ۳۰ سال میں کم از کم بنگال کے اندر کوئی شخص عیسائیت کے دائرے سے باہر نہ رہ سکے گا۔ انگریزوں نے ہندوستان میں جو تعیناتی نظام قائم کیا اس کا مقصد۔ سراسر یہ تھا کہ نئی نسل کے اندر عیسائی عقیدے کو راسخ کیا جائے۔ جا بجا عیسائی مشنریاں قائم کر دی گئیں اور انہوں نے لوگوں کو گمراہ کر کے عیسائی بنانا شروع کر دیا۔ حالت یہ تھی کہ انگریزوں نے ہندوؤں کے مذاق اڑاتے اور عیسائیت کی تبلیغ کرتے۔ بہت سے انگریزوں نے تو فوج میں صرف اس لئے ملازمت اختیار کر لی کہ وہ سپاہیوں کو زنجیروں کا لالچہ دے کر عیسائی بنائیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب کے لئے خیر شائستہ حتیٰ کہ یہودہ زبان استعمال کرتے۔ قدرتی طور پر اس کا شدید ردِ عمل ہوا انگریزوں کی طرف سے سستی کی رسم کو ختم کرنے اور ہندو بیواؤں کو دوسری شادی کرنے کا حق دے کر ان کے دلوں میں یہ شبہ پیدا کر دیا گیا کہ انگریز سماجی اصلاح کی آڑ لے کر انہیں عیسائیت کے دائرے میں شامل کرنے کی سازش کر رہا ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ فوج میں بھی بعض وجوہات کی بنا پر بددلی پیدا ہوئی۔ ہندو سپاہیوں کو برما اور افغانستان کے خلاف جنگوں میں حصہ لینے کے لئے دور دراز علاقوں میں بھیج دیا جاتا۔ سپاہیوں کی اکثریت برہمنوں اور راجپوتوں پر مشتمل تھی۔ برہمنوں کا خیال یہ تھا کہ جب وہ اپنے وطن سے دور سفر پار جاتے ہیں تو ان کی اونچی ذات کا امتیاز قائم نہیں رہتا۔ ۱۸۵۷ء میں

حکومت نے جنرل اسٹیمٹ ایکٹ (GENERAL ENLISTMENT ACT) کا اطلاق کر دیا۔ جس کے تحت حکومت فوج میں بھرتی

ہونے والوں کو جہاں چاہے بھیج سکتی تھی۔ اس ایکٹ کی وجہ سے سپاہیوں میں مزید بے اطمینانی پیدا ہو گئی اور فوج میں تنظیم قائم نہ رہ سکی۔ جب ان سپاہیوں کو باہر جانے کے لئے کہا جاتا تو وہ انکار کر دیتے یا زائد الاؤنس کا مطالبہ کرتے۔ حکومت قدرے پس و پیش کے بعد ان کے مطالبات منظور کر لیتی لیکن اس بنا پر سپاہیوں میں اپنی اہمیت کا خیال پیدا ہو جانے کے باعث فوجی نظم و ضبط میں خاصی کمی واقع ہو گئی۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ انہوں نے افغانستان میں برطانیہ کو شکست سے بچایا اور سکھوں کو زیر کر کے پنجاب پر قبضہ کیا۔ علاوہ ازیں چیمہ اور ابراہام میں زیادہ سے زیادہ انگریز سپاہیوں کی موجودگی کے باعث، ہندوستانی فوج میں انگریزوں کی تعداد تین کے مقابلے میں ایک رہ گئی ان میں بھی نصف انگریز سپاہی پنجاب میں تھے اور باقی

بنگال، بہار اور دوآب میں — سبھی وقت لارڈ ڈلہوزی ہندوستان سے واپس گیا تو ہندوستان میں انگریز سپاہیوں کی تعداد ۳۲۲،۵۴ ہزار اور ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد ۳۳۳،۰۰۰ تھی۔ لہذا قدرتی طور پر ہندوستان کی حفاظت صرف ہندوستانی سپاہی ہی کر سکتے تھے۔

کارنوسوں کے معاملے نے اس بددلی اور بے اطمینانی کو مزید ہوا دی۔ فوج میں ایک نئی قسم کی رائفل بھیجی گئی اس کے کارنوسوں پر کوئی چکنی چیز لگی ہوئی تھی۔ کارنوس کو استعمال کرتے وقت اس کے ایک سرے کو دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ فوجیوں میں یہ بات پھیل گئی کہ کارنوس پر لگی ہوئی چکنی چیز گامٹے اور شکر کی چربی سے تیار کی جاتی ہے۔ لہذا ہندو اور مسلمان سپاہیوں میں بیک وقت اس شبہ نے جنم لیا کہ انگریز جان بوجھ کر ان کے حقیقے میں فصل ڈالنا چاہتا ہے۔ جنوری ۱۸۵۷ء میں یہ رائفل سپاہیوں کو دی گئی تھی۔ جنوری اور مارچ کے دوران ملک کے قریب بہرام پور اور بارک پور کی چھاؤنیوں میں ہنگامہ شروع ہو گیا انہوں نے ملک کے فورٹ ولیم پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ ۹ مئی کو میرٹھ میں اس بات پر ہنگامہ ہو گیا کہ سپاہیوں نے ان کارنوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا تھا۔ ان سارے سپاہیوں کا کورٹ مارشل کیا گیا، بعد ازاں انہیں دس دس سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ دوسرے دن ہی مختلف مقامات پر نیپنی اور رجمنٹوں نے ایک جیل خانے کے دروازے کھول کر برطانوی افسروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور دہلی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ دہلی میں مقامی فوج دستے بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ اور انہوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر کو شاہ ہندوستان بنانے کا اعلان کر دیا گیا، کاہنہ تشکیل کی گئی اور دستور العمل راتیں، تیار کر لیا گیا۔ بہادر شاہ کے صاحبزادے، مرزا مظفر کو کمانڈر انچیف مقرر کر دیا گیا کچھ شہزادے فوج کے کمانڈر مقرر ہوئے اس دوران اودھ، روہیلکھنڈ اور بجنور کے مسلمان سرداروں نے بہادر شاہ ظفر کی اطاعت قبول کر کے نذرانے بھیجے۔ بریلی کا بخت خان چودہ ہزار سپاہی لے کر دہلی پہنچ گیا۔ اس طرح فوج کی کل تعداد ۱۹ ہزار ہو گئی لیکن مالی حالت خراب تھی کہ سپاہیوں کو تنخواہیں دینے کے لئے شاہی محل کی اشیاء ضبط کرنا پڑیں۔ انگریزوں نے کچھ شاہی شیروں کو اپنے ساتھ ملا کر باسوسی شروع کر دی۔ ان لوگوں نے مرزا مظفر اور بخت خان میں بھی کشیدگی پیدا کرائی۔ بیٹا اور جنہ کے سکھ بھی بخت خان کا ساتھ دے رہے تھے۔ آزاد فوجوں نے انگریز فوج کے خلاف بے جگری سے جنگ کی لیکن ۲۰ ستمبر کو شہر کی تفصیل توڑ کر انگریز دہلی میں داخل ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر بہایوں کے

مقبضے میں پناہ گزین ہوئے۔ بخت خلد فوج لے کر اودھ لوٹ گیا اور اُسے بھی نیپال کے بہادروں میں پناہ لینا پڑی۔ برطانوی فوج نے ہروڈس کی کمائی میں بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا اور اُن کے ساتھ انتہائی توہین آمیز سلوک کیا۔ پست ذہن ہروڈس نے بہادر شاہ ظفر کی موجودگی میں اُن کے دروازوں اور ایک پوتے کے سر قلم کرا دیئے بعد ازاں بہادر شاہ پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور جلاوطن کر کے دکن بھیج دیا گیا۔ یہاں وہ ۱۸۶۲ء میں وفات پا گئے۔

اودھ میں ہندوستان میں سپاہیوں سے مقابلے کے دوران ہنری لارنس ہلاک ہو گیا۔ وہنریت پسندوں کی قیادت مولوی احمد اللہ شاہ کر رہے تھے جو گذشتہ کئی ماہ سے انگریزوں کے خلاف فوجیوں میں خفیہ خط و تقسیم کرنے میں مصروف تھے۔ بعد ازاں انہیں گرفتار کر کے سزائے موت کا حکم سنایا گیا لیکن سزا ہونے سے پہلے ہی ہنگامہ بڑھا اور وہ جیل سے بھاگ نکلے۔ بعد میں ایک ہندو سردار نے ان سے غداری کی اور گرفتار کرا دیا۔ انہیں جون ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے گولی کاٹ دیا۔ مولوی احمد اللہ کے بارے میں کئے گئے کا کہنا ہے :

”اگر کوئی محبت وطن ہے اُس کے وطن سے محروم کر کے ناجائز طریق پر تباہ کیا گیا ہو، آزادی کی خاطر جنگ کرتا ہے تو اس اعتبار سے مولوی احمد اللہ یقینی طور پر ایک سچا اور عظیم محبت وطن تھا۔ مولوی احمد اللہ نے اپنی تلوار کو بلاوجہ قتل و غارت سے داخدا نہیں کیا۔“

نانا صاحب نے کانپور میں انگریزوں کے خلاف دہلی کو علم آزادی بلند کیا اور کانپور پر قبضہ کرنے میں انگریزوں کو ناکام باہر کیا۔ بعد ازاں نانا صاحب نے ۲۱۱ انگریز قیدیوں کو بی بی گڑھ میں قتل کر کے ایک کنزیریں میں ڈال دیا۔ جب انگریز دوبارہ کانپور میں داخل ہوئے تو نانا صاحب اور تانٹیا ٹوپی، اودھ اور گوالیار بھاگ گئے، تانٹیا ٹوپی کو بعد ازاں ہندو سردار مان سنگھ کی غلامی کی وجہ سے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔

رائی جھانسی نے میں ہزار سپاہیوں کے ساتھ برطانوی فوجوں کا زبردست مقابلہ کیا اور اور خود بھی اس جنگ میں ہلاک ہو گئی۔ رومیکھنڈ میں بھی خان بہادر خان نے برطانوی فوجی دستوں پر حملے کر دیئے۔ مراد آباد اور بننور کے علاوہ سہارن پور اور مظفرنگر میں بھی علم آزادی بلند ہوا۔ علاوہ ان کے علاوہ جنگال، بہار اور سندھ میں بھی انگریزوں کے خلاف طاقت استعمال کی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بارے میں میٹن نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ”انگریزوں

نے ہندوستانیوں اور بالخصوص بہادر شاہ کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اُس سے زیادہ ہیما نہ اور  
نکینہ سلوک شاید ہی تاریخ میں ملتا ہو، یہ نہ صرف بہت بڑی غلط تھی بلکہ ایک بہت بڑا جرم بھی تھا۔

## ناکامی کے اسباب

سلسلہ میں انگریز کے خلاف جو جدوجہد کی گئی اس کی ناکامی کی بڑی وجہ حریت پسندوں کے  
کے پاس ناکارہ اسلحہ اور فوج میں نظم و ضبط کا فقدان تھا۔ جبکہ انگریزوں کے پاس بہتر قسم کا ساز و سامان  
موجود تھا انگریزوں نے ڈاک اور تار کے نئے نظام سے ان دنوں میں پورا پورا فائدہ اٹھا لیا جبکہ  
حریت پسندوں کو اس سلسلے میں شدید دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ تیسری بات یہ تھی کہ انگریزوں کو  
رائی جھانسی، بیگم اودھ، حضرت محل اور کچھ دوسرے لوگوں کے سوا بہت سے ہندوستانیوں  
کو خرید لینے کے بعد فتح حاصل کرنے میں آسانی پیدا ہو گئی۔ انگریزوں کو گوالیار کے سردیکر راؤ،  
حیدر آباد کے سردار، جنگ، نیپال کے جنگ، بہادر، مان سنگھ اور سکھوں کی حمایت بھی حاصل رہی۔

## جنگ آزادی کی اہمیت

سلسلہ کی جنگ آزادی، جسے کچھ لوگ جنگ آزادی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں، تاریخ  
ہند کا ایک اہم ترین باب ہے جس نے بعد ازاں تاریخ کا نیا رخ متعین کیا۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا  
کہ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی گرفت نہایت کمزور تھی اور انگریزوں نے اسی سے سبق حاصل  
کر کے آئندہ کے لئے ہندوستان میں برطانوی انتظام و انصرام کے لئے نئے خطوط کا تعین  
کیا۔ اسی بنا پر بعد میں ہندوستان کا کنٹرول ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست تاجدارِ برطانیہ  
کے ہاتھ میں چلا گیا اور ہندوستان پر تاجدارِ برطانیہ کی حکومت، ایک وائسرائے اور ۱۱۵ الگ  
پیشواں ایک محالوں کوئٹل کی وساطت سے قائم کی گئی اس سلسلے میں ملکہ کے نام پر لارڈ کیننگ  
نے الہ آباد میں ایک دربار منعقد کیا اور یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہندوستان، تاجدارِ برطانیہ کی مملکت  
میں شامل کر لیا گیا۔ اس دربار میں ملکہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ حکومت پورا انصاف کرنے گی،  
ہر مذہب اور نسل کے لوگوں کو سرکاری ملازمت دے گی، اور وائلیں ریاست کی عزت اور  
وقار کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ ایسے تمام لوگوں کو عام معافی دی جائے گی جو انگریزوں کے  
قتل میں ملوث درہے ہوں یا آئندہ ملوث نہ ہوں۔



اس کے بعد انگریزوں نے فوج کی از سر نو تنظیم کی۔ فوج میں انگریزوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شامل کیا گیا اور اعلیٰ فوجی عہدے صرف اُن کے لئے مخصوص کر دیئے گئے۔  
 -- ہندوستانی ریاستوں کو تاج برطانیہ کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود انگریزوں نے ہندوستانیوں کو حقیر سمجھا۔ اور اُن سے جانوروں جیسا سلوک روا رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں کے خلاف نفرت پختی رہی اور رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کو نیا عزم دے کر ایک نئی منزل کی طرف لے جاتی رہی یہی وہ منزل تھی جسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء میں آزادی کی صورت میں حاصل کیا۔

## باب

# مجاہدینِ آزادی

## سر سید احمد خاں

۱۸۱۷ء — ۱۸۹۸ء

سر سید احمد خاں ۱۷ سال کے تھے کہ اُن کے والد وفات پا گئے۔ ۲۲ سال کی عمر میں انہیں ایسٹ انڈیا کمپنی میں معمولی ملازمت مل گئی انہوں نے محنت سے کام کیا اور ترقی پا کر آگرہ آگئے جس وقت کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہیں مانی پور میں منصف مقرر کر دیا گیا۔ ۱۸۴۲ء میں ان کا تبادلہ فتح پور سیکرٹری کر دیا گیا لیکن چار سال بعد تبدیل ہو کر پھر دہلی چلے گئے یہاں نو سال تک رہے۔ اس دوران انہوں نے اتنی کتابیں اور کتابچے لکھے کہ کل ہندوستان انہیں ایک اویس اور منکر کی حیثیت سے جاننے لگا۔ تاریخ بنوہ اور تاریخ سرکشی بنوہ اُن کی تصنیفات ہیں۔

سر سید کی اہم ترین تحریر اسبابِ بغاوتِ ہند کی صورت میں سامنے آئی جو سیاسیات پر اردو میں سب سے پہلی کتاب ہے اور جس میں ۱۸۵۰ء کے ہنگامے پر بحث کی گئی۔ ۱۸۵۵ء میں انہیں مزید ترقی دے کر "صدر امین" کے طور پر بنوہ بھیج دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے جنگاموں کے دوران وہ بعد مشکل بنوہ سے مراد آباد اور پھر میرٹھ پہنچے۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی پہنچے تو اُن کے چچا اور رشتے کے ایک بھائی سکھوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے کیونکہ سکھ مسلمانوں کے برعکس انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اُن کی والدہ اور خالوں کی حالت یہ تھی کہ وہ ایک اعطیل میں پناہ گزین تھیں اور کئی دن سے مجبوری اور پیاسی بھی! سر سید احمد ان سب کو میرٹھ لے آئے لیکن ان کی والدہ انسانوں کے انسانوں پر ظلم و ستم اور قتل عام سے ذہنی طور پر اتنی متاثر ہوئیں کہ کچھ عرصے بعد ہی

## وفات پاگئیں۔

کچھ دنوں بعد سرسید احمد خاں کا تہاولہ صدر الصدر کی حیثیت سے مراد آباد ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب تمام عدسے بندوؤں کے ہاتھوں میں تھے اور مسلمانوں کو معاشی، اقتصادی و سیاسی اعتبار سے ختم کرنے کے لئے انگریزوں نے سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر مطلقاً بند کر دیئے تھے۔ اعتبارات میں سرکاری اسامیوں کے لئے جو اشتہارات دیئے جاتے تھے ان میں واضح طور پر ان اسامیوں کے لئے مسلمانوں کو نااہل قرار دے دیا جاتا۔ جن عدوؤں پر مسلمان پہلے سے موجود تھے وہ بھی ان سے بچھین کر ہندوؤں کی جھولی میں ڈال دیئے گئے۔

سرسید احمد خاں نے ان حالات اور تقاضوں کا بنظرِ ناظر مطالعہ کیا جن کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ دونوں دیکھنا پڑ رہا تھا انہوں نے ان اقدامات پر بھی غور کیا جن کے ذریعے مسلمانوں کو اقتصادی خوشحالی، تعلیمی و سماجی حیثیت اور عزت و قدار کے راستے پر گامزن کیا جاسکتا تھا ان کے دل میں یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ کسی طرح مسلمانوں کو ایک باعزت قوم کی حیثیت حاصل ہو جائے لہذا سید احمد نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی ترقی کی خاطر شب و روز کام شروع کر دیا۔ ۱۸۵۹ء کو انہوں نے پہلی بار روم کے سامنے تقریر کی جس میں مسلمانوں کے مصائب و آلام پر روشنی ڈالی۔ اپنی تقریر کا اختتام مسلمانوں کے استحکام اور ترقی کی دُعا پر کیا۔

انہوں نے اپنی کتاب "اسبابِ بے باؤتِ ہند" اس وقت لکھی جب ملک میں مائشِ لاد نافذ تھا۔ تنازع کی پروا کئے بغیر اس رسالے میں نہایت جرأت کے ساتھ عادت پر تنبیہ کی گئی تھی۔ رسالے میں حکومت کی پالیسی پر بھی کڑی تنقید کی تھی۔ انہوں نے ہندوستانیوں کو سرکاری مشینری کی ان کونسلوں میں شامل نہ کرنے کی بھی شدید مذمت کی جو ہر سطح پر پالیسیاں مرتب کرتی تھیں۔ انہوں نے یہ بات واضح کر دی کہ اگر حکومت نے ایسی کونسلوں میں ہندوستانیوں کو شامل نہ کیا تو حکومت کا استحکام خطرے میں پڑ جائے گا نیز ضابطوں اور قوانین کی تشکیل میں ہندوستانیوں کو حجت تک شامل نہ کیا جائیگا حکومت یہ کہے جان سکے گی کہ ہندوستانی کیا چاہتے ہیں اور کسی قانون یا ضابطے کے بارے میں ان کا رد و عمل کیا ہے۔ انہوں نے کھلے الفاظ میں کہا کہ حاکموں اور رعایا کے درمیان فی الوقت کوئی ربط موجود نہیں۔ سرسید احمد خاں کے اس رسالے کی اشاعت پر انگریزوں نے زبردست احتجاج کیا اور بیان تک مطالبہ کیا کہ اس 'توہینِ آمیز' رسالے کو ضبط کیا جائے نیز سرسید احمد خاں کو اس گستاخی کی سخت سزا دی جائے۔

ہندوستان میں جا بجا عیسائی مشنریاں کام کر رہی تھیں۔ جب ۱۸۶۰ء میں زبردست گھٹ پڑا تو ان مشنریوں نے لاتعداد مسلمان اور ہندو یتیم بچوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ان کا مقصد رحم کرنا تھا نہ انسانی بھروسہ! بلکہ مکرمہ مقصد یہ تھا کہ ان بچوں کو مسلمان یا ہندو سے عیسائی بنادیا جائے۔

سرسید احمد خاں نے خود چار یتیم بچوں کو لے کر پالی لیا تھا جو بعد ازاں اُن سے چھین لئے گئے سرسید نے مطالبہ کیا کہ ان یتیم بچوں کی پرورش ہندو یا مسلمان گھرانوں میں ہونی چاہئے لیکن اقتدار کے نشے میں چر کر انگریزوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ واسرائلے کی کونسل میں 'اسباب بنادت ہند' کہنے پر سید احمد خاں کو مزادینے کا مطالبہ تو پہلے ہی کیا جا چکا تھا لیکن یتیم بچوں کے بارے میں اُن کے طرز عمل نے انگریزوں کے تنہا بن میں آگ لگا دی۔ جہاں تک مسلمانوں اور ہندوؤں کو عیسائی بنانے کا تعلق تھا تو انگریزوں کی دیدہ دلیری کا اندازہ ایٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیرمین میگل کی پارلیمانی تقریر سے ہوتا ہے اس نے کہا،

”خدا کے فضل و کرم سے انگلستان کی حکومت کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ پورے ہندوستان پر فتح کا پرچم لہرائے۔ یسوع مسیح کا پرچم آج ہندوستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک لہرا رہا ہے لہذا ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہندوستان ایک ایک شخص کو عیسائی بنانے کے لئے پوری قوت صرف کریں۔“

۱۸۵۹ء میں جب سید احمد خاں مراد آباد تھے تو اُن کی شریک حیات انتقال کر گئیں۔ گو اس وقت سرسید کی عمر چالیس برس سے کچھ اوپر تھی لیکن مسلمانوں کے لئے دن رات محنت نے اُن کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مسلمانوں کو بدلتے ہوئے دھاروں اور حالات کے نئے تقاضوں کا ساتھ دینا ہی پڑے گا اور اپنے منفی رویہ کو ترک کرتے ہوئے جدید تعلیم حاصل کرنا پڑے گی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جب تک مسلمان ایسا نہ کریں گے وہ ہندو کے مقابلے میں ایک مردہ قوم بن کر رہ جائیں گے۔ ۱۸۶۴ء میں جب اُن کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تو انہوں نے سب سے پہلا نعرہ یہ لگایا ”تعلیم، تعلیم اور تعلیم“ ایک بار انہوں نے معروف محقق جی آلاٹاسے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ساقی اور سیاسی پمپا خگی کو ختم کرنے کے لئے واحد علاج یہ ہے کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں۔ جب تک ہم جڑ کا علاج نہیں کریں گے، رخت سرسبز نہیں ہو سکتا۔

۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ اردو کے فارسی رسم الخط کو منسوخ کر دیا جائے

دیوناگری رسم الخط کو اپنایا جائے۔ اس کے بعد ہی سے سانی-نازہ زور پکڑ گیا۔ سرسید احمد خاں نے اردو کی پُرورش حمایت شروع کر دی۔ اسی موقع پر انہوں نے اپنے ایک اشریف دوست شیکسپیر کے اضع الفاظ میں کہا،

’مجھے یقین ہو چکا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمان دونوں قومیں ایک مقصد کے لئے کسی شے پر بھی مل جل کر کام نہیں کر سکتیں، اس وقت ان دونوں میں کسم کھد عداوت ہیں، لیکن نام نہاد تعلیم یافتہ لوگوں کی وجہ سے مستقبل میں لاتعداد پیپیڈیاں پیدا ہونا لازمی ہیں۔“

ہندوؤں کے اس رویہ پر ۱۹ اپریل ۱۸۶۰ء کو تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے نواب محسن الملک کو لکھا،

ہندوؤں کے سانی مطالبے کی وجہ سے مسلم ہندو اتحاد ناممکن ہو گیا ہے۔ مسلمان ہندی کو اپنا سنے پر کبھی رضا مند نہیں ہو گا اور اگر ہندو کا یہ مطالبہ جاری رہا تو ایک دن ہندوؤں کو قطعی طور پر مسترد کر دے گا جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک دن ہندو اور مسلمان مکمل طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں گے۔

۱۸۶۹ء میں سرسید احمد خاں انگلستان چلے گئے۔ آئندہ سال ہندوستان واپسی پر انہوں نے مسلمانوں کے لئے دن رات کام کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ایک رسالہ ’تذیب الاخلاق‘ جاری کیا۔ اس رسالے کے ذریعے مسلمانوں کے اندر قبیح رسومات کے خلاف جہاد شروع کیا گیا تھا۔ کچھ سرسید احمد خاں کا دہائی سنا آڑے آیا اور کچھ نام نہاد مذہبی رہنماؤں اور مریوں کو موقع ملا۔ انہوں نے سرسید پر کافروں اور محمد جھٹے کا فتویٰ جاری کر دیا۔ ۱۸۶۸ء میں امپیریل میسلیٹو کونسل اور تعلیمی کمیشن میں بطور رکن نامزدگی کے بعد ۱۸۸۲ء میں سرسید احمد خاں نے لدھیانہ میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا،

’یاد رکھئے کہ مسلمان قوم صحیح قوم کھلانے کی مستحق ہے کہ تمام افراد متحد ہو کر اسلام کی رسی کو منسوبی سے بکڑ لیں۔ جب تک وہ اپنے مذہب پر سختی سے عمل پیرا رہتے ہیں، ایک قوم ہیں۔ آپ کو اسلام نے لئے زندہ رہنا اور اسلام کے شے مرنے ہے۔ جب تک ہم میں اسلامی عقائد راسخ نہیں ہو جاتے ہم قوم کھلانے کے مستحق قرار نہیں پاتے۔ کوئی کچھ بھی ہو، لیکن اگر وہ مسلمان نہیں تو ہمیں ان سے کیا، وہ ہماری قوم کافر تو نہیں ہے۔ لہذا یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ حلق

قوم کی فلاح اسلام کا پرچم بلند رکھنے ہی میں ہے۔“

۱۹۵۵ء میں سرسید احمد خاں نے سیمبلٹو کونسل میں چوبش تقریر کرتے ہوئے کہا: اکثریت اور اقلیت کی بنیادوں پر انتخابات تو اسی ملک میں ممکن ہو سکتے ہیں جہاں ایک نسل کے ہم عقیدہ لوگ رہتے ہوں۔ لیکن ہندوستان کی طرح جس ملک میں مختلف نسلیں آباد ہوں، جہاں مذہبی تخصیص عروج پر ہو، جہاں ذات پات کا امتیاز موجود ہو، جہاں جدید طرز تعلیم، آبادی کے مختلف طبقوں میں یکساں تناسب کا سائل نہ ہو، میں پورے وقت کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ نوکل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں میں مختلف مفادات کے نمائندوں کی انتخاب کے اصولوں پر نمائندگی کا صرف یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ لاتعداد برائیاں اور بدعنوانیاں پیدا ہو جائیں گی جب تک ہندوستان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں نسلی اختلاف اور ذات پات کے امتیاز کی اہمیت موجود ہے، انتخابات کا یہ عام اور سادہ طریقہ کار ہی سرکاری محفوظ انداز میں اپنایا نہیں جاسکتا۔“

اب سرسید احمد خاں نے اپنی تمام کوشش اس بات پر صرف کر دی کہ کسی طرح مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم کر دیا جائے۔ جب ۱۹۵۵ء میں انٹرنیشنل کانگریس کی تنظیم ہوئی تو یہ اس وقت ملک میں اپنی نوعیت کی واحد سیاسی جماعت تھی، تو کچھ مسلمانوں نے جس کی کیفیت اعتبار کر لی سرسید نے اسے مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی تصور کیا انہوں نے ایک تقریر میں کہا:

”ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ہندو اور بنگالی بھائی ہماری قوم کو کسی نہ کسی انداز میں نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہم یہ کیسے سوچنا سکتے ہیں کہ ان کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کئے رکھیں۔ ہمیں اپنے اس فرض کی ادائیگی میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہمیں اپنی قوم کو ہندوؤں اور بنگالیوں کی معاون سرگرمیوں سے ہر قیمت پر بچانا ہے۔ کانگریس کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ وہ پورے ہندوستان کی نمائندہ سیاسی جماعت ہے ہم اسے ’قومی کانگریس‘ ماننے کے لئے تیار نہیں

یہ تو جی ممکن ہو سکتا ہے کہ کانگریس میں تمام قوموں کے مفاد واضح طور پر شامل ہوں۔ جب کانگریسی رہنما اس بات کو خود تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے کچھ مفاد نہ صرف مختلف ہیں بلکہ متضاد بھی — تو پھر کیا وجہ ہے

کہ ہم مسلمان ایک ہی عہد کا گریب کی تفکیک علیحدہ متادے لئے نہ کریں؛ لہذا  
 سارے کانگریسی دوستوں کو خود ہی یہ فیصلہ ایماذاری کے ماتو کر لینا چاہئے کہ  
 کیا ایسی قوم جن کے متاعدا ایک دوسرے سے متعارف و متصادم ہوں، خود  
 چند عام سی باتوں پر ان میں اتفاق بھی موجود ہو۔ ایک قومی کانگریس تفکیک کر سکتی ہیں  
 میری اس بات کو درست سمجھا جانے یا غلط، لیکن یہ کھلی حقیقت ہے کہ کوئی مسلم  
 خواہ وہ ایک معزز شخص ہو یا ایک پارچہ پات، وہ یہ بات کبھی پسند نہ کرے کہ  
 اس کی ہمایہ قوم اسے غلام بنائے۔ اسے اس بات کی بھی پروا نہیں ہوگی کہ وہ  
 کون سا قوم کی حیثیت پر چلے ہے۔ وہ ہر حال آزادی کو ترجیح دے گا۔

سر سید احمد خاں نے ۱۸۹۳ء میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان  
 کے مسلمان اٹوٹین نمیشنل کانگریس کے ذریعے کبھی سیاسی سلاستی حاصل نہیں کر سکتے۔ انہوں نے  
 کانگریس کو صاف طور پر بتا دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو سکھ، مدرسی اور مرہٹہ نہ سمجھیں ورنہ برہمن  
 نے یہ ایک خطرناک ٹنگون ہوگا۔ کانگریس اگر یہ سمجھتی ہے کہ یہ مسلمان خیان، عاریہ زندگی، سرتا  
 دیو، نے، فقبارتے وہی ہیں جو ہندو باسکھ، مدرسی اور مرہٹہ۔ تو یہ اس کی قبول ہے کانگریس  
 کے لئے مسلمانوں کی تاریخی روایات کو، یکھنا ضروری ہے۔ اسے یہ اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ  
 کہ ہندوستان میں وہ بڑی قومیں آباد ہیں ان میں ایک ہندو اور دوسری مسلمان! آپ نے کہا،  
 "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر کل انگیز ہندوستان چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو ہندوستان  
 کا حکم کون ہوگا؟ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ مساوی اختیارات کے تحت ہندو  
 اور مسلمان ایک ہی حقبت حکومت پر ساتھ ساتھ بیٹھ کر حکومت کریں گے؟ میں ذوق سے  
 کہہ سکتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ ضروری ہو جائے گا کہ ہندو یا مسلمان دونوں میں  
 کوئی ایک، دوسرے پر غلبہ حاصل کرے۔"

۲۶ دسمبر ۱۹۰۰ء کو سر سید احمد خاں نے بنارس میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے

SOCIETY FOR EDUCATIONAL PROGRESS OF THE INDIAN MUSLIMS

کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی۔ لہذا ان اسی انجمن نے علی گڑھ میں محمدن ایٹھکوار نیل ساج  
 قائم کیا۔ سرکاری انتظامیہ نے اس سلسلے میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کیں اور بڑی مشکل کے بعد  
 اس کالج کے لئے زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا حاصل کیا جاسکا۔ اس کالج نے جون ۱۹۰۱ء میں کام شروع

کر دیا۔ ایک سال بعد جب سر سید احمد خاں ریٹائر ہو گئے تو ان کے لئے ایک عمارت کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ اس عمارت کو "سید احمد خاں" کے نام پر رکھا گیا۔ یہ عمارت ۱۸۹۷ء میں مکمل ہوئی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں جدید تعلیم کا شعور پیدا ہوا۔ آخر کار سید احمد خاں نے ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کی آواز گھر گھر پہنچانے کے لئے "محکم الدلیلات" کاغذ شائع کیا۔

۱۸۹۳ء میں انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کی خاطر "محکم الدلیلات" کے نام پر "سید احمد خاں" میں اتنی جرأت تھی کہ نہ صرف انہوں نے "سبب بغاوت" ہندوؤں کو دیا بلکہ "سبب جنگ" میں مارشل لا نافذ تھا بلکہ وہ اگر وہ دربار سے بطور احتجاج اس وقت واک آؤٹ بھی کر گئے جب انہوں نے دربار میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے انگریزوں کے مقابلے میں نشستوں کا قوانین میں امتیازات کا ذکر کیا۔

در سید احمد خاں ۲۴ مارچ ۱۹۰۸ء کو میل ہوئے۔ ۲۷ مارچ کو ان کی حالت بگڑ گئی اور اسی رات تحریک آزادی کے پیغمبر محمد نابق جنتی سے جا ملے۔

## نواب محسن الملک

۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء

نواب محسن الملک (سید محمد علی) ۱۹ دسمبر، ۱۸۳۷ء کو اٹاروا میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت نہایت اچھے ماحول میں ہوئی۔ لیکن وہ اپنی اس خواہش کے باوجود کہ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں، مالی حالات کی غرابی کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ حالات کا تعاضا یہی تھا کہ ملازمت اختیار کر لیں۔ ابتدا میں انہیں صرف پانچ روپے ماہانہ پر ملازمت ملی۔ ان دنوں سرکاری ملازمت کی ابتداء میں بھی تنخواہ بڑھارتی تھی۔ کئی سال کے تجربہ کے بعد یہ مشاہدہ دس روپے کر دیا جاتا تھا۔ محسن الملک ایک افغان، دیانت دار اور محنتی شخص تھے۔ وہ دفتری اوقات کے بعد بھی اکثر کام کرتے رہتے۔ ان کی محنت سے متاثر ہو کر کلکٹر نے تنخواہ بڑھا دی۔ کچھ عرصہ بعد انگریز کلکٹر نے ان کے کام سے خوش ہو کر انہیں "سرشتہ دار" کے عہدہ پر ترقی دے دی۔ ۲۴ سال کی



اس وقت سرکاری سرکاری اور چارٹرڈ اسکولوں کی تعداد کم تھی۔ اسی دوران  
 میں سرکاری اسکولوں کی تیاری کرتے رہے۔ ۱۸۶۶ء میں انہوں نے اس امتحان  
 میں حصہ لیا اور انہیں مرزا پور کا ڈپٹی کمشنر بنا دیا گیا۔ انہیں ۳۴ روپے ماہانہ تنخواہ  
 ملا۔ سال بعد جب قحط پڑا تو انہوں نے سرسید احمد خاں کی طرح قحط زدگان اور یتیم بچوں کی  
 خدمت میں مصروف رہے۔ اپنے اعلیٰ عہدے کی وجہ سے نواب محسن الملک خاں نے ان پر  
 نواب خاں سے تحائف بھیجے تھے۔ سرسید احمد خاں نے حیدر آباد دکن کے نواب  
 صاحب سے سن الملک کی سفارش کی۔ اس پر نواب سالار جنگ نے سرسید احمد خاں کو  
 ایک تھیں بیگ وقت وہ ملازمتیں کیسے کر سکے گا؟ انہوں نے دو حکومتوں کا وفاق بھی نہیں  
 دیا۔ لہذا بہتر یہ ہو گا کہ محسن الملک برطانوی ملازمت سے استعفیٰ دے کر ہماری ملازمت میں  
 پہنچے۔ ۱۸۷۲ء میں محسن الملک نے استعفیٰ دے دیا اور نظام کی ملازمت میں چلے گئے ،  
 جہاں انہوں نے ۲۲ سال تک خدمات سرانجام دیں۔ اسی ملازمت کے دوران انہیں منیر نواز جنگ  
 اور نواب محسن الدولہ، محسن الملک کے خطابات سے فوارا گیا۔ ۱۸۷۷ء میں انہوں نے ریاستی  
 امور کے سلسلہ میں افغانستان کا دورہ کیا جہاں انہوں نے جدید طرز تعلیم کا جائزہ بنظر غائر لیا اور یہ  
 فیصلہ کر لیا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم کے ذریعے باعزت مقام دلائیں گے۔ ۱۸۹۳ء میں  
 وہ ریاست حیدر آباد کی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے اور علی گڑھ کی درس گاہ کی خدمت کر کے  
 سرسید احمد کے مشن کو پائیدار بنانے کی خاطر مستقل طور پر علی گڑھ میں قیام کر لیا۔  
 پانچ سال بعد سرسید احمد خاں وفات پا گئے۔ ان کے صاحبزادے سید محمود نے  
 محمدن ایگلز اور نیل کالج کا انتظام و انصرام سنبھالا۔ نواب محسن الملک نے ان کی بھرپور اعانت  
 کی۔ سرسید کے بعد انہیں مسلم ایجوکیشنل کونفرس کا سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ چنانچہ محسن الملک ہندوستان  
 کے طوفانی دوروں پر نکل گئے یہ انہی کی مساعی تھیں کہ یہ کانفرنس تعلیم کے میدان میں ہندوستان  
 کے مسلمانوں کی ترجمان بن گئی۔ ۱۸۹۹ء میں جب کانفرنس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا تو  
 یہ فیصلہ کیا گیا کہ ملک بھر کے تمام بڑے شہروں میں مسلمان مدارس قائم کئے جائیں۔ اس فیصلے کے  
 نتیجہ میں بہت سے سکول کھول دیئے گئے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مختلف صوبوں میں اردو اور ہندی کے مسئلہ پر شدید بحث کا  
 آغاز ہو گیا۔ اس جھگڑے میں بہت سے متعصب انگریزوں نے بھی اردو کے خلاف اور ہندی

کے حق میں بات کرنا شروع کر دی۔ اس موقع پر نواب محسن الملک تاجی و موآقب کی پروا کئے بغیر اردو کے حق میں میدانِ عمل میں اتر آئے۔ ۱۸۔ اگست ۱۹۰۰ء میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام گفتگو میں کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ محسن الملک نے اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

”ہم یہ مانتے ہیں کہ ناخواندگی کی وجہ سے ہمارے قلم میں طاقت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ سرکاری دفاتر میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں لیکن ہمارے پاس تلوار کی طاقت موجود ہے اور ہمارے دلوں میں ملک کے لئے محبت بھی موجود ہے۔۔۔۔۔ ہم ایک منٹ کے لئے بھی یہ تصور کرنا پسند نہیں کرتے کہ حکومت یہیں نظر انداز کر دے اور ہمارے لئے ایسے حالات پیدا کر دے کہ ہماری زندگی حزن و ملال سے دوچار ہو جائے۔ مجھے امید نہیں کہ حکومت ہماری زبان کو مرنے کی اجازت دے گی۔ میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری زبان کبھی نہیں مر سکتی۔ اگر کسی نے ہمارے لئے ایسی سانی مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی تو مستقبل میں اس کے نتائج خوشگوار نہ ہوں گے۔ یہی مددِ غوث ہے جس کے باعث ہم نے اپنی زبان کو زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور اگر خدا نخواستہ ہیں ایسا کرنے میں ناکامی مونی تو ہم اردو کا جنازہ خاموشی کے ساتھ اٹھا کر نہیں لے جائیں گے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب کسی قوم پر غم کا کوئی پہاڑ ٹوٹا ہو تو اس قوم کے افراد کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے کسی کوشش کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔“

علی گڑھ کالج کے حالات دن بدن خراب ہو رہے تھے۔ طلباء کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس نازک موقع پر محسن الملک سے درخواست کی گئی کہ وہ کالج کے سیکریٹری کا عہدہ سنبھال لیں۔ کالج کے ایک ہندو اکاؤنٹنٹ نے کالج کے فنڈ میں بنین کر کے مالی حالت کو شدید صدمہ پہنچایا تھا۔ محسن الملک نے یہ اعزازی عہدہ قبول تو کر لیا لیکن اب ان پر بھاری ذمہ داریاں آن پڑی تھیں۔ انہوں نے پورے ہندوستان کا طوفانی دورہ کیا اور علی گڑھ کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس کام میں انہیں قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے ان عمار اور

اور موبیوں کو تاجر کرنا شروع کیا۔ جنہوں نے سرستید احمد خاں پر کفر اور الحاد کے فتوے صادر کر کے علی گڑھ کے مدرسہ کو ایک لادینی درس گاہ قرار دیا تھا۔ محسن الملک نے چوٹی کے علماء کو علی گڑھ مدعو کیا اور انہیں کالج کے طرزِ تعلیم کا مشاہدہ بہ نفسِ نفیس کرنے کی دعوت دی۔ ان کے اس اقدام سے

علماء کی حمایت مٹوان ایکویشنل کانفرنس کے لئے وقت جو کر رہ گئی۔ پیٹنگ نظری کی جگہ ورسس گاہ کی حمایت نے حاصل کر لئے۔ محسن الملک نے پرنس آف ویلز (بعد ازاں کنگ جاسٹینم) کو ۱۹۰۶ء میں ان کے دورہ ہندوستان کے وقت علی گڑھ مدعو کیا۔ پرنس آف ویلز کی آمد سے عین دن پہلے پرنس آغا خان علی گڑھ پہنچ گئے تھے تاکہ تمام انتظامات بطریق احسن کئے جاسکیں۔ اس کے بعد پرنس آف ویلز کے نام پر ایک سائنس سکول بھی قائم کر دیا گیا۔ اس سکول کی عمارت کے لئے بیٹی کے سر آدم جی پیر بھائی نے ایک لاکھ روپے اور نرائیٹس آغا خان اور راجہ محمود آباد نے ۷۰ ہزار روپے دیئے۔ ۱۶ جنوری ۱۹۰۷ء کو امیر حبیب اللہ خاں شاہ افغانستان نے علی گڑھ کالج کا معاہدہ کیا۔ اس موقع پر پیچیم اہل خاں اور مولانا حالی بھی موجود تھے۔ نجی گفتگو کے دوران شاہ افغانستان نے فراب محسن الملک کو بتایا کہ انہوں نے کالج کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ اس میں کچھ اچھی اور کچھ بُری باتیں شامل ہیں۔ لیکن حضرت علیؑ نے فرمایا تھا کہ سچ اور جھوٹ کے درمیان صرف چار انگلیوں کا فاصلہ ہے۔ یعنی وہ فاصلہ جو کانوں اور آنکھوں کے درمیان ہے۔ میں نے صرف سنا ہے اور اب میں آنکھوں سے دیکھوں گا۔ اس کے بعد شاہ افغانستان نے کالج، لائبریری اور ہوش کا معاہدہ کیا۔ انہوں نے طلبہ سے بہت سی مشکل سوالات پوچھے جو اسلامیات سے متعلق تھے۔ لوگوں کے جواب سن کر شاہ کو سخت حیرت ہوئی۔ اپنے دورے کے اختتام پر شاہ افغانستان نے بلاجمک اس خیال کا اظہار کیا کہ انہوں نے جو کچھ سنا تھا وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو انہوں نے دیکھا علی گڑھ کے بارے میں انہیں جو کچھ بتایا گیا تھا وہ جھوٹ اور صرف جھوٹ تھا۔

کالج کے لئے روپے کی کڑاہی کی غرض سے محسن الملک رنگون بھی گئے۔ انہوں نے وہاں رہنے والے ہندوستانی مسلمانوں سے اپیل کی۔ تو یہ ایک سادہ قیام کے دوران رنگون کے مسلمان اور دولت مند اجروں سے انہوں نے بھاری رقم اکٹھی کر لی۔

جس سال سر سید احمد خاں نے مٹھون ایکویشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس میں شریک نہ ہوں، اسی سال کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت جنٹس بدرالدین طیب جی نے کی تھی۔ طیب جی نے سر سید کی اپیل کو نہ صرف کانگریس کے رکن مسلمانوں بلکہ اپنی توہین بھی قرار دیا۔ اُس دن کے بعد سے طیب جی نے علی گڑھ پر کڑوی کیسی تنقید کی ہم چلا دی تھی۔ سر سید کی وفات کے بعد محسن الملک بیٹی گئے اور جنٹس طیب جی سے اس معاملے پر طویل بات چیت کی۔ وہ کامیاب رہے اور طیب جی کو ہم نوا بنایا۔ نتیجہ

یہ نکلا کہ ۱۹۰۳ء میں طبیب جی نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔ اس موقع پر انہوں نے کہا کہ بمبئی میں یقینی طور پر اردو پورے ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا مسلمان ہو جو ملی گڑھ کے استحکام اور کامیابی کا خواہاں نہ ہو۔

سر اینتھونی میکڈونلڈ، جو صوبہ ہائے متحدہ کا گورنر، ہندی کا طوط دار اور اردو کا بدنام نہیں اور بدترین مخالف تھا۔ اپنے دور میں اردو کے خلاف بحیرہ روم بم چلا رہا تھا۔ اس نے سرکاری طور پر ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو یہ حکم جاری کیا کہ صوبہ میں اردو کو جو حیثیت حاصل ہے اسے ختم کر دیا جائے۔ ہندو یہ خبریں سن کر نفی میں بجا رہے تھے۔ اسی لئے ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے اعتماد کو مزید صدمہ پہنچا۔ محسن الملک نے فوری طور پر اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی تاکہ اردو کو تباہ ہونے سے بچایا جاسکے۔ ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء کو ملی گڑھ میں فواب آف چٹناری کی زیر صدارت پہلا اجتماعی اجلاس ہوا۔ متعصب اور کمینہ صفت گورنر نے اسے بھی اپنی توہین سمجھا اور چھوٹے ہتھکنڈوں کے ذریعے مسلمان رہنماؤں پر دباؤ ڈالا کہ وہ ایسوسی ایشن سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ کچھ مسلمان تو گورنر کے دباؤ میں آ گئے۔ لیکن فواب محسن الملک جیسے جرات مند مسلمان رہنما اردو کی حمایت میں اور نیا دہ سرگرم عمل ہو گئے۔ اجتماعی جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا آخر کار گورنر نے ملی گڑھ کالج کے ڈسٹریکٹ کا فوری اجلاس طلب کیا۔ اس نے خطاب کرتے ہوئے دھمکی دی کہ اگر اجتماعی جلسوں کا سلسلہ فوراً ختم نہ کیا گیا تو مسلمان رہنما سنگین نتائج کے لئے تیار ہو جائیں۔ کالج کے ٹی سرکاری مافی امداد بھی بند کر دی جائے گی۔ اس کے بعد بھی گورنر نے بہت سے اچھے ہتھیار استعمال کئے۔ محسن الملک سے ملاقات سے انکار کر دیا اور یہ کہلا بھیجا کہ وہ جو بات مل کر کرنا چاہتے ہیں، کھڑے بھیجیں۔ انگریز گورنر نے خط و کتابت میں اس حد تک پست ذہنیت کا مظاہرہ کیا کہ خط کا آغاز ان کے خطابات کی بجائے ”مولوی ہندی علی“ سے کیا۔ ان حالات میں محسن الملک نے یہی مناسب خیال کیا کہ وہ اس گورنر کے تبدیل ہوجانے تک خاموش رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی اور تابیت ہو شیاری سے کام لیتے ہوئے مرتضیٰ حس آرٹھ کو انجمن کا پہلا چیرمین چھی لیا۔

## مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب

۱۹۰۶ء میں سیاسی شعور کھنے والا برہمنہ یہ جانتا تھا کہ انڈین لیسیلیٹو کونسلوں کے انتخابات

مخلوہ صورت میں ہوں گے۔ محسن الملک نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہا اور پھر کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح وائسرائے کو مسلمانوں کے لئے وکیل باڈیوں اور کونسلوں میں جدانگاہ نشستوں پر آمادہ کیا جائے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کے لئے علیحدہ نشستیں مخصوص نہ تھیں۔ انیس عام ملتے ہوئے انتخابات میں ہی مقابلہ کرنا ہوتا تھا جس میں ہندوؤں کا غلبہ تھا جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ہر صوبہ میں اور مجموعی طور پر پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو تعداد کے اعتبار سے غائبانہ کی ذمتی اور ان میں بھی اکثر ہندوؤں کے دباؤ اور اثر و رسوخ میں آجاتے لہذا محسن الملک نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکریٹری کے ساتھ علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرچی بوڈ کی وساطت سے اس مسئلے پر خط و کتابت شروع کر دی۔ وائسرائے نے مسلمانوں کے ایک وفد سے شملہ میں ملاقات کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ مسلمانوں نے جدانگاہ انتخابات کے مطالبات کے سلسلہ میں ایک یادداشت تیار کی جسے ۱۶ ستمبر ۱۹۰۶ء کو مسلم رہنماؤں نے فٹو کے ایک اجلاس میں سر عبدالرحیم کی زیر صدارت قرار داد کی صورت میں منظور کیا۔ سر آغا خاں کی قیادت میں ۲۶ مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد تشکیل کیا گیا۔ یہی وفد بعد ازاں شملہ وفد (SIMLA DEPUTATION) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس وفد کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور پھر مارلے فٹو اصلاحات کے ذریعے مسلمانوں کے لئے جدانگاہ انتخابات کا اصول منظور کیا گیا۔

دب مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ سیاسی تنظیم کا وقت نزدیک آگیا تھا۔ ۲۰۔ دسمبر ۱۹۰۶ء کو اس موقع پر جب مسلم لیجو کیٹشل کانفرنس کا سالانہ اجلاس دعاکہ میں منعقد ہو رہا تھا۔ مسلمان رہنماؤں کا ایک خاص اجلاس منعقد کیا گیا اور نئی سیاسی جماعت کے قیام کی تجویز منظور کر لی گئی پھر محسن الملک اور قار الملک سے نئی مسلمان سیاسی جماعت کا مستودہ آئین تیار کرنے کی درخواست کی گئی۔ برطانوی نرس آغا خاں کو اس کا مستقل صدر منتخب کر دیا گیا۔

## مسلم لیگ کا قیام

پھر اس جماعت کا قیام عمل میں آیا جسے مسلم لیگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جو ہندوستان کے مجبور اور بے بس مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور حصول پاکستان کی بنیاد بنی۔

۱۸۸۸ء میں نواب محسن الملک کی صحت خاصی گر چکی تھی۔ وہ علاقے کے لئے انگلستان بھی گئے لیکن مستطاب نہ ہو سکے۔ ستمبر ۱۹۰۶ء میں وہ اس غرض سے شملہ چلے گئے کہ ان دنوں ہندوستان کے لئے

نیا آئین زیر غور اور زیر بحث تھا۔ اسی آئین پر ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار تھا۔ ہذا یہ ضروری تھا کہ اس موقع پر ایک ایک لمحہ پر کڑی نظر رکھی جاتی۔ وہاں نواب محسن الملک نے اعلیٰ افسروں اور وائسرائے کو ہندوستانی مسلمانوں کا نقطہ نظر سمجھانے کے لئے انتخاب کام کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہی دنوں کی محنت شاقہ کے باعث ان کی صحت مزید گری گئی۔ اوائل اکتوبر میں وہ صاحبِ فرانس ہو گئے۔ آخر تحریک آزادی کا یہ انتخاب مجاہد ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ۹ بجے شام محمود حقیقی سے جا ملا۔ وہ مجاہد جس نے اپنی زندگی کے آخری عرصہ تک مسلمانوں کی بہبود کے لئے کام کیا اور ان کے لئے ایک نایب آزاد وطن کا سنگ بنیاد رکھا۔ ان کی خواہش تھی کہ انہیں آٹھواں کے آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے مگر ان کے لاکھوں مداحوں کے اصرار پر انہیں علی گڑھ میں سپرد خاک کیا گیا۔

## جمال الدین افغانیؒ

۱۸۳۸ء تا ۱۸۹۶ء

یہ انیسویں صدی کے اس دور کی بات ہے جب یورپی ممالک مسلمانوں کے خلاف اپنے اوچھے چمکنے والوں پر اتر آئے تھے۔ وہ اسلامی ممالک پر ظہرِ حاصل کرنے کے لئے طاقت کے سلاخ و بیکڑہیتے بھی استعمال کر رہے تھے۔ انہوں نے افغانستان، ایران، ہندوستان، مصر وغیرہ کو سیاسی اور معاشی اعتبار سے اپنا غلام بنایا جو اتنا ترک کی بھی اپنے بہت سے علاقوں سے محروم ہو چکا تھا۔ دراصل مغرب کے سیاست دانوں نے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات پیدا کر دی تھی کہ قوموں کا وجود وطن سے ہوتا ہے لہذا مسلمان اسلامی وحدت سے ہٹ کر وطن کی بنا پر قومیت کا تصور لے کر چل رہے تھے، اسی لئے ان کا شیرازہ بکتر ناجار ہا تھا۔ مغربی طاقتیں چاہتی تھیں یہی تھیں۔ انہیں مسلمان ممالک کو اپنی غلامی میں لینے کے مواقع حاصل ہو گئے اور مسلمان وطن پرستی کے جذبہ نے کے تحت اصل مرکز سے ہٹ کر ایک دوسرے کی مدد کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے دور دور رہے۔ اس دور میں افغانستان میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے مسلمانوں کے عالمی اتحاد کی خاطر پوری زندگی مشکلات اور مصائب میں گزار دی۔ مغربی طاقتیں اسے اپنا بدترین دشمن سمجھنے لگیں لیکن اس کے باوجود اسی شخص نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی اور بہت سے اسلامی ممالک میں ایسی تحریکوں کی بنا ڈالی جو بعد میں آزادی پر منتج ہوئیں۔

یہ شخصیت جمال الدین افغانی کی تھی۔ آپ ۱۸۳۸ء میں جلال آباد کے قریب کوثر نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ نسباً سید حسینی تھے۔ آپ کے والد سید مقدر مشہور عالم اور عوام میں بے حد مقبول تھے۔ ایرافغانستان دوست محمد خاں ان کی مقبولیت سے خائف تھا۔ اسی بنا پر انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ اس وقت جمال الدین افغانی کی عمر صرف ۸ سال تھی۔ کابل میں انہوں نے فلسفہ، ریاضی، تاریخ، نجوم اور علوم شرعی کی تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے والد وفات پا گئے۔ جب امیر مراد اعظم خاں تخت نشین ہوا تو اس نے افغانی کو اپنا شہر خاص مقرر کر لیا۔ مگر کچھ عرصے بعد شیر علی خاں نے تخت پر قبضہ کر لیا۔

ان حالات میں افغانی نے سترے فرمانروا سے مجاز جانے کی اجازت طلب کی لیکن افغانستان میں ایران کے سفیر نے حکومت پر دباؤ ڈالا کہ افغانی کو ایران جانے یا ایران کے راستے سے گزرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اسی شرط پر افغانی کو جانے کی اجازت نہ ملی۔ وہ ہندوستان کے راستے جاز پنچے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں ان کے قیام کے دوران ان کی انقلابی سرگرمیوں کے پیش نظر ہندوستانی مسلمانوں یا رہنماؤں سے تنافی میں ملاقات کی اجازت نہ دی اور اگر کبھی اجازت مل جاتی تو ان پر ہندوستانی خفیہ تعلیم کی کڑی نظر دہتی کچھ عرصے بعد انہیں مصر جانے والے ایک سرکاری بحری جہاز میں سفر کرنے کی اجازت مل گئی۔ قاسم پینچتے ہی انہوں نے مسلمان ملا سے رابطہ قائم کیا اور عالم اسلامی کے بحران پر تبادلہ خیال شروع کر دیا۔ قاسم سے وہ مجاز چلے آئے وہاں بھی انہوں نے اسی قسم کی سرگرمیاں جاری رکھیں اور مسلمان رہنماؤں کو سمجھایا کہ وہ مغربی سامراجیت کے پنجے سے عالم اسلام کو نجات دلانے کے لئے تدارک کریں۔ وہاں سے وہ ترکی پہنچ گئے جہاں انہیں وزیر اعظم ترکی علی پاشا نے خوش آمدید کہا۔ چھ مہینے قیام کے دوران انہوں نے اسلامی اتحاد کے سلسلے میں متعدد رہنماؤں سے مسلسل تبادلہ خیال کیا لیکن نئی نسل کے دانشوروں میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث بہت سے ترکی علماء ان کے خلاف ہو گئے۔ ان علماء نے ایک متحدہ محاذ بنا کر افغانی کو ترکی سے نکلوانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہوں نے افغانی پر کفر کا فتویٰ بھی لکھا۔ ترکی کے اخباروں نے علماء کا ساتھ دیا۔ آخر کار افغانی کو ترکی سے فوری طور پر ہٹا جانے کا حکم مل گیا۔ وہ ۱۷ مارچ ۱۸۷۱ء کو قاسم پہنچ گئے۔

اتفاق کی بات ہے کہ جاتے ہی ان کی ملاقات قاسم کے ایک وزیر یا خاص پانچاسے ہوئی اسی وزیر کی کوشش سے جمال الدین افغانی کو الازہر یونیورسٹی میں رکھ لیا گیا اور ان کے لئے مناسب

الادونس بھی مقرر کر دیا گیا۔ افغانی نے تعلیم و تدریس کے ساتھ مصر کے تعلیم یافتہ لوگوں کو دشمنوں کے پیچھے سے نجات حاصل کرنے پر بھی اسیا۔ انہوں نے اپنے طلبہ کو بتایا کہ وہ اپنے دور کے لغاتوں کے اخبار سے اسلام کی تعریف کریں تاکہ مغرب پرستوں کے ذہنوں سے یہ بات نکل جائے کہ اسلام کوئی فرسودہ مذہب ہے جو نئے لغاتوں کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ افغانی کی اس بات نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے کان کھڑے کر دیئے وہ کتب چاہتے تھے کہ مصر کے مسلمان مذہب سے قریب ہوں اور ان کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کے لئے مصری مسلمانوں کو کوئی موقع فراہم ہو۔ چنانچہ لندن سے دیابات کے تحت قاهرہ میں برطانوی قونصل جنرل نے مصر کے توفیق پاشا کے ذریعے جمال الدین افغانی کو مصر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ لاقرب ستودہ کے مطابق:

”جمال الدین افغانی پہلے مسلمان تھے جنہوں نے عالم اسلام پر مغربی استعمار کی گرفت ختم کرنے کے لئے بے خوف ہو کر کام کیا۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ کے دست پسندوں کے لئے وہ ایک بہت بڑا خطرہ بن گئے۔ خاص طور پر انگریز ان سے بے حد ناگفت تھا۔ ہندوستان میں ایک عرصہ نظر بند رہنے کے بعد وہ ۱۸۸۰ء میں مصر گئے جہاں انہوں نے یورپیوں کے خلاف اعرابی پاشا کے ساتھ مل کر مغربی سامراجیوں کے خلاف جہم چلانے کی کوشش کی لیکن جب ۱۸۸۲ء میں مصر پر انگریزوں کو غلبہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے افغانی کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔“

جمال الدین افغانی پھر ہندوستان آ گئے۔ انہوں نے حیدرآباد دکن سے ایک رسالے کی اشاعت کا آغاز کیا جس میں مغربی سامراجیت کے خلاف بہت کچھ لکھا جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد ہی افغانی کو پولیس کی نگرانی میں حیدرآباد سے کلکتہ پہنچا دیا گیا۔ برطانیہ اور مصر کی جنگ ختم ہونے تک انہیں نظر بند رکھا گیا۔ اس کے بعد افغانی نے سرسالاہ جنگ بہادر اور سید حسن بگرامی کو اپنے دائرہ عقیدت میں شامل کر لیا۔ یہ لوگ برطانوی سامراج کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے حیدرآباد، کلکتہ، بمبئی اور پٹنہ بھی گئے۔

اس کے بعد جمال الدین افغانی امریکہ چلے گئے۔ دو ماہ قیام کے بعد لندن پہنچے، پھر پیرس آ گئے۔ یہاں ان کی ملاقات مشہور انگریز سیاست دان اور مصنف ولفرڈ بلنٹ سے ہو گئی اور اس کے بعد سے دونوں میں زندگی بھر دوستی رہی۔ جمال الدین افغانی کا خیال تھا کہ اگر ہندو اور



مسلمان کا اتحاد جو بنائے تو وہ مل کر ہندوستان میں برطانوی سامراج کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں  
افغانی پریس میں تقریباً تین سال رہے۔ وہاں سے انہوں نے فرانسیسی میں ایک رسالہ نکالا۔ یہ  
رسالہ دنیا بدر کے مسلمانوں میں بے حد مقبول ہوا۔ اس رسالے کے ذریعہ افغانی نے انگریزوں کے  
خلاف جبر و جہاد کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اس پر چرچہ پڑا ہندی مانہ کر دی۔  
اس کے علاوہ فرانس کے اخبارات میں مسلمانوں کی حالت زار کے بارے میں بھی "سے دن مضامین  
لکھے رہے۔ مشہور فرانسیسی آرٹسٹ رینان نے افغانی کے بارے میں لکھا:

"بلاشبہ افغانی کے دل میں اسلام کی سچی محبت اور وہ سچائی ہے جس نے افغانی کو  
بے خوف ہو کر سامراج کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور کر دیا۔... مگر سائنسی سچائیوں  
کی تلاش اور تجسس کی وہ روح جس کا اسلام مخالف بہ مسلمانوں کو پیچھے  
لے جا رہی ہے۔"

جمال الدین افغانی رینان کی اس بات پر مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے رینان کو عوام کے  
سامنے مناظرے کی دعوت دی۔ مناظرہ ہوا اور جمال الدین افغانی نے آیات قرآنی سے یہ ثابت  
کر دیا کہ اسلام علم اور تحقیق کی مکمل حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

اس اثناء میں انگلستان کے وزیر اعظم گلیڈسٹون کی بلکہ چرچل نے لے لی تھی۔ چرچل  
افغانی کے دوست بلنٹ کے بھی دوست تھے۔ بلنٹ نے افغانی کو ذاتی مہمان کے طور پر  
انگلستان بلایا اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ چرچل سے ملاقات کر کے انہیں ان مسائل سے آگاہ  
کریں جن کی وجہ سے ہندوستان اور عالم اسلام کے ساتھ انگلستان کے تعلقات کو شدید نقصان پہنچا  
چنانچہ اس دوران افغانی او چرچل میں بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ افغانی نے پوری کوشش کی کہ چرچل کو  
ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ بہتر رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کریں لیکن سامراجی پالیسیوں اور  
عوام نے خاص اثر قبول نہ کیا۔ یہاں سے افغانی ایران چلے آئے جہاں چھ ماہ قیام کیا۔ ایران میں  
شاہ کے ساتھ ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے شاہ کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی  
کہ وہ عوام کو زیادہ سے زیادہ حقوق دیں اور ملک میں اصلاحات نافذ کریں لیکن شاہ ایران کو یہ بات  
کیونکر پسند آ سکتی تھی۔ لہذا اس نے جمال الدین افغانی کو فوری طور پر ایران سے نکل جانے کا حکم  
دے دیا۔

جمال الدین افغانی وہاں سے ماسکو پہنچے۔ انہوں نے عالم اسلام کو برطانوی استعمار

سے نجات دلانے کے لئے روس کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ دو سال تک وہاں رہے۔ اُن دنوں زار، روس کا مطلق العنان فرمانروا تھا اور کسی مسلمان کو اس کی حکم عدولی کی جرأت نہ تھی۔ جمال الدین افغانی نے زار روس سے بہت سی ملاقاتیں کیں اور خواہش ظاہر کی کہ قرآن کریم کا روسی ترجمہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس سے پہلے زار روس نے اس کی ممانعت کر دی تھی۔ لیکن افغانی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ قرآن کریم کا ترجمہ روسی زبان میں ہوا اور شائع ہو گیا۔

اس کے بعد افغانی پھر تہران چلے آئے۔ انہوں نے عوام کے حقوق کی خاطر جدوجہد کا آغاز کر دیا مگر شاہ ایران نے ان کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ انہیں گرفتار کرنے کے لئے پانچ سو سپاہی گئے۔ افغانی کو نال دیا گیا۔ انہوں نے بعبرہ میں پناہ لی۔ بعد ازاں لندن سے ایک پرچہ نکالا اور انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان کو آزاد کر دیں۔ انہوں نے ایک مضمون میں لکھا کہ دنیا بھر کے عیسائی مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ عیسائیوں کے خلاف محاذ بنالیں۔ انگریزوں نے اس رسالے کو بند کر دیا۔

۱۸۸۲ء میں ترکی کے سلطان عبدالحمید نے جمال الدین افغانی کو ترکی آنے کی دعوت دی۔ سلطان نے اُن سے بہت اچھا سلوک کیا اور ہر قسم کی آسائش مینا کی۔ مگر جمال الدین افغانی اور سلطان ترکی میں بنیادی اختلاف یہ تھا کہ سلطان عالمی اسلامی اتحاد تو چاہتا تھا لیکن اپنی قیادت میں اس کے برعکس جمال الدین افغانی، آزاد اور خود مختار مسلمان ریاستوں کی انجمن کے تحت اس

اتحاد کے حامی تھے۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف چار پلوں کے درباریوں نے سلطان ترکی کے کان بھرے بعد سلطان نے افغانی کی رہائش گاہ پر بھی پہرہ لگا دیا اور بیرونی دنیا کے ساتھ ان کا تعلق ختم کر دیا۔

جمال الدین افغانی بیسنے میں اتحاد اسلامی اور آزادی کی ترویج کے لئے زندگی بھر ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرتے رہے۔ کہیں نظر بند کئے گئے اور کہیں ان کو ملک سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن ان تمام مشکلات و مصائب اور سفر کی صعوبتوں کے باوجود افغانی جہاد میں مصروف رہے۔ آخر ان کی صحت گرنے لگی۔ وہ بتدریج پر بھی مسلمانوں کی آزادی کے لئے منصوبے بناتے رہے۔ ۸ مارچ ۱۹۰۷ء کو ۶۰ سال کی عمر میں افغانی وفات پا گئے۔

## نواب وقار الملک

۱۸۴۱ء تا ۱۹۱۶ء

نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین مراد آباد کے جوڑے سے گاؤں میں ۳۴ مارچ ۱۸۴۱ء کو پیدا ہوئے۔ ابھی ان کی طرف چھ ماہ بھی کہ والد انتقال کر گئے۔ ان کی تحسین و تربیت کی تمام ذمہ داری والدہ پر آ پڑی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ایک مقامی مکتب میں حاصل کی کچھ مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں ڈسٹرکٹ سکول میں دس روپے ماہانہ پر استاد کی ملازمت مل گئی۔ ۱۸۶۱ء میں جب ہندوستان میں قحط پڑا تو مراد آباد میں اندری کاموں کا چارٹ سرسید احمد خاں کے پاس تھا انہوں نے ہی نواب وقار ملک کو کام میں اندری کاموں پر لگایا۔ نوبی کرتے کرتے وہ علی گڑھ میں سرسید احمد کے ماتحت کام کرنے لگے۔ اسی دوران انہوں نے تحصیلداری کا امتحان پاس کر لیا اور ۱۸۶۲ء میں تحصیل دار مقرر کر دیئے گئے۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین اتھانی آزاد ہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے انگریز افسروں کا رعب یا دباؤ کبھی برداشت نہیں کیا۔ جب انگریز افسروں نے انہیں سرکاری اوقات کار میں نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں جانے کی ممانعت کر دی تو نہ صرف انگریز افسروں کو کھری کھری سنائیں بلکہ استغفی بھی دے دیا اس وقت ان کی تنخواہ ۱۰۰ روپے ماہانہ تھی لیکن اس دور میں اتنی تنخواہ سے اچھی زندگی گزاری جاسکتی تھی۔ جلد ہی کچھ نیک طبع انگریز افسروں کی مداخلت سے انہیں نماز پڑھنے کی اجازت مل گئی اور انہوں نے اپنا استعفا واپس لے لیا۔

کچھ عرصے بعد سرسید احمد خاں کا بیاد علی گڑھ سے بنارس ہو گیا۔ ان کی جگہ علی گڑھ نمبر یکے ایک اور مرگرم کارکن نواب سمیع اللہ ان کی جگہ سب سے مقرر ہوئے۔ اب نواب وقار الملک نواب سمیع اللہ کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ اس طرح دونوں کو علی گڑھ تحریک کو ترقی دینے اور مسلمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا بہترین موقع نصیب ہوا۔ ۱۸۷۵ء میں نواب وقار الملک کو حیدر آباد دکن میں ملازمت مل گئی۔ ایک سال کے مختصر عرصے میں نواب سالار جنگ، نواب وقار الملک کے اتنے گرویدہ ہو گئے کہ انہوں نے نواب وقار الملک کو وزیر انصاف مقرر کر دیا۔ وقار الملک ہیاست حیدر آباد دکن میں، سال تک ملازم رہے لیکن سر سالار جنگ اور

انگریزوں کے درمیان تنازعہ کی وجہ سے مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) نے محسوس کیا کہ وہ مقامی لوگوں کی سازشوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان مقامی لوگوں کے پس پشت بھی انگریز کی سازش کا فرما تھی۔ اسی ریاست میں انہیں نواب وقار الملک کا خطاب ملا۔ ان کی حالت یہ تھی کہ اپنی پوری مائتہ تنخواہ غریبوں اور یتیموں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اس لئے عوام میں بے حد مقبول تھے۔ ریاست کی ملازمت سے انہوں نے ۱۸۹۲ء میں استعفا دے دیا اور ۱۰ سال تک امر دہ میں رہے۔

جی دونوں ہندی اور اردو کا جھگڑا شروع ہوا، نواب وقار الملک بھی میدانِ عمل میں اُتر گئے انہوں نے اردو کے حق میں تمام کوششیں صرف کر دیں۔ متعصب انگریز اور ہندی کے حامی گورنر انتھونی میکڈاؤل سے ملاقات کی کوشش کی لیکن ہندو نواز گورنر نے ملاقات کے لئے وقت دینے سے بھی انکار کر دیا۔

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک دونوں اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے کہ اگر ہندوستان میں ایک باعزت اور باوقار قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں نہ صرف جدید تعلیم حاصل کرنا ہوگی بلکہ سیاسی طور پر بھی پوری طاقت منظم ہونا پڑے گا۔ ۱۸۸۵ء میں جب ہندوؤں نے اٹھنی ٹیکٹل کانگریس قائم کی تو چند سال بعد ۱۸۹۳ء میں سرسید احمد خاں نے محمدن ایگلو اور نیل ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کر دی تاکہ مسلمانوں کے تعلیمی اور سیاسی حقوق کا بھرپور تحفظ کیا جاسکے۔ اس ایسوسی ایشن کی تنظیم میں مسلمانوں کو تھوڑے بیک کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ محسن الملک نے ڈیفنس ایسوسی ایشن میں نئی روح پھونکنے کا عزم ظاہر کیا تو نواب وقار الملک نے ان کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔

نواب محسن الملک بوڑھے ہو رہے تھے اور اب ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ دیر تک کالج کی ذمہ داریاں اٹھاسکتے چنانچہ نواب وقار الملک نے کالج کے معاملات میں زیادہ سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۰۶ء میں جب نواب محسن الملک انتقال فرما گئے تو نواب وقار الملک کو متفقہ طور پر بورڈ کا سیکریٹری چن لیا گیا لیکن جلد ہی لڑکوں کی ہڑتال کی وجہ سے کالج کے پرنسپل تھیوڈور بیک اور نواب محسن الملک کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور متعصب انگریز گورنر انتھونی نے وہیکیاں دینا شروع کر دیں کہ وہ کالج کی مالی امداد منسوخ کر دے گا۔

اکتوبر ۱۹۰۹ء میں ایک مسلمان وفد نے ہندوستان کے وائس رے نے ملازمتوں سے ملاقات کی

ہمارے مسلمانوں کے لئے جلا کا انتخاب پر آمادہ کیا جاسکے۔ نواب وقار الملک بھی مسلمانوں کے وفد کے رکن تھے۔ ۲۰ ماہ بعد ۲۰ دسمبر کو دھاکہ کے نواب سر سلیم اللہ خاں کی صدارت میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ نواب وقار الملک نے اس اجلاس میں تعارفی تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو فوری طور پر سیاسی تنظیم قائم کرنے کے لئے کہا اور یہ بات واضح کر دی کہ اگر اب بھی وہ سیاسی طور پر منظم نہ ہوں تو نوشتہ دیوار پڑھنے کے لئے تیار رہیں۔ انہوں نے کہا کہ آج سب لوگ بن مقصد کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں، وہ کوئی بن مقصد نہیں ہندو انڈین نیشنل کانگریس قائم کر چکے ہیں اور نیشنل کے لفظ کی آڑ لے کر مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور جیشہ کے لئے ان پر منسلک حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ کانگریس کی قوت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ کانگریس سے الگ نکل کر کانگریس کو مزید تقویت نہ پہنچائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تحریک آزادی کی تاریخ کا یہ اولین اور اہم ترین باب تھا۔

نواب وقار الملک نے تقریر کے آخر میں مسلمانوں کو اقتباہ کیا کہ اگر مسلمان سیاسی طور پر منظم نہ ہوں تو انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندوان پر حکومت شروع کر دیں گے جبکہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد پانچ گنا کم ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ اپنے مذہب، معاشرت، معیشت، بائداد، آبرو اور اپنے وقار کو بچانے کے لئے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور جبراً آواز کریں۔

## مسلم لیگ کی تشکیل

اسی دن دھاکہ میں ممتاز مسلمانوں کا ایک اجلاس نواب وقار الملک کی صدارت میں منعقد ہوا اور مسلمانوں کے لئے ایک سیاسی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اس تنظیم کا نام "دی انڈیا مسلم لیگ" تجویز کیا گیا۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

یہ اجلاس جڑ دھاکہ میں منعقد ہوا اور جس میں ہندوستان کے تمام حصوں سے مسلمان شرکت کر رہے ہیں، یہ فیصلہ کرتا ہے کہ "دی انڈیا مسلم لیگ" کے نام سے مسلمانوں کی ایک سیاسی تنظیم قائم کی جائے جس کے مقاصد یہ ہیں،

۱۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں برطانوی حکمرانی کے جذبات پیدا کرنے جائیں اور اگر مسلمانوں اور انگریز حکومت کے درمیان کوئی نقطہ فحشیاں ہیں تو انہیں

دور کیا جائے۔

ب۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کے تحفظ اور نشوونما کے بارے میں حکومت کے سامنے فائیدگی کی جائے۔

ج۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اگر کبھی غیر مسلموں کے خلاف عداوت کے جذبات پیدا ہوں تو ان کی روک تھام کی جائے۔

یہ قرارداد نواب ڈاکٹر سلیم اللہ خاں نے پیش کی اور حکیم اجمل خاں نے اس کی تائید کی۔ ۱۹۱۲ء میں جب نواب وقار الملک کی عمر ۱ سال ہو گئی تو وہ خرابی صحت کی بنا پر مزید کام کرنے اور علی گڑھ کالج کی خدمات سرانجام دینے کے قابل نہ رہے انہوں نے استعفا دے دیا لیکن اس کے باوجود کالج کی بہتری کے لئے آخر دم تک کچھ نہ کچھ کام کرتے رہے۔

جب ۱۹۱۳ء میں ایک مسجد کی دوبارہ تعمیر کرنے والے مسلمانوں پر انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ٹائمر نے پولیس سے فائرنگ کرائی تو جٹاھر جو گیا۔ نواب وقار الملک نے نہ صرف مسلمانوں کو بھرپور احتجاج کے لئے بجا کیا بلکہ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک تقریر کے دوران کہا: ”اگر تم غرور اور تکبر میں آج مسلمانوں پر ٹوٹی چڑا سکتے ہو تو کل پولیس کا ایک معمولی تھانے دار بھی ٹائمر بن کر ایسے مکروہ اقدام کرے گا۔“

۱۹۱۵ء میں نواب وقار الملک کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خاں ان کی مسلسل دیکھ بھال کر رہے تھے لیکن بہتر نہ ہو سکیا۔ آخر ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء کو یہ بطلِ حریت اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ نواب وقار الملک کو امر دہر میں اُن کے آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

## سید امیر علی

۱۸۴۹ء تا ۱۹۲۸ء

سید امیر علی، سید جعفر علی خاں ڈوٹی کلکٹر کلک کے صاحبزادے تھے۔ یہ کتبہ مستقل طور پر کلک میں آباد تھا۔ امیر علی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ گھر پر انہوں نے اردو اور فارسی سیکھی۔ اور اس کے بعد پٹنلی کالج میں داخل ہو گئے۔ یہ کالج اس وقت دوستوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔

ایک جھڑ لنگو پرنشین ڈیپارٹمنٹ کھنڈا تھا جو مسلمانوں کے لئے تھا اور دوسرا ہندو نوجوانوں کے لئے مخصوص تھا۔ انہی دونوں سید امیر علی کو ممتاز عالم سید کرامت علی اور پروفیسر عبید اللہ مسیحی سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ سید امیر علی نے اس کم عمری میں سید کرامت علی کی مشہور تصنیف ”مرکز علوم“ کا انگریزی ترجمہ کیا۔ یہ ان کی سب سے پہلی ادبی کوشش تھی۔ سید امیر علی کا کنا تھا کہ اسلامی فلسفہ کے بارے میں ان کی تمام تر معلومات سید کرامت علی کی رہنمائی میں تھیں۔ ۱۸۶۶ء میں سید امیر علی نے بی۔ اے کرنے کے بعد (وہ ہندوستان میں پہلے مسلمان گریجویٹ تھے) تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ اس طرح وہ ایم۔ اے کی ڈگری لینے والے پہلے بنگالی مسلمان تھے۔ ۱۸۷۸ء میں انہوں نے خاتون کا امتحان پاس کیا اور اسی سال مزید مطالعہ کے لئے سکالر شپ لینڈ پر انگلستان چلے گئے جہاں وہ چار سال تک ایک خاتون جینیہ کے پاس مقیم رہے۔ انگلستان میں ان کے تعلقات بہت سے ممتاز انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔ اسی وجہ سے سید امیر علی کو ۱۸۷۱ء میں وہاں نیشنل انٹرنیشنل ایسوسی ایشن کی تشکیل میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس ایسوسی ایشن میں ہندوستانی بھی شامل تھے اور وہ انگریز بھی نہیں ہندوستان کے امور سے دلچسپی تھی۔ ۱۸۷۶ء میں ان کی تصنیف ”تعلیمات محمد کا عقیدہ“ شائع ہوئی۔ یہ کتاب لاتعداد انگریزوں نے پڑھی اور اس کا گہرا اثر قبول کیا۔

سید امیر علی بہت رحمدل اور غریب پرور شخص تھے۔ ان کی اس خوبی سے متاثر ہو کر آرٹسٹ گروئن نے اس رائے کا اظہار کیا تھا:

”سید امیر علی کی کوششوں سے بھوکوں کو روٹی مل جاتی ہے۔ بنگے لوگوں کو لباس میسر آ جاتا ہے۔ بیمار صحت یاب ہوتے ہیں اور ڈھیسوں کے دھم مندل ہو جاتے ہیں۔ امیر علی کی کوششوں ہی سے بہت سی ماؤں کے لال دم توڑنے سے بچ گئے۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد یورپ اور نامراد کسانوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی اور انہیں زمین اور بیج نصیب ہوا۔ یہی وہ سطور ہیں جو سید امیر علی کے مزار پر آج تک موجود ہیں۔ سید امیر علی نے بنگال کی جنگوں کی تباہ کاری کے بعد مجبور اور بے بس افراد کو بے پناہ خدمت کی اور خدمت انسانی میں کبھی تذبذب کا امتیاز نہ ہوتا۔ ترکی اور اٹلی کی جنگ کے دوران ریڈ کر اس سوسائٹی بہت خدمات سرانجام دے رہی تھی لیکن امیر علی نے محسوس کیا کہ امدادی کام کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے انہوں نے ریڈ کر سینٹ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور جنگی زخمیوں کی اتنی خدمت کی کہ بہت

سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس سلسلہ میں آغا خان نے بھی ان کا بہت ساتھ دیا۔

انگریزوں میں اسلام کو واقع طور پر متعارف کرانے اور اسلام کے بارے میں انگریزوں کے دلوں سے غلط فہمیاں دور کرنے میں ان کی سطح پر اور کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ ایک مسلمان مصنف کی حیثیت سے ان کی نظیر نہیں ملتی۔ اسلامی قوانین کے ترجمان کے طور پر عالم اسلام انہیں حرف آخر تسلیم کرتا ہے اور مسلمانوں کے مفادات کے محافظ کی حیثیت میں ساری دنیا انہیں جانتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار سید مرتضیٰ حسینی نے اپنے ایک مضمون میں کیا۔

۱۸۵۷ء میں سرسید احمد علی گلستان گئے تو وہاں سید امیر علی کے ساتھ ان کی مسلسل ملاقاتیں ہوئیں۔ ہر ملاقات میں علی گڑھ اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل زیر بحث آتے رہے۔ سید احمد خاں کا خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کے لئے جدید تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی پنپنا ممکن ہو گا جبکہ امیر علی کا خیال یہ تھا کہ بلاشبہ جدید تعلیم ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی سیاسی تربیت بھی لازم ہے تاکہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ پر آکر نئی قومیت کی لہر پیدا کر دیں۔

۷۶۔ جنوری ۱۸۷۳ء کو سید امیر علی کو بارہا بلایا گیا۔ شرکت کے بعد وہ ہندوستان لوٹ آئے اور کلکتہ ہائی کورٹ کے دکن میں شامل ہو گئے۔ ان کی پریکٹس جلد ہی چل نکلی۔ ساتھ ہی انہیں کلکتہ یونیورسٹی میں مسلم قوانین کی تعلیم کے لئے بھجور رکھ دیا گیا۔ ۱۸۷۷ء میں انہیں قائم مقام پریذیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ مقرر کر دیا گیا۔ سید امیر علی نے اتنی سہولت سزائیں دیں کہ شریف شہریوں کو ایک بار پھر امن و سکون کے ساتھ لوہے کی طرف سے بلیک میل کئے جانے کے خطرے کے بغیر کاروبار جاری رکھنے کا موقع ملا۔ وہی کلکتہ جو اب ان سے پہلے غیر قانونی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا اور جہاں حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے اب اسی کی آغوش میں تھا۔ یہ امیر علی ہی کی مساعی کا نتیجہ تھا کہ نابالغ مجرموں کے لئے جیل خانوں کی بجائے اصلاح خانے کھولے گئے جو آج تک موجود ہیں۔ پہلا اصلاح خانہ علی پور میں کھولا گیا۔ ۱۸۷۸ء سے ۱۸۷۹ء اور پھر ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۳ء تک وہ بنگال لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔ بنگال اسمبلی میں انہوں نے جو کام کیا وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ ۱۸۸۳ء میں انہیں قومی لیجسلیٹو کونسل کا



رکن بنادیا گیا۔ اس وقت اس کونسل میں صرف دو ہندوستانی رکن تھے اور وہ دونوں ہی ہندو تھے۔ امیر علی کونسل کے رکن کی حیثیت سے سید امیر علی نے قانونی اصلاحات کے لئے بہت کام کیا۔ بنگال ٹیننسی ایکٹ مجریہ ۱۸۸۵ء - (BENGAL TENANCY ACT - 1885) کی منظوری کا سہرا انہی کے سر ہے۔

۱۸۷۵ء میں کلکتہ کے ہندوؤں نے انڈین ایسوسی ایشن اور انڈیا لیگ تشکیل کر لی تھی جو بلاشبہ ہندوؤں کی تنظیمیں تھیں۔ اس موقع پر سید امیر علی پہلے شخص تھے جنہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے لئے ہندوستان کی عوامی زندگی میں باوقار طریقہ پر زندہ رہنے کے لئے اپنی متحدہ سیاسی تنظیم کی ضرورت تھی۔ لہذا انہوں نے فوری طور پر سنٹرل نیشنل محمدن ایسوسی ایشن کی تشکیل کے لئے تحریک کی۔ ۱۸۷۷ء میں ایسوسی ایشن نے کام شروع کر دیا اور سید امیر علی اس کے سیکریٹری منتخب ہوئے۔ جلد ہی ہندوستان بھر میں اس ایسوسی ایشن کی ۵۲ شاخیں کھل گئیں اور اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ سید امیر علی اس ایسوسی ایشن کے لئے ۲۵ سال تک انتخاب کام کرتے رہے۔

”ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ساڑھے پانچ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ آئیے کثیر تعداد کو اقلیت کہنا مناسب نہیں۔ گویہ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہیں لیکن ان کی قومیت، ان کی نسلی روایات، ان کا مذہب اور ان کے راستے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔“

امیر علی پہلے مسلمان تھے جنہوں نے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کی ضرورت کو محسوس کیا۔ انہوں نے ۱۸۷۷ء میں کلکتہ میں برصغیر ہندوپاک کی پہلی مسلمان سیاسی تنظیم قائم کی، ۱۸۹۲ء میں انہوں نے وائسرائے ہند کو سنٹرل نیشنل محمدن ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک یادداشت پیش کی جس میں انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے خاص غور و خوض کی اپیل کی۔ اس یادداشت میں سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مناسب نمائندگی کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔ وائسرائے ہند لاٹوڈفرن نے اس یادداشت پر غور کے بعد یہ جائز مطالبات تسلیم کر لئے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ سید امیر علی نے انتہائی مشکلات کے دنوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کی پیش باخدمات سرانجام دیں۔ امیر علی ہی کی

## پہلی مسلمان تنظیم

ہندوستان میں ایسوسی ایشن پہلی مسلمان سیاسی تنظیم تھی۔ ۱۹۰۹ء میں سید امیر علی نے ہندوستان کے سیکرٹری آف سیٹل لاؤڈھوٹے کو ایک خط میں لکھا:

قیادت میں پہلی بار بنگال میں علیحدہ مسلم قومیت کے تصور نے جنم لیا۔ سامن کمیشن کی رپورٹوں نے سید امیر علی کے اہم کردار کا ذکر خاص طور پر ملتا ہے جو انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے سلسلہ میں ادا کیا۔ ۱۸۸۴ء میں جب سید امیر علی کراچی میں تھے تو انہیں ممتاز ماہر تعلیم حسن علی آفندی سے ملاقات کا موقع ملا۔ دونوں میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کے بارے میں طویل تبادلہ خیال ہوا۔ کراچی میں تقریر کرتے ہوئے سید امیر علی نے مسلمانوں کے کہہ کہ وہ اپنی تقریر کے مالک خود ہیں۔ وہ اس اعتقاد کو ترک کر دیں کہ جو لکھا گیا ہے وہ جو کہ رہے گا۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنے بال بچوں کو فراغ دلی سے انگریزی کی تعلیم دلوائیں۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے قیام میں منٹرل ٹینٹل محمد علی ایسوسی ایشن کی سرپرستی کا بہت عمل دخل تھا لیکن جب سید امیر علی نے محسوس کیا کہ کانگریس پر ہندو غلبہ حاصل کرتے جا رہے ہیں تو انہوں نے کانگریس کے ساتھ ایسوسی ایشن کا تعلق ختم کر دیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۸۹ء میں انہوں نے آل انڈیا محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ بنگال کے تمام مدرسوں کی تنظیم نو ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے طرز پر کی جائے۔

۱۸۹۰ء میں انہیں ملکہ بائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا۔ پورے ہندوستان میں سید امیر علی دوسرے مسلمان جج تھے۔ ۱۹۰۳ء میں وہ ریٹائر ہو گئے اور مستقل طور پر انگلستان میں آباد ہو گئے۔

۱۹۰۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی لندن شاخ قائم ہو گئی اور ہرباٹس آغا خان نے سید امیر علی کو اس شاخ کا پہلا صدر مقرر کیا۔ ۲۶۔ جنوری ۱۹۰۹ء کو سید امیر علی مسلم لیگ کی لندن شاخ کی طرف سے سیکرٹری آف سیٹل برائے امور ہند لاؤڈھوٹے کے پاس ایک وفد لے کر گئے۔ وفد نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے لوکل باڈیوں اور یونیورسٹیوں میں علیحدہ نمائندگی کی بنیاد پر جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا۔ سید امیر علی نے مسلم لیگ کی لندن شاخ کو اپنی ذمہ داری اور محنت کی وجہ سے ایک نہایت فعال سیاسی تنظیم بنادیا۔ انہوں نے اس شاخ کی

طرف سے اخبارات کو بہت سے خطوط اور کتابچے روانہ کئے جن میں مختلف مسائل پر مسلمانوں کے نقطہ نظر کی ترجمانی کی گئی تھی۔ بلقان کی جنگوں اور ترکی اور اٹلی کی جنگ کے دوران انہوں نے لندن میں برٹش ریڈ کراس کمیٹی سوسائٹی قائم کی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ برطانیہ کی ریڈ کراس سوسائٹی مسلمان تنظیموں کے لئے خلوص دل سے کام نہ کر رہی تھی۔

سید امیر علی نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ لندن میں کوئی مسجد نہیں۔ نومبر ۱۹۱۱ء میں انہوں نے لندن میں مسجد کی تعمیر کا منصوبہ تیار کیا۔ اس سلسلہ میں چند جمعے کئے گئے۔ بینک آف انجینڈ میں حساب کھولا گیا اور ہزاریوں آفاغاں اور لارڈ امپتیل کو ٹرسٹی مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں سید امیر علی کو پریوئی کونسل کی ہڈیشیل کمیٹی کا رکن بنایا گیا جہاں انہوں نے مسلم قوانین کے سلسلہ میں بہت زیادہ کام کیا۔

سید امیر علی نے اسلام کے لئے جو گرانقدر خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے ”نی سپرٹ آف اسلام“، ”اسلام“، ”وین این اسلام“، ”محمدؐ لاد“، ”دی پرنسپل آف دی محمدؐ“، ”دی رائٹس آف پرسنیا“، ”اسے کنٹری آن دی بنگال ایٹ“ اور ”دی لیگل پوزیشن آف وین این اسلام“ بھی لکھیں۔ ۱۲ اگست ۱۹۲۸ء کو وہ سکس میں انتقال فرما گئے۔

## شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی نے ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے ایک متمول گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا جو ایک ممتاز وکیل اور زمیندار تھے۔ وہ اپنے شہر کی سیرنپل کمیٹی کے اعزازی سیکریٹری بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کارخانے قائم کئے لیکن دولت اور تمول کے باوجود دین سے محبت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ شبلی کے آباؤ اجداد کے بارے میں روایت ہے کہ ان کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔ جہاں تک ان میں ایک کنبہ کے اسلام قبول کرنے کا تعلق ہے تو وہ خاصا دلچسپ واقعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک بزرگ شیوراج سنگھ تھے۔ ایک روز کسی عروسی کام سے ناشترہ کئے بغیر اپنی اراضی پر جانا پڑا اگر کسی بھی بلا کی تھی پتی دوپہ میں عروسی

تو گھوڑے کی پیٹھ سے اترتے ہی سیدھے رسوئی دباورچی خانہ میں گئے مگر جوتے اتارنا بھلا لئے  
 ان کی بڑی بھانج نے دیکھا تو تنک کر بولی: تم تو بس جڑے ترک ہو گئے ہو۔ جوتوں سمیت پانے  
 رچو لسا، پرچلے آئے۔ سارا بھوجن دکھانا، بھرٹ نہو گیا۔ شہنشاہ راج سنگھ کو نہ جانے کیا سوچھی۔  
 بے ساختہ جواب دے دیا: اگر ترک ہونے کا طعنہ ہے تو ہم ترک ہی ہو کر دکھاتے ہیں۔ یہ کہہ کر  
 وہ اسی وقت کھانا کھاٹے بغیر مسجد موضع خانقاہ گئے اور اسلام قبول کر لیا اور ان کا اسلامی نام  
 سراج الدین رکھا گیا۔

مولانا شبلی نے جنم لیا تو خوشی میں شہر بھر کی دعوت کر دی گئی جو سات روز تک جاری رہی۔  
 خیرات عام ہوئی اور پھر ان کا بچپن بے پناہ ناز و نعم میں گزرا مگر شبلی کے والد کی دوسری شادی  
 کے باعث ان کی والدہ دیگر رہنے لگیں جس کا شبلی کو شدید صدمہ تھا۔ اسی لئے گھر کا ماحول بھی خاصا  
 بدل چکا تھا۔ کہا ہی جاتا ہے کہ ان کی دوسری والدہ نہایت نیک، فیاض اور فرائد خاتون تھیں  
 مگر اس کے باوجود یہ گھر ان کو محبت نہ دے سکا۔ خود شبلی نے زندگی میں صرف ایک بار سوتیلی  
 والدہ سے بات کی۔ اسی لئے والد کے ساتھ بھی شبلی کے رویے میں گہری تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔  
 جب شبلی بغرض تعلیم لاہور آئے تو انہوں نے دس روپے میں دو ماہ گزار دیئے مگر والد سے  
 وجہ نہ مانگا۔ ۱۹ سال کی عمر میں جے کے لئے گئے۔ ۱۸۷۳ء میں اپنے والد اور کچھ دیگر دردمند  
 مسلمانوں کے قائم کردہ مدرسہ کے مدرس اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ انہوں نے اپنے وقت کے ممتاز علماء  
 دینی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں والد کے ایماء پر وکالت کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ ان کا  
 چھوٹا بھائی ہمدی بھی اسی امتحان میں تفریحا بیٹھا۔ ہمدی۔ شبلی سے کتابوں کے اسباق تفریحا  
 سنا کرتا تھا مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمدی نوکامیاب ہو گیا، شبلی وکالت میں فیل ہو گئے۔ بہر حال  
 ۱۸۸۱ء میں شبلی نے دوبارہ امتحان دیا اور کامیابی کے بعد ۱۸۸۱ء میں اعظم گڑھ ہی میں وکالت کا  
 آغاز کر دیا۔ وکالت کا چلنا مشکل تھا کیونکہ شبلی نے محض والد کے حکم کی اطاعت میں امتحان دیا اور  
 پرنکٹس شروع کی۔ طبعاً اس پیشہ ہی سے متنفر تھے۔ آخر انہوں نے وکالت ترک کر دی۔ ملازمت  
 تلاش کی تو صرف دس روپے ماہانہ کی اسامی ہی یہی نفل نویسی کی مگر ملازمت مایوسی تھی۔ آہستہ  
 ان کے والد نے انہیں اپنے ہی کارخانے میں کام پر لگا دیا۔ شبلی کی سیلابی طبیعت آڑے آئی۔  
 وہ یہاں بھی کام نہ کر سکے اور ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ چلے آئے۔ روزگار کے سلسلہ میں شبلی نے نسبت  
 ٹھوکریں کھائیں اور وہ خاصے دل برداشتہ بھی ہوئے مگر ان کی علمی و ادبی دلچسپیاں قائم رہیں۔

۱۸۸۲ء کے اواخر میں علی گڑھ کالج میں عربی کے لئے ایک معاون پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی تو شبلی نے اس کے لئے ممبر پور کوشش کی۔ آخر کار مولوی سمیع اللہ خاں نے انہیں منتخب کر لیا۔ اسی موقع پر وہ پہلی بار سر سید احمد خاں سے متعارف ہوئے۔ یہاں انہیں پالیس روپے ماہانہ مشاہروہ ملا جاتا تھا لیکن شبلی کے لئے یہاں سب سے بڑی دلچسپی اور کشش یہ تھی کہ لاہریہ یوں کی وجہ سے ہر وقت معاون کر سکتے تھے اور سر سید اور فی آرنلڈ کی صحبت نے شبلی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ وہ قریباً ۹ سال تک علی گڑھ سے منسلک رہے۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران ہی شبلی کو یہ احساس شدہ تھا کہ اس سے بڑا فائدہ، منطق اور صرف و نحو کے ساتھ انگریزی کی تسلیم بھی بے حد ضروری ہے۔

۱۸۸۵ء میں ترکی اور روس کے درمیان جنگ کے دوران — ہندوستان کے مسلمانوں میں بے پناہ جوش پایا جاتا تھا۔ ترکی کی امداد کے لئے گوگھر سے چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب برطانوی حکومت روس کو اپنا حریف سمجھتی تھی۔ لہذا قدرتی طور پر حکومت کی طرف سے بھی ترکی کی مدد پر کسی قسم کی پابندی مائد نہ تھی۔ اس وقت شبلی صرف ۲۰ سال کے تھے اور ان تمام مقامات مقدسہ کی زیارت کر آئے تھے جو سلطان ترکی کے زیرِ نگیں تھے۔ جب اعظم گڑھ میں ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنے کا کام شروع ہوا تو انہیں انجمنِ نایام عمل میں آیا جس کے سیکریٹری شبلی تھے۔ اس انجمن نے ۲ ہزار روپے جمع کئے اور ترکی بھیجے۔

ترکی اور یونان کے درمیان جنگ پر سر سید احمد خاں کو شدید تشویش تھی۔ شبلی — ہر قدم پر سر سید احمد کے ساتھ تھے۔ دونوں محسوس کر رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان جس حالت میں ہیں اس قابل نہیں کہ ترکی کو کیا کسی بھی اسلامی مملکت کے لئے کوئی عملی کام کر سکیں۔ اور یہ مسئلہ تھا کہ حکومت برطانیہ کی ہمدردیاں یونان کے ساتھ تھیں لہذا میں لکھن تھا کہ ترکی کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کے نازک جذبات اور انگریز حکومت کی یونان سے ہمدردی کے باعث — مسلمانوں اور انگریزوں میں فاصلہ قائم ہو جاتا ہے۔ سر سید نے بڑے عجیب دور سے گزرنے اور مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد اس فاصلے کو ختم کیا تھا۔ اس موقع پر سر سید احمد خاں نے ایسے متعدد مضامین لکھے جن میں ترکوں سے اسلامی ہندوستان کی محبت اور جذبات کا مکمل اظہار موجود تھا۔ ایک مضمون میں گیڈ سٹون اور دوسرے انگریزوں کے رویے کی شدید مذمت بھی کی گئی تھی مگر یہ بات بھی واضح کر دی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ترکی سے اس بڑے محبت ہے کہ ترکی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی

ملکت تھے۔ نہ کہ اس لئے کہ مسلمان، سلطان روم کو خلیفہ السلیین سمجھتے ہیں۔ یا نہ ہی انہوں میں اس کے احکامات کے پابند ہیں۔ اس بحث میں شبلی نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ انہوں نے ایک نہایت مدلل مضمون لکھا اور تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں (مثلاً متصل بادشاہوں) نے کبھی عثمانی ترکوں کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔

شبلی کافی عرصہ سے علیل رہنے لگے تھے مگر ان کے مرض کی وجہ اب تک دریافت نہیں ہو سکی تھی تاہم انہوں نے تصنیف و تالیف اور قومی اور ملی دلچسپی کے سلسلہ کو کسی قیمت پر بھی منقطع نہ ہونے دیا بلکہ ان کی مصروفیت کچھ بڑھ ہی گئی۔ ۱۹۰۸ء میں صوبہ کے گورنر نے دارالعلوم ندوہ کی نئی اور وسیع عمارت کا سنگ بنیاد رکھا نیز حکومت کی طرف سے ندوہ کے لئے ۵ سو روپے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کیا گیا تقریباً دو صد روپے ماہانہ ندوہ کی اپنی آمدن تھی۔ حکومت نے جو امدادی غنیمت بڑھادی تعلیم کے لئے تھی لہذا قدرتی طور پر غیر مذہبی تعلیم کا سلسلہ وسیع ہو گیا۔ علامہ شبلی نے یہ حالات دیکھے تو انہیں شدید لگہ لگتی ہوئی۔ مولانا نے حضور بیگم بھوپال کے ادبی سیکرٹری مولوی محمد امین نعیمی کو خط لکھا کہ حکومت نے ندوہ کے لئے ۵ سو روپے ماہانہ وظیفہ دیا ہے جبکہ خالص مذہبی علوم کا صیغہ اس کے مقابلہ میں بہت کم وقعت رکھتا ہے لہذا ضروری ہے کہ ندوہ کی اپنی آمدن میں اضافہ ہو۔ جب حضور بیگم بھوپال کو اس امر کی اطلاع ملی تو انہوں نے بھوپال کی طرف سے دسویں جہانے والی مالی امداد (۲۰۰۰ روپے ماہانہ) میں پچاس روپے ماہانہ کا اضافہ کر دیا۔ اس کے بعد ریاست رام پور سے پانچ سو روپے سالانہ کی امداد کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۱۰ء میں آغا خاں نے ندوہ کے معائنہ کے موقع پر پانچ سو روپے سالانہ کی امداد کا آغاز کر دیا۔

علامہ شبلی نے ندوہ ہی کے پیٹ فارم سے یہ کوشش کی کہ مسلمان کسی طرح متحد ہو کر قومی معاملات پر توجہ دیں اور ان کی باگ ڈور علماء کے ہاتھوں میں آجائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ندوہ کو قلم کی آواز بنانے کی سعی شروع کر دی۔ اس ضمن میں ایک کام تو 'قانون وقف علی الاولاد' تھا جس کی بنیاد بنانے والی تھی۔ پھر ایک بل کا مسودہ تیار کیا مگر اس وقت قانون دان طبقہ اس کے خلاف تھا۔ کچھ عرصہ بعد سید امیر علی نے ۱۸۹۹ء میں بطور رنج مانیکورٹ کلکتہ اور بعد ازاں لندن کے ایک جدیدے میں اسی قانون کے حق میں ایسے مضبوط دلائل پیش کیے جن کی وجہ سے

تعاونی اخراجات کی رکاوٹ خاصی حد تک دور ہو گئی لیکن پریس کونسل کا فیصلہ سیرامیر علی کے فیصلے کے خلاف ہونے کی بنا پر نئے قانون کے ذریعہ ہی اس مسئلہ کا کوئی حل مل سکتا تھا۔ بہر حال سیرامیر علی کے فیصلہ اور ضمنیوں کے بعد ہی شبلی نے اس مسئلہ کو از سر نو اٹھایا اور پریس کی کونسل کے فیصلے کے مطابق حکومت قانون وقف علی الاولاد وضع کرنے۔ ۱۹۰۶ء میں اس کے حق میں قائد اعظم کی تقریر کے بعد کانگریس کے اجلاس میں شبلی کی پوزیشن مضبوط ہوئی۔ ۱۱ نومبر ۱۹۰۶ء کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۰۸ء میں اس قانون کے حق میں قرارداد منظور کرائی۔ منظوری کے بعد انہوں نے علی مساعی کا آغاز کیا۔ ایک مجلس وقف قائم کی اور جگہ جگہ جلسے منعقد کرانے کا اہتمام کیا۔ دیریں اثناء منظور شدہ سیم کے تحت لیمبڈیو کونسل تشکیل پا چکی تھی اور قائد اعظم اس کے رکن تھے۔ چنانچہ قائد اعظم نے حکومت سے اس مسئلہ پر سوال کیا۔ مگر حکومت نے اپنے طور پر ایسا کوئی قانون وضع کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اگر کسی غیر سرکاری کارکن نے جلی میٹس کیا تو حکومت یقیناً غور کرے گی۔ بعد ازاں قائد اعظم نے خود وقف علی الاولاد کا بل کونسل میں پیش کیا جو قدرے ترمیم کے بعد منظور ہو گیا۔

۱۹۰۸ء میں آریہ سماجیوں نے راجپوتانہ، دلی اور اس کے فوجی علاقوں اور آگرہ وغیرہ کے بہت سے مسلمان راجپوتوں کو دوبارہ ہندومت قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ مولانا شبلی کو اسی سال پٹیار میں مسلمان راجپوت کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ واپسی پر علامہ شبلی نے متعدد مضامین لکھے اور اس مسئلہ میں سرگرم عمل ہو گئے۔

کانگریس سے متعلق سرسید سے اتفاق رائے کے علاوہ علامہ شبلی اس وقت بے حد محتاط و رعب حسیت کا فواد الملک نے بنگال کی تقسیم کی تفسیر کے بعد سیاسی حالات پر واضح طور پر اظہار خیال کیا۔ اپریل ۱۸۹۵ء میں جب ہندوہ کے سالانہ جلسے میں مجوزہ ”ج بل“ پیش کیا گیا تو علامہ شبلی نے اسے کسی حد تک سیاست میں ٹوٹ جانے کے برابر خیال کیا اور لکھا کہ ”حجائے کی بٹ چونکہ سرکاری قانون کی نسبت کچھ چینی ہے اس لئے سیاسی ہے۔ اور جب عام بطور پر یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہندوہ میں سیاسی بنیادیں ہوتی ہیں تو قطعی سمجھ لیجئے کہ کل علماء متفق ہو کر کسی ہندوہ کو نہیں پاسکتے۔ راکین اشتراکیت تمام ہندوہ داران سرکاری و راکین میونسپل وغیرہ مستثنیٰ ہو جائیں گے اور جلسوں میں کسی کو مجال شرکت نہ ہوگی۔ اس طرح ایک عرصہ تک مولانا شبلی نہ صرف کانگریس کے معاملہ میں سرسید کے ہم خیال تھے بلکہ سیاست سے قطعی طور پر دور رہنا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں انہوں نے نئی کروٹ لی۔ دسمبر ۱۹۱۱ء

میں دلی دربار کا انعقاد ہوا۔ حکومتِ قسیم بنگال کو ٹول سمجھ رہی تھی لیکن اس موقع پر اسے غصہ و خروش ہو گیا۔ بنگال کی تقسیم پر بنگالی مسلمان بہت خوش تھے۔ مگر جب اس کی تفسیح ہوئی تو وہ بہت افسردہ ہوئے۔ مارچ ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ نے بھی تقسیم بنگال کی تفسیح پر احتجاج کیا۔ اسی موقع پر علامہ شبلی نعمانی مکمل کریمیت میں آئے کیونکہ اب مزید احتیاط سے مسلمانوں کے مفادات پر واضح ضرب آرہی تھی۔ علی گڑھ کے ارباب کی پالیسی تو یہ تھی کہ کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ علامہ شبلی کانگریس سے علیحدگی کے حق میں تو نہ تھے البتہ دیگر پالیسی سے قطعی طور پر متنفر تھے۔ انہوں نے لکھنؤ کے ”مسلم گزٹ“ میں ”مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ“ کے عنوان سے ایک مضمون سپردِ قلم کیا۔ اس مضمون میں مسلمانوں کی کوشش اور آئندہ پالیسی پر سیر حاصل بحث تھی۔ تاہم یہ اعتراض اس میں بھی بھی موجود تھا کہ اگر مسلمانوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی تو وہ تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ بلکہ اس مضمون میں مسلم لیگ پر بھی کچھ طنز کیا گیا تھا۔ انہوں نے کونسلوں اور یونیورسٹیوں میں مسلمان اراکین کی باتوں پر بھی اعتراض کیا ان کا کہنا تھا کہ مسلمان سطحی سوال کرتے ہیں جو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتے۔ جبکہ ہندو اعداد و شمار نے کربات کرتے ہیں۔

علامہ شبلی نے قوم میں جوش و خروش پیدا کرنے اور آزادی کے جذبے کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ قوم کے خیالات میں انقلاب پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ طویل عرصات کے بعد مولانا محمد شبلی ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو صبح ساڑھے اٹھ بجے رحلت فرما گئے۔

## مولانا علیہ اللہ سندھی

۱۸۴۲ء تا ۱۹۴۴ء

جب پنجاب میں سکھوں کا زوال آیا تو بہت سے سکھ سرکاری افسر بنے روزگار ہو گئے۔ انہی میں ایک گلاب رائے تھا۔ گلاب رائے کا بیٹا جیت رائے بھی سرکاری ملازمت میں تھا۔ لہذا جب پرودہ گاری بڑھی تو جیت رائے کا لڑکا رام سنگھ بیاکوٹ میں آکر آباد ہو گیا اور اس نے حلقہ کا کام شروع کر دیا۔ رام سنگھ کا کاروبار چل نکلا اور اس نے بیاکوٹ کے ایک سکھ خاندان کی لڑکی جیوتی سے شادی کر لی۔ ۱- مارچ ۱۸۷۲ء کو رام سنگھ کے گھر بیاکوٹ کے موضع چیانوالی میں ایک بڑا



ہمیدا ہوا جو بعد ازاں مشرف بہ اسلام ہو کر مولانا عبید اللہ سندھی نے  
نام سے مشہور ہوا۔

رام سنگھ بیٹے کی پیدائش کے وقت چار ماہ بعد انتقال کر گیا۔ اس کی بیوی اپنے بچوں کو بے  
پنپے ان کے وادائے پاس رہی۔ کچھ عرصہ بعد ان کا وادہ جیت رائے بھی انتقال کر گیا۔ وہ بچوں کو  
لے کر ان کے نانائے پاس چلی گئی لیکن بد قسمتی یہ کہ کچھ عرصہ بعد ہی وہ جی مر گیا۔  
اب اس نے اپنے دو بھائیوں کے گھر پناہ لی۔ یہ دونوں ڈیرہ غنائی خاں میں  
پڑوسی تھے۔

چھ سال کی عمر میں اردو سکول ہام پور میں عبید اللہ کو داخل کرایا گیا اور وہ وہاں میں یہ بچپن  
تیسری جماعت میں ہو گیا۔ ابھی یہ بچہ مدلل سکول ہی میں تھا کہ آریہ سماج ہندو فرقہ سے تعلق  
رکنے والے دوست نے اسے ایک کتاب "تحفۃ الہند" دی۔ عبید اللہ نے یہ کتاب پڑھنے کے  
بعد اسلام میں کشش محسوس کی اور پھر اسے جو بھی اسلامی کتاب نظر آئی، پڑھ ڈالی۔ اچانک اس نے  
فیصل کیا کہ اسے مسلمان ہو جانا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ اگر اس نے اسلام قبول  
کر لیا تو اس کی ماں ناراض ہو جائے گی۔ لہذا وہ گھر سے بھاگ کر سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں کباد  
ہو گیا۔ یہاں اسے سکول میں کسی دوست نے مولانا اسماعیل شہید کی کتاب "تقویتۃ العوام" پڑھنے  
کے لئے دی۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد عبید اللہ نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ اس نے "تحفۃ الہند"  
کے مصنف عبید اللہ کے نام پر اپنا نام رکھا۔ وہ خود ایک مجدد تھے ہیں کہ انہیں دائرۃ اسلام میں  
شامل کرنے میں ایک ہندو عالم کا بڑا ہاتھ ہے جو خود کو "پنڈت مولوی" کہا کرتا تھا۔ اس کے  
بعد وہ مدرسہ کے ایک مسلمان طالب علم کے ساتھ کوئلہ رحیم شاہ پیچھے۔ چند دن کے بعد جب ان کے  
رشتہ داروں نے ان کے مسلمان ہونے پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا تو وہ سندھ چلے گئے۔ سندھ میں  
محافظ محمد صادق کے شاگرد ہو گئے۔ انہوں نے عبید اللہ کو بیک وقت ماں اور باپ کا جیلہ دیا۔ انہی  
کی وجہ سے بعد میں وہ حضرت شیخ الحدادی کی شاگردی میں آئے۔ ۱۱ سال کی عمر میں فار العلوم دیوبند  
میں داخل ہو گئے۔ شیخ الہند سے انہوں نے اتنا اثر لیا کہ وہ زندگی بھر ان کے قریب رہے۔ یہاں  
احتمان پاس کر کے وہ گنگوہا چلے گئے مگر کچھ عرصہ بعد ہی علالت کی وجہ سے وہی لوٹ آئے۔ یہاں  
انہیں حافظ محمد صدیقی کی اچانک وفات سے شدید صدمہ پہنچا۔ سکھ میں قیام کے دوران انہوں نے  
اسلامیہ سکول کے ایک مدرس محمد عظیم خاں کی صاحبزادی سے شادی کر لی۔ اس موقع پر انہوں نے

منت سماجت کر کے اپنی والدہ کو بھی بلایا۔ انہوں نے اپنے مطالعاتی دور میں مولانا اسماعیل شہید سے بے حد اثر قبول کیا۔ مولانا عبید اللہ کے خیال میں مولانا کی تحریروں میں اسلامی اور انقلابی عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مولانا حمید اللہ سندھی نے اپنی سیاسی زندگی کے لائحہ عمل کی بنیاد مولانا اسماعیل شہید کی تحریروں پر ہی کو بنایا

۱۹ سال تک امرٹ کے ایک دینی مدرسہ میں پڑھانے کے بعد وہ دیوبند واپس چلے گئے اور وہاں میں چار سال تک تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد ان کا تبادلوہ دلی کر دیا گیا اور شیخ الحدیث خواجہ پر مولانا عبید اللہ نے دلی کے فوجیان دانشوروں سے ربط قائم کر لیا۔ یہ وہ فوجیان تھے جو مسلمانوں کے لئے جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ یہیں پر مولانا کے مراسم مولانا محمد علی مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری اور نواب وقار الملک کے ساتھ ہوئے۔ مولانا نے دلی کی مسجد فتح پوری میں مذہبی علوم کی تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہاں پر ان کے لیکچر سننے کے لئے بہت سے مسلمان اور ہاتھموس فوجیان آتے رہے۔ تدریس کے دوران مولانا نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی تبلیغ بھی شروع کر دی۔ اس الزام میں مولانا پر نہ صرف کڑی نگرانی شروع کر دی گئی بلکہ بعد ازاں انہیں گرفتار کر کے مدرسہ بھی بند کر دیا گیا۔ مولانا تیس سال تک پڑھاتے بھی رہے اور انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی آزادی کے لئے منصوبہ بندی کو بھی اپنا شعار بنائے رکھا۔ وہ ہندوستان اور بیشتر مسلمان ممالک پر مغربی غلبہ کے باعث روحانی تڑپ میں مبتلا رہتے۔ برطانوی سامراج کے خلاف ان کے رگ و پلے میں ایک نئی انقلابی رُوح کو جنم لیتی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ ان پر خفیہ پولیس کی مسلسل اور کڑی نگرانی رہنے لگی۔ ان کی نظریں اُس وقت پر تھیں جب غیر ملکی سامراج کا سایہ استبداد مطلع ہند سے ختم ہو تاکہ مسلمان ایک آزاد اور خود مختار و باوقار قوم کی حیثیت سے سانس لے سکیں۔

ایک انہیں شیخ الحدیث نے ہدایت کی کہ وہ کابل چلے جائیں۔ مولانا کو یہ علم نہ تھا کہ کابل میں ان کا پروگرام کیا ہو گا۔ تاہم انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی آمد کے بارے میں پہلے ہی اطلاعات پہنچ چکی تھی۔ چونکہ جب وہ ہندوستان سے افغانستان پہنچے تو وہاں ان کا نصیر مقدم بڑی گرم جوشی کے ساتھ کیا گیا۔ نیز حکومت کابل نے بھی ان کے ساتھ مکمل تعاون کیا۔

۱۹۱۶ء میں شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ نے مولانا کو ہدایت کی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی کردار ادا کریں۔ چنانچہ مولانا آل انڈیا نیشنل کانگریس کے رکن ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے کابل میں ڈاکٹر انصاری کے تعاون سے کانگریس شائع کی بنیاد رکھی۔ اس شائع کے آغاز کا فیصلہ کانگریس کے گیتا کے اجلاس میں کیا گیا تھا۔ اس وقت شاہ افغانستان امیر مان اللہ خاں تھے۔ قریباً ایک سال بعد مولانا مسکو چلے گئے۔ سات ماہ قیام کے دوران مولانا نے اشتراکیت کا بنظرِ خاص مطالعہ کیا۔ اس بارے میں مولانا نے خود لکھا ہے کہ :

”مگر مجھ پر اشتراکیت نے اپنا اثر کیا تھا لیکن شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا اثر تھا کہ میرا اپنا عقیدہ راسخ رہا۔ اور میں نے اپنے سیاسی و مذہبی ایمان میں کسی ”ازم“ کو در نہ آنے دیا۔“

اسی دوران روس میں ترکی کے سفیر سے ان کے تعلقات ہو گئے۔ مولانا کو ترکی جانے کی اجازت مل گئی اور حکومت ترکی نے نہایت رازداری سے کام لیتے ہوئے ان کے سفر کا پروگرام مرتب کر دیا۔ دراصل بات یہ تھی کہ حکومت برطانیہ مولانا کو اپنے لئے ایک خطرناک آدمی سمجھتی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو انگریزوں کے سامراجی عزائم اور اس کی غلامی کے سامنے دیوار بن کر حائل ہونے کی کوشش کرتا۔ وہ خطرناک تصور کیا جاتا کیونکہ مولانا نے بھی انگریزوں کے پناہ گاہکاروں کے خلاف جہاد شروع کر دیا تھا اس لئے انگریزوں کی نظر میں وہ زندگی بھر ایک خطرناک آدمی رہے۔ ترکی میں مولانا کا قیام ۳ سال تک رہا جہاں وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے مسلسل منصوبہ بناتے رہے۔ نیز دوسرے ملک کے مسلمانوں کو بھی مغربی سامراج کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کرتے رہے۔

مکہ میں عالمی مسلم کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ مولانا کے خیال میں دنیا بھر کے مسلمان رہنماؤں سے ملنے اور مسلمانوں کے مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ چنانچہ انہوں نے اٹلی کے راستے ترکی سے مکہ کا سفر اختیار کیا۔ لیکن برطانیہ کی خفیہ پولیس کے حیران کن مسلسل نگرانی کو رہے تھے۔ سفر کے دوران مولانا کے راستے میں ان لوگوں نے اتنی رکاوٹیں پیدا کیں کہ کانگریس کا اجلاس ختم بھی ہو گیا مگر مولانا سفر ہی میں رہے جب وہ مکہ پہنچے تو کچھ مسلمان رہنما اسی وہاں موجود تھے۔ لہذا مولانا کو ان سے ملنے اور تبادلہ خیال کرنے کا قصور بہت

موقع مل گیا۔

## گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۲۵ء کے بعد

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۲۵ء شائع ہو چکا تھا اور اب یہ توقع کی جاتی تھی کہ پہلی مرتبہ عوامی ذرائع کی تشکیل پائیں گی نیز صوبوں اور مرکز میں عوام کو کام کرنے کا موقع مل جائے گا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں پیدا ہو چکی تھی اور انگریزوں کو بھی یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ عوام کے مطالبات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس نے ہندوستان میں مولانا عبید اللہ کے واسطے پر پابندی اٹھانے کا پُر زور مطالبہ کیا۔ اس مطالبے کی حمایت ہر طرف سے کی گئی۔ ۱۹۳۷ء میں صوبائی خود مختاری کے تحت کام ہورہا تھا اور کچھ صوبوں کی حکومتوں نے حکومت برطانیہ سے یہ سفارش کی تھی کہ مولانا کو ہندوستانی پاسپورٹ جاری کیا جائے۔ انگریز کو یہ مطالبہ منظور کرنا پڑا۔ اس طرح یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو مولانا کے لئے ہندوستانی پاسپورٹ جاری کر دیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں جب مولانا ۴۴ سال کی جلاوطنی کے بعد ۶ سال کی عمر میں ہندوستان پہنچے تو ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔

مولانا کی ہندوستان میں آمد کے بعد انگریز کی پرانی تحلیف عموماً کو آئی۔ انگریز جس بات خائف رہتا تھا، مولانا نے وہی بات شروع کر دی یعنی مسلمانوں میں اس بات کی تبلیغ شروع کر دی کہ وہ خدا کی رشتی کو مضبوطی سے تھامے رہیں اور اس کے رسول کی تعلیمات کو قواموش نہ کریں۔ کیونکہ مسلمان کے لئے صرف مادی خوشحالی خود مند نہیں تاؤتھیکہ وہ اپنے اندر سے دیگر تمام خواہیوں کو ختم نہیں کر دیتا ورنہ اس کے مسائل کا لا متناہی سلسلہ جاری رہے گا۔ مولانا نے ہندوستان کے کاشت کار اور کارکن طبقہ کا معیار زندگی بہتر بنانے کی طرف بھی توجہ دی۔

سندھ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کا جو کھلا اجلاس ۱۲ جولائی ۱۹۴۰ء کو ٹھٹھہ میں منعقد ہوا۔ اس سے مولانا نے خطاب کرتے ہوئے کہا،

”گزشتہ پچاس سال سے سندھ میرا وطن ہے کیونکہ اسی سرزمین نے میرے روحانی باپ کو جنم دیا۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک ہندو پنڈت نے مجھے یہ بتایا کہ اسلام کیا ہے۔ جب میں نے استسما سے ملا وجیت رائے کو خط لکھا تو وہ پنجاب سے چلے اور مجھے

ملنے نئے لئے ترکی پہنچے۔ یورپ سے واپسی کے بعد میں نے مشاہدہ کیا کہ دیوبند اور علی گڑھ کے مسلمانوں کے درمیان زبردست اختلافات پیدا ہو چکے ہیں لیکن میں ایمان داری سے سمجھتا ہوں اور کانگریس بھی کی میٹج سے بر ملا کرتا ہوں کہ ان اختلافات کی طبع کو وسیع کرنے میں کانگریس نے اہم کردار ادا کیا ہے جبکہ کانگریس کا فرض تو یہ تھا کہ وہ ان اختلافات کو ختم کرانے کی کوشش کرتی۔ اسی طرح مولانا نے کئی مواقع پر کانگریس سے اختلافات کا اظہار کیا۔ انہوں نے صاف طور پر کہا کہ اگر کانگریس اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ ہندوستان کو کئی ہزار سال پہلے کا ہندوستان بنا دیں گے تو وہ یہ جھوٹ ہیں کہ ہندوستان میں گزشتہ ۲۰ سال سے ایک اور قوم بھی آباد ہے جس کی زبان، مذہب، ثقافت اور سوچ کا انداز اس قوم سے مختلف ہے۔ جو کانگریس کی قوم ہے۔

اس کے بعد مولانا نے ایک نئی سیاسی جماعت بننا ببا سندھو ساگر پارٹی تشکیل کی۔ اس پارٹی کے مقاصد بیان کرنے ہوئے مولانا نے صاف طور پر کہا کہ ہندوستان کو کسی قیمت پر ایک ملک تصور نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسے یورپ کی طرح سانی اور ثقافتی بنیادوں پر تقسیم کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے اس پارٹی کے لئے ایک نہایت ٹھوس سماجی و اقتصادی پروگرام مرتب کیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی خود نوشت میں مولانا عبید اللہ سندھی کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا،

• مولوی عبید اللہ سے میری مختصر سی ملاقات اٹلی میں ہوئی۔ میں نے ان کی ذہانت اور قابلیت کے باوجود یہ محسوس کیا کہ وہ جدید تصورات نہیں رکھتے۔ انہوں نے مجھ سے یونائٹڈ ری پبلک آف انڈیا کی سکیم کا ذکر بھی کیا۔ میرے خیال میں مولوی عبید اللہ کی طرف سے فرقہ وارانہ مسائل کے حل کی یہ ایک قابل قدر کوشش تھی۔ مولوی عبید اللہ نے مجھے اپنی استقبالیہ کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی بتایا لیکن میں نے ان سرگرمیوں کو خاص اہمیت نہ دی اور جلد ہی یہ بات میرے ذہن سے اتر گئی۔ چند ماہ بعد ترکی میں مولوی عبید اللہ کی ملاقات لاہر لاجپت رائے سے ہوئی تو مولوی عبید اللہ نے انہیں بھی اپنی ان سرگرمیوں کا قصہ سنایا۔ لاہر جی ان سرگرمیوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ لیکن ایک وقت وہ آیا جب انہی سرگرمیوں کے تذکرے نے انڈین کونسل کے انتظامات میں اہم کردار ادا کیا۔

مولانا عبید اللہ سندھو کا دورہ کر رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے طلبہ سے خطاب

کرتے ہوئے کہا،

”میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کے لئے انگریزی اور مغربی دسائشی طومر سیکھنا بہت ضروری ہے تاکہ آپ کو یہ علم ہو کہ یورپ میں کون سی انقلابی تحریکیں حسینم لے رہی ہیں۔ ہندوستان میں بھی آپ کو اسی قسم کے انقلاب کے لئے تیار رہنا چاہیئے“

جب مولانا کراچی واپس آئے تو ان کی صحت بہت بگڑ چکی تھی ان کا زیادہ وقت بستر میں گزارتا۔ جسکی اس کے باوجود وہ کام کرتے رہے اور دوروں پر بھی جاتے رہے۔ آخر ۲۲ اگست ۱۹۴۲ء کو ان کی روح نقیض مغربی سے پرواز کر گئی۔ انہیں ضلع بہاولپور کے موضع دیہی پور میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

## علامہ اقبالؒ

(۱۸۷۳ء تا ۱۹۳۸ء)

علامہ محمد اقبالؒ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد نے قریباً تین سو سال پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ بنیادی طور پر اس خاندان کا تعلق کشمیری برہمنوں سے تھا۔ اقبالؒ نے ابتدائی تعلیم کتب میں حاصل کی۔ ایک مشہور عالم شمس العلماء میر حسن ان کے استاد تھے جنہوں نے اقبالؒ کی ذہانت اور ان کے اندر چھپے ہوئے جوہر کو پہچانا اور ان کی تعلیم کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں اقبالؒ کو شاعری سے مس ہوا اور وہ اپنی نظمیں حضرت دانش کو اصلاح کے لئے بھیجتے رہے۔ اکثر اوقات یہ ہوتا کہ دانش ان کی منظومات اصلاح کے بغیر واپس کر دیتے کیونکہ اصلاح کی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ مکتب کی تعلیم کے بعد اقبالؒ نے مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا، جہاں سے ۱۸۹۹ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور دو سال بعد ایم۔ اے کر لیا۔ فوراً بعد انہیں اور ٹیٹل کالج لاہور میں تاریخ کا درس مقرر کر دیا گیا۔ تاریخ کے علاوہ وہ فلسفہ اور انگریزی بھی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۰۰ء میں انہوں نے پہلی بار انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں اپنی نظر و آراء پیش کیے۔

اقبالؒ اپنی زندگی میں سرگرم اس آرٹلز سے بہت متاثر تھے۔ ۱۹۰۵ء تک اور ٹیٹل کالج لاہور

میں تدریس کے بعد سر تھامس آرنلڈ کے مشورے پر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ وہاں انگریزی اور جرمنی ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہاں قیام کے دوران انہیں بہت سے ممتاز دانشوروں سے تبادلا خیال کا موقع بھی ملا۔ یہ وہی دور تھا جب علامہ اقبال کو غرضی اور ٹینگ نظر جذبات قوم پرستی سے نفرت پیدا ہوئی۔ ان کے خیال میں یورپ کے اندر سیاسی جنگاموں اور انتشار کی بنیادی وجہ اسی قسم کے نظریات تھے۔ کیمبرج سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے میونخ سے ڈاکٹریٹ کیا اور بیرسٹری کی سند حاصل کر لی۔ لندن یونیورسٹی کی دعوت پر انہوں نے کچھ عرصہ عربی پڑھا لی۔ اس دوران انہیں ایک فلسفی کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل ہو چکا تھا۔ انہوں نے لندن کے کلیسنس ہال میں متعدد دیکچر بھی دیئے۔ ۱۹۰۸ء میں لاہور واپسی پر اچھی سے اچھی ملازمتوں کی پیشکش کی گئی۔ کچھ عرصہ تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی ادب کے جزوقتی پروفیسر کی حیثیت میں پڑھاتے رہے اور ساتھ ہی وکالت بھی کرتے رہے مگر انہوں نے جلد ہی محسوس کیا کہ اگر قوم کی خدمت بھی کرنا ہے تو ملازمت جاری رکھنا مشکل ہوگا۔ ۱۹۱۱ء کے بعد انہوں نے ملازمت ترک کر دی۔

علامہ اقبال کی سیاسی زندگی کا آغاز ان کے قیام انگلستان کے دوران ہی ہو گیا تھا۔ وہاں جب سید امیر علی نے آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی تو علامہ اقبال مسلم لیگ کی برطانوی کمیٹی کے سرگرم کارکن رہے۔ یہ کمیٹی انگلستان کے عوام اور سیاسی رہنماؤں میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جدانگادہ انتہا بات کی راہ ہموار کر رہی تھی۔ جب وہ لاہور پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ مسلم لیگ کی صوبائی شاخ جس کے صدر مولوی شاہ دین اور سیکریٹری سر محمد شفیع تھے، خوب کام کر رہی تھی۔ علامہ اقبال نے مسلم لیگ کی رکنیت قبول کی اور سرگرمی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران انہیں ایک فلسفی اور شاعر کے طور پر ممتاز مقام حاصل ہو چکا تھا۔

ایک ممتاز انگریز نگار وینٹ ہاؤس میں گورنر کا خاص مہمان تھا۔ گورنر نے علامہ اقبال کو مدعو کیا اور اپنے مہمان سے متعارف کرایا۔ یہ مہمان علامہ اقبال کے فکر کی گہرائی، فلسفہ اور شاعری سے اس درجہ متاثر ہوا کہ جونہی اقبال وہاں سے رخصت ہوئے اس نے گورنر سے شکوہ کیا کہ اتنے قابل شخص کی اس درجہ ناقدری کیوں کہ آج ملک اسے کسی عزت سے نہیں ڈاڑا لگیا، کچھ عرصہ بعد ہی علامہ اقبال کو سر کا خطاب دے دیا گیا۔ ۱۹۲۸ء کے بعد انہوں نے حیدر آباد، علی گڑھ اور مدراس میں

متعدد دیگر دیئے جو بعد ازاں کتابی صورت میں شائع کر دیئے گئے۔ تین چار سال بعد انہوں نے یورپ کا دورہ کیا۔ سپین گئے اور یر دوشم میں منعقدہ اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔

۱۹۲۰ء کے انتخابات میں وہ پنجاب یونیورسٹی اسمبلی کے لئے منتخب ہو گئے۔ اسمبلی نے ۵۔ مارچ ۱۹۲۰ء کے بجٹ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے دیہی علاقوں کی صفائی اور عورتوں کے لئے طبی امداد پر زیادہ رقم صرف کرنے پر زور دیا اور کہا کہ تاج پستانے اور آمارے جاتے رہے ہیں۔ لیکن صرف عوام مستقل حیثیت کے حامل ہیں۔ علامہ اقبال نے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے گنجائش پیدا کرنے پر بھی بہت زور دیا۔ ۱۹۔ جولائی ۱۹۲۰ء کو انہوں نے کھلے مقابلوں کے ذریعہ سرکاری ملازمتیں پُر کرنے کے بارے میں ایک "تحریر" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا،

"اس ملک کی حالت ایسی ہے کہ ہمارے لئے مقابلے کے عام اور مروج طریق کار کو اپنانا ممکن نہیں۔ اس ملک کے لئے بہتر یہ ہے کہ نامزدگیوں کے ذریعے سرکاری آسامیاں پُر کی جائیں۔"

۲۔ مارچ ۱۹۲۹ء کو انہوں نے اسمبلی میں ایک اور تقریر کرتے ہوئے تعلیمی حالات کو مدبرانہ قرار دیا اور اس امر کی مذمت کی کہ تعلیم کے معاملے میں مسلمانوں کے پسماندہ سکول صرف ۲۳ فیصد سرکاری گرانٹ حاصل کر رہے ہیں۔ تعلیم پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے اس کی مساوی تقسیم ضروری ہے بالخصوص ان علاقوں میں جہاں کے لوگ پسماندہ ہیں اور تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ ۱۹ مارچ ۱۹۳۰ء کو صوبہ کی نازک اقتصادی حالت کے بارے میں کہا کہ یہ صوبہ متروک ہے، بے روزگاری میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور تجارت غیر تسلی بخش ہے۔ انہی حالات سے صوبہ کے اقتصادی مستقبل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ صنعتی ترقی پر کچھ بھی حشر نہیں کیا جاتا جب کہ اسی ترقی کے ذریعے بے روزگاری بھر قابو پایا جاسکتا ہے۔

جن دنوں علامہ اقبال پنجاب اسمبلی کے رکن تھے، انہی دنوں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکریٹری بھی منتخب کر لئے گئے۔ ۳۔ فروری ۱۹۲۰ء کو سائنس کمیشن بمبئی پہنچا تاکہ ہندوستان میں آئینی اصلاحات کے سلسلہ میں مقامی رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کے خیالات کا علم ہو سکے۔



سائنس کی پیش رفت کے سامنے رکھی جانے والی تباہیوں کے جھینٹے کے لئے مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا لیکن علامہ اقبال اور دیگر اراکین مجلس عاملہ کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ مجلس عاملہ نے سائنس کی پیش رفت کے مدد کو تباہیوں کو پیش کرنے کے لئے جو قراردادیں منظور کیں، اقبال کو ان سے اختلاف تھا لہذا ۲۴۔ جون ۱۹۶۸ء کو انہوں نے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ انہوں نے استعفا میں اپنی کمزور بینائی کے پیش نظر کام کرنے سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ اخبارات میں مسلم لیگ کی طرف سے یہ یادداشت کا جو اقتباس شائع ہوا اس میں مکمل صوابی خود مختاری کا کوئی مطالبہ نظر نہیں آتا۔ اس یادداشت میں ایک ایسی وفاقی طرز حکومت کی تجویز پیش کی گئی ہے جس میں قانون اور انصاف گورنر کے برابر اس وقت چارج ہیں دے دیئے گئے ہیں۔ واضح ہوتا ہے کہ کوئی آئینی پیش قدمی نہیں کی گئی۔ لہذا میں محسوس کرتا ہوں کہ ان حالات میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کے اتنے ذمہ دار عہدے پر فائز نہیں رہنا چاہیئے۔

علامہ اقبال ان اختلافات کے باوجود آل انڈیا مسلم لیگ کے نظریات اور اصولوں سے وفادار رہے۔ ۱۹۶۸ء میں انہیں الہ آباد مسلم لیگ کے عام اجلاس کی صدارت کے لئے مدعو کیا گیا اس اجلاس میں علامہ اقبال کا خطبہ صدارت تحریک پاکستان کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حثیت رکھتا ہے۔

### اقبال کا خطبہ الہ آباد

”مذہبی گرد و جوں کے وجود کی ٹھوس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر یورپی جمہوریت کا کوئی اصول ہندوستان پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے اندہ مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ مسلم ہندوستان تخلیق کیا جائے، قطعی طور پر جائز اور مناسب ہے۔ میرا خیال ہے کہ دلی میں تمام مسلمان جماعتوں کی کانفرنس (آل پارٹیز مسلم کانفرنس) کی قرارداد اسی جمہوریت کا طے کے اعلیٰ تصور کی پیداوار ہے۔ قرارداد تمام اجزاء کی انفرادیت کو ختم کرنے کی جگہ یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ یہ اجزاء اپنی تمام تر پوشیدہ اور زیر قفل صلاحیتوں کو رو بہ عمل لائیں۔ مجھے اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ آج کا یہ اجلاس ان تمام مطالبات کی تصدیق کرے گا جو مسلم مطالبات کی حیثیت میں اس قرارداد کے اندر موجود ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے

میں اس قرارداد میں مندرج مطالبات سے بھی کچھ آگے بڑھوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ صوبہ پنجاب، صوبہ بہار، صوبہ سندھ اور صوبہ بونچستان کو کجا کر کے ایک علیحدہ ریاست کی صورت دے دی جائے۔ انگریز سلطنت کے اندر مسلمان خود اختیار حکومت یا انگریز حکومت سے الگ شمال مغرب میں مسلمانوں کی نئی حکومت کی تشکیل ہی میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے قطعی مستقبل پوشیدہ ہے۔ ہندو کمیٹی نے اس تجویز کو صرف اس لئے مسترد کر دیا کہ اس تجویز کے نفاذ کی صورت میں ایک اتنی بڑی ریاست وجود میں آجائے گی جسے سمجھنا ناممکن ہو جائے گا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد سات کروڑ ہے اور ہر اعتبار سے باہم یکساں۔ اور کوئی ایسا مندر ہندوستان میں موجود نہیں۔ ہندوستان میں صرف مسلمان ہی نہیں جن کو 'قوم' کے جدید ترین معانی کا جامہ پہنایا جاسکتا ہے ہیں تسلیم ہے کہ ہندو قوم سے ہر معاملے میں آگے ہے لیکن ہندو کے اندر دو یکسانیت موجود نہیں جو ایک قوم کا خاتمہ ہوتی ہے جبکہ یہ چیز مسلمان کو اس کے مذہب کی طرف سے تحفہ کے طور پر ملی ہے۔

علامہ اقبال نومبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے۔ یہاں علامہ اقبال نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور زیادہ سے زیادہ انجینی اصلاحات کی بھرپور وکالت کی۔ وہ ایسے بہت سے ہندوستانیوں سے بھی ملے جو گذشتہ تیس چونتیس برس سے انگلستان میں آباد تھے۔ ان لوگوں نے وہاں اقبال ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن تشکیل کر رکھی تھی۔ جب علامہ اقبال لندن گئے تو اس انجمن کی طرف سے ان کا غیر مقدم بڑی گرم ہوشی کے ساتھ کیا گیا۔ انجمن کی ایک دعوت میں انگلستان کی ممتاز و سرکردہ شخصیات اور نمایاں ہندوستانی رہنما بھی موجود تھے۔ اسی موقع پر تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے علامہ اقبال کو زبردست خواجہ تحسین پیش کیا۔ ۱۹۳۲ء میں علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں دوبارہ شرکت کی۔ غرض وہاں سے انگلستان پہنچے۔ قائد اعظم اس وقت وہیں موجود تھے اور انہوں نے ہندوستان کی سیاست سے قریباً گیارہ کئی اختیار کر لی تھی وہاں علامہ اقبال اور قائد اعظم کے درمیان متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور دونوں رہنما اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ گول میز کانفرنس مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت نہیں کر سکتیں۔ ۱۹۳۲ء میں اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کی اور اس کانفرنس میں بھی اپنے اس موقف کا اعادہ کیا کہ وہ اس فیصلہ کے شدید مخالف ہیں جسے یورپ میں جانا جاتا ہے۔ کیوں کہ یورپ میں قومیت کا تصور محض مادیت پر ہے جب کہ اصل بنیاد

انسان کے ایمان و یقین، اس کی تہذیب اور اس کی تاریخی روایات پر ہوتی ہے۔

حکومت کشمیر کی مسلمانوں کے بارے میں نامناسب پالیسی نے مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ کر کے ان کے لئے مصائب کے دور کا آغاز کر دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے ۶ جون ۱۹۳۲ء کو حکومت کشمیر کی مسلم دشمن پالیسی کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان رہنماؤں کی گرفتاریاں، تمام پر ظلم و تشدد اور غارتگری اور بچوں اور عورتوں پر ناروا مظالم کے باعث کشمیر میں وہی حالات پیدا ہو چکے ہیں جو کربل کا خون کی پالیسی سے پیدا ہو گئے تھے۔ اگر حکومت کشمیر کشمیری مسلمانوں کے سرمہ اطمینان کی وجوہات کو نفسیاتی پس منظر میں جانچنے کی کوشش کرے اور مناسب رویہ اختیار کرے تو امن بجالا ہو سکتا ہے۔ ۲۰ جون ۱۹۳۳ء کو انہوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے استعفا دے دیا۔

اپریل ۱۹۳۶ء میں جب قائد اعظمؒ، علامہ اقبالؒ کی قیام گاہ لاہور پر تلے کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے علامہ اقبالؒ سے انتخابات لڑنے کے لئے پارلیمانی بورڈ کے قیام پر تبادلہ خیال کیا۔ علامہ اقبالؒ فوری طور پر آمادہ ہو گئے۔ مئی ۱۹۳۶ء میں جب قائد اعظمؒ پنجاب میں سیاسی مشن پر تھے تو دشمنوں نے یہ افواہ اڑائی کہ بہت سے لوگ قائد اعظمؒ کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ اس موقع پر علامہ اقبالؒ، ملک برکت علی، خلیفہ شبیر الدین، غلام رسول خاں اور پیر نیاز الدین جیسے اہل کلمات کے نام ایک بیان جاری کیا جس میں واضح طور پر اس افواہ کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ پنجاب کے مسلمان قائد اعظمؒ اور مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ نیز ان کی قیادت اور دیانت داری پر مبرور اعتماد رکھتے ہیں۔ اسی دن یعنی ۸ مئی پنجاب صوبائی مسلم لیگ کا ایک اجلاس منعقد ہوا، جس کی صدارت علامہ اقبالؒ نے کی۔ اجلاس نے انہیں متفقہ طور پر مسلم لیگ کا صدر چن لیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۶ء کو قائد اعظمؒ نے سری نگر سے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کر دیا اور پنجاب کے نمائندوں میں علامہ اقبالؒ سر فہرست تھے۔

مرکزی پارلیمانی بورڈ اور کونسل کا اجلاس لاہور میں ۸ جون ۱۹۳۶ء کو منعقد ہوا تھا۔ ان میں قائد اعظمؒ کو بھی شرکت کرنا تھی۔ یہ افواہ گرم تھی کہ قائد اعظمؒ کی آمد پر انگریزوں کے پٹرولینٹ (جن کی قیادت میاں فضل حسین کر رہے تھے) سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ مظاہرہ کرنے کا پروگرام مرتب کر رہے تھے۔ اس وقت علامہ اقبالؒ کی صحت بھی خاصی خراب تھی۔ جب اس مجوزہ مظاہرے

کی اطلاع ملی تو علامہ اقبال نے ملک لال دیشی کو خواتین نمائندہ کی حیثیت میں یونیٹس رہنماؤں کے پاس بھیجا اور ان پر واضح کر دیا کہ اگر اس قسم کے کسی اقدام کی جرأت کی گئی تو نتائج افسی کے لئے سنگین ہوں گے۔ چنانچہ یونیٹس مظاہرے کا ارادہ ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ اجلاس اسلامیہ کالج کے ہال میں منعقد ہوگا۔ یہ کالج انجمن حمایت اسلام کی سرپرستی میں چل رہا تھا۔ نواب مظفر علی خاں نے جو کٹر یونیٹس تھے، موقع غنیمت جانتے ہوئے مسلم لیگ کا اجلاس ہال میں کرنے کی اجازت نہ دی۔

علامہ اقبال نے جون ۱۹۳۴ء سے نومبر ۱۹۳۷ء تک قائد اعظم کو جو خطوط تحریر کئے اب وہ تحریک پاکستان کی تاریخ میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال کی بینائی کافی حد تک جواب دے چکی تھی۔ انہوں نے ایک خط میں قائد اعظم سے معذرت طلب کرتے ہوئے اجازت چاہی کہ انہیں مسلم لیگ کی خدمات سے سبکدوش کر دیا جائے۔ تاہم ان کی تمام تر ہمدردیاں اور مشورے تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کے لئے وقف رہے۔ ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ عظیم فلسفی، رہنما، شاعر اور تحریک آزادی کا سرگرم کارکن اس جہان فانی سے کوچ کر گیا، جسے بادشاہی مسجد کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔

## شیر بنگال مولوی فضل الحق

(۱۸۷۳ء تا ۱۹۶۲ء)

اے، کے فضل الحق کے آباؤ اجداد کا تعلق ضلع باریسال کے ایک قوی موضع چاکر سے تھا۔ فضل الحق کی پیدائش ۲۹۔ اکتوبر ۱۸۷۳ء کو ستوریہ میں ہوئی۔ ان کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہی ان کے والد وکالت کے سلسلہ میں مستعلاً باریسال چلے آئے۔ ان کا شمار چوٹی کے قانون دانوں میں ہوتا تھا۔ بعد ازاں انہیں سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔

فضل الحق کی ابتدائی تعلیم کتب میں قرآن کریم، اسلامیات، عربی اور فارسی سے ہوئی۔ اس کے بعد وہ باریسال ضلع سکول میں داخل ہو گئے۔ ۳ سال کی عمر میں میٹرک کرنے کے بعد اگلے سال ہی انہوں نے ایف اے کر لیا اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخل آئے۔ بی اے کرنے کے

میدایم اسے کیا اور لکھتے یونیورسٹی کے متحق مقرر ہو گئے۔ انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور کلکتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔ انہیں مالی اعتبار سے پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا کیونکہ ان کے علمی کام کا تبادلہ سب سے بڑی گرفت ہوتے تھے نیز ان کو کالوں سے بھی معقول آمدن ہو جایا کرتی تھی۔

وکالت کے دوران مولوی فضل الحق نے محسوس کیا کہ بنگالی مسلمانوں کی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ تعلیم کا فقدان ہے۔ اس صورت حال سے متاثر ہو کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی تمام زندگی مسلمانوں کی خدمت اور ان کی تعلیمی ترقی کے لئے وقف کر دیں گے۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک جریڈ ہا ہاکس کے نام سے شائع کیا۔ اس طرح پہلے بار۔ ہا ریسال کے معلقین میں عوام کے ساتھ ان کے تعارف کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ہی وہ باقی کچھ مڑکٹ بورڈ کے رکن منتخب ہو گئے۔ پھر ہا ریسال میونسپلٹی کے کسٹرن منتخب ہوئے۔

۱۹۰۶ء میں جب محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس دھاکہ میں منعقد ہوا تو اس اجلاس میں ملک کی اہم مسلمان شخصیات نے شرکت کی۔ کانفرنس کے تمام اختیارات دھاکہ کے نواب جاہم اللہ خاں کے ہاتھ میں تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے چند مسلمان نوجوانوں کو بطور کارکن جمع کیا۔ انہیں میں فضل الحق بھی شامل تھے۔ نواب سلیم اللہ۔ فضل الحق کی گرم جوشی اور وکالت سے پیدا ہونے والے بیرونی اثرات۔ یہ وہی اجلاس تھا جس کی ضرورت ہندوستانی نس آغا خاں نے کی تھی اور درحقیقت جی کانفرنس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ چند ماہ بعد باقاعدہ طور پر مسلم لیگ کا ہیڈ کوارٹر عمل میں آ گیا۔ قیام مسلم لیگ کے بعد چار افراد پر مشتمل ایک آئین سازی کمیٹی تشکیل کی گئی۔ فضل الحق اس کمیٹی کے ایک جانٹ سیکریٹری تھے۔ فضل الحق نے نواب وقار الملک کے ساتھ مل کر مسودہ آئین تیار کیا۔ یہی مسودہ آئین بعد ازاں ہندوستان کے مسلمانوں کے نمائندہ اجلاس نے متفقہ طور پر منظور کیا۔ جب فضل الحق کو ڈپٹی مجسٹریٹ بنایا گیا اس وقت وہ دھاکہ میں تھے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ جمال پور کر دیا گیا۔ اس دوران جمال پور میں ہندو مسلمان فسادات ہو گئے۔ مگر فضل الحق بے خوف ہو کر مسلمانوں اور ہندوؤں کے معلقین میں جاتے رہے۔ اس طرح وہ دونوں میں امن بحال کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انہیں عاری پور میں اسسٹنٹ رجسٹرار کو آ پریو سوسائٹیز مقرر کیا گیا مگر جب رجسٹرار کی اسماعیلی خالی ہوتی تو حکومت نے اپنی ہندو نواباں کی تحت ایک جونیئر ہندو کو رجسٹرار لگا دیا۔ چنانچہ فضل الحق نے اس نا انصافی کے خلاف بطور احتجاج استعفاء کر لکھتے میں دوبارہ وکالت کا آغاز کر دیا۔ اس طرح انہیں تعلیم و ترقی کے مختلف شعبوں کا کام کرنے کا موقع مل گیا۔

۱۹۱۳ء میں ڈھاکہ ڈویژن سے بنگال کی صوبائی کونسل کے لئے ایک نشست خالی ہوئی۔ رائے وہی کا حق جاندا کی اہلیت کی بنا پر دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رائے دہندگان کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ ان کا براہ راست مقابلہ ایک نہایت بااثر ہندو، کامار ہندو رانا موہن جی کے ساتھ تھا۔ فضل الحق اس کے مقابلے میں آزاد امیدوار تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے ہندو مخالف کو شکست دے کر کامیابی حاصل کر لی۔ کونسل میں ان کی پہلی تقریر بجپٹ سے متعلق تھی۔ انہوں نے کہا "جہاں ہم حکومت میں مسلمانوں کی شرکت کا سوال ہے تو اس سلسلہ میں حکومت ان سے نا انصافی کر کے سخت غلطی کر رہی ہے۔ مسلمانوں کو قطعی میدان میں تمام تر سرکاری سرپرستی سے محروم کرنے انہیں بہاندہ رہنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر حکومت نے یہی رویہ قائم رکھا تو اس کا نتیجہ مسلمانوں میں بے اطمینانی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ یہ طبعی بات ہے کہ حکومت اس بے اطمینانی اور بددلی کو بھی نظر انداز کر دے۔ ڈھاکہ میں محض کالج اور کلکتہ میں اول درجے کا ایک کالج مسلمانوں کے لئے ہونا ضروری ہے۔ طلبہ کے لئے ہوسٹل کا قیام بھی ایک فیاد ضرورت ہے۔ علاوہ انہیں سرکاری امداد حاصل کرنے والے مدارس میں عربی اور فارسی کی تعلیم کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جب ۱۹۱۴ء میں بنگال کی صوبائی مسلم لیگ کے انتخابات ہوئے تو نواب سلیم اللہ کو صدر اور فضل الحق کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب نواب سلیم اللہ وفات پا گئے تو بنگالی مسلمانوں کی قیادت فضل الحق نے منہا لی۔ فضل الحق نے مسلم لیگ کی قیادت کے ساتھ ساتھ اپنے غور پر ۱۹۱۵ء میں کسان تحریک منظم کی۔ اس کا نام کرشک پر جاسمیتی رکھا گیا۔ جلد ہی بنگال کے بہت سے حصوں میں اس جماعت کی شاخیں قائم کر دی گئیں اور ایک وقت وہ بھی آیا جب کرشک پر جاسمیتی بنگال کی سیاست کا ایک اہم ستون بن گئی۔ بہت سے رہنماؤں نے تو اس پارٹی میں حصہ اس لئے شرکت کی کہ وہ اسے بیڑھی بنا کر سیاست میں قدم رکھ سکیں۔ اس پارٹی کا اجلاس تقریباً ہر سال ہوا کرتا تھا اور ۱۹۱۶ء تک یہ عالم تھا کہ یہ جماعت ایک ناقابل تسخیر قلعہ کی مانند ہو گئی تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے روزنامہ "نوائیگ" شائع کیا جس کی ادارت کسی دور میں نذر الاسلام کیا کرتے تھے۔ یہ روزنامہ بنگال کے کسانوں کا ترجمان تھا۔

مولوی فضل الحق کی صدارت میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۴ء کو ڈھاکہ میں بنگال پرینیڈنسی مسلم لیگ کا

اجلاس منعقد ہوا۔ اس موقع پر انہوں نے ہندوستان کی سیاست پر تفصیلی روشنی ڈالی اور ان مسائل کا ذکر کیا جو بنگال کے مسلمانوں کو درپیش تھے۔ اس موقع پر انہوں نے "تفنیخ تیسیم بنگال" کے مسئلہ پر بھی حکومت کو کھری کھری سنائیں۔ انہوں نے بنگال کے مسلمانوں کو سول سروس میں اتھاقی کم حصہ دینے پر بھی حکومت کی سخت مذمت کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ملازمتوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقلیتوں کو بھی مناسب نمائندگی دی جائے ورنہ حکومت کی کونسلوں میں عوام کی آواز قطعی طور پر غیر موثر ہو کر رہ جائے گی۔ اب مسلمانوں کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ سرکاری آسامیوں میں مناسب نمائندگی حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، اپنے مطالبات تسلیم کرائیں۔ انہوں نے پریس ایکٹ کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایکٹ برطانوی حکومت کے دامن پر ایک بدناماء جہز ہے۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس گھنٹو میں منعقد ہوا جس کی صدارت قائد اعظم نے کی۔ اس اجلاس میں مولوی فضل الحق نے بنگال کے نمائندے کے طور پر شرکت کی۔ اجلاس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اصلاحات کی ایک ایسی سیکنڈ سٹیج کرنا تھا جو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے لئے قابل قبول ہو۔ ان موقع پر انہوں نے کہا کہ اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعاون اور خیر سگالی کے جذبات کی شدید ضرورت ہے۔ یہ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے کہ ہم کس حد تک یہ تعاون اور خیر سگالی پیدا کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو ملک کی کونسلوں میں اور یونیورسٹیوں اور میونسپل بورڈوں میں مناسب اور موثر نمائندگی درکار ہے۔ اگر کوئی حیر متعصب ہندو سپے تو اسے ایک لمحہ کے لئے بھی اس معاملے میں سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔

مولوی فضل الحق نے مزید اور سنی مسلمان طلبہ کی امداد کی طرف سے ۱۹۱۲ء میں ایک منڈلیشنل کونسل آف انڈیا کی تشکیل ایسوسی ایشن قائم کی۔ یہ انہی کی مساعی کا نتیجہ تھا کہ اس ایسوسی ایشن کو مسلمان طلبہ کی امداد کرنے کے لئے حکومت بنگال سے مالی مدد ملتی رہی۔ اس کے بعد انہی کی کوششوں سے ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں مسلمان طلبہ کے لئے دو بورڈس تشکیل دیے گئے۔ مولوی فضل الحق نے ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کے سلسلہ میں بھی نہایتی شہرت آغا خان اور نواب حسن الملک کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اسی سال وہ بنگال کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں سے خواہندگی ختم کرنے کے لئے اسلامیہ کالج قائم کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمان طلبہ کے لئے بھی سرکاری سکولوں اور کالجوں میں سنسکرت لازمی تھی مگر عربی اور فارسی پڑھانے کے لئے شاف موجود نہ

تھا۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے مسلمان طلبہ کے لئے متعدد سہولتوں کا انتظام کیا اور ان میں عربی اور فارسی پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احکام بھی جاری کر دیئے کہ محکمہ تعلیم میں صرف مسلمانوں کی خاصی تعداد کو ملازم رکھا جائے بلکہ کالجوں اور ہائی سکولوں میں مسلمان طلبہ کے لئے بھی نشستیں مخصوص کی جائیں۔ اس طرح انہوں نے بنگال کے مسلمانوں پر احسان عظیم کیا۔ جب تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں سیاسی رہنماؤں نے طلبہ سے یہ اپیل کی کہ وہ سکولوں اور کالجوں میں جانا بند کر دیں تو مولوی فضل الحق نے مسلمان طلبہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ سیاسی معاملات میں الجھنے کی جگہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ بنگال ایکریٹیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۹۶۶ء، مئی، لمپنڈرز ریکٹ اور بنگال ٹینیسی ایکٹ کی منظوری کا سہرا بھی انہی کے سر پر۔ اس طرح انہوں نے بنگال کے مظلوم کاشتکار طبقہ کو ہندو سود غوروں کے کروڑوں روپوں کے مستحق سے نجات دلا دی۔ انہی کے دور میں بنگال اسمبلی نے زمینداری کا سلسلہ ختم کر دیا۔

اب شیر بنگال مولوی فضل الحق کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی وہ مسئلہ طور پر ایک سیاسی رہنما تھے۔ مسلم لیگ نے ۱۹۶۱ء میں انہیں اپنے گیارہویں سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے مدعو کیا۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کماؤ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کو خود حل کرنا چاہئے۔ اس مسئلہ میں ہندوؤں کی مداخلت ناقابل برداشت ہے۔ دراصل مولوی فضل الحق نے گاندھی جی کی طرف اشارہ کیا تھا جو خلافت کے معاملے میں پیش پیش تھے۔ مولوی فضل الحق کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کے مقدس مقامات بہر حال غنیمت مسلمانوں کے اثر و رسوخ سے پاک رہنے چاہئیں۔

فضل الحق کو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے بھی نامزد کیا گیا۔ انہوں نے انھیں سٹیٹ میں نہایت سرگرمی کا مظاہرہ کیا اور ۱۹۶۲ء کی اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جہاں جہاں انتخابات کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ ان انتخابات کی وجہ سے مسلمانوں اور دوسرے لوگوں کو ایک دوسرے سے تعاون کرنے اور مجموعی طور پر ملک کے مشترکہ مفادات کے لئے کام کرنے کا موقع نصیب ہو گا۔ آپ نے اس موقع کا اظہار بھی کیا کہ امور مملکت چلانے میں مسلمانوں کو مناسب مذاق فراہم کئے جائیں گے۔



گول میز کانفرنس کے نتیجے میں ہندوستان میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت خدمت کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد اسمبلیوں کے انتخابات ہونے اور مولوی فضل الحق کو چواکھانی کے حق سے انتخابات میں کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ بنگال اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ قائد اعظم کے کہنے پر مولوی نے مسلم لیگ میں شرکت اختیار کر لی اور متفقہ طور پر مسلم لیگ محدود پارٹی کے قیام پر متفق ہو گئے۔ اس طرح وہ وسط ۱۹۳۷ء میں بنگال کے پہلے وزیر اعلیٰ بنادیں گئے۔ ان کی کابینہ میں خواجہ ناظم الدین (مرحوم) اور سید حسین شہید سہروردی (مرحوم) بھی شامل تھے۔ شیر بنگال کا وزیر و وزارت اعلیٰ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء پر محیط ہے جسے بجا طور پر یکہ جہتی دور کہا جاسکتا ہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے پورے بنگال کا طوفانی دورہ کیا، اور مسلم لیگ کو ایک نہایت منظم سیاسی جماعت کی شکل دی۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے نکستہ میں منعقد مسلم لیگ کانفرنس سے خطاب کیا جو بے کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے انہوں نے جو اہم ترین اقدام کیا وہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے مناسب نمائندگی کا حصول تھا۔ احکام میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ صوبے کی عوامی ملازمتوں میں آئندہ جہاں تک ممکن ہو سکے مسلمانوں اور غریب مسلمانوں کے لئے مساوی پالیسی اختیار کی جائے۔

دوسری طرف جن صوبوں میں کانگریس وزارتیں قائم تھیں وہاں مسلمانوں سے نہایت ناروا سلوک کیا گیا۔ ان صوبوں میں ہندو مسلمان کو برداشت ہی نہیں کرتا تھا جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اسی کے نتیجے میں فسادات پھیلے تو ڈھاکہ تک پہنچ گئے۔ مولوی فضل الحق نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت میں ۲۳ فروری ۱۹۳۷ء کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک گول میز کانفرنس منعقد کی۔ یوں مسلمانوں اور ہندوؤں میں امن بحال ہو گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود ہندوؤں کے تعصب نے مسلمانوں کو دانش مند بنادیا۔ اب مسلمانوں کو اس بات کا صحیح اندازہ ہو چکا تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوؤں سے کیا سلوک کرے گا۔ آئندہ ماہ ۲۲، ۲۳ اور ۲۴ تاریخ کو لاہور میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس قائد اعظم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ۲۳ تاریخ کو مولوی فضل الحق نے قرارداد پاکستان پیش کی۔ اس موقع پر مولوی فضل الحق نے کہا کہ مسلم ہندوستان ایسے کسی آئین کو کسی قیمت پر قبول نہیں کرے گا جس کی تصدیق مسلمانوں سے نہ کرائی گئی ہو اور اگر ان پر کوئی آئین ٹھونسے گا تو وہ نہ صرف اس کی مخالفت کریں گے بلکہ اسے نافذ کرنا عمل بھی بنادیں گے انہوں نے مزید کہا کہ ہندوستان میں نہ کروڑ مسلمان ہیں۔ پنجاب اور بنگال میں ان کی واضح اکثریت

ہے لیکن ہم اسے نوثر اکثریت کا نام نہیں دے سکتے۔ موصوف نے اس دوران مولانا ابوالکلام آزاد کی اس بات کی بھی شدید مذمت کی کہ مسلمانوں کو گھبرانے یا خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مولوی فضل الحق نے کہا کہ مولانا ابوالکلام کی یہ بات غیر اسلامی ہے۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کروڑوں کوئی معمولی تعداد نہیں۔ یہی مسلمان کو گھبرانے کی کوئی ضرورت ہے انہوں نے مسلمانوں کو انتباہ کیا کہ اگر وہ کاحیاب ہونا چاہتے ہیں تو قائد اعظم کی قیادت میں ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو جائیں اور مسلم لیگ کے پرچم پر جمع ہو جائیں۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مولوی فضل الحق بنگال اسمبلی کے لئے دو حلقوں سے بیک وقت کاحیاب ہوئے۔ ان کی یہ کامیابی عوام میں ان کی مقبولیت کی واضح دلیل تھی۔ اس وقت مسلم لیگ کے ساتھ ان کے اختلافات پیدا ہو چکے تھے اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے (جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے) فضل الحق سے کانگریس میں شمولیت کی درخواست کی نیز عارضی کابینہ میں ان کی نامزدگی کا سہرا بھی دکھایا لیکن مولوی فضل الحق نے ان کی یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ نمبر ۱۹۴۶ء میں لکھنے کے کچھ مسلمان ایک وفد کی صورت میں ان کے پاس آئے اور امراد کیا کہ وہ دوبارہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ مسلمانوں کے اسی وفد نے قائد اعظم سے بھی ملاقات کی اور درخواست کی۔ مولوی فضل الحق پر جو پابندیاں مائد ہیں انہیں ختم کر دیا جانے۔ یہ کوشش کامیاب ہوئی اور مولوی فضل الحق دوبارہ مسلم لیگ میں آ گئے۔ ۱۹۴۶ء کے اواخر میں جب ملک کی تقسیم پر برطانوی حکومت نے آمادگی ظاہر کر دی تو کانگریس، مسلم لیگ اور ریڈ کلفٹن کشن کو دو نئے ممالک کی سرحدوں کے تعین کا کام سونپا گیا۔ اس موقع پر فضل الحق نے کمیشن پر دودھیا کہ کھانا کے ضلع کو پاکستان میں شامل کیا جانے اپنی کی مساعی کی وجہ سے کھانا پاکستان میں شامل کیا گیا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد جب مولوی فضل الحق پاکستان پہنچے تو ان کی عمر ۷۵ سال کے قریب تھی۔ ۱۹۵۱ء میں وہ مشرقی پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل مقرر کئے گئے اور جب مشرقی پاکستان اسمبلی کے انتخابات قریب تھے تو انہوں نے حزب مخالف کے طور پر متحدہ محاذ قائم کیا۔ انتخابات میں متحدہ محاذ کو سبوتاہ طور پر کامیابی حاصل ہوئی اور مولوی فضل الحق مشرقی پاکستان کے وزیر مقرر ہو گئے۔ بعد ازاں وہ مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ اور مشرقی

پاکستان کے گورنری رہے۔

ان کی صحت مسلسل خراب ہو رہی۔ کچھ عرصہ کا قضا بھی تھا جو ۸۲ برس سے  
تھاؤز کر چکی تھی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۶۲ء کو صبح کے وقت یہ مجاہد آزادی اس دہائی  
سے کوچ کر گئے۔

## مولانا حسرت موہانی

۱۸۷۵ء تا ۱۹۵۱ء

مولانا حسرت موہانی ۱۸۷۵ء میں موہان کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ غازی  
روایات کے تحت ان کی ابتدائی تعلیم ایک قاضی کتب میں ہوئی جہاں انہوں نے قرآن کریم،  
حدیث اور فقہ وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ بعد ازاں انہوں نے عربی اور فارسی سیکھنا شروع کر دی۔ پھر  
اردو کی طرف توجہ دی۔ آٹھویں درجہ کا امتحان انہوں نے ۱۸۹۱ء میں پاس کیا اور صوبہ بھر میں  
اول آئے۔ موہان میں کوئی ہائی سکول نہ تھا لہذا وہ مدرسہ تعلیم کی غرض سے موہان سے فتح پور چلے گئے  
جہاں انہیں گورنمنٹ ہائی سکول میں داخلہ مل گیا۔ ۱۸۸۹ء میں میٹرک کر کے علی گڑھ کالج میں داخلہ  
لینے کے لئے چلے گئے۔ شاعری کا آغاز سکول کے دور ہی میں کر دیا تھا اور رفتہ رفتہ لوگ انہیں بطور  
شاعر جاننے لگے تھے۔

علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل نے محسوس کیا کہ حسرت موہانی میں انقلابی "جوائزم" موجود ہیں۔  
یہ حقیقت بھی ہے کہ کالج کی زندگی ہی سے حسرت موہانی کو انگریز حکومت سے شدید نفرت تھی۔ یہی وجہ تھی  
کہ حسرت موہانی کو ایسی سرگرمیوں کے الزام میں تین بار کالج سے نکالا گیا مگر وہ نواب محسن الملک سیکڑی  
کالج کے چیتے تھے لہذا انہی کی وجہ سے ہمیشہ دوبارہ داخلہ ملتا رہا۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت نے بی اے  
کا امتحان پاس کر لیا۔ اس دوران انہیں متعدد ملازمتوں کی پیشکش کی گئی مگر حسرت موہانی نے  
کوئی قبول نہ کی۔ دراصل وہ ملازم بن کر رہنے اور کسی کو ملازم بنا کر رکھنے کے قائل ہی نہ تھے۔ آزاد  
طبیعت پائی تھی۔ مناسب سمجھا کہ صحافت کا پیشہ اختیار کریں لہذا انہوں نے بی۔ اے کرتے ہی  
ایک جریدہ "اردوئے معلیٰ" کے نام سے جاری کیا۔ اس جریدہ میں برطانیہ کے خلاف مواد موجود  
ہوتا تھا، انگریز حکومت نے اس جریدے کی نگرانی شروع کر دی۔ ۱۹۰۶ء میں جب ایک مضمون  
"عبرت ان" "مصر میں برطانیہ کی پالیسی" شائع ہوا تو انگریز حکومت کو ان پر وار کرنے کا موقع مل گیا۔

اس مضمون پر حکومت کی طرف سے اعتراض کیا گیا اور عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ مگر حسرت موہانی نے کسی قیمت پر بھی مضمون نویس کا نام ظاہر نہ کیا۔ یہ مضمون نویس علی گڑھ کا ایک طالب علم تھا اور حال میں یہ تھا کہ شہر کا کوئی کیل انگریز کے استبداد کی وجہ سے ان کے مقدمہ کی پیروی کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ مقدمہ کی سماعت محض دکھاوے کے لئے کی گئی اور انہیں چار سال قید با مشقت اور پانچ سو روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ حسرت کے پاس اتنی رقم کہاں تھی کہ جرمانہ ادا کر سکتے مگر ان کی نادار کتب پر مشتمل لائبریری سیلام کر دی گئی جس سے صرف سٹھ روپے جمع ہوئے۔

حسرت موہانی کو جیل بھیج کر بھی انگریز کے انتقام کی آگ ختم نہ ہوئی۔ قید و بند میں ان سے شدید مشقت لی جاتی اور طرح طرح کے ظلم و ستم جاتے۔ انہیں بالعموم قید تنہائی میں رکھا جاتا۔ کئی کئی گھنٹوں تک بجلی میں اسی سپورایا جاتا۔ انہیں روزانہ ایک من مخمدم پینا پڑتی۔ یہ سلسلہ ایک سال تک جاری رہا۔ علی گڑھ جیل سے انہیں الہ آباد جیل منتقل کر دیا گیا۔ حکومت نے انہیں جیل سے منتقل کیا تھا مگر کرایہ بھی انہی سے وصول کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حسرت کے پاس پیسہ بالکل نہ رہا۔ وہ تھوڑے سے چنے پانی میں جھگوڑے اور رات کو کھا کر سو رہتے۔ الہ آباد جیل میں ایک بار ان کے والد ملقات کے لئے آئے تو ملنے کی اجازت دے دی گئی۔ سچی کہ حسرت موہانی کو ان کی آمد سے بھی مطلع نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے والد اسی غم میں کچھ دنوں بعد انتقال کر گئے۔ والد کی اس انداز میں موت کا حسرت کو کبھی شدید دکھ نہ ہوا اور اب انگریزوں کے خلاف ان کے اطوار میں مزید تلخی پیدا ہو گئی۔ انگریز نے اس حد تک پست ذہنیت کا مظاہرہ کیا کہ حسرت تک ان کے والد کی وفات کی اطلاع بھی نہ پہنچنے دی۔ ایک بار سپرنٹنڈنٹ جیل ان کی کوٹھڑی میں آیا اور ان کے تمام اخبارات، رسائل اور دیوان حافظ و غمیسہ نذر آتش کر دیئے۔ اس کے بعد اپنے دفتر میں طلب کر لیا۔

۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے فراغت کے بعد ہی سے حسرت موہانی کی سیاسی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں سورت میں کانگریس کا جو اجلاس منعقد ہوا وہ خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ کانگریس دو گروپوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک گروپ کی قیادت دادا بھائی نوروجی کر رہے تھے اور دوسرے یعنی اتھاپنڈ گروپ کی قیادت تیلک کے ہاتھ میں تھی۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی کانگریس کے اجلاس سورت میں شرکت کی۔ وہ ملکات گروپ کے

ساتھ تھے۔ بعد ازاں ملک نے کانگریس سے قطعاً کٹ کی بنا پر استغفا دے دیا تو حسرت میں ایک ہو گئے۔ ان دنوں مولانا حسرت موہانی کو بعض ساتھیوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر کے مسلم لیگ میں شمولیت کا مشورہ بھی دیا مگر وہ نہ مانے۔

جب ہندوستان میں سودیشی تحریک کا آغاز ہوا تو حسرت نے اس تحریک کا ساتھ ختم کر دیا۔ وہ اس بات کے حق میں تھے کہ ہندوستانیوں کو تمام غیر ملکی اشیاء کا مکمل بائیکاٹ کر دینا چاہئے۔ انہوں نے ایک سودیشی سٹور قائم کر دیا۔ ان کے پاس تو تھا ہی کیا۔ مولانا شبلی نعمانی کی سفارش پر بمبئی کے سرفضل بھائی کریم بھائی نے انہیں رقم فراہم کی۔ یہ سٹور خوب چلا۔ حسرت موہانی کی اس کامیابی پر شبلی نعمانی نے کہا:

”تم انسان ہو کہ جی۔ ہ پلے تم شاعر تھے۔ پھر تم سیاست دان بنے۔ اب تم بننے ہو گئے ہو۔“

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں شروع میں مولانا حسرت موہانی مسلم لیگ سے دور دور رہے۔ مگر جب ۱۹۱۳ء میں قائد اعظمؒ نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور عوامی حکومت کا نعرہ لگایا گیا تو حسرت موہانی نے کہا ”الحمد للہ! مسلم لیگ نے ۱۹۱۱ء میں وہ نعرہ لگایا جو میں نے ۱۹۰۷ء میں بتدیتاً تھا۔ لہذا ۱۹۱۵ء میں حسرت موہانی نے مسلم لیگ میں باضابطہ شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد سے انہوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کو قریب کرنے کے لئے مسلسل کنگ و دو شروع کر دی۔ مولانا نے ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ احمد آباد کی صدارت کی۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

”مسلمان کی حیثیت میں ہمارے لئے اتنا ہی کافی نہیں کہ ہم مکمل آزادی کے مطالبہ پر اکتفا کریں بلکہ ہمیں اس کا تین بھی کرنا ہو گا کہ یہ حکومت ہوگی کس قسم کی؟ گو ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں مگر خدا کا فضل ہے کہ بعض صوبوں میں ان کی واضح اکثریت موجود ہے۔ مثلاً کشمیر، سندھ، پنجاب، بلوچستان اور آسام وغیرہ ایسے ہی صوبے ہیں۔“

یہ وہ دو مطالبہ گاندھی کو عروج حاصل تھا۔ گاندھی ہی کی تحریک پر کانگریس نے ”سوراج“ کے لفظ کو اپنایا تھا۔ جب کانگریس کے کئے اجلاس میں ”سوراج“ کی بات

کی گئی تو مولانا نے گرج کر کہا کہ یہ لفظ بے اُردو اور بے معنی ہے۔ ضروری ہے کہ جیسے لفظ لکھنا  
 میں اس کے معنی کو واضح کیا جائے اور یہ مفہوم مسترवाद میں شامل  
 کیا جائے کہ

”سوراج سے ہماری مراد بیرونی کنٹرول سے آزاد مکمل آزادی ہے۔“

مولانا حسرت موہانی کی یہ تقریر سن کر گاندھی جی بہت بوکھلائے اور مولانا کی اس ترمیم کی  
 مخالفت کی۔ گاندھی جی نے حسبِ عادت کہا: بعض لوگوں کے رویتے سے مجھے شدید دکھ پہنچا ہے۔  
 ایسی بات کرتے وقت خود داری سے کام نہیں لیا جاتا۔ سب سے پہلے خودی ہے کہ ہم اپنے  
 اندر مکمل اتحاد پیدا کریں۔ ہمیں پانی کی گہرائی کا اندازہ کے بغیر اس میں  
 نہیں کودنا چاہیئے۔ حسرت موہانی نے جوابات کی ہے وہ گہرائی کا اندازہ کئے  
 بغیر کی ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ جب حسرت موہانی نے مکمل آزادی کی بات کی تو گاندھی جی نے ”سوراج“  
 کے لفظ میں ہی پناہ ڈھونڈنے میں غیریت جانی۔ مگر ”سوراج“ کو ”مکمل آزادی“ کا مفہوم دینے سے  
 گریز کیا۔ کانگریس — گاندھی جی کے زیرِ اثر تھی لہذا حسرت موہانی کی ترمیم کو کون پوچھتا تھا۔ کانگریس  
 کی یہ قرارداد ”سوراج“ کے لفظ کے ساتھ ہی منظور کی گئی مگر حسرت کا وہ اہواز کون چھین سکتا ہے  
 جو انہوں نے پہلے ہندوستانی کی حیثیت میں ہندوستان کی مکمل آزادی کے مطالبہ کی صورت میں  
 حاصل کیا تھا۔

اسی وقت سے مولانا حسرت موہانی اور گاندھی جی کے درمیان ٹھن گئی۔ ۱۹۳۰ء میں

کانگریس نے سیتہ گروہ تحریک شروع کر دی۔ اس موقع پر حسرت موہانی نے خود کو گرفتاری کے لئے  
 پیش کر دیا۔ واقعہ دلچسپ ہے۔ گھٹو کے امان الہیادک میں جلسہ تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے  
 تقریر شروع کی تو برطانوی سامراج کو کھری کھری سنائیں۔ پارک کے باہر پولیس خاصی تعداد میں  
 موجود تھی۔ تقریر کے دوران تو پولیس نے کچھ نہ کہا مگر جونی ان کی تقریر ختم ہوئی، پولیس ان پر  
 جھپٹ پڑی۔ مولانا نے پولیس کی لاری تک جانے سے انکار کر دیا اور زمین پر لیٹ گئے۔ وہ مسلسل  
 انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ ٹیگ آکر پولیس نے مولانا حسرت موہانی کو اٹھا کر  
 لاری میں رکھ دیا اور جیل پہنچا دیا۔

۱۹۲۵ء میں جب ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانفرنس کا انعقاد ہوا تو حسرت اسکی استقبال یہ کمپنی کے چیرمین تھے۔ برطانیہ کے لئے کمیونسٹوں سے زیادہ خوفناک اور خطرناک چیز کوئی نہ تھی۔ لیکن کمیونٹا اور نیو چرٹھار۔ حسرت موبانی اور کمیونسٹ پارٹی۔ انگریز کے کان کھڑے ہو گئے۔ حسرت موبانی نے اس پابنڈی کے پیٹ فارم سے برطانوی استبداد کے خلاف دھواں دھار نکھاری کی۔ انہوں نے کہا:

”کیونکہ ہم کارکنوں اور کاشت کاروں کی ایک تنظیم و تحریک ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کمیونزم کسی دہشت پسندی کا نام ہے مگر ہم عدم تشدد پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہماری آزادی۔ عسکریت حکومت کے طرز پر ہونا ضروری ہے۔“

۱۸۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو کھٹنوی مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ حسرت موبانی نے اپنی قرارداد ”مکمل آزادی“ کے لئے اراکین کو قائل کرنا شروع کر دیا۔ مگر قائد اعظم اس قرارداد کے حق میں تھے۔ مسلم لیگ کے عام اجلاس میں حسرت موبانی نے یہ قرارداد پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ اس قرارداد کی حمایت مولانا ظفر علی خاں، حسین امام، عبدالرحمان صدیقی اور چودھری خلیق الزماں نے کی۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد مولانا حسرت موبانی نے کھٹنوی ہی میں مستقل قیام پسند کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۷ سال کے لگ بھگ تھی اور صحت بھی خاصی گر چکی تھی۔ ۱۲۔ مئی ۱۹۵۱ء کو وہ کھٹنوی میں انتقال کر گئے۔

## محمد علی جناح

۱۸۷۶ء تا ۱۹۴۸ء

محمد علی جناح ۲۵۔ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہیں سب سے پہلے گجراتی کی تعلیم دی گئی۔ ۳۔ جولائی ۱۸۸۷ء کو انہیں سندھ مدرستہ الاسلام میں داخل کر دیا گیا۔ چوتھی جماعت میں وہ اس سکول سے چلے گئے کیونکہ ان کی شادی کا اتہام کر دیا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی کیونکہ گجراتی تعلیم کے بعد انہیں گیارہ سال کی عمر میں سکول میں داخل کیا گیا تھا۔ جب ان کی عمر سولہ سال کی ہوئی تو فریڈرک کرافٹ نے انہیں مزید تعلیم کے لئے لندن بھیجے کا مشورہ دیا۔ ۱۸۹۲ء میں محمد علی جناح قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن روانہ ہو گئے وہاں انہوں نے ایکس

انگریز کتبہ کے ساتھ رٹائٹس اختیار کی۔ اس مقام پر بعد ازاں لندن کورٹ کونسل کی طرف سے یہ تحریر نصب کی گئی (جو آج تک موجود ہے) قائد اعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء تا ۱۹۴۸ء) باقی پاکستان یہاں پر ۱۸۹۵ء تک مقیم رہے۔ بیرٹری کرنے کے بعد ۱۸۹۶ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ قائد اعظم کے مطابق انہوں نے قانون سے محض اس بنا پر دلچسپی لی کہ ممکن ان کے صدر دروازہ پر دنیا کو قانون دینے والوں کی فہرست میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک بھی شامل تھا۔ ۱۸۹۵ء میں وہ بار کے رکن ہو چکے تھے اور ان کا شمار ہندوستان کے سب سے کم عمر بیرٹری کے طور پر ہوتا تھا۔ محمد علی جناح جس وقت ہندوستان لوٹے تو گھر کا نقشہ بدلا دیا۔ دولت ختم ہو چکی تھی۔ والد کا کاروبار تباہ ہو چکا تھا اور گھر کا اثاثہ تک قرض خواہوں کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ کراچی سے بمبئی آ گئے اہل خانہ بالکل بے گھر تھے۔ ان کے ابتدائی تین سال انتہائی عسرت میں گزرے تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ کچھ عرصہ بعد انہیں عارضی طور پر پینڈیٹنسی مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ مبعاد ختم ہونے پر انہیں پندرو سو روپے ماہانہ ملازمت کی پیش کش کی گئی مگر محمد علی جناح نے اسے یہ کہہ قبول نہ کیا کہ اب وہ اتنی رقم روزانہ کما سکتے ہیں اور فی الواقع جلد ہی ان کی پریکٹس خوب چل نکلی۔

۱۹۰۶ء میں قائد اعظم، دادا بھائی نوروجی کے ساتھ فنیش کانگریس کے اس تاریخی اجلاس میں شریک ہوئے جو کلکتہ میں منعقد ہوا تھا اور جس میں دادا بھائی نے ہندوستان کے لئے حکومت نو اختیار کی کا خاکہ پیش کیا تھا۔ اسی اجلاس میں محمد علی جناح نے وقت علی الاداؤ کے قانون کی فوری ضرورت پر تقریر کی۔ کانگریس کے اجلاس میں یہ ان کی پہلی تقریر تھی۔ اسی تقریر کا اثر تھا کہ بعد ازاں ہر سیاسی ماحول میں ان کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جانے لگا۔

۱۹۱۰ء میں سرولیم کی زیر صدارت الہ آباد میں مسلمان اور ہندو رہنماؤں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں دونوں کے اختلافی مسائل کے حل پر غور کیا گیا۔ محمد علی جناح نے اس کانفرنس میں نہایت گرم جوشی سے حصہ لیا۔ اسی سال انہیں بمبئی کے مسلمانوں کی طرف سے امپیریل مجسٹریٹ کونسل کا رکن چن دیا گیا۔ جب اس کونسل میں انہوں نے وقت بل پیش کیا تو مسلمان اور ہندو دونوں ہی ان کی سیاسی قابلیت اور لڑائیت کے قابلِ غور تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی وقت سے ہندوستان کے مسلمانوں نے انہیں اپنے سیاسی رہنماؤں کے دائرے میں شامل کر لیا۔ ۱۹۱۲ء کے وسط میں مسلمان



رہنماؤں کی ایک کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں مسلم لیگ کے سیاسی دستور میں حالات کے اعتبار سے ترمیم کی تجویز منظور کی گئی۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے پہلے یہ طے پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بیکرٹری سرورپ جسنی سارے ملک کا دورہ کریں گے اور دستور پر نظر ثانی کے بارے میں مسلمانوں کی رائے معلوم کریں گے۔ ان کے دورے کے بعد اسی سال کے اواخر میں مسلم لیگ کونسل کا ایک خاص اجلاس سرانجاموں کی صدارت میں منعقد ہوا اور ضروری ترمیم کے بعد مسلم لیگ کے دستور سیاسی کا جدید مسودہ تیار کر دیا گیا جسے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس گھنٹوں میں ۲۶ مارچ ۱۹۱۳ء کو منظور کیا گیا۔

ابتداء میں محمد علی جناح مسلم لیگ سے الگ تھلک رہے۔ گو وہ کلکتہ کانفرنس میں بھی شریک ہوئے تھے لیکن علی طور پر انہوں نے مسلم لیگ سے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی تھی۔ انہوں نے چلے با۔ ۱۹۱۳ء کے اجلاس گھنٹوں میں مسلم لیگ کے ساتھ اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور مسلم لیگ کے بھید دستور کی اس دفعہ کی نہایت سرگرمی سے تائید کی جس میں مسلم لیگ کا سیاسی سطح نظر بھی وہی قرار پایا گیا تھا جو اس وقت کانفرنس کا نصاب تھی۔

”تاج برطانیہ کے زیر نگین، آئینی طریقوں سے ایسی خود اختیاری حکومت حاصل کرنا جو ہندوستان کے حالات کے مطابق ہو۔“

اپریل ۱۹۱۳ء میں محمد علی جناح اور گورکھ پورپ روانہ ہو گئے۔ انہوں نے وہاں چہیتے ہی لندن انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس طرح انگلستان میں تمام ہندوستانی طالب علم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ اس دوران محمد علی جناح کی ذاتی سرگرمیوں سے اس ایسوسی ایشن کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ انڈیا آفس نے محض اس ادارے کے مطالبہ پر وہاں کے کالجوں کی تعلیم اور داخلہ کے سلسلہ میں ہندوستانی طالب علموں کی جائز شکایت کی پڑتاں کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ اس کامیابی کے بعد اسی سال اکتوبر میں محمد علی جناح کے ہندوستان میں واپس ہونے سے پہلے مولانا محمد علی اور وزیر حسن نے ان دنوں یہ دونوں لندن ہی میں تھے، محمد علی جناح کو مجبور کیا کہ وہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کریں۔ محمد علی جناح اس وقت تک مسلم لیگ کے جلسوں میں شمولیت کے باوجود باقاعدہ رکن نہیں بنے تھے۔ آئندہ کار انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔

مئی ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا کانگریس نے انڈیا کونسل کی مجوزہ اصلاحات کے سلسلہ میں اپنا

ایک وفد لندن بھیجا جس کے ممتاز رکن محمد علی جناح تھے۔ اس سال لندن جانے سے پہلے انہوں نے انڈیا کونسل کی مجوزہ اصلاحات کے خلاف کانگریس کے کراچی اور مسلم لیگ کے آگرہ والے اجلاس میں قراردادیں منظور کرائی تھیں۔ اس موقع پر انہوں نے حکومت برطانیہ کے سامنے جس انداز میں ہندوستانیوں کا صلح منظر پیش کیا اس نے انگریزوں پر بھی ہندوستانیوں کی سیاسی فہم و تدبر کا سکھ بٹا دیا۔ انگلستان کا کوئی اخبار ایسا نہ تھا جس نے اس موقع پر محمد علی جناح کے انٹرویو شائع نہ کئے ہوں۔ نہ ہی لندن کی کوئی سیاسی جماعت ایسی تھی جس میں ان کے بیانات کا چرچا نہ ہوا ہو۔

فروری ۱۹۱۵ء میں گویاں کرشنا گوکھلے کا انتقال ہو گیا۔ جہاں تک گوکھلے کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں قائد اعظمؒ نے کہا تھا،

”گوکھلے ہندوستانی سیاست کا امام ہے جس نے اپنی قوم میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ میری دلی تائبہ کہ میں مسلمانوں کا گوکھلے بن جاؤں۔“

اور قائد اعظمؒ کی یہ خواہش پوری ہوئی۔ اس وقت جب محمد علی جناح، قائد اعظمؒ بھی نہ ہوا تھا، گوکھلے نے اسی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا،

”محمد علی جناح میں بڑی صلاحیتیں ہیں۔ سیاسی مسائل میں ان کا فز واز اور مذہبی تعصب سے آزاد انداز انہیں ایک دن ہندو مسلم اتحاد کا بہترین قاصد بنا دے گا۔“

ممكن ہے کانگریس کی نظروں میں آج قائد اعظمؒ وہ نہ رہے ہوں جو وہ گوکھلے کے زمانے میں تھے لیکن اس میں محمد علی جناح کا کوئی قصور نہیں۔ بات تو ہندو کے تعصب پر اگر کوئی ہے — ۱۹۱۹ء کے بعد خود کانگریس کے سیاسی نقطہ نظر میں جو تبدیلیاں ہوئیں محمد علی جناح کو بھی انہی کی بنا پر اپنی پالیسی بدلنا پڑی۔

بہر حال گوکھلے کی بے وقت موت کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے شہادت کے ساتھ محسوس کیا۔ محمد علی جناح نے ہندو مسلم اتحاد کی طرح ڈالی۔ اسی سال بمبئی میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا محمد علی جناح نے کوشش کی کہ اس سال مسلم لیگ کا اجلاس بھی بمبئی ہی میں منعقد ہو۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کا اجلاس پٹنہ کے ایک برسر منظر راجی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے اس مشترکہ اجتماع کو تاریخی حیثیت حاصل ہوئی۔ اسی اجتماع میں پہلی بار ہندو مسلم معاہدہ کی پیشکش

پہلی مرتبہ بار آور ہوئیں۔ محکمہ جنت کی قیادت میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی اور ہندو مسلمانوں میں سیاسی مفاہمت کی سکیم تیار کرنے کا کام کیپٹی کے سپرد کیا گیا۔ اس وقت ہندوستان کی سیاسی حالت یہ تھی کہ حکومت کی طرف سے (۱۹۱۷ء میں) اصلاحات کی دوسری قسط ہندوستان کو ملنے والی تھی اور کانگریس نے ملک میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی۔ لیکن کانگریس کا یہ خواب اس وقت تک پورا نہ ہو سکا تھا جب تک وہ ہندوستان کی وہ سری بڑی اکثریت یعنی مسلمانوں کے ساتھ سیاسی مفاہمت نہ کرتی۔ اور مسلمانوں کو یہی مجوزہ اصلاحات کے معاملے میں خسارہ منظور نہ تھا۔ اصلاحات کا اثرا چھوٹا اس وقت تک حکومت پر نہیں پڑ سکا تھا جب تک ہندوستان کی اہم سیاسی جماعت سے مجبور نہ ہو جاتا۔ اس لئے مسلمانوں کے ذمہ دار حلقوں نے مفاہمت کی پستی خواہش پیدا ہو گئی اور ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے فضا ساز کار ہو گئی۔ اس موقع پر مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کی نظریں محمد علی جناح پر پڑیں۔ انہوں نے یہ اہم اور بڑا کام قبول کر لیا اور ایک ایسی سکیم تیار کی جس پر عمل کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی مفاہمت ہو سکتی تھی۔

نومبر ۱۹۱۷ء میں کلکتہ میں ہندوؤں کی زیر صدارت مسلم لیگ اور کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا اور محمد علی جناح کی قیادت میں وہ ميثاقِ مشرب کیا گیا جسے ميثاقِ لکھنؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس ميثاق کی توثیق مسلم لیگ نے ۱۲ دسمبر ۱۹۱۷ء کو لکھنؤ کے اجلاس میں کر دی اس موقع پر محمد علی جناح نے کہا،

”میں ہمیشہ سے پکا کانگریسی ہوں اور فرقہ وارانہ پالیسی کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود میرے نزدیک مسلمانوں پر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد لگ بنانے کا جو الزام لگایا جا رہا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس موقع پر مجھے ایک عظیم الشان قومی تمام نہایت تیزی کے ساتھ عالم وجود میں آ رہا ہے۔ ایک اقلیت والی قوم کے لئے اس قومی نظام کی تشکیل میں حصہ لینے سے پہلے اپنی انفرادیت کی مکمل حفاظت کا اطمینان حاصل کر لینا بہت ضروری ہے اور یہ اطمینان ایک منفرد قوم کی حیثیت میں اپنی سیاسی مبنی کے کامل اور موثر تحفظ ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ ميثاقِ لکھنؤ کی رو سے میرے کیا خیال یہ ہے کہ مجالس قانون ساز کے آئندہ انتخابات میں ہندوستان کی اہم اقلیتوں کو موثر نمائندگی حاصل رہے اور یہ بھی طے پایا ہے کہ صوبوں کی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی خاص نشستوں کے ذریعے کی جائے۔ چنانچہ اس تصفیہ کی رو سے صوبوں کی کونسلوں میں

ان کی نیابت کا تناسب یہ ہوگا۔ پنجاب ۵ فیصد، بنگالی ۴ فیصد۔ صوبہ متحدہ ۳۰ فیصد، ہریانہ ۱۵ فیصد،  
صوبہ متوسطہ ۱۵ فیصد، اسی ۵ فیصد اور بھٹی ۳۳ فیصد۔

میسلیٹو کونسل کے منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کی کل تعداد کا ایک تہائی حصہ مسلمان  
ہوگا۔ مختلف صوبوں میں جداگانہ حلقہ آئے انتخاب سے مسلمان ممبروں کا انتخاب عمل میں آئے گا اور  
اسی تناسب سے برصوبے میں انتخاب ہوگا، جو تناسب صوبائی کونسلوں میں مسلمانوں کو  
حاصل ہے۔

اسی سال بمبئی کے مسلمانوں نے محمد علی جناح کو دوسری بار وائسرائے کی کونسل کے نئے  
نائب منتخب کیا۔ ابھی تک ہندو ماساجدانے قیاق کھنکھ کی توثیق نہیں کی تھی اور نہ ہی ہندوؤں  
نے جماعتی حیثیت میں اسے تسلیم کیا تھا تاہم کانگریس اور مسلم لیگ کی ایک مشترکہ کمیٹی بن گئی جسے  
اصلاحات کی یکجہ مترب کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ یہ یکجہ حکومت کے سامنے پیش کر دی گئی۔ لیکن اس میں  
موجود مسلم مطالبات کا کچھ پاس نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے عام مسلمانوں کو شکایات  
پیدا ہو گئیں۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ انتہائی سیاسی بحران کا زمانہ تھا۔ کئی نئی سیاسی تحریکیں پیدا  
ہو گئی تھیں اور اس دور میں محمد علی جناح کانگریس کی پالیسیوں سے اتفاق نہ ہونے کی بناء پر  
خاموش تھے۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی نے "ترک موالات" کی تجویز پیش کی۔ سیاسی رہنما اس تجویز پر  
غور کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ ان میں محمد علی جناح بھی شامل تھے۔ وہ ان تجاویز  
سے مطمئن نہ ہو سکے۔ اور اس طرح کانگریس کے ساتھ محمد علی جناح کا  
تعلق ختم ہو گیا۔

۱۹۲۲ء کے بعد فرقہ وارانہ منافرت کا آغاز ہوا۔ ہندوؤں کی بعض متعصب تنظیموں نے ہندوؤں  
اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کر دیئے۔ یہی وہ دور تھا جب مسلمانوں نے شدت کے  
ساتھ محسوس کیا کہ ہندوؤں کو دھوکہ دے کیا ہے۔ جنہوں نے سیاسی جنگ میں مسلمان کے کندھے  
پر ہندوؤں کو کھ کھلائی اور سیاسی اقتدار کا شمار خود کھیلے۔ گو اس موقع پر مسلمان رنجائوں نے  
ہندو اور مسلمان کے درمیان مفاہمت کی چوڑی کوشش کی مگر بات نہ بنی۔ کیونکہ اب ہندو کو مسلمانوں  
کی خاص ضرورت نہ تھی۔ مفاہمت میں ناکامی کے باعث خود مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس  
موقع پر (۱۹۲۴ء میں) محمد علی جناح ایک بار پھر مسلم لیگ کی شیج پر نظر آئے۔ انہوں نے ۱۹۲۶ء

میں مسلمانوں کو دن رات کوشش کے بعد مسلم لیگ کے پرچم تلے جین کیا۔ اس موقع پر ہندو مسلم مخالفت کی ایک اور کوشش کی گئی۔ کانگریس نے تجمہ ویر کو مان بھی دیا۔ لیکن بعد ازاں ان کا پاس نہ کیا۔

۱۹۲۰ء میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا۔ کانگریس نے اس کا بیٹیکاٹ کر دیا۔ محمد علی جناح نے بھی اس معاملے میں کانگریس کا ساتھ دیا لیکن مسلم لیگ کے اندر محمد شفیع کی قیادت میں ایک ایسے جماعت پیدا ہو گئی جس نے سائمن کمیشن سے تعاون کا فیصلہ کر لیا۔ لہذا مسلم لیگ کے اندر بھی پٹیٹ پڑ گئی۔ اس دوران کانگریس نے دلی میں مجلس عامہ کا اجلاس طلب کیا اور ہندوستان کے لئے دستور مرتب کرنے کی خاطر تمام جماعتوں کے نمائندے کو اجلاس ہوتے رہے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ایک اور کمیٹی تشکیل کی گئی جس نے رپورٹ مرتب کی اور کانگریس نے اس پر غور کرنے کے لئے ایک اور نسل جماعتی کانفرنس طلب کر لی۔ محمد علی جناح نے شرکت کی مگر ہندو مسلسل تعصب سے کام لے رہا تھا لہذا کسی فیصلہ پر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اسی اجلاس میں محمد علی جناح نے ۵۵ چوڑے نکات پیش کئے جو بعد ازاں ہندوستانی مسلمانوں کی جداگانہ سیاست کی بنیاد قرار پائے۔ ۱۹۳۰ء میں لندن میں ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا تاکہ سائمن کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں ہندوستان کے لئے ایک جدید دستور مرتب کیا جاسکے۔ کانگریس نے شرکت سے انکار کر دیا۔ ۱۳ نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں پہلا اجلاس ہوا اور محمد علی جناح نے شرکت کی۔ مگر یہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔

۴۔ اپریل ۱۹۳۲ء کو حافظ جبرایت اللہ کی زیر صدارت مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں محمد علی جناح کو مستقل صدر منتخب کر لیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے انتخابات میں محمد علی جناح کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ایک پارلیمانی بورڈ قائم کریں جس میں کم از کم ۳۵ ممبر شامل ہوں۔ ۱۹۳۶ء میں عام انتخابات کا آغاز ہوا اور مسلم لیگ کو مجالس قانون ساز میں باری باری گروپ قائم کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی کوششوں سے بنگال اور پنجاب کی وزارتوں سے مسلم لیگ کا معاہدہ ہو گیا۔ آسام میں لیگ کی وزارت قائم ہوئی لیکن بعد میں ٹوٹ گئی۔ سندھ میں بعض مسلمان ممبروں کی وعدہ خلافی کے باعث وزارت قائم نہ ہو سکی۔

جب دوسری عالمگیر جنگ کے دوران حکومت برطانیہ کو ہندوستانی عوام کی مکمل حمایت کی ضرورت پیش آئی اور حکومت نے خود بات چیت کا آغاز کیا تو مسلم لیگ کی مجلس عامہ نے دسمبر ۱۹۴۱ء میں یہ قرارداد منظور کی کہ مسلم لیگ ملک کے دفاع کے لئے حکومت کے تمام بشارت کام کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ مرکز اور صوبوں میں حقیقی ذمہ داریاں سونپی جائیں۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو سرسید فورڈ کورس سیاسی مشن پر ہندوستان پہنچے اور انہوں نے کسی حد تک مسلمانوں کے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۲ء کو محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے اجلاس کو اچھی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے پیچھے کوڑوں عوام ہیں۔ ہمارا اپنا جھنڈا اور اپنا پیٹ فام ہے اور ہمارے سامنے پاکستان کی یقینی منزل موجود ہے۔ اب کوئی طاقت (اشارہ امریکہ کی طرف تھا) ہم میں لفاق پیدا نہیں کر سکتی۔ انگریز کو چاہیئے کہ وہ ہندوستان تقسیم کرے اور یہاں سے چلا جائے۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں مرکزی اسمبلی کے لئے انتخابات ہوئے جن میں مسلم لیگ نے پاکستان کی بنیادوں پر حصہ لیا اور ۷۰ فیصد مسلم ووٹ حاصل کر لئے۔ ۱۹۴۶ء کے شروع میں قائد اعظم نے ایک الیکشن کمیشن قائم کیا جس کے سیکرٹری جی ایل انا تھے۔ سندھ کے انتخابات کے نتائج کا کانگریس کو شدت سے انتظار تھا لیکن میدان مسلم لیگ کے ہاتھ رہا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو کانپور میں ہندوستان پہنچا اور ۴ اپریل کو قائد اعظم نے مشن سے ملاقات کی۔ اسی موقع پر سید حسین شہید سہروردی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سلامتی کے لئے پاکستان کو واحد منزل قرار دیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو لاہور ڈاؤنٹ ٹیئن ہندوستان کے واسرائے ہو کر آئے اور انہوں نے ہندوستان کو ۱۹۴۷ء تک آزادی دینے کے لئے کام کا آغاز کیا کانگریس نے پاکستان کی شدید مخالفت کی لیکن قائد اعظم کے تدبیر اور فراست نے کانگریس کو ہر قدم پر شکست دی۔ آخر کار ہندوستان کی آزادی کا بل ۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوا، ۱۵ جولائی کو منظور ہوا اور ۱۸ جولائی کو شاہ انگلستان نے اس کی توثیق کر دی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے تمام اختیارات ہندوستان اور پاکستان کو منتقل کر دیئے جائیں گے۔

قائد اعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرر کئے گئے مگر جون ۱۹۴۸ء میں ان کی صحت بے حد گر چکی تھی۔ ۱۳ اگست کو انہیں کوئٹہ بھیج دیا گیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو

انہیں دوبارہ کورٹ سے کراچی پہنچا دیا گیا۔ اور اسی شب حالت خواب میں وفات پا گئے۔

## پرنس آغا خاں

(۱۸۷۱ء تا ۱۹۵۷ء)

سلطان محمد شاہ (پرنس آغا خاں دسوم) کے آباؤ اجداد مصر کے فاطمی خلفاء سے تعلق رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا شیخوہ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ سے ملتا ہے۔ سلطان محمد شاہ اپنے والد آغا خاں دسوم کے بعد صرف آٹھ سال کی عمر میں اسماعیلیہ فرقہ کے سربراہ ہوئے۔ ان کی والدہ نے تمام جائیداد وغیرہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور حجب آغا خاں دسوم، باغ ہو گئے تو اہلک ان کے سپرد کر دی۔ ان کی والدہ نے بیٹے کی تعلیم کے لئے بہترین طبائی خدمات حاصل کیں جنہوں نے آغا خاں کو قرآن مجید، عربی اور فارسی کی تعلیم دی۔ آغا خاں نے اوائل عمر ہی میں اسلامی ادب اور تاریخ کا مطالعہ بھی کیا۔ مگر ان کی ساری زندگی مغرب کے ماحول میں گزری تھی۔ لیکن اسلامی تعلیمات اور اسلام کے ساتھ انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی والدہ انتقال کر گئیں اور انہیں محبت میں اپنے شوہر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آغا خاں کو فلسفہ، دینیات اور فارسی شاعری سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ سعدی، فردوسی، عمر خیام، مولانا رومی، مولانا جامی اور حافظ کے انہیں لائق داد و تحسین تھے۔ اسلام سے ان کے بے پناہ لگاؤ ہی کی وجہ تھی کہ ایک بار سرحد ہندو۔

مورین نے ان کے بارے میں لکھا،

”مجھے قوی امید ہے کہ آئندہ نصف صدی کے دوران آغا خاں عالم اسلام کے ارفع مقام کے حصول کا رخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ ان کی قابلیت اور مسلمانوں میں ان کی حیثیت دونوں ہی اس مستقبل کی نشان دہی کرتی ہیں۔“

آغا خاں نے ۲۵ سال کی عمر میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کی طرف توجہ دی۔

اسی سال لاہور کزن نے انہیں امپیریل یونیورسٹی کونسل کا رکن نامزد کیا۔ وہ کونسل کے سب سے کم عمر رکن تھے۔ کونسل میں انہوں نے جو تقاریر کیں، ان کی روشنی میں بیہات واضح تھی کہ مستقبل میں مسلمانوں کے لئے نمایاں خدمات سر انجام دیں گے۔ کونسل میں انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اور تعلیمی حالت کے بارے میں حکومت کو مفید معلومات بہم پہنچائیں اور ان کے موقف کی

وکالت کی۔ آغا خاں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا کونسل کی وکالت کے دوسرے ہی سال انہوں نے دلی میں مستعد محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کی۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی پسماندگی ختم کرنے اور سیاسی قوت ختم کرنے کے لئے علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کا قیام بے حد ضروری ہے۔ ۱۹۱۱ء میں آغا خاں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ اس سے قبل وہ یہ بات واضح کر چکے تھے کہ ہندوستان میں اسلام کے شایان شان یونیورسٹی کا قیام اس کی اولین ذمہ داری ہے۔ اسی موقع پر انہوں نے ایم۔ اے۔ او کالج کی وہ سالانہ امدادی بڑھادی تھی جو کئی سال سے اپنی جیب خاص سے ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے بہت سے مسلمان طلبہ کے لئے وظائف جاری کیے تاکہ وہ بیرون ملک جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ چندہ جمع کرنے کی مہم کے سلسلہ میں جب آغا خاں لاہور پہنچے تو ان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے چیس لاکھ روپیہ جمع کیا۔ انہی کوششوں کو سراہتے ہوئے مولانا شبلی نے کہا تھا کہ جو کام چھ کروڑ مسلمان نہ کر سکتے تھے وہ پرنس آغا خاں نے تنہا کر دیا۔

جب مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کا سوال پیدا ہوا اور نواب محسن الملک کو وائسرائے سے ملنے کے لئے وفد کی تشکیل اور اس کے قائد کی نامزدگی کا اختیار دینے کا انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے پینتیس مسلمانوں کو منتخب کیا اور وفد کی قیادت کیلئے آغا خاں کا نام تجویز کیا۔ گو انہی دونوں آغا خاں چین جا رہے تھے لیکن نواب محسن الملک کی درخواست پر وہ کوئٹہ ہی میں رکتے اور وہاں سے سیدھے شملہ چلے آئے۔ جہاں انہیں وفد کو لے کر یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے سے ملاقات کرنا تھی۔ اس وفد کو خاں غرود کا مینا بی حاصل ہوئی۔ ملاقات کے بعد ۱۲ اکتوبر کو آغا خاں نے کھنڈہ سے نواب محسن الملک کو ایک خط میں یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کے سیاسی مفادات کی حفاظت کے لئے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں صوبائی انجمنیں قائم کی جائیں اور اسی طرح ایک مرکزی تنظیم کا قیام بھی عمل میں لایا جائے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس نواب سلیم اللہ کی صدارت میں دہاکہ میں منعقد ہوا۔ لہذا آغا خاں کی تجویز کی روشنی میں اجلاس نے مسلمانوں کی



ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ سفارش کی کہ جماعت کا نام انڈیا مسلم لیگ ہو۔ جب مسلم لیگ قائم ہو گئی تو آغا خان اس کے پہلے صدر منتخب ہو گئے اور ۱۹۱۲ء تک صدارت ان کے پاس رہی۔ دراصل آغا خان جس وفد کے ساتھ وائسرائے سے ملے تھے اسی کی کوشش کے باعث ۱۹۰۹ء میں منظور شدہ اصلاحات میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ شامل کیا گیا تھا اور انہی بنیادوں پر مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کے مطالبے کی منظوری نگران برصغیر کی تھی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کی شدید مخالفت کی تو ۱۹۱۱ء میں آغا خان نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں کہا کہ اب جبکہ اصلاحات کی سکیم پر عمل شروع ہو رہا ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں سبھی کے لئے بہتر یہ ہے کہ ان اصلاحات کو قبول کر لیں اور دوستی کی نفاذ قائم کر لیں۔

اب آغا خان ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلہ سیاسی رہنما بن چکے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں مونٹنگ، چیف سرفورڈ اصلاحات کے بارے میں آغا خان نے "ہندوستان، سبوری دور میں" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے ہندوستان میں اصلاحات کی ضرورت اور انہیں متوقع اصلاحات میں ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ پر غور کی بحث کی۔ انہوں نے لکھا کہ اگر انگریز اس اہم ترین ذمہ داری کی ادائیگی میں ناکام ہو گئے تو جنوبی ایشیا میں مصائب و آفات انسانی کا بدترین نمونہ بن جائے گا۔ ہم ہندوستان میں نہ صرف سماجی اور اقتصادی بلکہ سیاسی ترقی بھی چاہتے ہیں اور ہم بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ جب تک سیاسی ترقی نہ کریں گے سماجی اور اقتصادی ترقی ممکن نہ ہوگی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۱ء میں ترکی اور مسلمان ریاستوں کو شدید خطرہ پیدا ہو گئے۔ اس موقع پر آغا خان نے بجا طور پر محسوس کیا کہ ان مسلمان ریاستوں کے ساتھ اسلام کو بھی شدید خطرہ کا سامنا ہے۔ اس موقع پر آغا خان نے ترکہ دار وادایا و دماہینے یورپ میں انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ انہوں نے مسلمان ریاستوں کو بچانے کے لئے حتیٰ المقدور کوشش کی اور نوروچی دماسیا کے مطابق آغا خان نے اس نازک ترین وقت میں اتنی صحیح سوچ سے کام لیا اور اتنے نپے تلے خطوط اختیار کئے کہ انہیں یورپ اور اسلامی ریاستوں دونوں کے لئے امن کا بیجا مبر کہا جانے تو بیجا نہ ہوگا۔

آغا خان نے اس خطرے کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا کہ برطانیہ اپنی سامراجی خارجہ پالیسی

کی خاطر مسلمان ریاستوں کو ختم کر سنبھالنا ہوا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد نے کر  
 اتھستان گئے اور برطانوی وزیر اعظم لڈلو جارج سے ملاقات کے دوران سمرنا اور تھریس کے  
 علاقے جو یونانیوں نے قبضہ میں کر لئے تھے۔ ترکی کو واپس دلانے پر اصرار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ  
 اس وفد نے برطانوی وزیر اعظم کے سامنے سرسمر ترکی کی وکالت کی لیکن اس موقع پر برطانوی وزیر  
 اعظم نے یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی، ”ہم کیا مدد کر سکتے ہیں۔ یونانی جن علاقوں پر قبضہ  
 کر چکے ہیں انہیں وہاں سے باہر کون نکالے گا؟“

آغا خان نے ترکی پر ترکی جواب دیا: ”محترم وزیر اعظم! گو میں بھی اتنی ہی عمر میں ہوں  
 جتنے آپ۔ لیکن اب تو یہی ہوسکتا ہے کہ میں خود تلوارا تھیں لے کر جاؤں اور یونانیوں کو ان  
 علاقوں سے باہر نکال پھینکوں۔ ہم ہر طرح ترکی کی مدد کریں گے۔ ہم پورے جہاز کرایہ پر حاصل  
 کریں گے۔ لہذا اب آپ یونانیوں کا معاملہ ہم پر چھوڑ دیں۔“

برطانوی وزیر اعظم اس اچانک، غیر متوقع اور خوفناک حملہ اور کھلے الفاظ میں برطانیہ کی  
 مذمت پر حیران و پریشان ہو گیا۔ اس نے کچھ عجیب سے مگر بزدلانہ لہجہ میں جواب دیا ”آپ خود  
 ہی سمجھیں ہم کبھی کیا سکتے ہیں؟“ ۱۹۱۸ء میں مسلمانوں کو انتہائی نازک دور کا سامنا تھا۔ ہندوستان  
 کے مسلمانوں کی وکالت دو مختلف جماعتیں کر رہی تھیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ  
 نبھانے لگی تھیں۔ اس گروہ بندی کے نہایت خطرناک اور ناخوشگوار نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ ان  
 دنوں آغا خان بیمار تھے۔ جب انہیں تاروں کے ذریعے ان حالات سے مطلع کیا گیا تو وہ مسرور  
 ۱۹۲۸ء میں بحالت علالت یورپ سے ہندوستان پہنچ گئے۔ یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دلی میں آل انڈیا  
 پارلیمنٹ مسلم کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ صدارت آغا خان نے کی۔ شملہ وفد کے بعد یہ کانفرنس غالباً مسلمانوں  
 کی بھرپور نمائندگی کر رہی تھی۔ اس میں خلافت کانفرنس، جمعیت العلماء اور آل انڈیا مسلم لیگ کے  
 دونوں گروپ شامل تھے۔ آغا خان نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس موقع پر باہم اختلافات مسلمانوں  
 کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ اپنے ملک کے مفادات کے  
 تحفظ کی خاطر تمام اختلافات ختم کر دیں اور ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی دوستانہ اور برادرانہ انداز  
 میں تعاون کریں۔ یہ وقت ایک دوسرے پر اپنی برتری ثابت کرنے کا نہیں۔ ہندوستان کے  
 مسلمان اپنی انفرادی حیثیت کو برقراری پر برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ لہذا ہم سب مل کر ہی ان کی  
 توقعات پر پورے اتر سکتے ہیں۔

۱۹۳۰ء تک انگریز محسوس کر چکا تھا کہ ہندوستان میں سیاسی اصلاحات بہت زبردستی ہیں۔

بحسب وجہ دیگر اسے حکومت برطانیہ کے ایک دوست کی حیثیت میں اپنے ساتھ رکنا بہت مشکل ہو گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ۱۲ نومبر ۱۹۳۲ء کو لندن میں پہلی گول میز کانفرنس طلب کی گئی۔ کانفرنس نے اس کانفرنس کا ہائیڈ کاٹ کر دیا۔ لیکن دوسری جماعتوں نے اس میں شرکت کی۔ نمائندوں کی نامزدگی برطانیہ کی طرف سے کی گئی۔ مسلمانوں کی طرف سے قائد اعظم، آغا خان، سر محمد شفیع، مولانا محمد علی اور مولوی فضل الحق نے شرکت کی۔ دوسرے تمام طبقوں اور جماعتوں نے آغا خان کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ آغا خان کے لئے ہر طبقہ کا اس درجہ اعتماد و ہمدردی بہت بڑا اعزاز تھا جو دوسری گول میز کانفرنس کے وقت بھی انہی کے حصہ میں آیا۔

۱۹۳۲ء میں اور اس کے بعد دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک آغا خان کو لیگ آف نیشنز میں ہندوستان کی نمائندگی کے لئے نامزد کیا جاتا رہا۔ ۱۹۳۰ء میں انہیں اسی لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۳۹ میں ۴۴ ووٹ انہیں ملے اور وہ پہلے ایشیائی تھے جنہیں یہ اعزاز نصیب ہوا۔

جولائی ۱۹۵۵ء میں انہیں دل کا دورہ پڑا اور ۱۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو وہ ضیاء میں انتقال کر گئے۔ انہیں مصر میں اسمان کے قریب سپرد خاک کر دیا گیا۔

## مولانا محمد علی

(۱۸۷۸ء — — — تا — — — ۱۹۳۱ء)

رئیس الاحرار مولانا محمد علی ۱۸۷۸ء کے آخر میں رام پور میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد عبدالصی خان ایک معزز عرصے پر مامور تھے لیکن زعمری ہی ہیں والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ ان کی والدہ نے بچوں کی ابتدائی تعلیم کا اہتمام کیا۔ محمد علی نے بریلی ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ میں داخل کر دیئے گئے۔ ۱۸۹۹ء میں انہوں نے علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور بھول مروس کے لئے لندن روانہ ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو محمد علی سے کچھ اور کام لینا منظور تھا۔ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت اور استثنائی قابلیت کے باوجود بھول مروس کے امتحان میں ناکام رہے۔ اسی سال ان کی شادی کر دی گئی۔ شادی کے دوسرے برس پھر انگلستان گئے

اور کسٹور ڈس سے انگریزی ادب میں آئز کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم میں یہ اعزاز حاصل کرنے کے بعد محمد علی سبب ہندوستان واپس ہوئے تو رام پور میں انہیں افسر تعلیمات کا عہدہ مل گیا۔ لیکن رام پور کی سازشی فضا محمد علی کو موافق نہ آئی اور انہوں نے کچھ عرصہ بعد اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ رام پور سے علیحدہ ہونے کے بعد ریاست بڑودہ نے ملازمت دے دی — وہاں محمد علیوں کے سپرنٹنڈنٹ اور کچھ دنوں بعد ضلع فوساری کے کمشنر ہو گئے۔ محمد علی کو انگریزی ادب کا اچھا ذوق تھا۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے انگریزی کے اچھے مضمون نگار بن جاتے تھے۔ عمر کم اور تجربے کے ساتھ ان کی مضمون نگاری میں بھی پختگی اور کثرت مشق آتی گئی اور یہ شوق اتنا بڑھا کہ دوران ملازمت بھی جاری رہا۔ وہ ادب سے بڑھ کر سیاسیات میں اپنے جوہر دکھانے لگے۔ بڑودہ کی ملازمت کے زمانہ میں محمد علی "ٹائمز آف انڈیا" میں سیاسی مضامین نگاشتے تھے۔ اخبار بین طبقہ میں یہ مضامین بڑے شوق اور توجہ سے پڑھے جاتے تھے۔ بڑودہ کونسل نے محمد علی کے اس شوق پر اکتساب کرنا چاہا اور ان سے گزارش کی کہ وہ کم سے کم سیاسی رنگ کے مضامین نہ لکھائیں۔ لیکن محمد علی کونسل کا یہ حکم ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے اور استعفا دے کر اپنے عہدے سے علیحدہ ہو گئے۔ بڑودہ سے علیحدگی کے بعد نواب صاحب جاوہر نے محمد علی کو اپنے اہل وزارت پیش کی اور بیگم صاحب بھوپال نے آپ کو چیف سیکرٹری کا عہدہ پیش کیا۔ لیکن محمد علی نے دونوں میں کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ انہوں نے حکومت سے انگریزی کا ایک ہفتہ وار اخبار "کامریٹ" نکال دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۱ء کا ہے اور ہندوستان کی عملی سیاست میں ہی محمد علی کی ابتداء ہے۔ کامریٹ ہی کے ذریعہ محمد علی کے اصلی جوہر کھلے، "کامریٹ" ایک برس ہی میں اس قدر مقبول ہوا کہ ملک کے سربراہ اور وہ یورپین اور ہندوستانی اس کے خریداروں میں نظر آنے لگے۔ اصلی میں محمد علی کو انگریزی زبان پر اس درجہ قدرت حاصل تھی اور اسلوب بیان اس قدر شستہ ہوا کرتا تھا کہ بڑے بڑے انگریز مترجمان کے قلم کا وہاں ماننے لگے تھے۔ یہی ان کے "کامریٹ" کی کامیابی کا راز تھا۔

کامریٹ کی ادارت کے ساتھ ساتھ محمد علی ملک کی عملی سیاست میں بھی حصہ لینے لگے۔ ۱۹۱۲ء میں جب جنگ بھتان شروع ہوئی اور ترکوں کی مالی امداد کے لئے ملک میں ہلالِ احمر کے نام سے انجمنیں قائم کی گئیں تو محمد علی اور ان کے بھائی شوکت علی نے اس مقصد کے لئے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا اور اپنی آتش بیانی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں

ترکوں کی امداد کا ایک نیا جوش اور دلولہ پیدا کر کے لاکھوں روپے جمع کئے۔ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ایک طبعی وفد ترکی بھیج کر جنگ بلقان میں ترکوں کی امداد کی۔ اس سلسلہ میں محمد علی نے کامریڈ میں ترکوں کی ایک اپیل بھی چھاپی تھی۔ اس اپیل کا شائع ہونا تھا کہ حکومت نے کامریڈ کی وہ ساری کاپیاں جن میں یہ اپیل چھپی تھی ضبط کر لیں، دو لاکھ روپے سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی لیکن اس طلبی ضمانت کا محمد علی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ ضمانت تو انہوں نے داخل کر دی مگر کامریڈ کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

۱۹۱۳ء کے وسط میں کانپور میں سڑک کی خاطر جامع مسجد کا ایک حصہ شہید کر ڈالنے پر بیگم امروہو گیا۔ پہلے مسلمانوں نے رسمی طور پر احتجاج کیا لیکن یوپی کی حکومت میں جب شنوائی نہیں ہوئی تو مسلمان ایک اجروہ کی شکل میں خود ہی مسجد کے شہید سسوں کو تعمیر کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ حکومت نے مجھے کو منتشر کرنے کے لئے گوبیاں چلا دیں جس سے قریباً ایک سو مسلمان شہید ہو گئے۔ اس ہنگامے نے سارے ہندوستان میں آگ لگا دی اور مسلمانوں میں بے پناہ جوش پیدا ہو گیا۔

محمد علی نے فوراً اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انہوں نے گورنر یوپی سے رجوع کیا لیکن جب یہاں شنوائی نہ ہوئی تو میکڈونلڈ کو لندن تار دیا کہ وہ پارلیمنٹ میں اس کے لئے کوشش کریں لیکن جب وہاں سے بھی ان کے تار کا جواب نہیں ملا تو اکتوبر ۱۹۱۳ء میں سر وزیر حسن کے ساتھ خود لندن گئے اور سر جیمز لائوش سابق رکن مجلس وزیر ہند کی مدد سے اس قضیہ کو وزیر ہند تک پہنچایا۔ وزیر ہند نے وائسرائے کو ہدایت کی کہ مسجد کے شہید حصے دوبارہ بنوا دیئے جائیں۔ محمد علی اپنے پہلے ہی مشن میں پوری طرح کامیاب رہے۔ آخر دسمبر ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آئے جہاں مسلمانوں نے ان کا نہایت پر جوش خیر مقدم کیا۔ یہ محمد علی کا پہلا عوامی استقبال تھا۔ اس دوران حکومت ہند کا پانچ تحت کلکتہ سے دہلی منتقل ہو گیا اور محمد علی بھی کامریڈ کا دفتر دہلی لے آئے یہاں آکر حکیم اجمل خاں مرحوم کے مشورے سے کامریڈ کے ساتھ ایک اردو اخبار ہمدرد بھی جاری کر دیا لیکن ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی تو لندن ٹائمز کے ایک اشتعال انگیز مضمون کے جواب میں محمد علی نے CHOICES OF THE TURKS کے نام سے کامریڈ کے ۲۴ کالموں میں ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون کو وہر بنا کر حکومت نے کامریڈ کی ضمانت ضبط کر لی۔ محمد علی نے اس حکم کی اپیل کی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اور کامریڈ بے وقت موت کی آغوش میں

کچھ عرصہ بعد ہی محمد علی کی صحت خراب ہو گئی۔ چنانچہ ڈاکٹروں کے مشورے پر وہ آرام لینے دامپور آ گئے۔ یہاں نواب صاحب رام پور کے حکم سے وہ ۲۴ گھنٹے نظر بند رہے۔ اجیر ہانے کے لیے واپس دہلی آئے تو دوسرے ہی دن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کے حکم سے مہرولی میں محمد علی کے ساتھ ان کے بڑے بھائی شوکت علی بھی نظر بند کر دیئے گئے لیکن مہرولی میں چونکہ محمد علی سے عداوت کے لئے دہلی کے مسلمانوں کا جوش بھڑک رہا تھا۔ اس لئے ان دونوں بھائیوں کو حکومت نے لینڈون بھیج دیا اور کچھ ہی دنوں بعد انہیں لینڈون سے جھنڈواڑہ جانا پڑا جہاں ایک غیر مستین مدت کے لئے وہ نظر بند رہے۔

۱۹۱۷ء میں محمد علی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے لیکن حکومت نے ان کو رہا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے ان کی والدہ کو لیگ کی صدارت کرنا پڑی۔ اسی سال کانگریس کے سالانہ اجلاس میں تنک (آبنہائی) نے علی برادران کی رہائی کے لئے ایک قرارداد منظور کرائی مگر وہ بھی بے اثر ہوئی۔ ملک میں جگہ جگہ محمد علی اور شوکت علی کی رہائی کے لئے مظاہرے ہوتے مگر دنیا بھر کوئی اثر نہ پڑا البتہ یہ ضرور ہوا کہ ۱۹۱۷ء کے آخر میں حکومت کی خفیہ پولیس کا ایک افسر جھنڈواڑہ پہنچا اور اس نے ان دونوں بھائیوں کو بتایا کہ اگر وہ ایک ہمدانہ پر دستخط کر دیں تو انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ ہمدانہ یہ تھا کہ دوران جنگ میں دونوں بھائی ایسی بات نہ کریں گے جس سے شہنشاہِ انگلستان کے دشمنوں کو تقویت پہنچے۔ محمد علی اور شوکت علی نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور ان کی رہائی کا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔

۱۹۱۸ء میں علی بھائیوں کی تحقیقات کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر ہوا۔ اس کمیشن نے ان دونوں کے بیان لئے لیکن رہائی کی سنارش اس نے بھی دیں کی۔

اسی سال نظربندی کے دوران نماز جمعہ کے بعد جھنڈواڑے کی مسجد میں محمد علی نے مسلمانوں کے سامنے ایک زبردست تقریر کر ڈالی۔ حکومت نے اس تقریر کو دہ بنانا کہ انہیں گرفتار کر لیا لہذا مقدمہ چلائے تو جیل میں بھیج دیا۔ گویا نظربندی کے زمانے میں جو کچھ تھوڑی بہت آزادی حاصل تھی وہ بھی چھین لی گئی اور بالکل قیدیوں کی طرح کی زندگی شروع ہو گئی۔ ۱۹۱۹ء میں یہ دونوں بھائی جو نظربندی اور سیری میں پورے پانچ برس گزار چکے تھے غیر مشروط طور پر رہا کر دیئے گئے۔ اس سال وہ کانگریس، خلافت کا نفرنس اور مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس میں شرکت کے لیے امرتسر پہنچے جہاں جلیاں والے باغ کا حادثہ پیش آیا تھا۔ محمد علی اور شوکت علی جیل سے رہا ہوتے ہی

سیدھے امر سرگئے اور آرام کے بغیر قوم اور ملک کی خدمت کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔ امرت سر میں ان دونوں بھائیوں کا جیسا استقبال ہوا سو تھا لیکن دہلی میں جس شانہ انداز سے ان کا خیر مقدم کیا گیا اس کی نظیر شاید شاہان مغلیہ کے عہد میں بھی نہیں مل سکتی۔

۱۹۲۰ء میں خلافت کا ایک وفد حکومت برطانیہ کو ترکی کے ساتھ اپنے وفد کے یاد دلانے محمد علی کی قیادت میں لندن بھیجا گیا۔ لیکن اس وفد کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اس ناکامی کو دہر بنا کر محمد علی نے گاندھی جی کے ساتھ حکومت برطانیہ کے "مقاطعہ" والی تحریک میں تعاون کر لیا اور پورے جوش و سرگرمی سے حکومت کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

گاندھی جی اور محمد علی کے تعاون کا یہ زمانہ اپنے بامعنائی کے اعتبار سے خاصا ہنگامہ خیز ہے اس لئے تحریک آزادی کی بنیاد فی الحقیقت اسی تعاون کے بعد پڑتی ہے۔ سارے ملک میں ایسی زبردست سیاسی بیداری پیدا ہو گئی کہ حکومت کے لئے اس کا مقابلہ مشکل ہو گیا۔ مقاطعہ والی تحریک میں خطابات کی واپسی، عدالتوں اور کونسلوں کے بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ اسکولوں اور کالجوں کا مقاطعہ بھی شامل تھا۔

محمد علی نے اپنے چند رفیقوں، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجلی خاں کے ساتھ علی گڑھ کے درباب محل و مقصد کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ حکومت کا دامن چھوڑ کر قوم کی پناہ میں آجائیں لیکن یہ تجویز منظور نہ کی گئی۔ محمد علی نے کورٹ کے اس فیصلے کے بعد براہ راست طالب علموں سے خطاب کیا اور انہیں آمادہ کیا کہ اسلام اور وطن کی خدمت کے لیے تعلیم کو خیر باد کہہ کر وہ قومی جنگ میں شریک ہو جائیں۔ طلبہ پر محمد علی کی تقریر کا کافی اثر ہوا۔ سیکڑوں طالب علموں نے جلسہ ہی میں اعلان کر دیا کہ وہ کالج چھوڑ دیں گے طلبہ کے اس فیصلے سے علی گڑھ کالج کی پرسکون زندگی میں ایک طوفان سا اُگیا اور منتظمین کالج کو طوفان مسرور ہونے تک کچھ دنوں کے لئے کالج بند کرنا پڑا۔

علی گڑھ کالج کے اس ہنگامہ کے بعد محمد علی نے قومی خطوط پر ایک اور کالج قائم کیا جس کا نام جامعہ طیبہ اسلامیہ رکھا گیا۔ اس معاملہ میں محمد علی کے سب رفیقوں نے ان کا ساتھ دیا۔ محمد علی نے علی گڑھ کالج کے طالب علموں میں منتظمین کے خلاف نبوات پھیلا کر جس انداز سے اس اسلامی ادارے کو نقصان پہنچایا تھا اس پر بعض لوگوں کو سخت اعتراض ہوا اور یہ

بحث چھڑ گئی کہ تعلیم ختم کرنے سے پہلے سیاست میں طالب علموں کو حصہ لینا چاہیے یا نہیں۔ یہ ایک طویل اور تکلیف دہ بحث تھی جو مدتوں چلتی رہی اور طرفین سے اس پر بہت کچھ کہا گیا۔ لیکن اطمینان بخش انداز پر اس بحث کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

مسترفین کو محمد علی سے دراصل شکایت یہ تھی کہ اگر محمد علی قومی خطوط پر کوئی کام کرنا چاہتے تھے تو ملی گزٹ پر ریورسٹی کو نقصان پہنچائے بغیر بھی ایسا کر سکتے تھے۔ ملی گزٹ کو حکومت سے کتنی ہی امداد کیوں نہ ملتی ہو وہ بہر حال ایک مسلم ادارہ تعلیم ہے جس کے تباہ کر ڈالنے کا خیال ہر مستحسن نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں ہندو ریورسٹی بنارس کی مثال پیش کی جاتی تھی جہاں کے ارباب محل وقتہ نے گاندھی جی کے بائیکاٹ والی تحریک کا اپنی ریورسٹی پر مطلق اثر نہ ہونے دیا اور ہندوؤں کے قوم پرست لیڈروں نے ہندو ریورسٹی کے مستقبل میں اس فیصلے کے خلاف وہ انداز اختیار کیا جو محمد علی نے ملی گزٹ میں جائز رکھا تھا۔ بہر حال مسیحیانہ محمد علی نے ملی گزٹ کے بائیکاٹ کی تحریک ضرور چلائی اور اس کے جواب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی قائم کر ڈالا جو اب تک دلی میں خاصی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ بہر حال محمد علی کی نیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

گاندھی جی اور محمد علی کا اتحاد اصل ہندو مسلم اتحاد تھا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۷ء تک ہندو مسلم اتحاد کے جو رجحان پورے ہندوستان میں نظر آئے وہ اسی اتحاد کی برکت تھی۔ لیکن یہ اتحاد کچھ زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوا اور بہت جلد ہندوستان کی پرگلیت اور وجد آؤر فضا مکدر ہو گئی۔ ۱۹۳۱ء میں محمد علی نے کراچی خلافت کانفرنس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں ایک تجویز منظور ہوئی کہ اسلام کے دشمنوں کی امانت اور خدمت مذہباً حرام ہے۔ یہ تجویز کیا تھی۔ ایک فتویٰ تھا جس پر علمائے دین کے بھی دستخط تھے اور سیاسی لیڈروں کے بھی! اس تجویز کا پاس ہونا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں عام بے چینی پیدا ہو گئی اور حکومت کی ملازمت ناجائز قرار دے دی گئی۔

اس تجویز کے اقرار میں حکومت نے محمد علی کو گرفتار کر لیا۔ ان کے ساتھ شریعت علی، مولانا عبد الباقی، ڈاکٹر کھلو، پیر گاندھ اور سوامی شنکر اچاریہ بھی پکڑے گئے۔ کراچی میں ان پر مقدمہ چلا اور محمد علی کو حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے کے جرم میں دو سال کی سزا سنائی گئی۔ دو سال کی سزا بھگت کر اگست ۱۹۳۳ء میں محمد علی جیل سے باہر آئے اور اسی سال ان کی قومی خدمات کا



احزاب کرتے ہوئے کانگریس کی صدارت کے لئے ان کا نام پیش کیا گیا۔

۱۹۲۴ء محمد علی کی صدارت کا سال ہے لیکن نہایت پر شور اور ہنگامہ خیز حکومت سے ترک تمام والی تحریک کا مدخل شروع ہو چکا تھا۔ ہندو مسلمانوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور برس بھر پہلے ان دونوں قوموں میں جو اتحاد تمامہ رخصت ہوا۔ شہر حاندیل سے سانی مانگ کر راجا جوا اور شندھی کی فرقہ وارانہ تحریک شروع کر دی۔ پنڈت مالویہ نے پنجاب اور یوپی کے جمہور کو سنگت کی تلقین شروع کر دی۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے تبلیغ اور تنظیم کا تحریک شروع ہوئیں اور مقابلہ کی فضا قائم ہو گئی۔ ان اکھاڑوں کا نتیجہ بھی بہت جلد نکل آیا۔ جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہوئے اور اتحاد و اتفاق کا خیال بھی حرام سمجھا جانے لگا۔

ان فرقہ وارانہ جنگوں کے دوران مسلم قوم پرور رہنماؤں کی پوزیشن، جن میں محمد علی جو شمل تھے، عجیب تھی۔ یہ قوم پرور رہنما تو اپنے بہت پسند مسلمان بھائیوں سے دست و گریبا رہتے تھے اور ان کے خلاف انہوں نے پوری قوت سے جنگ شروع کر رکھی تھی لیکن ہندوؤں کے قوم پرست رہنما اپنے تا ایک خیال مہاسبھائی ہندو کے خلاف ایک نقطہ بھی منہ سے نہ ماننے کو تیار نہیں تھے۔ بلکہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ کانگریس کے یہ نام نہاد ہندو رہنما مہاسبھائیوں کو قتل پروا دیں اور فرقہ وارانہ تحریکوں میں ان کی اخلاقی امداد بھی کرتے رہے تھے۔ اسی مشاہدے سے جو تو اتر کی حد تک پہنچ گیا تھا، مسلم قوم پرور رہنماؤں کو بد دل کرنا شروع کیا اور وہ باری باری کانگریس سے علیحدہ ہونے لگے۔

۱۹۲۵ء کے وسط میں ایک خالص اسلامی مسئلہ زیر بحث آگیا۔ حجاز پر ابن سعود کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا اور اس قبضہ کے دوران نجدیوں کی بے اعتدالیوں کے افسانوں نے ہندوؤں کے متقی مسلمانوں کو بے چین کر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ حجاز کے مستقبل کا سوال تھا۔ ابن سعود اعلان کیا تھا کہ اس کا تصفیہ مؤثر اسلامی کرے گی۔ چنانچہ ہندوستانیوں کو بے چینی سے مؤثر اسلامی کا انتظار تھا۔

۱۹۲۶ء میں متحدین مؤثر اسلامی کا اعلان ہوا۔ محمد علی خلافت کے وفد کے ساتھ اس مؤثر میں شامل ہونے مقرر گئے جہاں انہوں نے عمارتوں اور مقابلہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جنہیں ابن سعود کے آدمیوں نے منہدم کر دیا تھا اور ابن سعود کے اس نظم و نسق کا بھی مطالعہ کیا جو جہاں موجود تھا محمد علی حجاز مقدس میں ایک جمہوری نظام حکومت کی سیم لے کر مؤثر میں گئے مگر

انہیں محسوس ہوا کہ یہ مؤثر برائے نام ہے اور محض اس لئے طلب کی گئی ہے کہ ابن سعودی تھان میں فتح حجاز کے متعلق سپاسنامہ پیش کرے۔ محمد علی اس انداز سے بہت بدولت ہوئے لیکن مؤثر میں اس کی ایک ڈچل۔ وہ ناکام ہندوستان واپس آئے اور یہاں انہوں نے ابن سعود کی پوری شدت کے ساتھ مخالفت شروع کر دی۔

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ابتدائیں محمد علی، شریف حسین کی بد اعمالیوں کے باعث اس کے مخالفت تھے اور ابن سعود نے چھوٹے مقامات مقدسہ پر حکومت جمہوری کے قیام کا اعلان کیا تھا اس لئے اس کے طرہ قرار ہو گئے تھے لیکن نام نہاد مؤثر کی ناکامی اور ابن سعود کے طرہ حکومت کا مشاہدہ کرنے کے بعد محمد علی اسی شدت سے اس کے مخالفت ہو گئے جس شدت سے کبھی اس کی حمایت کی تھی۔ اس رد عمل کا اثر یہ ہوا کہ خود مسلمانوں میں ایک طبقہ محمد علی کی اس روش پر مغرض تھا۔ اس اعتراض کے ساتھ خلافت کمیٹی کے جن کا مسئلہ بھی اٹھایا گیا اور یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ اس کے آگے مسلمانوں کے لئے ہندوستان کے دوسرے مسائل میں دلچسپی باقی نہیں رہی۔ اسی دوران یعنی مئی ۱۹۲۶ء میں خلافت کا خاص اجلاس ہوا جن میں ہندو قوم پرستوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا کہ وہ اپنے مہاسبجائی عنصر کی مذمت نہیں کرتے جس سے ملک کی فضا مکھڑ جوتی جا رہی ہے۔ اس کا فرض کے بعد مسلم قوم پروردہ ہٹا لگ گئیں سے طابنہ کشیدہ نظر آنے لگے انہیں بیڈروریاں محمد علی بھی تھے۔

محمد علی کانگریس کے مہاسبجائی ممبروں کی ذہنیت سے دل برداشتہ ضرور رہنے لگے تھے لیکن ابھی انہوں نے کانگریس سے اپنا رشتہ نہیں توڑا تھا بلکہ اس کوشش میں تھے کہ کسی نہ کسی طرح ایک بار پھر ہندو مسلم اتحاد ہو جائے۔ چنانچہ محمد علی کی سعی سے کئی یونٹیوں کا نفرنیس ہوئیں مگر ناکام رہیں، ۱۹۲۷ء میں آل پارٹیز کانفرنس کے نام سے اتحاد کی ایک اور کوشش ہوئی وہ بھی ناکام رہی۔ آخر محمد علی نے مسلمانوں کی سب جماعتوں کو متحد کرنے کی کوشش کی تاکہ یہ سب متحد ہو کر اپنا مطالبہ کانگریس سے منوالیں۔ ۱۹۲۷ء میں اسمبلی کے زمانہ میں مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں طلب کیا اور مشر جناح کی شرکت سے وہ مطالبے اس اجلاس میں پیش کئے جو مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مطالبات کے سلسلہ میں بطور بنیاد کام دے سکتے تھے۔ ان نکات کو سب مسلم جماعتوں نے تسلیم کر لیا اور محمد علی نے مسلم لیگ کی منظوری کے بعد ان مطالبات کو کانگریس کے روشن خیال ممبر سے بھی منظور کرایا۔ اسی اثنا میں انگلستان کی مزدور حکومت کی طرف سے سامن کمیٹیشن

ہندوستان بھیجا گیا کہ وہ ملک کے حالات، مطالعہ کر کے ہندوستان کے لئے ایک دستور اساسی کی سفارش کرے۔ کانگریس نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا اور مسلمانوں کا قوم پرور طبعیت بھی اس سلسلہ میں کانگریس کے ساتھ ہو گیا۔ لیکن مسلمانوں کے حکومت پر مست طبعیت نے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس طبقہ کے لیڈر سر محمد شفیع تھے۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال مسلم لیگ کا اجلاس دو مقامات پر ہوا۔ ایک لاہور میں جس کے صدر سر محمد شفیع تھے اور دوسرا کلکتہ میں جہاں محمد علی جناح نے صدارت کی۔ کلکتہ والے اجلاس نے دہلی کی تجاویز کا اعادہ کیا اور محمد علی کی تجویز کے مطابق سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ قوم پرور مسلمانوں کے اس طرز عمل سے کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کا اختلاف بڑھنے لگا اور فضا کسی قدر درست ہو گئی لیکن بہت دنوں تک یہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ حکومت برطانیہ کے چیلنج کے جواب میں کانگریس نے ہندوستان کا دستور اساسی مرتب کر کے لئے پندرہ جونی لال نہرو کی صدارت میں کانگریس ممبروں کی ایک سب کمیٹی بنائی جس نے ہندوستانی دستور کا خاکہ مرتب کر کے کانگریس میں پیش کر دیا۔ یہ خاکہ نہرو رپورٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہی وہ رپورٹ ہے جس کے کنونشن میں منظور ہونے کے بعد مسلمانوں کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ محمد علی نے بھی آل انڈیا کانگریس سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔

نہرو رپورٹ جس وقت کانگریس کے سامنے پیش ہوئی، محمد علی علاج کے لئے یورپ گئے ہوئے تھے۔ لیکن بیجنورجی کرہ فوراً ہندوستان آئے اور انہوں نے علی الاعلان اس رپورٹ کی مخالفت کی۔

نہرو رپورٹ پر محمد علی کو دو نیادہی اعتراض تھے ایک یہ کہ رپورٹ کی بنیاد کانگریس کی منظور قرار دہ آزادی قانون کے نصب العین پر نہیں رکھی گئی بلکہ یہ ڈومینن اسٹیشن کا غیر محکمہ سا خاکہ ہے۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس میں مسلمانوں کے ان سیاسی مطالبات کا تشفی بخش طریقہ پر عمل نہیں کیا گیا جو دہلی کی تجاویز میں صراحت کے ساتھ مسلمانوں کی ساری سیاسی جماعتوں کی منظور سے قلم بند کئے گئے تھے۔ اسی سلسلہ میں محمد علی نے ایک بیان بھی شائع کیا، جس میں انیسویں کے ساتھ کانگریس سے اپنی علیحدگی اور بے تعلقی کا اعلان کیا گیا تھا۔ کانگریس سے علیحدگی کے بعد محمد علی صرف خلافت کمیٹی کے ہورہے اور مسلمانوں میں تنظیم کا کام شروع کر دیا۔

اسی دور تنظیم میں ایک ایسا ناگوار واقعہ پیش آیا جس نے مسلم سیاست میں مزید پرانگی

پیدا کر دی اور محمد علی کی شخصیت کو ناقابل نقصان پہنچایا۔

حکومت سے "ترک تعاون" کے ابتدائی دور میں محمد علی نے مسلم عوام میں کامیابی سے بیداری اور ہوش پیدا کرنے کے لئے مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کو اسٹیج پر آنے کی ترغیب دی لیکن سیاست میں یہ طبقہ چونکہ بصیرت نہیں رکھتا تھا اس لیے محمد علی خود ہی اس طبقہ کے سیاسی استاد بن گئے۔ ابتداً قوشاگردوں کے ساتھ استاد کا تبادلا ہوتا رہا، لیکن کچھ ہی دنوں بعد سیاست کے ان فو مشق شاگردوں میں مذہبی اختلافات کا جذبہ پیدا ہو گیا اور محض اس ناپاک چکر محمد علی کے پاس کسی مذہبی مدرسہ کی سند نہیں ہے، انھوں نے محمد علی کی قیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب محمد علی نے کانگریس سے قطعی ختم کر دیا تھا اور اب وہ مسلمانوں کی طاقتور جماعت کو ہاتھ میں لے کر تنظیم کا کام کرنا چاہتے تھے۔ ایسے وقت میں مذہبی گروہ کے ان پسند شدہ سر افراد کی تنگ دلی اور تنگ نظری سے محمد علی کو سخت تکلیف پہنچی اور انہیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کے سیاسی مخالفین نے ان لوگوں کو اکسا کر انہیں نیچا دکھایا اور مسلمانوں میں اختلاف پیدا کر دیا۔ چنانچہ جب یہ حقیقت بالکل ظاہر ہوئی تو اس گروہ کے بعض ان افراد کے ساتھ جنہیں ان کی قیادت پر کامل اعتماد تھا، محمد علی نے جمیٹ اعلیٰ ہند کا پندر کے نام سے ایک نئی جماعت کی بنیاد ڈال دی وہی اس کے پہلے صدر منتخب ہو گئے۔ مسلمانوں میں آپس کے اختلاف کی یہ ابتدا تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں گروہ بندی کی وہ و با پھیل کر اسلامی یک جہتی کے پرزے اڑ گئے۔ جو لوگ سیاست کو مذہبی میلک سے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے ان کے نزدیک محمد علی کی یہی غلطی تھی کہ انھوں نے مولویوں کی جماعت کو سیاسی اسٹیج پر آنے کی ترغیب دی اور یہ اس سے بھی بڑی غلطی تھی کہ ۱۱۶۹ میں اس گروہ کو دو مخالفت جماعتوں میں تقسیم کر دیا کہ مولویوں کا جمہور مسلم عوام پر بڑا اثر تھا جس سے کام لے کر بعض کوتاہ اندیش مولویوں نے مسلم سیاست اور مسلم مفادات کی مخالفت کو توپس پشت ڈال دیا اور ذاتی اقتدار کی خاطر مذہبی دھڑے بندی کے اصول پر سیاسی دھڑے بندی شروع کر دی جس کے بعد مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کا خیال ایک ایسا خواب بن کر رہ گیا جس کی کوئی تعبیر ہی نہیں ہو سکتی۔

محمد علی کی زندگی کا آخری کارنامہ گول میز کانفرنسی میں شرکت ہے۔ ہندوستان سے لندن تک کا یہ سفر محمد علی نے معجزات پر کیا جس وقت لندن پہنچے، مرض میں کسی قدر افادہ تھا

کافر نس میں شریک ہوئے اور معرکہ آزاد تقریر کی جس کا یہ آخری جلد آج تک زبانِ ندغام ہے اور جو حقیقتاً ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں آبِ زر سے گھنے کے قابل ہے۔ محمد علی -

برطانوی پارلیمان کے غائبوں کو مخاطب کر کے کہا،

”میں آج اس مقصد سے یہاں آیا ہوں کہ جب میں اپنے وطن واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے ہاتھ میں ہو۔ میں غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا ایک یوٹیک میں، جسے آزادی کی نعمت حاصل ہے مجھے غریب الوطنی کی موت منظور ہے۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو میرے لئے یہاں قبر کے لئے جگہ دینا ہوگی۔“

جس سچے جوش اور جذبہ سے محمد علی نے یہ بات کہی تھی اس کا اثر بھی فوراً ظاہر ہوا اور اس تقریر کے صرف دو ہی دن بعد وہ ہندو مسلم سمجھوتے کے لئے اپنی آخری اسکیم تیار کر رہے تھے کہ ۴۔ جنوری ۱۹۳۱ء کو دائی اہل کو لیک کہہ گئے۔ انتقال کے بعد بعض احباب کی تجویز یہ تھی کہ مرحوم کو لندن ہی میں دفن کیا جائے مگر ان کی بیگم کو ارادہ تھا کہ مرحوم کی لاش ہندوستان لے جانی جائے۔ ان دونوں تجویزوں کے برعکس، مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی کے ایما پر انہیں یروشلم میں دفن کیا گیا۔ اسلام اور مسلمانوں سے مرحوم کو جو محبت اور سچا خلوص تھا اور ساری عمر جس طرح انہوں نے اسلام کی خدمت کی۔ اس کے بعد وہ یقیناً اس اعزاز کے مستحق تھے انہیں مقدس سرزمین نصیب ہوئی جو مسلمانوں کی قبلہ اول تھی۔

ایک - جی ویلز نے ان کے بارے میں کہا کہ  
”مولانا کے پاس بیٹا لے کاظم، برک کی زبان اور نیلی کا دل تھا۔“

## نوابزادہ لیاقت علی خاں

(۱۸۹۵ء تا ۱۹۵۱ء)

قریباً سوا پانچ سو سال پہلے نوشیروان عادل کی نسل سے تعلق رکھنے والا ایک خاندان ایران سے ہندوستان آیا۔ تماشیں روزگار کے سلسلے میں اس خاندان کو مختلف شہروں میں گھر منا پڑا۔ لاہور کے بعد یہ کنبہ پہلے مظفرنگر گیا۔ پھر مستقل طور پر مشرقی پنجاب کے شہر کراںال میں آباد ہو گیا۔ مظفرنگر میں فوجی ملازمتوں اور اعلیٰ خدمات سرانجام دینے کے سلسلے میں اس کنبہ کو

کافی جاگیریں اور دیگر اعزازات ملے۔ اسی کتبے میں ایک شخص نواب رستم علی خاں تھے ان کے چار بیٹوں میں ایک نواب زادہ یاقوت علی خاں تھے جو کرنال میں یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ یاقوت علی خاں نے قرآن کریم اور حدیث کی تعلیم بعض علما سے اپنے گھر پر حاصل کی بعد اس کے بعد کرنال کے اسکول میں داخل کر دیئے گئے۔ پانچویں جماعت میں جب وہ اول درجے پر آئے تو انہیں انعام کے طور پر ایک کتاب دی گئی لیکن یاقوت علی خاں نے کتاب کی جگہ یہ درخواست کی کہ انہیں چھٹی کی جگہ ساتویں جماعت میں کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، یاقوت علی خاں

کو تعلیم کے ساتھ ساتھ موسیقی اور بھی بہت شوق تھا اور انہی قصد کے لئے انہوں نے استاد اختر رکھا سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے بی اے کرنے کے لئے علیگڑھ کالج میں داخل کیا۔ کچھ عرصہ وہاں تعلیم حاصل کی۔ پھر الہ آباد کے ایک کالج میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۸ء میں بی اے کرنے کے بعد وہ کرنال واپس آ گئے۔ کچھ عرصے بعد ہی ان کے والد انتقال کر گئے اور یاقوت علی خاں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے اہلستان چلے جائیں۔ انگریز کالج آکسفورڈ یونیورسٹی سے انہوں نے ۱۹۲۱ء میں ایم اے کی سند حاصل کی بعد ازاں وہیں سے پیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۳ء میں وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ انہیں بہت سی اچھی حالتوں کی پیشکش کی گئی مگر انہوں نے ملازمت سے انکار کر دیا۔

ہندوستان کوٹنے کے بعد انہوں نے سیاسی حالات کا مطالعہ شروع کیا اور اس کو پیش میں رہے کہ مناسب وقت پر سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کر دیں۔ اس وقت مسلم لیگ، ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی لہذا یاقوت علی خاں نے اس کی رکنیت اختیار کر لی اور جب ۱۹۲۶ء میں لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخابات کا آغاز ہوا تو انہوں نے بھی بطور آزاد امیدوار حصہ لیا۔ وہ بکسانی جیت گئے اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ اور ان اسمبلی میں وہ مسلم لیگ کی بنیوں پر بیٹھنے کی جگہ اختیار کر لیا۔ وہ پورے یہاں سے انہیں جو توجہ حاصل ہوا اس کی روشنی میں انہوں نے اسمبلی کے اندر ڈیموکریٹک پارٹی تشکیل کی اور اس کے قائد چنے گئے۔ جب ڈپٹی سپیکر کا انتخاب ہوا تو انہیں متفقہ طور پر چن لیا گیا۔

۱۹۲۳ء میں انہوں نے مسلم لیگ میں شرکت کر لی اور اس کے بعد سے سیاست میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دی۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں قائد اعظم کو آل پارٹیز نیشنل کونشن میں

شرکت کی دعوت دی گئی تاکہ نہرو رپورٹ پر بحث کی جاسکے۔ یہ معاملہ مسلم لیگ کونسل کے زیرِ بحث آیا۔ کچھ لوگوں نے اس کنونشن میں شرکت کے حق میں بات کی اور کچھ نے اس کے خلاف، لیکن جب کونسل نے نہرو رپورٹ کو مسترد کرنے کا فیصلہ کیا تو چھالگہ نے بعض مسلم لیگ کے سیکرٹریز کے مدد سے استعفا دے دیا۔ تاہم اُن کی یہ تجویز کہ قائد اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ کی ایک کمیٹی کنونشن میں شرکت کرے، منظور کر لی گئی اس مقصد کے لئے ۱۰۲ افراد پر مشتمل وفد ترتیب دیا گیا جس میں یاقوت علی خاں بھی شامل تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۲ سال تھی۔

پہلی گول میز کانفرنس کے بعد جب قائد اعظم سیاست سے کنارہ کش ہو کر انگلستان چلے گئے، طاقت علی خاں نے ہی انہیں مسلسل اصرار کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے پر آمادہ کر لیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۲۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو بمبئی میں سید ذریر حسن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محمد علی جناح مسلم لیگ کے صدر تھے اور جنرل سیکرٹری کے عہدے کیلئے انتخاب ہونا تھا۔ گوانڈر لوگ راجہ غنفر علی خاں کے حق میں تھے لیکن قائد اعظم نے خود ایک قرارداد پیش کی اور یاقوت علی خاں کی تعریف کرنے جوئے اپیل کی کہ انہیں سیکرٹری چُن لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یاقوت علی خاں آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے اس وقت سے ۱۹۴۷ء تک وہ اسی عہدے پر رہے۔

اس دوران وہ قائد اعظم کے بہترین معتاد اور دستِ راست رہے۔ ۱۹۴۰ء میں اجلاس لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہونے کے بعد پنجاب کے یونیٹ پاکستان کے مطالبے کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے اور جب مدراس میں اپریل ۱۹۴۱ء میں مسلم لیگ کا ۲۸واں اجلاس ہوا تو یہ بات واضح کر دی گئی کہ مسلم لیگ پاکستان کے مطالبے سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے گی۔ اس موقع پر نواب زادہ یاقوت علی خاں نے قرارداد پاکستان کے مفاد پر مشتمل ایک اور قرارداد پیش کی جو متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

۱۹۴۳ء میں جب دوبارہ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا تو قائد اعظم نے مسلم لیگ کے اجلاس میں یاقوت علی خاں کو اس انداز میں خراج عقیدت پیش کیا کہ شاید آج تک کسی کو نصیب نہ ہوا ہو۔

”یاقوت علی خاں میرا دستِ راست ہے اور اس نے تاریخ کے مشکل ترین دور

میں اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان دل سے اس کی عزت کرتے ہیں اور اس پر اعتماد کرتے ہیں۔ یاقوت علی خاں بلاشبہ ایک اونچے گھرانے کی پیداوار ہے لیکن عوام کے ساتھ اُس نے جو سلوک کیا ہے وہ مثالی حیثیت رکھتا ہے اور ہم سب کو اس کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ میری دعا ہے کہ خدا اسے عہدِ رازِ عطا فرمائے تاکہ وہ قوم کی زیادہ سے زیادہ خدمات انجام دے سکے۔

۱۹۳۷ء تک یاقوت علی خاں ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلہ رہنما بن چکے تھے۔ اسی

بورڈ کے چیئرمین اور مسلم لیگ کے ترجمان روزنامہ ڈان کے منیجنگ ڈائریکٹر تھے۔

۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو جب شملہ کانفرنس کا انعقاد ہوا تو انہوں نے سب سے پہلے اس اصول پر اصرار کیا کہ مسلم لیگ کو کانفرنس میں شریک ہونے والے لوگوں کی ماضی کی مکمل اختیار ہونا چاہئے۔ مولانا آزاد کو کانگریس کے صدر، خضر حیات ٹوانہ کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور ڈاکٹر خاں صاحب کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت میں مدعو کیا گیا۔ مسلم لیگ کی نمائندگی چھ افراد نے کی اور ان میں نواب زادہ یاقوت علی خاں بھی شامل تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جب مرکز کی عبوری حکومت قائم کی گئی تو یاقوت علی خاں کو خزانے کی وزارت سونپی گئی۔ کانگریس نے یاقوت علی خاں پر اس گھمٹ میں اعتراض نہ کیا کہ ایک مسلمان خزانے کے معاملے میں بُری طرح ناکام ہو جائے لیکن جلد ہی ہندوؤں کو محسوس ہو گیا کہ انہوں نے بہت بُری غلطی کی تھی۔ خود مولانا آزاد نے لکھا، ”جلدی کانگریس نے محسوس کیا کہ حکمہ مایات کی مرضی کے بغیر کسی گھمے میں ایک چرپر اسی بھی جبرتی نہیں کیا جاسکتا۔“

اسی دوران میں پہلی بار ایک مسلمان وزیر خزانہ کو ملک کا بجٹ پیش کرنا تھا۔ بجٹ کی تجاویز میں یاقوت علی خاں نے ایک خاص حد سے زیادہ آمدنی پر ۲۵ فیصد ٹیکس عائد کر دیا۔ اس تجویز پر کانگریس تو کیا پورے ہندوستان کا ہندو بُری طرح چیخ اٹھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی تجارت ہندو کے اور گرد گھوم رہی تھی اور اس ٹیکس سے سرکاری خزانے میں صرف ہندو کی دولت سمٹ کر آجاتی۔ کانگریسی وزیر اور خود پڈت نہرو، کابینہ کے اہلاس میں تو اس تجویز سے متفق ہو گئے کیونکہ کانگریس بار بار یہ نعرہ بلند کرتی تھی کہ اس کا نقطہ نظر سوشل ازم ہے، جبکہ مسلم لیگ سرمایہ داری کے حامی ہیں۔ اس طرح کانگریس خود اپنے جال میں پھنس گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے ہندو سرمایہ دار کانگریس کے خلاف ہو گئے۔ نہرو نے یہ دیکھا تو بجٹ تجاویز کی مخالفت شروع کر دی اور



سال جب حکومت ہندوستان نے ایک تجارتی وفد انگلستان بھیجا تو ریاست علی خاں کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ جب ۱۹۴۰ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے تو انہوں نے یوپی اسمبلی میں انتخابی خدمات سر انجام دیں۔ اس موقع پر مسلم لیگ نے انہیں بریلی سے انتخاب لڑنے کو کہا اور وہ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ اُن کی شب و روز محنت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اُن کے پاس ایک وقت متعدد ذمہ داریاں تھیں۔ وہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر، مسلم لیگ کے اعزازی جنرل سیکریٹری، آل انڈیا مسلم لیگ کی ایکشن کمیٹی کے کنوینر، مرکزی پالیسی ایجنٹ تمام گوشہ نشینوں کو مٹرل گئی۔ آخر کار ریاست علی خاں نے یہ سب کچھ کر کے ۱۰ فیصد کر دیا۔ ۲۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو وہ اٹھارے ہندو لارڈز ویل نے آئین ساز اسمبلی کے لئے دعوت نامے جاری کئے۔ اسمبلی کا کام یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرے۔ لیکن مسلم لیگ کے مجاہدوں کو ولایت کی گئی کہ وہ اسمبلی میں شریک نہ ہوں۔ یہ سب کر لارڈ ویل کو سخت غصہ کیا اور اس نے ریاست علی خاں سے کہا کہ اگر انہوں نے ۶ مئی کی تجویز کو قبول نہ کیا تو عبوری حکومت سے مسلم لیگ کے نامزد وزراء کے نام خارج کر دیئے جائیں گے اس پر ریاست علی خاں نے جواب دیا کہ مسلم لیگ کا بینہ سے الگ ہونا گوارا کر سکتی ہے لیکن اپنے اصولوں کو نظر انداز کرنے پر ہرگز تیار نہیں۔ جب حالات خواب ہو گئے تو وائسرائے کو انگلستان سے حکم ملا کہ وہ مسلم لیگ، کانگریس اور سردار بلدیوسنگھ سے درخواست کریں کہ وہ انگلستان آئیں اور اس مسئلہ کو ختم کرنے کی کوشش کریں لہذا قائد اعظم اور ریاست علی خاں ۲۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کو لندن پہنچ گئے۔ برطانیہ کے سیکریٹری آف سٹیٹ کے ساتھ بات چیت کے دوران یہ فیصلہ کیا گیا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے ہندوستانیوں کو اختیارات مستقل کر دیئے جائیں۔

نواب زادہ ریاست علی خاں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی ختم کرنے کے لئے بھی پوری جہد جمی۔ اس کی ابتداء انہوں نے پہلے اپنے صوبے سے اور پھر کل ہند سطح پر کی۔ وہ ایک جرحے تک علی گڑھ یونیورسٹی کی ایگزامینیشن کمیٹی کے رکن رہے اور اس کے بعد ایٹلو عمریکہ کالج دہلی کی کمیٹی کے رکن اور بعد ازاں اُس کے سیکریٹری بھی رہے۔ یہ اعزازی خدمت اُن کے پاس سات سال تک رہی۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ ۵ اگست کو انہیں پاکستان ہ وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ اُن کے کندھوں پر ایک نوزائیدہ مملکت کی جو بھاری ذمہ داریاں آن پڑی

تھیں، انہیں لیاقت علی خاں نے نہایت دیانت داری اور جانفشانی کے ساتھ سرانجام دیا۔  
 ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وہ کراچی سے راولپنڈی گئے۔ یہاں انہیں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا  
 چار بجے شام وہ کمپنی باغ میں پہنچے لیکن خبری انہوں سے عوام سے خطاب شروع کیا۔ ایک شخص سید  
 اکبر نے ان پر فائر کھول دیئے۔ گولی اُن کے سینے میں لگی۔ انہوں نے کلمہ پڑھا اور یہ کہہ کر خدا پاکستان  
 کی حفاظت کرے۔ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے قاتل کو موقع پر  
 ہی ہلاک کر دیا گیا لیکن اب تک اس شخص کے اصل قاتل جو نے پر اس لئے شبہ کیا جاتا ہے کہ اس  
 سازش میں کچھ اعلیٰ سرکاری افسروں کا ہاتھ تھا تاہم اس لمحے تک اس قتل کے بارے میں واضح طور پر  
 کوئی بات سامنے نہیں آسکی۔

## چودھری رحمت علی

۱۸۹۵ء تا ۱۹۵۱ء

چودھری رحمت علی ۱۸۹۵ء میں ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں موہریں پیدا ہوئے۔ ان کے  
 والد کی تنہائی سی زمین تھی جس سے باعوت زندگی گزارنے کے لئے مناسب آمدن ہو جاتی تھی۔  
 چودھری رحمت علی کے والد کی خواہش تھی کہ اُن کا لڑکا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اسی گاؤں میں ابتدائی  
 تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے موضع راہوں کے ڈل سکول میں داخلہ لے لیا۔ میٹرک کرنے  
 کے لئے وہ جالندھر گئے اور ایئر سنسکرت ہائی سکول میں داخل ہو گئے۔ یہاں سے میٹرک کرنے کے  
 بعد وہ لاہور چلے آئے اور اسلامیہ کالج سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ کالج کی تعلیم کے دوران ہی  
 وہ ایک اخبار ”شمسیری“ میں سب ایڈیٹر ہو گئے جہاں انہوں نے انگریز سامراج کے خلاف مضامین  
 لکھنا شروع کر دیئے۔ ایسے ہی ایک مضمون پر حکومت حرکت میں آئی اور اخبار کو ضمانت و احسن  
 کرانے کے لئے کہا گیا۔ اخبار کے مالک محمد دین فوق نے ضمانت داخل کرادی لیکن چودھری رحمت علی  
 کو عازمت سے جواب دے دیا۔

کالج میں بھی ان کی سرگرمیاں اسی قسم کی تھیں۔ ایک بار کالج کے ہندو طلبا نے ہندو  
 پرنسپل ٹریچیر جی سے شکایت کی ”چودھری رحمت علی انگریز اور ہندو کے خلاف ہمت باتیں کرتا  
 ہے۔ اس کے جواب میں پرنسپل نے کہا: اس کی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرو کیونکہ وہ جاگتے ہیں خواب  
 دیکھتا ہے اور ایک پاگل قاتل ہے“

چودھری رحمت علی تسلیم سے فارغ ہونے کے بعد چیف کالج لاہور میں پکڑ ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد ہی پیرٹری کے لئے انگلستان چلے گئے انہوں نے اعزاز کے ساتھ ایم۔ اے۔ اور بی۔ ایل۔ بی۔ کیل۔ اسی دوران ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں مخصوص خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے دوران انہوں نے کیمبرج میں قومی تحریک پاکستان کی ابتدا کی۔ ۱۹۳۲ء جنوری ۱۹۳۲ء کو آئین، لیکن انتہائی تاریخی اہمیت کا حامل، ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو "شاہ" کیل۔ اس کے نیچے چودھری رحمت علی بانی قومی تحریک پاکستان، لکھا تھا اور ہر مسلمان روڈ پر کیمبرج انگلستان کا پتہ درج تھا۔ اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا جس میں لکھا گیا تھا:

"میں ہندوستان کے تین کروڑ مسلمانوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں ایک اپیل روانہ کر رہا ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کے صوبہ پنجاب، سرحد، کشمیر، شندھ اور بلوچستان میں رہتے ہیں۔ مسلک کتاچے ہیں ان لوگوں کی طبعیت قومی حیثیت کے نعتیق کا مطالبہ درج ہے۔"

کتاچے میں لکھا تھا کہ "یہ اپیل ایسے نازک موقع پر کی جا رہی ہے جب مسلمان زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ہندوستان ایک ملک نہیں بکواس کے بہت سے حصوں میں مختلف قزاقیتیں موجود ہیں۔ مسلمانوں کا مذہب، ثقافت، تاریخ، روایات، سماجی ضابطہ، اقتصاد، نظام، قوانین وراثت اور شادی ہندوستان میں رہنے والی ہر دوسری قوم سے مختلف ہیں۔ ہم ان کے ساتھ کھائیں سکتے نہ ایک دوسرے سے شادی کر سکتے ہیں۔ ہمارے قومی رسم و رواج اور کیلنڈر، حتیٰ کہ ہماری خوراک اور لباس بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اگر اس کے باوجود پاکستان کے مسلمانوں کو مجوزہ وفاق ہند میں منغم کر دیا گیا تو ہم بھی اقلیت ہی کہہ جائیں گے یہ وہ ٹکس اور تاریخی معافی ہیں جنہیں کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ ہم جس کے مستحق ہیں اسی کا مطالبہ کر رہے ہیں لہذا "پاکستان" کی صورت میں اور باقی ماندہ ہندوستان سے علیحدہ ہماری قومی حیثیت کا تئیں ضروری ہے۔ پاکستان کا قیام ایک علیحدہ قوم کے لیے ہو گا باقی حصہ ہندوؤں کے پاس رہے گا جہاں وہ خود مختار حیثیت میں زندہ رہیں گے ماضی میں ہم نے لاتعداد مصائب اور خطرات کا سامنا کیا لیکن ہم صوف ایک چیز برداشت نہیں کر سکتے اور وہ ہے خود کشی! ہم اپنے آپ کو کسی قیمت پر بھی ہند کی صلیب پر نہیں چڑھنے دیں گے۔ ہمارے سینوں میں اسلام کا نور اب بھی موجود ہے۔ ہمارا مشن ابھی حل جزا چاہئے ورنہ یہ کیسی مل نہ ہو سکے گا۔ اگر ہم اپنے عقائد سے

افزونہ کمزوری تو ہمارا مستقبل دیوبند و تہاؤں کی گود میں نہیں بکھ رہا ہے اپنے ہاتھوں میں ہو گا۔  
بہتر چاہیں تو اسے بنا سکتے ہیں چاہیں تو بگاڑ سکتے ہیں۔

چودھری رحمت علی نے ایک اور کتابچہ ۱۹۳۲ء میں شائع کیا جس کا عنوان تھا "قومی تحریک پاکستان کا مطلب کیا ہے؟"

اس بات پر ایک طویل مضمون بحث رہی کہ سب سے پہلے پاکستان کا لفظ کس کی اختراع ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلے "پاکستان" کی صورت میں چودھری رحمت علی کی اختراع تھی اور ان کے کتابچہ "اب یا کبھی نہیں" میں استعمال کیا گیا۔ اس کتابچے کی تلاش برطانیہ کی لائبریریوں میں ایک موصوفے کے ہمارے رہی۔ آخر مسٹر آر ڈبلیو پرچ فیلڈ اسے کہیں دیکھیں سے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے، جس کی نقل انہوں نے شریعت الدین پیرزادہ کو بھیجی۔

مسلمان طالب علموں میں چودھری رحمت علی کے پیغام نے بیداری کی ہر دوڑا دی تھی اور جب یہ تحریک دعوت کو پہنچی تو چودھری رحمت علی نے بنگالی مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ آئادو علی "انگل اسلام" اور حیدر آباد وکٹ میں "عثمانستان" کے قیام کا نعرو بھی شامل کر لیا۔ انہوں نے سعودی ترکی موزخ خاتون خالدہ ادیب کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے "پاکستان" کا لفظ پنجاب، کشمیر، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد (جسے افغان صوبہ بھی کہا جاتا تھا) سے جمعیت لے کر اختراع کیا۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہوا تھا تو ایک روایت کے مطابق چودھری رحمت علی ہندوستان ہی میں موجود تھے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہیں اس اجلاس میں شرکت کا کوئی دعوت نامہ جاری کیا گیا یا نہیں۔ اور وہ کیا وجوہات تھیں کہ انہوں نے اجلاس میں شرکت نہ کی۔ پاکستان سے دوبارہ انگلستان جانے کے بعد انہوں نے وینسیر کوئی نیٹیل موڈنٹ بھی بلائی۔ اس تحریک کے تحت مسلمانوں، اچوتوں، عیسائیوں، سکھوں، بدھوں اور پارسیوں کی الگ الگ قومی حیثیت کے تعین کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

پاکستان کے قیام کے بعد چودھری رحمت علی ۱۹۴۸ء میں یہاں آئے یہ وہی ملک تھا جسے کالج کی زندگی میں ان کے ہندو پرنسپل نے "خواہوں کا ملک" قرار دیا تھا۔ لاہور میں چودھری

رحمت علی اپنے ایک دوست ڈاکٹر یار محمد خاں کے پاس ٹھہرے۔ اُن کے بہت سے انٹرویو اخبارات میں شائع ہوئے جن پر ہندوستانی حکومت نے شدید احتجاج بھی کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہماری حکومت نے بھی چودھری رحمت علی کی عظیم خدمات کا کوئی نوٹس نہ لیا جس کی وجہ سے وہ بہت افسردہ رہنے لگے۔ بعد ازاں انہوں نے جیل روڈ پر ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے کر ٹائٹل اختیار کر لی لیکن کچھ عرصے بعد ہی یکم شائستہ اکرام اللہ اور اقبال شیدائی کے ایما پر وہ پھر یورپ چلے گئے وہاں سے ان تینوں نے کشمیر کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اقوام متحدہ کے نام ایک اپیل بھیجی۔

گچھوڑھی رحمت علی کے خوابوں کی سرزمین حقیقت بن کر آباد تھی لیکن انہیں یہ سرزمین ماسخ نہ آسکی۔ وہ یہاں پر خود کو انتہائی تنہا محسوس کرتے رہے۔ آخر ۱۲۔ فروری ۱۹۵۱ء کو وہ دیارِ غیر میں وفات پا گئے۔ ان کی قبر و کنگ میں موجود ہے لیکن اس قبر پر کوئی کتبہ نظر نہیں آتا کہ اس مجاہد آزادی کی نشان دہی کر سکے۔

## نواب بہادر یار جنگ

۱۹۰۵ء تا ۱۹۴۴ء

نواب بہادر یار جنگ کا تعلق حیدر آباد کن کے ایک متمول گھرانے سے تھا۔ ان کے آباؤ اجداد ۱۷ویں صدی کے وسط میں احمد شاہ ابدالی کی افواج کے ساتھ ہندوستان آئے تھے بعد ازاں اس فوج کے کچھ سپاہی افغانستان لوٹ گئے اور کچھ ہندوستان ہی میں آباد ہو گئے۔ ان میں ایک کنبہ بیاست بچے پور کے نزدیک بارہ سبزی میں آباد ہو گیا۔ ۱۹ویں صدی کے اوائل میں یہ کنبہ حیدر آباد کی منتقل ہو گیا۔ اس کنبہ کے افراد کو جلد ہی دکن کی فوج میں عمدہ ملازمتیں مل گئیں۔ فوجی خدمات ہی کے سلسلہ میں اس کنبہ کو بہت بڑی جاگیر بھی دی گئی۔ ۲۰ویں صدی کے شروع میں اس نے سربراہ نواب نصیب یار و جنگ کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام محمد بادر حسن رکھا گیا جو بعد ازاں نواب بہادر یار جنگ کے نام سے مشہور ہوا۔

بہادر یار جنگ کی پیدائش کے ساتویں روز ان کی والدہ وفات پا گئیں۔ لہذا اُن کی نانی نے پرورش کا اہتمام کیا۔ گھر پر مذہبی تعلیم سے آغاز ہوا۔ پھر دینی تعلیم کے لئے مدرسہ میں داخلہ لے لیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں جب وہ دسویں میں زیر تعلیم تھے، والد کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا

اور نواب بہادر خاں کو تعلیم اس لئے ترک کر دینا پڑی کہ ان کے والد حامد ادا کی جگہ قریباً ۱۰ لاکھ روپے کے قرض کا دور چھوڑ گئے تھے۔ قرض خواہوں نے گھر کے چکر لگانا شروع کر دیئے اور ادائیگی کے لئے تعاقب بڑھتے چلے گئے۔ نواب بہادر یار جنگ نے حالات کا مروانہ وار مقابلہ کیا۔ ۸ سال تک یہ قرضے اقساط میں ادا کئے اور ساتھ ہی اپنے تمام نواری ضابطہ ختم کر کے انتہائی سادہ زندگی گزارنا شروع کر دی۔

بہادر یار جنگ اپنی اہلیہ کے ہمراہ حج بیت اللہ پر گئے اور واپسی پر مشرق وسطیٰ اور بالخصوص افغانستان میں قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے متحدہ حاکم کی سیاسی شخصیتوں سے بھی ملاقات کی اور اسلامی حاکم کو پیدا شدہ خطرات کا مطالعہ بنظرِ خائن کیا۔ وہاں علوم کو نیچر بھی دیتے رہے اور انہیں متحدہ ہر حالات کا مقابلہ کرنے کی ترغیب بھی اور اپنی پرخواجہ حسن نظامی سے ان کی بیٹھک ہوتی رہی۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کے بارے میں ایک بار اس رائے کا اظہار کیا کہ ”بہادر یار جنگ صحیح معنوں میں ہندوستان کا ابنِ بلوط ہے۔“

اب نواب بہادر یار جنگ نے سیاست سے بھی دلچسپی لینا شروع کر دی اور متعدد اسلامی حاکم کی معروف شخصیتوں مثلاً مصر میں وہ، مارٹی کے رہنما مصطفیٰ خاں پاشا اور محمد علی پاشا وغیرہ کو خطوط لکھے اور ان سے گزشتہ ملاقاتوں کے حوالہ سے مسلمانوں کے عام حالات اور مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ نواب صاحب نے انہیں مسلمانوں کے دیگر مسائل سے بھی آگاہ کیا۔

۱۹۳۸ء کے بعد انہوں نے خاکسار تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس تحریک کی قیادت علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کر رہے تھے۔ نواب صاحب نے علامہ مشرقی کے ساتھ ایک سرگرم کارکن کی حیثیت میں کام کیا۔ حکومتِ برطانیہ خاکسار تحریک کو ایک فاشسٹ تحریک خیال کرتی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں علامہ مشرقی کو گرفتار کر کے ویلور جیل میں بند کر دیا گیا۔ جانِ ملام نے سبک دھڑک کر دی۔ اس موقع پر نواب بہادر یار جنگ نے انتہائی کوشش کی کہ علامہ مشرقی سے جیل میں ملاقات ہو سکے، لیکن انہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ان دنوں نواب بہادر یار جنگ خاکسار تحریک کے حاکم اعلیٰ تھے۔

لیکن ۱۹۴۲ء تک علامہ مشرقی کے مضامین سے یہ بات نواب بہادر یار جنگ پر عیاں ہو چکی تھی کہ وہ قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کے مقاصد کے سمجھتے غلط ہیں۔ علامہ مشرقی کے اس

دوبنے نے نواب صاحب کو شدید رنج پہنچایا۔ اتفاقاً انہی دنوں ایک خاکسار نے عبیدی میں تاجدار اعظم پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ نواب بہادر یار جنگ اس سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے علامہ شریف کے نام یہ لکھ کر کہ وہ ان کی قیادت سے افتادہ کھو بیٹھے ہیں، استعفا دے دیا۔

۱۹۳۵ء میں نواب بہادر یار جنگ کو چلی یار مجلس اتحاد المسلمین، حیدر آباد دکن کا صدر چن لیا گیا۔ نواب صاحب کی کوششوں سے اس مجلس میں حتی زور پیدا ہو گئی۔ بعد ازاں یہ مجلس بدر آباد کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا باعث بنی۔ سب نظام حیدر آباد نے یہ دیکھا کہ مجلس کے پیش فارم سے ریاست کی حکومت کے خلاف عوام کی سیاسی روشیں معاہدوں کی صورت میں سامنے آ رہی ہیں تو انہوں نے پہلے تو نواب صاحب کو انعام و اکرام سے نوازا چاہا لیکن جب بات نہ بنی تو انہیں سب سے بڑے انعام یعنی ریاست کے وزیر اعلیٰ کے عہدے کی پیشکش کر دی گئی۔ لیکن لوگوں کے ساتھ نواب بہادر یار جنگ کی وفاداریاں فہم نہ کی جاسکیں۔ اس سے بعد نظام حیدر آباد نے دھمکیاں دینا شروع کر دیں اور ایسی تعابیر سے باز رہنے لگے۔ جن میں سرکاری پالیسیوں پر نکتہ چینی کی جاتی تھی لیکن نواب صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ

”ایسا کوئی راستہ جو قرآن کریم کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ کر، کسی

اور بنیال کی طرف رہنمائی کرتا ہو صرف اور صرف جہنم ہی کی طرف جاتا ہے۔“

پھر وہ دور آیا جب پاکستان کا مطالبہ زور پکڑ چکا تھا۔ قائد اعظم ہندوستان کے مسلمانوں کو مطالبہ پاکستان کے لئے قائل کرنے کی غرض سے مسلسل ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے تو نواب بہادر یار جنگ نے ہندوستان کی ریاستوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ انتہائی نامساعد حالات کے باوجود بہادر یار جنگ آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ قائد اعظم نے نواب صاحب کو ریاستوں کی مسلم لیگوں کا صدر منتخب کیا تھا اور یہ عہدہ ان کے پاس تا دمِ مرگ یعنی ۱۹۴۳ء تک رہا۔

اب بہادر یار جنگ ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلہ ہنڈاؤں میں شامل ہو چکے تھے۔ وہ اپنی تقاریر میں حکومت برطانیہ پر انتہائی سخت نکتہ چینی کرتے رہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے آزادی کے مطالبے پر ڈٹے رہے۔ وجہ یہ کہ ان کے نظام کی پالیسیوں بھی زیر بحث لاتے رہے۔ نظام تو خود ہی ان سے ٹکرتا تھا۔ یہ کہہ دینا اس لئے نظام

کو ہدایت کی کہ وہ فوری طور پر نواب صاحب کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لئے اقدامات کرے۔  
نظام نے موقع غنیمت جانا اور نواب صاحب کو ریاست کی حدود کے اندر یا باہر تقریر کرنے کی  
مانعت کر دی۔ انہی دنوں قائد اعظم صوبہ سرحد میں عام انتخابات کے انعقاد کے سلسلہ میں  
متنکر نظر آتے تھے۔ اس علاقے میں خان عبدالغفار خان، جنہیں کانگریس پیار سے سعدی  
گاندھی بھی کہتی تھی، اپنے خدائی خدمت گاروں کی قوت کے باعث بہت زیادہ اثر رکھتے تھے۔  
قائد اعظم نے محسوس کیا کہ اس وقت نواب بہادر یار جنگ کے سوا کوئی دوسرے شخص سرحدی  
مسلمانوں کو ہموار نہیں بنا سکتا مگر مشکل تو یہی تھی کہ موصوف کو کہیں بھی تقریر کرنے کی اجازت نہ  
تھی۔ قائد اعظم نے نظام دکن سے ایک خط میں درخواست کی کہ نواب صاحب کو مسلم لیگی  
امیدواروں کے حق میں صوبہ سرحد کے اندر تقاریر کرنے کی اجازت دی جائے۔ نظام دکن نے  
اجازت دے دی اور نواب صاحب نے سرحد کا طوفانی دورہ شروع کر دیا۔ ان کی امتش بیانی  
نے سرحد کے ہزاروں کو - کو مسلح ایڈ کے حق میں ووٹ دینے پر مجبور کر دیا۔

دیں اثناء نظام دکن کے بہت سے چالیس درباری نواب صاحب کے خلاف نظام کے  
کان بھر رہے تھے۔ سازشوں اور شہادتوں کے اس غلیظ ماحول سے دل برداشتہ ہو کر  
نواب صاحب نے اپنا خطاب (نواب بہادر یار جنگ) اور جاگیر واپس کر دی۔

جب نواب صاحب نے ۱۲/۱۲ اور ۱۵/۱۲ اگست ۱۹۴۳ء کو سری نگر میں آل جوں کشمیر  
مسلم کانفرنس کے اجلاس کا اعلان کیا اور اس میں اپنی اور قائد اعظم کی شرکت کی بات کی تو کشمیر  
کے سکد راجہ کے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔ ۱۲- اگست ۱۹۴۳ء کو جب وہ اپنی بیگم کے  
بہار کشمیر کی سرحد میں داخل ہوئے تو پہلی چیک پوسٹ پر ان کا پستول چھین لیا گیا۔ جب وہ سرنگر  
پہنچے تو علی الصبح انہیں گرفتار کر کے پولیس کی گاڑی میں ڈال کر ایک گھنٹے جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔  
شدید بارش ہو رہی تھی اور نواب صاحب عجیب کشمکش میں تھے کیونکہ دوسرے روز کانفرنس  
منعقد ہونا تھی۔ انہیں سری نگر میں داخلہ کی مانعت کر دی گئی، سامان چھین لیا گیا اور ان کی  
بیگم کو بھی ان سے جدا کر دیا گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ قائد اعظم بھی انتہائی مصروفیات کے باعث  
سری نگر نہ پہنچ سکے۔ اسی دوران اگریز حکومت نے ان کی طرف سے یا ان کو بھیجے جانے والے  
خطوط اور تار ضبط کرنا شروع کر دیئے۔ بہر حال اس کے باوجود کشمیری مسلمانوں کے لئے ان کی



۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کراچی میں نواب صاحب نے تحریک پاکستان کے مقاصد بیان کئے۔ تقریر کے دوران جب انہوں نے یہ کہا کہ پاکستان کا آئین اسلامی اصولوں پر مبنی ہوگا تو قائد اعظم نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے ان کے خیال کی بے ساختہ تائید کی۔

نواب بہادر یار جنگ نے مجلس تبلیغ اسلام، جس کے وہ خود ہی بانی تھے، کی وساطت سے تبلیغ اسلام کی بہترین مثال قائم کی۔ انہوں نے حیدر آباد دکن میں بیسیوں امام مذہبی جلسوں سے خطاب کیا اور شہر شہر، قریہ قریہ مجلس کی شاخیں قائم کیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہزاروں ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ وہ دور تھا جب آریہ سماجی اپنے رہنما سوامی دیانند سراسوتی کی قیادت میں اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے۔ آریہ سماجیوں نے بہادر جنگ کی مذہبی سرگرمیوں کے باعث ان پر طرح طرح کے بے ہودہ الزامات عائد کئے۔ بین معروف ہندو اخباروں کے الزامات، اپنے خلاف احتجاجی پوسٹروں اور بے مقصد پرائیڈ سے سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہے۔ اسی دوران انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک پر جا بجا لیکچر دینا شروع کر دیئے۔ ہزاروں مسلمان ان کی تقریر سننے کے لئے دور درود سے چلے آتے۔ ان کی زبان کی محاسن اور انداز بیان کچھ اتنا معروف ہوا کہ ایک رات (۱۹۳۰ء میں) جب بہادر یار جنگ وکٹری گراؤنڈ میں بیت نبوی بیان کر رہے تھے تو نظام دکن خاموشی کے ساتھ آئے اور ان کا بیان سنتے رہے۔ بہادر یار جنگ نے اپنی آواز قدرے بلند کی اور نظام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گرج کر کہا:

”مسئو! تم وہ شخص ہو، جس نے سر پر تاج اور جس کے نیچے چنٹ ہے لیکن تم بھی اسلام کے آنری اور سب سے بڑے پیغمبر کے غلام ہو، کیونکہ صحیح تاجدار وہی ہیں۔“

یہ سنتے ہی نظام کی آنکھوں سے آنسو روان ہو گئے۔ نظام جلسہ کے بعد چلے گئے اور ایک زمان کے خدیو نے انہیں نواب بہادر یار جنگ کا خطاب عطا کیا گیا۔

بیت نبوی پر جلسوں میں شرکت اور تقریر کے لئے ہندوستان کے کونہ کونہ سے اجہوں۔ یہ موصول ہوتی رہیں۔ نواب بہادر یار جنگ کا عالم یہ تھا کہ ۱۹۴۲ء تک انتہائی سیاسی مصروفیات کے باوجود وہ تبلیغ اسلام میں مصروف رہے۔ ان کا معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد بلا تاخیر مسجد میں دس قرآن دیتے اور نامریخ اسلام بتاتے۔ اس طرح ان کے ہر دن کا آغاز

تبلیغ اسلام سے ہوتا۔

۲۵۔ جون ۴۴ء اور کی صبح درس قرآن کے بعد عادت کے مطابق کوئی ایک گھنٹہ تک خطوط کے جواب لکھواتے رہے۔ اس کے بعد وہ مدرسہ عربیہ نسوان میں لڑکیوں سے خطاب کرنے چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا بیگم کے ساتھ کھایا، تنھوڑی دیر آرام کیا اور شام کو حبشہ ہاشم علی کے یہاں مشائخہ پر چلے گئے۔ کھانے کے بعد حسبِ عادت حقہ پینے لگے لیکن ان کا سر پکرا گیا اور کچھ دیر بعد یہ مجاہد آزادی صرف ۲۹ سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

## باب

## ہندوستان کا آئینی ارتقاء

۱۸۶۱ء تا ۱۹۳۵ء

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں پر قابو پانے کے بعد انگریزوں نے مناسب یہی سمجھا کہ فوری طور پر ہندوستان میں آئینی حکومت قائم کر دی جائے۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ نے ایک قانون کی منظوری دی جس کے تحت بریٹانیا ڈائریکٹریٹ اور بورڈ آف کنٹرول کی جگہ ہندوستان کے لئے ایک سیکریٹری آف سٹیٹ کا عہدہ قائم کیا گیا۔ اور اس کے لئے پندرہ ارٹھین پر مشتمل ایک کونسل قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ یہ قانون انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۵۷ء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ تاج برطانیہ نے براہ راست ہندوستان کے علاقوں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ کمپنی کے بعد ہندوستان میں یہ پہلی آئینی تبدیلی تھی۔ ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ برطانوی پارلیمنٹ کی وجوہات کی بنا پر یہ قانونی منظور کرنے پر مجبور ہوئی اس کی دیگر اہم وجوہات یہ تھیں کہ اس وقت جو قوانین موجود تھے۔ حوام ان سے بدول تھے۔ گورنر جنرل کی مجسٹریٹ کو نسل کو پورے ملک کے لئے قانون وضع کرنے پڑتے تھے۔ قانونی مرکزیت ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ کے تحت قائم کی گئی تھی۔ مگر وہ اس لئے انتہائی غیر موثر ثابت ہوئی۔ کہ مرکزی حکومت کے لئے پرمیٹیف فیسوں کی ضروریات اور عام حالات کی تفصیل میں جانا ناممکن تھا۔ بلکہ حکومت خود بھی مجسٹریٹ کو نسل کی کارکردگی سے مطمئن نہ تھی۔ حکومت اس چیز کو محسوس کر چکی تھی۔ کہ ۱۸۵۷ء کی

مجدد سجد آزادی کی ایک نئی طرح پر جو یہ بھی تھی کہ چند دستاویزوں کو امور مملکت سے بالکل الگ رکھا گیا تھا۔ سرسید احمد خان نے مسودہ میں جن اپنے رسالہ ”اسباب بغاوت ہند“ میں یہ واضح کر دی تھی کہا کہ ہندوستانیوں کو امور قانون سازی میں شامل رکھا جانا۔ تو مسودہ کی ”کے ابھرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ حکومت ہندوستانیوں کے مشورے کے بغیر قوانین کا اطلاق کرتی ہے۔ ان میں وہ منطقی حالات، رسم و رواج اور مذہبی عقائد کو ملحوظ رکھتی،

نئے قانون کے تحت گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کر کے ایک اور رکن کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ یعنی اب یہ کونسل گورنر جنرل سمیت ۵۔ اراکین پر مشتمل ہو گئی۔

گورنر جنرل کی مجلس قانون ساز > LEGISLATIVE COUNCIL  
میں کم از کم چھ اور زیادہ سے زیادہ اراکین کی توسیع کی گئی۔ ان میں سے نصف اراکین غیر ہندو ضروری تھے،

مجلس قانون ساز مدراس اور بمبئی میں قائم کی گئیں۔

گورنر جنرل کو پنجاب اور صوبہ سرحد میں بھی اسی قسم کی مجلس قائم کرنے کا اختیار دیا گیا۔ مجلس قانون ساز کے اختیارات قطع طور پر یہ قانون سازی تک محدود کر دیئے گئے۔ گورنر جنرل کی مجلس قانون ساز کی طرف سے منظور شدہ بل کے لئے گورنر جنرل کی ضروری تھی تاکہ اسے قانون کی حیثیت حاصل ہو جائے کسی پریذیڈنسی یا صوبہ کی مجلس قانون کی طرف سے منظور شدہ بل کے لئے متعلقہ صوبہ کے گورنر اور اس کے بعد گورنر جنرل کی تو ضروری تھی ہندوستان میں کسی بھی مجلس قانون ساز کے منظور شدہ بل کو تاج مسترد کر سکتا تھا۔

۱۸۶۱ء کے اس قانون کے تحت گورنر جنرل کو ہنگامی حالات کی صورت میں امن کرنا اور برطانوی مقبوضہ ہندوستان میں بہتر حکومت کے قیام کے لئے آرڈی نینس جاری کر کے اختیار تفویض کیا گیا تھا۔

## ایکٹ ۱۸۹۱ء کی اہمیت

۱۸۹۱ء کے ایکٹ کے تحت پہلی بار ہندوستانیوں کو حکومت کے امور میں حصہ لینے کی تہذیب ملی۔ بلاشبہ کونسلوں میں ہندوستانیوں کی شمولیت ایک اہم اقدام تھا۔ ایکٹ ہندوستان کی آئینی تاریخ میں دو وجوہات فی بنا پر اہمیت کا حامل ہے۔ ایک تو یوں کہ اس کی وجہ سے گورنر جنرل کو مقامی لوگوں کو قانون ساز کے کام میں ساتھ جانے کا موقع ملا۔ نیز اس لئے کہ مختلف صوبوں میں قانون ساز کونسلوں کے قیام کے باعث اس قانون نے ۱۹۳۷ء میں صوبوں کو داخلی خود مختاری دینے کی بنیاد ڈالی۔

## انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء

آئینی ترقی میں دوسرا اہم قدم انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء تھا اس ایکٹ کے تحت قانون ساز کونسلوں (مرکزی اور صوبائی) میں توسیع کی گئی اور مزید اراکین شامل کئے گئے۔ مرکزی کونسل میں اراکین کی تعداد بڑھا کر ۹ کر دی گئی اور صوبائی کونسلوں میں (بڑے صوبوں میں) ۱۲ اور ۱۵ دھوٹے صوبوں میں ۹ کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی غیر سرکاری اراکین کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ پہلے ان مجالس قانون ساز کے اراکین کے اختیارات صرف قانون سازی تک محدود تھے۔ لیکن اس ایکٹ کے تحت انہیں بجٹ پر بحث کرنے اور تنقید کرنے کے اختیارات بھی دے دیئے گئے۔ تاہم مرکزی اور صوبائی اس قانون ساز میں سرکاری اراکین کی اکثریت کو قائم رکھا گیا۔

## منظور لے اصلاحات ۱۹۰۹ء

انڈین کونسل ایکٹ ۱۹۰۹ء ہی کو غٹھ مورے اصلاحات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نادر جہ ہندوپاک پر اس ایکٹ نے بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔ ہندوستان کے عوام ۱۸۹۲ء کی اصلاحات سے کچھ مطمئن نہ تھے۔ مرکزی مجلس قانون ساز (امپیریل لیجسلیٹو کونسل) اور صوبائی مجالس قانون ساز کے اختیارات محدود تھے۔ لہذا ہندوستانیوں نے مزید اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ علاوہ ازیں لارڈ کرزن کی انتظامی پالیسی نے حکومت کے ساتھ

محرم کی ہمدردیاں ختم کر دیں۔ گورنر کا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ نامناسب تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ کہ ہندوستانی حکومت کے اہل نہیں۔ لہذا اُس نے تمام اعلیٰ افسرین کے سپرد کر دیئے۔ گورنر مقامی خود مختار اداروں کے خلاف تھا۔ اس نے کلکتہ کا ریورسٹن انکسٹ میں ترمیم کر کے کلکتہ کی مقامی خود مختار حکومت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ ۱۸۵۷ء میں بنگال کی ۱۹۰۴ء کے تحت ملک بھر کی ریورسٹیاں سرکاری تحویل میں چلی گئیں۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم نے ملک بھر میں بے چینی کی لہر دوڑادی۔ لنگاہ، ملایا اور جرنی افریقہ میں ہندوستانیوں سے توہین آمیز سلوک کیا جاتا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اور آغا خان کی قیادت میں ایک وفد نے گورنر جنرل سے مل کر مسلمانوں کے لئے علیحدہ انتخابات کا مطالبہ کر دیا تھا۔ لارڈ کٹلر اس مطالبہ پر ہمدردانہ غور کا وعدہ بھی کیا۔

انہی حالات کے تحت وزیر ہند لارڈ مورلے اور گورنر جنرل ہندوستان لارڈ کٹلر نے محسوس کیا۔ کہ ہندوستانیوں کی بہتری کے لئے مزید اصلاحات ناگزیر ہیں۔ انہوں نے آئین میں کچھ تبدیلیوں کی سفارش کی جس کی روشنی میں برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۹۰۹ء میں انڈین کونسل ایکٹ منظور کیا۔ یہ آئینی تبدیلیاں کیا تھیں ؟

ایکٹ ۱۹۰۹ء کے تحت مجالس قانون ساز میں توسیع کر دی گئی۔ گورنر جنرل کی مجالس میں زائد اراکین کی تعداد ساٹھ کر دی گئی۔ صوبہ متحدہ، بہار، اڑیسہ، بنگال، مدراس اور بمبئی کی مجالس میں یہ تعداد پچاس اور برما، آسام اور پنجاب کی مجالس میں ۳۰ کر دی گئی۔ انکسٹ میں واضح کیا گیا کہ مجلس کے اراکین منتخب اور نامزد افراد پر مشتمل ہوں گے۔ گورنر جنرل کی مجلس میں ۳۷ سرکاری اور ۳۱ غیر سرکاری اراکین شامل ہونا تھے۔ ۳۷ سرکاری اراکین میں سے ۲۸ گورنر جنرل کی طرف سے نامزد کئے جانے تھے۔ باقی اراکین بلحاظ صوبہ رکن ہونا قرار پائے۔ ان میں خود گورنر جنرل، کانڈر انچیف، اس صوبہ کا گورنر جہاں اجلاس منعقد ہونا ہو، اور گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے ۶ عام اراکین شامل تھے۔ ۳۱ غیر سرکاری اراکین میں ۲۷ کا انتخاب اور ۴ کی نامزدگی قرار پائی۔ جو ۱۲۷ اراکین منتخب کئے جانے تھے ان میں سے ۱۳ عام انتخابات میں، ۶ زمینداروں سے، ۶ مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخابات سے اور ۲ چیمبرن کامرس سے منتخب ہوتے تھے۔ سرکاری اکثریت مرکز ہی کے ہاتھ میں رہی۔

صوبائی مجالس قانون ساز میں بھی توسیع کر دی گئی۔ مدراس، بنگال، یوپی، بمبئی، بہار

اور آسام کی مجلس کے لئے ۵۔ اور پنجاب، برما اور آسام کے لئے ۳۰۔ اراکین کی تعداد مقرر کی گئی۔

مجلس قانون ساز کی ذمہ داریاں بھی بڑھا دی گئیں۔ مرکزی اور صوبائی مجلس قانون ساز کو بجٹ پر بحث کا اختیار دیا گیا۔ اراکین مجلس قانون ساز بحث پر، یا عام مفاد کے کسی دوسرے معاملہ پر قرارداد پیش کر سکتے تھے ایسی کسی قرارداد کو صرف سفارش کی حیثیت دی گئی۔ حکومت اس پر اقدام کرنے کی پابند نہ تھی۔ اراکین کو سوالات اور ضمنی سوالات کرنے کی اجازت بھی دی گئی۔ لیکن سوال سے متعلق حکمہ کار کن فوری طور پر سوال کا جواب دینے سے انکار کر سکتا تھا اور اس مقصد کے لئے وقت طلب کر سکتا تھا۔

اس ایکٹ کے تحت بمبئی، بنگال اور مدراس کی طرف سے ایگزیکٹو کونسل میں اراکین کی تعداد ۲۰ کر دی گئی۔

حق رائے دی محدود تھا۔

پہلی مرتبہ مسلمانوں کے مطالبہ بڑا کارِ انتخاب کو منظور کیا گیا۔ دوسری اقلیتوں کو قبل کا انتخاب حق نہیں دیا گیا۔

ہندوستانیوں کو ایگزیکٹو کونسلوں میں شامل کیا گیا۔ گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں سب سے پہلے ہندوستانی رکن ایس۔ بی۔ سہتے لیکن ایکٹ کے تحت ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے پر نہ دیتے تھے۔

۱۹۰۹ء کی اصلاحات نے نمائندہ حکومتوں کے قیام کی طرف پہلا قدم بڑھانے کا موقع فراہم کیا۔ لیکن یہ اصلاحات ہندوستانیوں کی سیاسی امنگوں اور خواہشات کو پورا نہ کر سکیں۔

### اعتراضات

ہندوستانی کے لوگ ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لیکن نثر مائے اصلاحات میں ایسی حکومت کے لئے کوئی بنیاد نہ تھی۔ صرف مجلس قانون ساز کے اختیارات میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ اصل اختیارات اب بھی انگریز حکومت کے ہاتھ تھے۔

گوباریمانی نظام حکومت کا ڈھانچہ موجود تھا۔ لیکن ایگزیکٹو یا مقتضہ پر ذمہ دار یا ان کا مقصد  
اس ایکٹ کے تحت بڑے زمینداروں اور تجارتی چیمبروں کو بلاوجہ علیحدہ نمائندگی دی گئی تھی  
انتخابی طریق کار موجود تھا۔ لیکن خزانے دی حدود اور وٹروں کی تعداد اتنی کم تھی کہ  
ان سے آسانی کے ساتھ سودا بازی کی جاسکتی تھی۔

انتخاب کا بالواسطہ طریق کار غیر جمہوری تھا۔ اس لئے کہ ایسے انتخابی طریق کار کے باعث  
ووٹ دینے اور ووٹ لینے والے کے درمیان کوئی براہ راست تعلق نہ رہتا تھا۔ سرگوتھوں کو  
ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ نہ ہی ان کی کسی سیاسی حیثیت کا تعین کیا  
گیا تھا۔

مرکز میں سرکاری اراکین اور صوبوں میں غیر سرکاری اراکین کی اکثریت کسی صورت بھی معتدلات  
تفویض نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ منتخب اراکین بہر حال اقلیت ہی میں رہتے تھے۔ لہذا سرکاری اور نامزد  
غیر سرکاری اراکین کی آراء کی اکثریت اول الذکر کی رائے پر غلبہ حاصل کر  
سکتی تھی۔

اس اعتبار سے ۱۹۰۹ء کا یہ ایکٹ ہندوستان کے لوگوں کو مطمئن کرنے میں ناکام رہا اور  
اسی بنا پر مزید اصلاحات کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔

### گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء

۔ مونٹگمری جیمس فورڈ اصلاحات ۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء پہلی جنگ عالمگیر کے بعد منظور ہوا اس ایکٹ کی  
منظوری جن حالات میں کی گئی وہ یہ تھے۔

۱۹۰۹ء میں جو اصلاحات کی گئی تھیں ان سے ہندوستان کے عوام مطمئن نہ تھے کیونکہ ان  
کے تحت ہندوستانہوں کو مناسبت اختیارات تفویض نہیں کئے گئے تھے۔ گوباریمانی طرز حکومت  
 قائم کر دیا گیا تھا لیکن ایگزیکٹو مقتضہ کے سامنے جواب دہ نہ تھی۔ امپیرل لیجسلیٹو کونسل میں سرکاری  
 اراکین کی اکثریت اور صوبائی مجالس قانون ساز میں غیر سرکاری اراکین کی اکثریت رکھی گئی اس  
 کا واضح مطلب یہ تھا کہ اختیارات عوام کے نمائندوں کے ہاتھ  
 میں نہ تھے۔



شروع شروع میں مسلمانوں کا رویہ حکومت کے ساتھ دوست و تھا کیونکہ حکومت کی طرف سے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد بنگال کی تعلیم کی تبلیغ کا اعلان دیا دیا گیا اور حکومت کے اس اقدام سے مسلمانوں کو جو صدر سپنچا اس کی وجہ سے حکومت پر مسلمانوں کا اعتماد ختم ہو گیا۔ مسلمانوں نے حکومت کے اس اقدام کو مسلمانوں کے ساتھ تعصب اور بندہ دلوں کے ساتھ رواداری پر مبنی قرار دیا علاوہ ازیں انگریزوں نے ترکی اور اٹلی کی جنگوں میں ترکی کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ لہذا ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریز کی اس پالیسی پر شدید اعتراض تھا کہ اس نے آٹھ وقت میں ترکوں کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر مسلمان حکومت برطانیہ سے بد دل ہو گئے تھے۔

## جنگ عظیم کے اثرات

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی ہندوستان میں نے حکومت سے بہت سی رنجشوں کے باوجود ان کی مدد کی تقریباً دس لاکھ ہندوستانی برطانیہ کی طرف سے لڑنے کے لئے سمندر پار گئے۔ انہوں نے فرانس سے مشرقی افریقہ تک اپنی بہادری اور وفاداری کی مثال قائم کی۔ اپنی انہی خدمات کے صلہ میں ہندوستانی اب اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ انہیں حکومت سے خود مختاری سونپی جائے گی۔ جنگ طویل چلی گئی اور ہندوستانی محسوس کرنے لگے کہ حکومت انہیں حکومت خود مختاری سونپنے کے وعدے پر بھی آمادہ نظر نہیں آتی۔

## وطنی حکومت کی تحریک

انگریزوں کی طرف سے مایوسی کے بعد مسز اینی بینٹ نے وطنی حکومت کی تحریک شروع کر دی مسز بینٹ نے کہا کہ حکومت خود مختاری ہندوستانیوں کا پیدائشی حق ہے۔ بیشتر ہندوستانیوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا اور ایس پی سہنا نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ عوام اور خاص طور پر نوجوانوں کو ملٹی کرنے کے لئے اس ضمن میں واضح اعلان کرے۔ حکومت نے بھی محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کے لئے اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا

برطانوی سکریٹری آف سٹیٹ برائے امور ہند لارڈ مونٹگیگ نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو برطانوی پارلیمان میں اعلان کیا کہ تاج برطانیہ کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری قائم کرنے کے لئے ہندوستانیوں کو انتظامیہ کے ہر شعبے میں جگہ دی جائے اور ہندوستان میں ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کی خاطر حکومت خود اختیاری کی بتدریج نشوونما حکومت برطانیہ کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت سے کی جائے۔ اس اعلان میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ برطانوی حکومت کا نصب العین یہ ہے کہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری دی جائے۔

لارڈ مونٹگیگ ہندوستان آئے اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ چیمفورڈ کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد انہوں نے اصلاحات کے لئے ایک سکیم مرتب کی۔ یہ سکیم برطانوی پارلیمان کے سامنے پیش کی گئی اور پھر اسی رپورٹ کی بنیاد پر برطانوی پارلیمان نے ۱۹۱۹ء میں ایک ایکٹ منظور کیا۔ جسے عام طور پر مونٹگیگ-چیمفورڈ اصلاحات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

### خاص خاص باتیں

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء..... مونٹگیگ چیمفورڈ رپورٹ کی بنیاد پر منظور کیا گیا اس ایکٹ کی خاص خاص باتیں یہ تھیں۔

○ ابتدا میں ایکٹ کے مقاصد کی مکمل وضاحت کر دی گئی تھی یہ وہی باتیں تھیں جن کا ذکر ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان میں کیا گیا تھا (دیکھئے وطنی حکومت کی تحریک)۔ اس کے تحت ہندوستان کو ہر حال تاج برطانیہ کا ایک جزو لاینفک رہنا تھا اور ہندوستانیوں کو بتدریج ایک ذمہ دار حکومت قائم کرنا تھی۔ ہر صوبے میں اقدامات کی نگرانی حکومت برطانیہ کو رہنا تھا۔

○ ایکٹ ۱۹۱۹ء کے تحت صوبوں میں جزوی طور پر ذمہ دار حکمرانوں کا قیام عمل میں آنا تھا لہذا اس بنا پر مختلف ذمہ داریوں اور امور کی تفہیم لازمی ہو جاتی تھی ان امور کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

(۱) مرکزی (۲) صوبائی

دفاع، سیاسی اور خارجہ تعلقات، کسٹمز، ڈاک و تار، کرنسی اور مواصلات وغیرہ مرکزی

امور میں شامل کئے گئے اور مقامی حکومت خود اختیاری کو صحت عامہ، صفاغی تعلیم، زراعت اور آبپاشی وغیرہ دے دیجئے گئے۔

اس ایکٹ کے تحت برطانوی مریٹری آف سٹیٹ برائے امور ہند کے اختیارات میں قدرے تخفیف کر دی گئی اس کے کچھ اختیارات گورنر جنرل کو منتقل کئے گئے۔ ایسے متعدد امور جن کے سلسلے میں بغرض وضع قانون اس کی رضامندی ضروری تھی، یہ بھی کمی کر دی گئی۔ صوبائی امور میں بھی تخفیف کی گئی ہندوستانی کونسل کے ڈھانچے میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ ایکٹ کے تحت سکریٹری آف سٹیٹ برائے امور ہند اور اُس کی کونسل کے اراکین کے مشاہدوں کی ادائیگی برطانوی خزانے کے ذمہ کر دی گئی ہندوستانی کونسل میں اراکین کی تعداد کم کر کے اُس میں کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ ۱۲ اراکین کی گنجائش رکھی گئی ان میں کم از کم نصف اراکین ایسے ہونا ضروری تھے جن کا ہندوستان میں سروس کا تجربہ دس سال ہو۔ ان کی میعاد رکنیت ۵ سے سات سال تک کر دی گئی۔ لیکن ان کا سالانہ مشاہرہ بڑھا کر ایک ہزار سے بارہ سو پونڈ کر دیا گیا۔

ایکٹ کے تحت پہلی بار ہائی کشنر برائے ہندوستان کا عہدہ قائم کیا گیا اور انگلستان سے ہندوستان کی حکومت کے لئے مشینوں اور دیگر اشیا کی خرید کی ذمہ داری بھی ہائی کشنر کے سپرد کر دی گئی۔ اُس کے ذمہ انگلستان میں ہندوستانی طالب علموں کی بہبود کی نگرانی بھی کر دی گئی۔ ہائی کشنر کو گورنر جنرل کے ماتحت کر دیا گیا اُس کے عہدے کی میعاد پھر سال مقرر کی گئی جو ہندوستان کے خزانے سے واجب الادا تھی۔

ایکٹ کے تحت مرکز میں ایک دو ایوانی

منفصلہ کا نظام قائم کر دیا گیا۔ دو ایوانوں کو مجلس قانون ساز اور مجلس مملکت

کا نام دیا گیا۔ مجلس مملکت ایوان بالا

کو کہا جاتا تھا جس کے اراکین کی کل تعداد ساٹھ مقرر تھی۔ اس میں سے ۳۳ منتخب اور ۲ نامزد کئے جاتے تھے۔ اس کی میعاد پانچ سال مقرر کی گئی۔ تاہم گورنر جنرل کو اس میعاد میں توسیع کا اختیار تھا۔ مجلس قانون ساز ایران زیریں کہلاتا تھا جو ۱۳۵ اراکین پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ۴۰ منتخب اور ۹۵ نامزد کئے جاتے تھے اس کی میعاد تین سال تھی جس میں توسیع کا اختیار گورنر جنرل کو دیا گیا۔ گورنر جنرل کو دونوں ایوانوں کا اجلاس طلب کرنے، ختم کرنے

اور انہیں کا عدم کرنے کا اختیار تھا اور وہ دونوں ایوانوں سے خطاب بھی کر سکتا تھا۔

مرکزی مقننہ گروپ سے برطانوی ہند کے لئے قانون سازی کر سکتی تھی تاہم اس کے اختیارات کی کچھ حد بھی مقرر تھی۔ دفاع، تعلقات خارجہ، سوامی قرضوں اور امور ہندوہی کے بارے میں گورنر جنرل کی پیشگی اجازت کے بغیر کوئی بھی مقننہ میں پیش نہ کیا جاسکتا تھا۔

○ مرکزی مقننہ کے اختیارات پر ہندوہی بااروک لوک سے یہ ظاہر تھا کہ مرکزی ایگزیکٹو اس کی ہدایت کو رد کر سکتی تھی ایگزیکٹو کے اراکین مقننہ سے نہیں لئے جاتے تھے اور نہ ہی وہ اس کے سامنے جواب دہ تھے اس اظہار سے مرکزی مقننہ، مرکزی ایگزیکٹو کے سامنے بے بس تھی۔ لہذا مرکزی ایگزیکٹو کو کسی صورت بھی ذمہ دار اداہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

○ مورے فٹو اصلاحات کے تحت صوبائی مجالس قانون ساز میں غیر سرکاری اکثریت تھی مگر یہ لیگی ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت تمام صوبوں میں یہ اکثریت انتخاب کے ذریعہ قائم کی گئی۔ اور اب اس کے سربراہان فی حد اراکین منتخب کئے جاتے تھے۔

○ انتخابی طریق کار میں بہت سے استقام تھے۔ انتخاب کے لئے جائداد کی اہمیت بہت زیادہ تھی اور پورے ملک میں اس کا یکساں عیار مقرر نہ تھا۔ علیحدہ انتخابات کا نظام صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ سکھوں کے لئے بھی رکھا گیا تھا۔

○ صوبوں میں دو عملی DYARCHY نظام حکومت کا طریق کار رائج کیا گیا اور صوبائی امور کو محفوظ اور منتقل دو شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

### دو عملی کا طریق کار

دو عملی کا مطلب یہ ہے کہ دوہری حکومت دو با اختیار اداروں کے تحت کام کرے۔ برطانوی حکومت میں پہلی بار ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت ہندوستانی صوبوں کو ذمہ دار نظام حکومت کے آغاز کے لئے موزوں قرار دیا گیا لیکن فوری طور پر اس بات کو مناسب نہ سمجھا گیا کہ

تمام صوبائی محکمے بند و ستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل کر دیئے جائیں لہذا کچھ محکمے انہیں دیئے گئے اور کچھ صوبائی امور یا ایگزیکٹو کونسل کی مدد سے حکومت کے زیر انتظام لائے گئے۔ کیونکہ صوبائی حکومتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا یعنی ایک وہ جو وزیروں کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا وہ جو ایگزیکٹو کونسلوں کے ہاتھ میں! یہ نظام حکومت دو عملی کہلوٹنے لگا۔

دو عملی کے تحت ۱۹۲۲ء اور کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی محفوظ اور منتقل۔ پرنس، امین خان انصاف اور آبپاشی وغیرہ محفوظ امور تھے۔ جن کا انتظام صوبہ کا گورنر یا ایگزیکٹو کونسل کی مدد سے کرتا تھا۔ اس کے اراکین کی تعداد مختلف صوبوں میں دو سے چار تک تھی اور ہر ایک ایک یا ایک سے زائد محکمے کا ذمے دار تھا۔ یہ رکنی مقننہ کے سامنے جواب دہ نہیں تھے محفوظ محکموں کا انتظام وزراء کے سپرد تھا۔ وزیروں کی تعداد مختلف صوبوں میں مختلف رہی۔ ہر وزیر ایک یا زائد محکموں کا انچارج تھا۔ وزراء کا مقننہ کے منتخب اراکین میں سے گورنر کرتا تھا ان کی دوسری ذمہ داریاں تھیں۔ وہ گورنر اور مقننہ دونوں کے سامنے جواب دہ تھے۔ منتقل محکموں میں کچھ مقامی حکومت خود اختیاری۔ صحت عامہ، تعلیم، زراعت اور امداد باہمی پر مشتمل تھے۔ اگر کسی وقت کسی منتقل محکمے کا انچارج وزیر نہ ہوتا تو وزیر کی تقرری تک گورنر خود اس محکمے کی ذمہ داری سنبھالتا تھا۔ گورنر جنرل ہیکٹر ٹری آف سیٹھ کی پہلی اجازت سے کسی ایک یا سب صوبائی امور کے انتقال کو معطل یا ختم کر سکتا تھا اور صورت میں یہ امور محفوظ امور ہو جاتے تھے جن کا انتظام و انصرام گورنر کے سپرد ہو جاتا تھا۔

دو عملی نظام حکومت ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۷ء تک قائم رہا۔ لیکن تجربے کی روشنی میں یہ نظام تسلی بخش ثابت نہ ہوا۔ اس کی ناکامی کی متعدد وجوہات تھیں :

○ دو عملی کا بنیادی اصول ہی غلط تھا کیونکہ انتظامیہ کی دو حصوں میں تقسیم اور دونوں کی ایک دوسرے سے آزاد علیحدگی بنیادی طور پر سیاسی نظریئے اور حکومت کے طریق کار کے خلاف تھی۔ حکومت کو جو ہمہ گیر حیثیت حاصل ہے، اُسے دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا لہذا قدرتی طور پر یہ تقسیم غلط تھی۔

○ منتقل اور محفوظ صوبائی امور کی تقسیم بھی بنیادی طور پر غلط تھی۔ زراعت، منتقل امور میں شامل تھا۔ لیکن آبپاشی کو محفوظ امور میں رکھا گیا۔ اسی طرح تعلیم منتقل امور میں شامل کی گئی۔ لیکن ایگزیکٹو امور کی تقسیم محفوظ امور کے ذمے میں شامل کی گئی۔ محکموں کی یہ غیر سائنسی تقسیم

بھی اس تجربے کی ناکامی کا باعث بنی۔ مثلاً وزیرِ زراعت، آب پاشی پر کنٹرول کے بغیر اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتا تھا حتیٰ کہ بعض اوقات تو یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا کہ کونسا شعبہ کون سے مخصوص محکمے کے ماتحت ہے۔

○ حکومت کی تسلی بخش کارکردگی کے لئے مختلف محکموں کے درمیان تعاون، بنیادی ضرورت ہوتا ہے لیکن دو محکمے میں اس تعاون کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ایگزیکٹو کونسل کے رکن افسر شاہی سے متعلق تھے۔ جبکہ وزراء عوام کے نمائندے تھے۔ اس طرح ان دونوں میں تعاون کا سوال تو دور رہا۔ وہ اکثر اوقات ایک دوسرے پر کھلے ہندوں تنقید کرتے رہتے تھے۔

○ گورنر، ایگزیکٹو کونسل کے اراکین کا مجموعی مشورہ تو حاصل کر لیتے تھے لیکن انہوں نے وزراء سے اجتماعی مشورہ کبھی حاصل نہ کیا۔ گورنر ہمیشہ ہر وزیر سے انفرادی طور پر مشورہ کرتا تھا۔

○ عملی نظام کے تحت وزراء کی حیثیت بہت نازک تھی۔ ان کے سر پر بیک وقت دو اوقات سوار رہتے، یعنی گورنر اور مجلس قانون ساز۔ وزیر کی تقرری گورنر کے ماتھے میں تھی لیکن وہ اُسے کسی وقت بھی بطرف کر سکتا تھا چنانچہ وزیر کی کوشش یہ ہوتی کہ گورنر کو خوش رکھے اور مختلف کسی وزیر کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کر سکتی تھی۔ وزیروں کو اپنی پالیسی کہ تصدیق کونسل سے کرانا پڑتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وزیر بیک وقت گورنر اور کونسل دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں ناکام ہو کر دونوں کی ناراضگی مول لے لیتے تھے بالعموم وہ گورنر کو خوش رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتے اگر کسی وزیر سے گورنر خوش ہوتا تو اُسے مجلس مقننہ میں بیس فی صد نامزد و سرکاری ممبروں کی حمایت حاصل ہو جاتی۔

○ آل انڈیا سروس کے لوگوں کی طرف سے بھی وزیروں کے لئے بہت سی دشواریاں پیدا کی جاتی تھیں ممبروں میں اعلیٰ ترین عہدے آل انڈیا سروس کے لوگوں کے پاس تھے وزیروں کا تقرریوں، برطرفیوں یا معطلی پر کوئی کنٹرول نہ تھا۔ سروس کے افسر وزیروں کو خاطر میں نہ لاتے اور وزیروں کی طرف سے پالیسیوں کے نفع و فائدہ میں روڑے اٹکاتے تھے۔

○ جن معاملات میں وزیروں کو لینے چلنے کے سکرٹری سے اختصات ہوتا، وہ معاملہ گورنر کے پاس چلا جاتا۔ سکرٹری کی پہنچ گورنر تک براہ راست تھی اور ویسے بھی اُسے ہفتے میں ایک بار گورنر سے ضرور ملنا ہوتا۔ لہذا وہ وزیر کے خلاف آسانی کے ساتھ بات کر سکتا نیز گورنر کو اپنا ہمنوا بنا لیتا اس طرح ہر کام میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی۔

## گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء

جیسا کہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ سے واضح ہو چکا ہے۔ کہ اس ایکٹ کی وجہ سے مرکز میں خاص تبدیلیاں پیدا نہ ہوئیں۔ مرکز میں دو ایرانی مقننہ کا نظام متعارف کرایا گیا۔ لیکن اس کے باوجود مقننہ کے اختیارات میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہ ہوا۔ صوبوں میں دو سبکی کی ترمیم کی گئی۔ لیکن دو سبکی نظام حکومت سکھ اور اصولاً گھوٹکھڑا ثابت ہوا۔ ہندوستان میں نے محسوس کیا کہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت انہیں خاص اختیارات نہیں دیئے گئے۔ چنانچہ ان میں بیداری پیدا ہو گئی۔ علاوہ ان میں دولت ایکٹ، جلیا نوالہ باغ امرتسر کا سانحہ، مارشل لاء اور ایسی ہی دیگر وجوہات کی بناء پر عوام میں خاصی تلخی پائی جاتی تھی۔

## سائمن کمیشن

۱۹۲۷ء میں برطانوی پارلیمان نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جس کے چیئر مین سر جان سائمن تھے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ کمیشن صوبوں میں دو سبکی حکومت کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کرے۔ لیکن ہندوستان کی ممتاز سیاسی جماعتوں اور بااثر طبقہ نے کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ بائیکاٹ کی وجہ یہ تھی کہ کمیشن کے تمام اراکین انگریز تھے۔ کمیشن نے سرکاری افسروں اور صوبائی مقننہ کے اراکین کی مدد سے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ مرتب کی۔ جو ۱۹۳۰ء میں برطانوی حکومت کو پیش کر دی گئی۔ رپورٹ کا لب لباب یہ تھا کہ دو سبکی نظام حکومت ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ خود مختاری کو دی جائے۔ یہ سفارش بھی کی گئی کہ ہندوستان کا آئینی مسئلہ ایک گول میز کانفرنس میں زیر بحث لایا جائے۔

## گول میز کانفرنس

۱۹۴۷ء میں لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جس میں ہندوستان اور برطانوی حکومت کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس نے کل ہندوفاق (آل انڈیا فیڈریشن) کی سفارش کی۔ کانگریس نے کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ اور فیڈریشن کی تجاویز کو عملی صورت دینے کے لئے کوئی اقدام نہ کیا۔ ۱۹۴۸ء میں گاندھی - ارون معاہدہ طے پایا۔ اور دوسری گول میز کانفرنس ۱۹۴۸ء میں منعقد ہوئی۔ کانگریس کی طرف سے صرف گاندھی نے شرکت کی۔ لیکن دوسرے مذاہب کی نمائندگی کا سوال اپنی جگہ موجود رہا۔ کیونکہ گاندھی نے اقلیتی نمائندوں کی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کانفرنس کے بعد برطانوی حکومت نے (۱۹۴۷ء) میں ایک کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا۔

ہندوستان واپسی پر جب گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک چلانے کے عزم کا اظہار کیا۔ تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں تیسری گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ لیکن کانگریس کی عدم شمولیت کے باعث خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

۱۹۴۳ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے لئے نئے آئین پر مشمولہ تجاویز کے سلسلہ میں قرطاس اربعہ جاری کیا۔ یہ تجاویز برطانوی پارلیمنٹ کی ایک مشترکہ مجلس انتخاب (جو آئٹ سلیکٹ کمیٹی) کو غور و خوض کے لئے بھیج دی گئیں۔ اسی کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر برطانوی پارلیمنٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء منظر پر کیا۔

## ایکٹ کی نمایاں باتیں

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ایک عریض اور تفصیلی دستاویز کی صورت میں سامنے آیا۔ اس ایکٹ پر ۱۹۳۶ء میں مکمل کام شروع ہوا۔ اور پہلی بار اس کے مجوزہ خطوط پر ملک میں عام انتخابات کا انعقاد ہوا۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں اس کا مکمل نفاذ عمل میں آیا۔ اس ایکٹ کی خاص خاص باتیں یہ تھیں۔

○ ایکٹ کے تحت دو نئے منصوبہ سندھ اور اڑیسہ قائم کئے گئے ان صوبوں کے قیام کے بعد گورنری صوبوں کی کل تعداد گیارہ ہو گئی۔



ایکٹ کی اہم ترین بات صوبائی خود مختاری تھی۔ دو عملی نظام اور "منتقل" اور "محفوظ" امور کی تقسیم ختم کر دی گئی۔ تمام صوبائی امور وزراء کو منتقل کر دیے گئے۔ اور وزراء کو مقننہ کے سامنے جواب دہ قرار دیا گیا۔

ایکٹ کے تحت برطانوی ہندوستان میں صوبوں اور ہندوستان میں ریاستوں پر مشتمل ایک آل انڈیا فیڈریشن کے قیام کی تجویز پیش کی گئی۔ اس وفاق (فیڈریشن) کی ۱۱ آئینی و صوبہ میں گورنری صوبوں کے چھ چیت کشز کے صوبوں کی صورت میں اور وفاق میں شمولیت پر رضامند ریاستوں پر مشتمل تھیں۔ ہر ریاست کو اس بات کی مکمل آزادی حاصل تھی کہ وہ وفاق میں شرکت کرے یا نہ کرے۔ مگر شرکت کی صورت میں وہ ریاست وفاق کی وحدت ہی ہلانے کی ہر وحدت کو اپنے اندرونی معاملات کے معاملے میں مکمل خود مختاری حاصل تھی۔

وفاق اور صوبائی خود مختاری کی تجاویز کے باعث مرکز اور صوبوں کے درمیان محکموں کی تقسیم بھی لازمی ہو گئی۔ گورنمنٹ کے ایکٹ کے تحت تقسیم کر دی گئی تھی۔ لیکن اس پر نظر ثانی کی گئی۔ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت صرف دو ہی فہرستیں ترتیب دی گئیں۔ یعنی مرکزی فہرست اور صوبائی فہرست۔ لیکن ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت تین فہرستیں مرتب کی گئیں۔ یعنی

(۱) وفاق (۲) ریاستی (۳) مشترکہ

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت صوبائی سطح سے دو عملی ختم کر کے مرکز میں دو عملی کوراج دیا گیا۔ وفاق امور کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یعنی "محفوظ" اور "منتقل"۔ "محفوظ" میں دفاع، مذہبی امور، امور خارجہ اور قبائلی علاقوں کے انتظامی امور شامل تھے۔ ان کا انتظام گورنر جنرل کے پاس تھا۔ جس کی مدد ایگزیکٹو کونسل کرتے تھے۔ جن کی تعداد تین تھی۔ باقی تمام امور منتقل امور میں شامل کئے گئے۔ یہ امور بھی گورنر جنرل کے ذمہ تھے لیکن ان کی انجام دہی میں وزراء کی مجلس کو اس کی مدد کرنا تھی۔ وزیروں کی تعداد زیادہ سے زیادہ دس مقرر کی گئی۔ وزراء گورنر جنرل اور مقننہ کے سامنے جواب دہ تھے۔ گورنر جنرل اپنے خاص اختیارات کے تحت وزراء کی رائے کے خلاف فیصلہ دے سکتا تھا۔

○ اس ایکٹ کی ایک اور نمایاں خصوصیت اقلیتوں کے تحفظ کا اقدام تھا۔ اس کا جواز یہ تھا۔ کہ اکثریت کے ماعتوں اقلیت کا تحفظ ضروری ہے۔ تاہم قوم پرستوں کو اس چیز کا کوئی جواز نظر نہ آیا۔ ان کے خیال میں یہ محض ایک فریب تھا۔ تاکہ اس طرح گورنر جنرل اور گورنروں کو وزراء اور قانون سازوں پر غالب کر دیا جائے۔

○ مقننہ میں توسیع کر دی گئی۔ مجوزہ وفاقی مقننہ ایک ایوان بالا (کونسل آف سٹیٹ) اور ایک ایوان زیریں (فیڈرل اسمبلی) پر مشتمل تھی۔ ان دونوں کے علی الترتیب ۱۲۰ اور ۲۷۵ رکن تجویز کئے گئے۔ ۱۱ صوبوں سے چھ میں دو ایوانی مقننہ کا نظام ترتیب دیا گیا۔ ایکٹ کے تحت رائے دہی کا دائرہ بھی وسیع کر دیا گیا۔ اور آبادی کے تقریباً دس فی صد حصہ کو صوبائی مقننہ کے لئے حق رائے دہی استعمال کرنے کا حق دے دیا گیا۔

○ ایکٹ کے تحت ایک وفاقی عدالت کے قیام کی تجویز بھی شامل کی گئی۔ عدالت کے قیام کا مقصد یہ تھا۔ کہ ریاستوں کے باہمی تنازعات اور آئین کی وضاحت کا فیصلہ کیا جاسکے تاہم اپیل کے لئے یہ آخری عدالت نہ تھی۔ بعض معاملات میں انگلستان میں پریوی کونسل میں بھی اپیل کی جاسکتی تھی۔ مذکورہ وفاقی عدالت کا قیام ۱۹۳۷ء میں عمل میں آیا۔

○ ۱۹۵۷ء میں سکریٹری آف سٹیٹ برائے ہند کے لئے جو ہندوستانی کونسل ترتیب دی گئی تھی۔ اسے ختم کر دیا گیا۔ اب سکریٹری آف سٹیٹ کے لئے کونسل کی جگہ شہر مقرر کر دیئے گئے۔ صوبائی خود مختاری کے باعث متعلق امور پر سکریٹری آف سٹیٹ کی گرفت بھی کافی حد تک کمزور ہو گئی۔ تاہم گورنر جنرل اور گورنروں کے اختیارات پر اس کی گرفت میں کوئی فرق نہ آیا۔

○ اس ایکٹ کے تحت ہندوستانی عیسائیوں اور اینگلو انڈینز کو علیحدہ انتخاب کا حق دیا گیا۔

○ برطانوی پارلیمان کی برتری اس ایکٹ کے تحت بھی قائم رہی۔ ہندوستان کی کوئی وفاقی یا صوبائی مقننہ آئین میں ترمیم یا تینج نہیں کر سکتی تھی۔ صرف برطانوی پارلیمان کو ترمیم یا تینج کا حق حاصل تھا۔ ہندوستانی قانون ساز ادارے زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے

کہ ایک سترار داد کے ذریعہ حکومت برطانیہ سے آئین میں تبدیلی کی درخواست کر دی۔

○ اس ایکٹ کے تحت اپریل ۱۹۳۷ء سے برما کو ہندوستان سے الگ کر دیا گیا۔ عدن کو حکومت ہند کے انتظامی کنٹرول سے الگ کر کے آزاد باوقی و فر کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طرح عدن تاج برطانیہ کی ایک نوآبادی بن گیا۔

### ایکٹ کا صوبائی حصہ

ایکٹ کے صوبائی حصہ کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے ہوا۔ لیکن وفاقی حصہ کبھی مؤثر نہ ہو سکا اور مرکزی حکومت بدستور ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت کام کرتی رہی۔ ۱۹۳۷ء کے ایکٹ کے تحت جو بنیادی اور اہم تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ وہ یہ تھیں:-

- ۱۔ سندھ اور اڑیسہ کے دو نئے صوبے قائم کئے گئے۔ اور اب گیا، گوردازی صوبے تھے۔
- ۲۔ صوبائی مقننہ میں گورنر بطور نمائندہ تاج برطانیہ شامل تھا۔ اور یہ مقننہ ایک یا دو ایوانوں پر مشتمل تھی۔ مدراس، بمبئی، بنگال، متحدہ صوبے، بہار اور آسام کے ہر صوبے میں دو ایوان تھے۔ جنہیں ایران بالا (لیجسلیٹو کونسل) اور ایران زیریں (لیجسلیٹو اسمبلی) کہا جاتا تھا۔
- پنجاب و مرکزی صوبے (سی۔ پی)، بہار، اڑیسہ، سندھ اور صوبہ سرحد میں ہر ایک صوبہ کا صرف ایک ایران تھا۔ جسے لیجسلیٹو اسمبلی کہا جاتا تھا۔
- ۳۔ جہاں تک لیجسلیٹو کونسل کا تعلق تھا۔ تو گورنروں کو کچھ اراکین نامزد کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ جبکہ لیجسلیٹو اسمبلی مکمل طور پر منتخب ادارہ تھا۔ لیجسلیٹو کونسل کو مستقل حیثیت حاصل تھی۔ لیکن ہر تین سال بعد اس کے ایک تہائی اراکین ریٹائر کر دیئے جاتے تھے لیجسلیٹو اسمبلی کی میعاد پانچ سال تھی۔ لیکن گورنر اسے میعاد سے پہلے بھی کالعدم سترار دے سکتا تھا۔

- ۴۔ مقننہ میں نمائندگی پونا پیکٹ کے تحت نظر ثانی شدہ کمیونل ایوارڈ کی معاہدہ کے ذریعہ تھی۔
- ۵۔ صوبوں میں دو عمل ختم کر دی گئی۔ اب وہاں ”محفوظ“ امور اور کوئی ایگزیکٹو کونسل باقی نہ رہی۔ وزارتی کونسل کو خود ہی تمام صوبائی امور سرانجام دینا تھے۔ اسوا میں عامہ وغیرہ ان امور کے لئے گورنر پر خاص ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں۔ وزیروں کا انتخاب منتخب

- ۶۔ جہاں تک صوبائی امور کا تعلق تھا، صوبائی حکومتیں خود مختار ہو گئی تھیں۔ یعنی ڈومیل ختم کر کے خود مختاری دے دی گئی تھی!
- ۷۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت گورنروں کو کچھ غیر معمولی اختیارات دے دیئے گئے۔ وہ آرڈی نینس جاری کر سکتے تھے۔ اور قانون نافذ کر سکتے تھے۔
- ۸۔ ریلوے، دہی کو وسعت دے کر ریلوے دہندگان کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ اور مقننہ میں عورتوں کے لئے نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔

### ایکٹ کا وفاقی حصہ

- گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے وفاقی حصہ کی نمایاں باتیں یہ تھیں۔
- ۱۔ ایکٹ کے تحت ہندوستان کے انہیں کے لئے وفاقی طرز تجویز کیا گیا۔ ہندوستانی ریاستوں سے بھی یہ توقع کی گئی کہ وہ وفاقی میں شامل ہو جائیں گی۔ اس اعتبار سے کل ہندو وفاقی برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں پر محیط تھا۔
- ۲۔ مجوزہ وفاقی مقننہ ایک دو ایوانی ادارہ تھا۔ جس میں ایوان بالا (کونسل آف سٹیٹ) اور وفاقی اسمبلی دو ایوان زیریں شامل تھے۔
- ۳۔ کونسل آف سٹیٹ یا ایوان بالا کے کل ۲۹۰ اراکین تجویز کئے گئے۔ ان میں سے ۱۰۰ وفاقی میں شامل ریاستوں کے حکمرانوں کے نامزد نمائندے اور چھ گورنر جنرل کے نامزد نمائندے شامل تھے، باقی ۱۵۰ نمائندے منتخب ہونا تھے۔ کونسل آف سٹیٹ ایک مستقل ادارہ تھا اور اس کے اراکین کا انتخاب ۱۰ سال کے لئے ہونا قرار پایا۔ ایک تہائی اراکین ہر سال بعد ریٹائر ہونا تھے۔
- ۴۔ وفاقی اسمبلی کے لئے کل ۱۳۷ اراکین تجویز کئے گئے۔ ان میں ۲۵ برطانوی ہندوستان کے نمائندوں اور ۱۲۵ ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں کے طور پر شامل ہونا تھے۔ برطانوی ہندوستان کے نمائندہ اراکین کا انتخاب براہ راست ان انتخابی اداروں کے ذریعہ ہونا تھا جو ایوان زیریں کے اراکین پر مشتمل تھا۔ لیکن ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں کی نامزدگی

ریاست کا فرمانروا کر سکتا تھا۔ اس کی میعاد ۱۰ سال مقرر کی گئی۔ تاہم قبل از وقت گورنر جنرل اسے کالعدم قرار دے سکتا تھا۔

۵۔ مرکز میں دو سبکی کرواج دیا جاتا تھا۔ اور وفاقی امور کو ”محفوظ“ اور ”منتقل“ دو حصہ بن میں تقسیم کرنا تھا۔ وفاج، اور امور خارجہ وغیرہ ”محفوظ“ امور میں شامل کئے گئے۔ جن پر براہ راست گورنر جنرل کا اختیار تھا۔ گورنر جنرل کی اعانت کے لئے تین کونسلوں کا قیام ہوا۔ منتقل امور وزراء کے ذمہ تھے۔ وزراء مقتضی کے سامنے جواب دہ تھے۔

۶۔ وفاقی قانون سازی کے اختیارات کی تقسیم کو ضروری قرار دیا گیا۔ ایکٹ میں ۳ ذریعہ نام کی گئیں۔ (۱) وفاقی راج (۲) صوبائی راج (۳) منتقل یا مشترکہ۔

۷۔ گورنر جنرل کے لئے خصوصی اختیارات اور ذمہ داریاں تجویز کی گئیں۔ جن کے تحت وہ اپنی مرضی سے اپنے اختیارات کو استعمال کر سکتا تھا۔

۸۔ ایک وفاقی عدالت ہند کا قیام جسے وفاقی سے متعلق تنازعات کے فیصلے اور اہم قانونی نکات کے طرٹ ہونے کی صورت میں۔ دیگر عدالتوں کے فیصلے کے خلاف اپیلوں کی سماعت کا اختیار تھا۔

”حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہندوستانیوں کی منزل آزادی کافی حد تک قریب آگئی۔ اور یہ ایکٹ برطانوی حکومت سے ہندوستانی مانتوں میں اقتدار کی منتقلی کی تمہید ثابت ہوا۔“

لیکن پروفیسر کپلینڈ کے اس خیال سے ہندوستانی رہنما متفق نہیں۔ جہاں تک اس ایکٹ کے وفاقی حصہ کا تعلق ہے۔ ہندوستانی اور بالخصوص مسلم لیگی قلعی طور پر بغیر غلطی تھے۔ اس ایکٹ کے بارے میں قائد اعظم نے کہا تھا۔

”قلعی طور پر بکواس بنیادی طور پر گندہ اور کلینا ناقابل قبول“

کانگریس کے راج گوپال اچاریہ نے اس ایکٹ کے بارے میں کہا۔

”یہ آئین دو سبکی سے زیادہ خواب ہے۔“

شہر نے یوں اظہار خیال کیا۔

”یہ غلامی کا ایک نیا باب ہے۔ یہ اس مشین کی طرح ہے۔ جس کے بریک نہایت مضبوط  
مگر انجن خاص ہے“

سب سے زیادہ استعراض وفاق متقنہ میں ریاستی حکمرانوں کی شمولیت، گورنر جنرل اور  
گورنروں کی ”مخصوص ذمہ داریوں“ صوبائی مقننہ میں ایک ایوان کے اضافہ اور ”حکومت  
نوادہ بندی کی خود کار نشرو نما“ کی عدم موجودگی پر کی گئی۔

باب

# مسلم قومیت کا آغاز

سید احمد کا کردار

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد برصغیر ہندو پاک کے مسلمانی سیاسی اقتدار سے قطعاً محروم ہو چکے تھے۔ سماجی اور اقتصادی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ انگریز مسلمان کو اس جنگ آزادی کے لئے مورد الزام ٹھہرا رہا تھا اور مسلمان اس کے دل میں غار کی طرح کھنک رہا تھا۔ مسلمان تعلیمی میدان میں بھی ہندو کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گئے تھے اسی لئے انہیں سرکاری ملازمتوں میں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ اس موقع پر سر سید احمد خاں اور سید امیر علی نے محسوس کیا کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم عام نہ کی جائے گی انہیں باعزت مقام حاصل نہ ہو سکے گا۔

۱۸۵۹ء میں سر سید احمد خاں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندوستان کی رسول مروجہ سوسائٹی ہندوستانیوں کے لئے گنجائش پر مبنی ضروری ہے۔ اُس وقت تک انڈین رسول مروجہ پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں سید امیر علی نے مسلمانوں کے مطالبات اور رہنمائیوں کے بارے میں ایک یادداشت مرتب کر کے وائسرائے ہند لارڈ رین کو سنٹرل ایسوسی ایشن کی طرف سے روانہ کی جس کے ذریعے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں جگہ دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی موقع پر محمد علی ایسوسی ایشن کا تصادم انڈین ایسوسی ایشن کے ساتھ ہوا۔ انڈین ایسوسی ایشن نے یہ مطالبہ کیا کہ رسول

سروسوں کے لئے مقابلے کے امتحانات بیک وقت انگلستان اور ہندوستان میں منعقد کئے جائیں۔ نیز امیدواروں کی عمر کی حد بھی انیس سال سے بڑھائی جائے جو ۲۱ سال سے ۹ سال کر دی گئی تھی۔ لیکن عمر ان ایسوسی ایشن نے یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے نامزدگی کے ذریعہ ملازمتوں میں گنجائش پیدا کی جائے۔ سید امیر علی کا کہنا یہ تھا کہ ۱۸۹۵ء تک تو حکومت مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے ملازمتوں میں توازن قائم رکھتی رہی لیکن اس کے بعد سے اس امر کا کوئی خیال نہ کیا گیا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کے لئے ملازمتوں کے دروازے بند ہوتے چلے گئے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس وقت صرف چوبیس سو پچیس پر گنہ کے کل ۲۲۵ سہدرے جلالہ میں صرف ۶ مسلمان تھے۔ بنگال کے دوسرے اضلاع میں بھی کم و بیش یہی صورت تھی۔ کلکتہ کے ۹۰ فی صد دفاتر میں تو ایک بھی مسلمان نظر نہ آتا تھا۔ سنٹرل عمرٹن ایسوسی ایشن کے مطابق مسلمانوں کو ملازمتوں سے مان بوجھ کر دُور رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ جو مسلمان ملازمت کے اہل بھی ہوتے تھے انہیں بھی جگہ بند دی جاتی۔

ان حالات میں سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے لئے نیا تعلیمی لائحہ عمل مرتب کیا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر چکے تھے کہ انگریزی اور مغربی علوم و سائنس کے حصول کے بغیر مسلمانوں کی پسماندگی کو ختم کرنا بہت مشکل ہے۔ ۱۸۹۳ء میں انہوں نے غازی پور میں ایک سکول قائم کیا جس میں انگریزی کی تعلیم ضروری تھی۔ اُسکندہ سال ایک ترجمہ سوسائٹی کی بنیاد رکھی جو کا صدر دفتر بعد ازاں علی گڑھ منتقل کرنے کے بعد نیا نام سائنٹفک سوسائٹی کر دیا گیا۔ اس سوسائٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو مغربی افکار کی نشرونا کے بارے میں باخبر رکھنے کی غرض سے انگریزی کتب کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے اس سوسائٹی کو ایک ایسے پلیٹ فارم کی حیثیت بھی حاصل تھی جہاں مسلمان اور انگریز باہمی مفادات پر تبادلہ خیال کر سکیں۔

سر سید احمد خاں نے ناذک حالات کے تحت یہ بھی محسوس کیا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون کا سلسلہ جاری رکھا تو یہ اُن کے مفادات کے لئے تباہ کن ثابت ہو گا۔ سر سید احمد خاں نے اپنی دونوں اسباب بغاوت ہند کے نام سے جو کتابچے لکھا، شروع میں تو اُس پر بہت سے دسے ہوئے، لیکن بعد ازاں یہی کتابچہ بہت سی اصلاحات کے لئے نکتہ آغا زینا۔ قریباً ایک سال بعد ہی ہندوستان میں کوئٹہ سوسائٹی کو تشکیل دیا گیا اور کانگریس کے بانی لارڈ ہیم نے یہ اعتراف کیا :



”سر سید احمد خاں کے رسالہ اسباب بغاوت ہند پڑھنے کے بعد ہی میں نے پہلی بار ہندوستانیوں کی رشتے عامہ کے بارے میں جاننے کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اسی کے نتیجے میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔“

### برٹش انڈیا ایسوسی ایشن علی گڑھ

مئی ۱۸۶۶ء میں سر سید احمد خاں نے علی گڑھ کے ممتاز لوگوں کا ایک اجلاس طلب کیا تاکہ برطانوی انتظامیہ کی طرف سے نافذ کردہ قوانین کے بارے میں تبادلہ خیال کیا جاسکے۔ اسی موقع پر برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ راجہ جے کشن داس کو ایسوسی ایشن کا صدر اور سر سید احمد خاں کو سکریٹری چنا گیا۔ آئین میں کہا گیا تھا کہ نسل اور مذہب کے امتیاز کے بغیر کوئی بھی باعزت شخص، جو ہندوستان میں رہتا ہو یا ہندوستان میں مستقر رہائش پذیر کوئی غیر ملکی انجمن کا رکن بن سکتا ہے۔ یہ پہلی تنظیم تھی جس میں ہندو اور مسلمان یکساں وقت شامل تھے لیکن یہ صرف ایک سال تک قائم رہی۔ اس دوران اس ایسوسی ایشن نے ایک ہی کام کیا، یعنی شمال مغربی صوبوں میں ایک یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ!

### برہمہ سماج

راجہ رام موہن رستے نے ۱۸۲۵ء میں برہمہ سماج قائم کیا۔ یہ خالصتاً ایک ہندو تحریک تھی جس کا مقصد ہندوؤں کو عیسائیوں کے مذہبی اثر و رسوخ سے دور رکھنا تھا۔ راجہ رام موہن رستے نے بت پرستی کی جگہ وحدانیت کا نعرہ لگایا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی کے آخری سال تک ہندو کہلانا پسند کرتے رہے۔ وہ اس الزام کی تردید بھی کرتے رہے کہ انہوں نے ہندوؤں کے اندر ایک نیا فرقہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس تحریک کے ہفتہ روزہ جلسوں میں کٹر برہمن اور دوسری ذات کے ہندو مل کر وید پڑھا کرتے تھے۔ رام موہن رستے کی موت کے بعد اس تحریک کو دیوندر ناتھ لیگور نے سنبھالا، بعد ازاں کیشب چندر سین نے اس تحریک میں مزید نعرے شامل کئے۔ انہوں نے عورتوں کی تعلیم، بیواؤں کی دوسری شادی اور مذہبی میدان میں سب کی برابر پر زور دیا۔

## آریہ سماج

انگریزی اثر و رسوخ کے خلاف ایک اور تحریک آریہ سماج کے نام سے سامنے آئی۔ ۱۸۶۵ء میں اس کی بنیاد بمبئی کے دیانند سراسوتی نے رکھی۔ یہ قطعی طور پر ایک متعصب ہندو جماعت تھی۔ جس میں مسلمانوں عیسائیوں اور غیر ہندو کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ لالہ دیانند نے ہندوؤں پر زور دیا کہ وہ اپنے قدیم مذہب پر سختی کے ساتھ کاربند رہیں اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے خلاف اپنا ”جہاد“ جاری رکھیں۔ دیانند نے غیر ہندو کو ہندو بنانے کے لئے شذھی کی تحریک بھی چلائی۔ ۱۸۸۲ء میں ایک گٹورکشا ”سوسائٹی قائم کی تاکہ اس اڈ میں ہندوؤں کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف منظم کیا جاسکے۔ حکومت کو ایک یادداشت پیش کی گئی جس میں گائے کے ذبح پر پابندی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس تحریک کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں نفرت پیدا ہو گئی اور ہندوتن میں جا بجا ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے۔ ۱۸۹۰ء میں گٹورکشا کے فرے کے تحت ہی تنک نے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو خوب ہوا دی اور فساد کر لئے۔

## انڈین ایسوسی ایشن

ایک اور ہندو سیاستی تنظیم انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے ۱۸۸۵ء میں کلکتہ میں قائم کی گئی۔ اس کے بانی بابو سر ہندرناتھ میتر ہی تھے۔ وہ خود انکلتن کے تعلیم یافتہ تھے۔ اس تحریک کا مقصد تعلیم یافتہ متوسط درجے کے بنگالی ہندوؤں میں سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا۔ تاہم اس تحریک کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

## مسلمانوں کے شبہات

ہندوؤں کی طرف سے ایسی ہی تحریکوں اور تعصب آمیز اقدامات کی وجہ سے مسلمانوں کی بد دل ہو چکے تھے۔ انڈین ایسوسی ایشن کے قیام کے ایک سال بعد یعنی ۱۸۸۶ء میں سید امیر علی نے سنٹرل نیشنل محمدن ایسوسی ایشن قائم کر دی تھی اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنی قدیم روایات کی پاسبانی کے ساتھ وقت کے تقاضوں کا ساتھ بھی دیں۔ نیز مسلمانوں کو باعزت

سیاسی سطح پر لانے کے لئے تنگ دود کی جائے۔ چند سال ہی میں اس ایسوسی ایشن نے ملک کے اہم شہروں میں اپنی شاخیں قائم کر لیں اور مسلمانوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ تنظیم کی پہلی کوشش یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم تنظیموں کی سرگرمیوں کا مقابلہ کیا جاسکے تاہم ہندوؤں کو ان تنظیموں میں شرکت اور ووٹ دینے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن غیر مسلم سر مسلمانوں کے امور پر ووٹ دینے کا حق استعمال نہ کر سکتے تھے۔

ہندوستان میں یہ پہلی مسلم سیاسی تنظیم تھی۔ اس تنظیم نے متعدد یادداشتیں حکومت کو پیش کیں اور مسلمانوں کے مطالبات سے آگاہ کیا۔ ۱۸۸۵ء میں اس تنظیم نے دائرہ رائے ہندو لارڈ رین کو مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی اور سرکاری دفاتر میں ان کی عدم موجودگی کے بارے میں یادداشت پیش کی۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے سماجی سیاسی اور مذہبی مفادات کے تحفظ کا بیڑہ بھی اٹھایا۔ یہ تنظیم ۱۸۸۵ء تک مؤثر انداز میں کام کرتی رہی تاہم بعد ازاں علی گڑھ کی قیادت اس تحریک پر حاوی ہو گئی۔

### ہندو مسلم اتحاد

سر سید پر یہ الزام عائد کیا جاتا تھا کہ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کو صدر مہینہ پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ سر سید احمد نے ابتدا میں جتنی بھی جدوجہد کی وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترک مفادات پر تھی۔ لیکن اس بات کا کیا علاج کہ ہندو نے انگریز کے ساتھ مل کر مسلمان کو نہ صرف مکمل طور پر نظر انداز کر دیا بلکہ اس کے مفادات کو بھی پوری طرح ضرب لگانے کی کوشش کی۔ سر سید نے واضح الفاظ میں یہ کہا تھا کہ اگر ملک کے قوانین میں نسلی امتیاز روا رکھا گیا تو حکم اور محکوم کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ انہوں نے صرف مسلمان کا نام نہیں لیا تھا۔ اسی بنا پر ۱۸۸۵ء میں البرٹ مل کی حمایت کی، ہندو مسلم تعاون کی ضرورت پر زور دیا نیز ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو انگلوں سے تشبیہ دی اور کہا کہ اگر ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی تو پورا جسم بدنام ہو جائے گا۔

جائیداد میں لالہ بھگت رام نے سر سید احمد خاں کو سپانہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا ”سید صاحب کسی ایک مذہب کے لوگوں یا کسی مخصوص طبقے کے ساتھ نہیں وہ کشیش چندر سین اور موامی دیانند سرمستی کے پیروکاروں کے ساتھ بھی اُسی مددگار مخلص ہیں جتنے مسلمانوں کے ساتھ وہ صحیح معنوں میں محب وطن ہیں“

سرسید احمد خاں نے جب بھی ملک کے انتظام اور یکساں قوانین وضع کرنے کی سرگرمیوں میں شرکت کے لئے ہندوستانیوں کی شمولیت کا مطالبہ کیا تو لفظ ہندوستانی ہی استعمال کیا اور کوئی امتیاز قائم نہ کیا۔ جب انہوں نے ۱۸۶۳ء میں ساؤتھک سوسائٹی قائم کی تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس کے رکن تھے، غازی پور میں سکون قائم کیا تو وہاں انگریزی اور عربی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کی تعلیم کا انتظام بھی کیا۔ ۱۸۶۶ء میں پرنس انڈیائی ایسوسی ایشن قائم کی تو اس کا مقصد بھی ہندوستانیوں کے حقوق کا تحفظ تھا، اس ایسوسی ایشن کے جلسوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے رہے۔

علی گڑھ کالج میں ۳۰۰ ہندو لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ نہ صرف ہندو طلبہ کا باورچی خانہ الگ تھا بلکہ انہیں اپنی سمبارت اور ساجی حومات کی ادائیگی کی بھی کھلی آزادی حاصل تھی۔ سوال یہ ہے کہ آخر سرسید احمد خاں کو اپنے رویے میں تبدیلی کیوں کر نا پڑی ؟

### اُردو اور ہندی کا تنازعہ

یہ بات واضح ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اُردو کے سوا اور کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ ان دونوں کے درمیان یہی زبان ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اور بالخصوص شمال مغربی صوبوں میں باہم رابطہ کا واحد ذریعہ تھی۔ مسلمان اور ہندو دونوں، انگریز کی غلامی میں آچکے تھے، آزادی کا حصول ان دونوں کا واحد مقصد تھا۔ جہاں تک سرسید احمد خاں کی مساعی کا تعلق تھا تو انہوں نے ہندو اور مسلمان کے درمیان کبھی فرق محسوس نہ کیا۔ لیکن اس کے برعکس ہندوؤں نے کچھ ایسی تحریکیں چلیں جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، کہ مسلمان دل برداشتہ ہو گئے۔ سرسید احمد خاں ایسا نڈر شخص بھی جس نے انتہائی نازک دور میں رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے اُن کے حقوق کے حصول کی بھرپور مدد دہن کی، ہندوؤں کے اس رویے سے بد دل ہو گیا اور جب ہندوؤں نے ہندی کا فتنہ کھڑا کیا تو سرسید احمد خاں کو یقین ہو گیا کہ مسلمان کا ہندو ذہنیت کے ساتھ جینا ممکن نہیں۔

۱۸۶۶ء میں بنارس کے کچھ ممتاز ہندوؤں نے یہ تحریک شروع کی کہ سرکاری عدالتوں میں فارسی رسم الخط میں اُردو کی جگہ دیوناگری رسم الخط میں ہندی کو متعارف کرایا جائے۔ اُن کے خیال میں اُردو زبان مسلمانوں کی تھی اور ہندو تہذیب کی بلکہ مسلمان تہذیب کی نمائندگی کرتی تھی۔ دیکھتے

بھی دیکھتے تمام شمال مغربی عربوں میں مختلف ہندو تنظیمیں وجود میں آئیں اور ہندی کا فتنہ کھڑا کر دیا گیا۔ ان تمام تحریکوں کا مرکز الہ آباد تھا۔ تمام ہندو اخبارات نے اس تحریک کی پُر زور حمایت کی اور شمال مغربی عربوں کے لئے ایک یونیورسٹی کے قیام اور اس میں ہندوؤں کے لئے ہندی ذریعہ تعلیم قرار دینے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ قدرتی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اسی موقع پر سر سید احمد خاں نے محسوس کیا کہ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے اس وقت تک جو کوشش کی وہ اِکارت گئی۔ لہذا ان کی سرگرمیوں کا رخ فوراً تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا:

”اگر ہندو اس حد تک تنگ نظر ہے کہ وہ مشترکہ قومی زبان کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تو اس سے مزید کیا توقع کھی جاسکتی ہے؟ کیا اس کے ہاں وجود پر مغیرہ یہ ایک مشترکہ قومیت کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے؟“ بنارس کے ڈویژنل کمشنر مسٹر ٹیکسپیٹر نے یہی بات سنی کہ سر سید احمد خاں کو جواب دیا تھا کہ ”میں نے آج پہلی بار آپ کی زبان سے صرف مسلمانوں کی ترقی کے بارے میں سنا ہے ورنہ اس سے پہلے تو آپ ہمیشہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ مفادات کی بات کیا کرتے تھے۔“

سر سید احمد خاں نے اُسی وقت یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ رفتہ رفتہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات کی وسیع فلیج عاقل ہوتی چلی جائے گی کیونکہ ہندو کسی قومیت پر بھی مسلمان کو ترقی کے راستے پر کامزن نہیں دیکھ سکتے تھے۔

### مسلم قومیت پر یقین

بلاشبہ سر سید احمد خاں پہلے مسلمان تھے جنہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ لیکن جب انہوں نے ہندوؤں کی تنگ نظری اور تنگ دلی کے مظاہرے دیکھے تو اس وقت بھی وہ پہلے مسلمان تھے جن کے ذہن میں علیحدہ مسلم قومیت کے تصور نے جنم لیا۔ سر سید نے محسوس کیا کہ ان دونوں کے درمیان اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی مغایرت کبھی پیدا نہ ہو سکے گی اور دونوں کے نظریات کا تصادم ہوتا ہی رہے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انہی تجربات نے انہیں بعد ازاں مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس سے الگ رہنے کی تاکید کرنے پر مجبور کیا اور اسے قطعی طور پر ایک ہندو متعصب جماعت قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے

مسلمانوں کو باوقار زندگی گزارنے کے قابل بنانے کے لئے ان کی جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے نہ صرف علی گڑھ کو ایک تعلیمی بلکہ سیاسی مرکز بھی بنایا۔

## علی گڑھ تحریک

علی گڑھ تحریک کو اگر پاکستان کا سنگ بنیاد قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

۱۸۶۹ء میں سر سید احمد خاں انگلستان گئے۔ انہوں نے قریباً ڈیڑھ سال تک برطانوی نظام تعلیم کا بغیر غائر جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے لئے انہی خطوط پر تعلیم حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ وطن واپس آتے ہی مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے ان کی تعلیمی ترقی کی طرف توجہ دی۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں آراء طلب کیں اور ان کی روشنی میں محسوس کیا کہ مسلمان والدین میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی خواہش اور انگریزی تعلیم کے خلاف نفرت کسی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ سرکاری سکولوں میں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کا پورا ہونا مشکل تھا کیونکہ ان سکولوں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ تھا لہذا مسلمانوں کو اس کے لئے خود ہی ہاتھ پاؤں مارنا پڑے۔

اس مقصد کے لئے جو کمیٹی قائم کی گئی اس نے علی گڑھ میں محمدان اینگلو اور نیشنل کالج کے نام سے ایک درس گاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ سر سید اس کی انتظامیہ کمیٹی کے سربراہ بن گئے۔ رقوم فراہم کرنے کے لئے دن رات کوشش کا آغاز کر دیا گیا۔ خود سر سید احمد خاں نے ہندوستان کے کونے کونے کا دورہ کیا اور لاتعداد مشکلات کا سامنا کیا۔ بہت سے مسلمانوں کے دل سے یہ خوف دور کرنے کے لئے کہ اگر مغربی تعلیمی خطوط پر ان کے بچوں کو تعلیم دی گئی تو مذہبی عقائد پر بری طرح متاثر ہوں گے، کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے ایک سکول قائم کر کے ثابت کر دیا جائے کہ مغربی تعلیم سے ان کے مذہبی اعتقادات اور اسلامی اصولوں پر کوئی آئچ نہ آئے گی۔ مئی ۱۸۶۹ء میں ایم۔ اے اسکول کھول دیا گیا۔ اور کوئی دو سال بعد اسے کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ جنوری ۱۸۷۰ء کو گورنر جنرل لارڈ لٹن نے اس کالج بنیاد رکھا چند ہی سال میں کالج کی شاندار سعادت تعمیر کر دی گئی اس طرح یہ ایک مثالی درس گاہ بن گئی۔ جو لوگ باہر سے آتے، ہندوستان میں ایسی درس گاہ دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ طلبہ کے لئے مخصوص لباس مقرر کیا گیا۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ پانچ وقت نماز اور روزوں کو لازمی قرار دیا گیا۔ اس طرح علی گڑھ مسلمانوں کی سماجی،

ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی ادارے نے مسلمانوں کو قیادت دی اور ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑا دی۔

اُدھر بنگال میں مسلمانوں کے لئے تعلیم کا بیڑہ نواب عبداللطیف خاں نے اٹھایا۔ نواب عبداللطیف خاں کلکتہ مدرسہ میں عربی کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۶۲ء میں انہیں بنگال میں ڈپٹی کمشنر بنادیا گیا بعد ازاں بنگال کی یجیلیٹر کونسل کے لئے نامزد ہوئے۔ وہ کونسل کے پہلے ممبران رکن تھے۔ ۱۸۶۷ء میں وہ کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو بنادیئے گئے۔ اسی سال نواب عبداللطیف خاں نے سرسید احمد خاں کی طرح مسلمانوں کی پس ماندگی سے متاثر ہو کر ایک محمدن لٹریری سوسائٹی آف کلکتہ کی بنیاد رکھی۔ جس کے مقاصد بہت حد تک عملی گڑھ سے ہم آہنگ تھے۔ اس سوسائٹی کا اجلاس ہر ہفتہ نواب صاحب کے گھر ہوتا جس میں ممتاز انگریز اور ہندوستان فی مضامین پڑھتے اور مسلمانوں کی اخلاقی و مادی ترقی کے مسائل پر تبادلہ خیال کرتے۔ حکومت اس سوسائٹی کو بنگال کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نمائندہ تسلیم کرتی تھی۔ اسی سوسائٹی کی وجہ سے بنگال کے مسلمانوں میں تنظیم کا احساس پیدا ہوا۔

### انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

برطانوی حکومت کو ہندوستانیوں کے مطالبات اور ان کے مصائب سے آگاہ کرنے کے لئے ملک میں بہت سی سیاسی اور نیم سیاسی تنظیمیں قائم تھیں۔ ۱۸۸۶ء میں سرسید احمد خاں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کر چکے تھے جس کی دسات سے کونسل میں ہندوستانیوں کے لئے نشستوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں بنگال کے سریندر ناتھ بینرجی نے انڈین ایسوسی ایشن قائم کر دی تھی جس کا مقصد سیاسی تھا۔ بینرجی کو انڈین سول سروس سے نکال دیا گیا تھا اور ہندو اس اقدام پر احتجاج کر رہے تھے لیکن جب سول سروس امتحانات کے لئے مقرر کی مدت اکٹیس سے اُننیس سال کر دی گئی تو یہ احتجاج نازک صورت اختیار کر گئے اس طرح سریندر ناتھ بینرجی بڑے آرام سے ایک سیاسی رہنما بن گئے۔

اس احتجاج کے فوراً بعد ہندوستانیوں نے پریس ایکٹ اور آرمرز ایکٹ کے خلاف بھی تحریک شروع کر دی۔ دونوں ایکٹ کے ذریعہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں امتیاز قائم کیا گیا۔ اور جب البرٹ بل مجریہ ۱۸۸۳ء کا نفاذ ہوا تو انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان

نسلی امتیاز اور منافرت مزید زور پکڑ گئی ان تمام تحریکوں کی وجہ سے سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی اور قومی پیمانے پر سیاسی جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔

حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ایک ریشٹرا رسول افسر ایلیں گٹھرویا ہیٹوم نے سوچا کہ ان تحریکوں کا رخ بدلنے کی کئی تدبیر کی جائے اور ہندو جو خفیہ سازشیں مذہب کی آڑ لے کر کر رہے ہیں انہیں شرم کر دیا جائے نیز ہندوستانی کے لوگ آئینی طریقوں پر کام کریں۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر حالات پر فوراً قابو نہ پایا گیا تو بغاوت کا اندیشہ ہے انہوں نے ایک سکیم مرتب کی جس میں کچھ ممتاز ہندوستانی بھی شامل تھے۔ مسٹر ہیٹوم شکر گٹے اور واسٹرلے سے مشورہ کیا تاہم لارڈ ڈفرن نے سکیم سے اتفاق نہ کیا چنانچہ ہیٹوم نے واسٹرلے سے مل کر ایک اور سکیم تیار کی۔ دونوں سکیمیں ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کے سامنے پیش کی گئیں۔ ان رہنماؤں نے بھی لارڈ ڈفرن کی سکیم کو پسند کیا۔ لیکن اُس وقت تک ان رہنماؤں کو یہ قطعاً علم نہ تھا کہ جس سکیم سے وہ متفق ہوئے ہیں، وہ واسٹرلے کی سکیم تھی۔ اس سلسلے میں ہیٹوم اور ڈفرن کے درمیان پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہیٹوم نے انگلستان کا رخ کیا یہاں لارڈ رین لارڈ لہورڈ سر جیمز کیرڈ، جان ہرٹسٹ، مسٹر ریڈ اور مسٹر سلگ کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ انہوں نے وٹاں ایک انڈین پارلیمانی کمیٹی بھی قائم کی۔

اس طرح انگریز کی سرپرستی میں اور ہندو رہنماؤں کی اکثریت کی مرضی سے انڈین نیشنل کانگریس کا قیام مکمل میں آیا۔ اور اس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو گوگل واس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں منعقد ہوا۔ کانگریس کے قیام کے بعد پہلے اجلاس میں شرکت کرنے والے ۷۰ نمائندوں میں سے صرف دو مسلمان۔ آراہیم سیانی اور لے ایم دھرمسی تھے۔ اس موقع پر ”ناٹھ“ لندن نے واضح طور پر لکھا۔

”کانگریس میں صرف دو مسلمان۔ نہ ہونے کے برابر ہیں۔“

پہلے اجلاس میں کانگریس نے اپنے خیر و افراط و مقاصد بیان کرتے ہوئے ”ہمارے محبوب لارڈ رین کے الفاظ استعمال کئے۔ سر سید احمد خان پر انگریزوں کی خوشامد کا جو الزام عائد کیا جاتا رہا تھا۔ کانگریس نے وہ الزام خود ہی اپنے سر لے لیا۔

اب کانگریس قدم قدم پر لارڈ ہیٹوم اور ان کے انگریز ساتھیوں کے مشوروں پر عمل کر رہی تھی۔ ایک بڑی وجہ انگریز سے اپنی وفاداری ثابت کر کے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ



قائم کرنا تھی جس میں بعد ازاں ہندو کامیاب بھی ہوئے۔ کانگریس کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈبلیو۔ سکا بیرنہی نے کی۔

### رد عمل

کچھ مسلمان رہنماؤں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔ لیکن اکثر اس سے دور دور رہے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ہندو اکثریت کی حامل کانگریس مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ نہ کر سکتی تھی۔ ماضی میں کانگریس نے جس تنگداند رویہ کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے پیش نظر یہ بات واضح ہو چکی تھی۔ انہی وجوہات کی بنا پر سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ تھلگ رہنے کی تلقین کی۔ سر سید احمد خاں نے کانگریس کی اس تجویز کی بھی مخالفت کی کہ وائسرائے کی کانفرنس میں انتخاب کے ذریعے نمائندے لئے جائیں۔ سر سید اس خطرے سے بہت پہلے باخبر ہو گئے تھے کہ اگر ہندوستان میں مغربی طرز پر جمہوریت قائم کی گئی تو کونسل میں مسلمانوں کے لئے کوئی نمائندہ باقی نہ رہے گی۔ کیونکہ ہندوؤں کے مقابلے میں ان کی تعداد ایک چوتھائی تھی۔ ہوا بھی یہی، انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء نافذ ہوا اور سلیڈر کونسل کے لئے نصف اور اکیس بذریعہ انتخاب اور نصف بذریعہ نامزدگی شامل کئے گئے۔ کونسل کے لئے ایک بھی مسلمان منتخب نہ کیا گیا۔ کانگریس عوام اس ایکٹ سے ناخوش تھی۔ چنانچہ کانگریس نے خود بھی آئین تحریک کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی دوران کچھ ہندوؤں نے انقلابی پالیسی اختیار کی اور ہندوستان میں قومی تحریک کے نام پر ہندو راج کے خواب دیکھنے لگے۔ قدرتی طور پر مسلمان عوام اور رہنماؤں کے دل میں ہندوؤں کے خلاف شبہات جنم لینے لگے۔ ان شبہات کو اس وقت مزید تقویت پہنچی جب ۱۹۰۵ء میں ہندوؤں نے تقسیم بنگال کے خلاف آواز بلند کیا۔ تقسیم بنگال، صوبہ کے انتظام و انصرام میں آسانیوں پیدا کرنے اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو اقتصادی اور دیگر سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے لارڈ کرزن نے کی تھی۔ اس تقسیم کے خلاف ہندوؤں نے زبردست تحریک چلائی۔ آخر کار ۱۹۱۱ء میں حکومت کو بنگال کی تقسیم منسوخ کرنا پڑی۔

کانگریس کا یہ مطالبہ کہ چھڑا سیوں، کلرکوں اور اس قسم کی دوسری سرکاری ملازمتوں کو مقابلے کے امتحانات کے ذریعے چڑھایا جائے۔ مسلمان کیونکہ مغربی تعلیم سے بے بہرہ اور ہندو کے مقابلے میں بہت پیچھے تھے۔ لہذا یقینی طور پر اس طریق کار سے ان کے مفادات کو شدید دھچکا لگنے کا

احتمال تھا۔ جہاں تک لیجلیٹیو کونسلوں میں نمائندگی کا سوال تھا۔ تو مسلمان اہلیت احکام کی بنیاد پر ووٹ دینے کا حق اپنی غربت کے باعث استعمال نہ کر سکتا تھا۔ اور اگر میونسپلیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، ایوان ہائے مجلیس اور یونیورسٹیوں کے اراکین کے ذریعہ ووٹ کا حق دیا جاتا۔ اس صورت میں بھی مسلمان کونسل میں نشست حاصل نہ کر سکتے۔ کیونکہ ان اداروں پر بھی ہندو چھٹے ہوئے تھے۔ یہی وجوہات تھیں کہ سر سید احمد خان، نواب عبداللطیف اور سید امیر علی نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ تھلگ رہنے کی تاکید کی اور ان سے اپنے الگ سماجی، ثقافتی اور سیاسی مفادات کے تحفظ کے لئے اپیل کی۔

### نیشنل کانگریس کیوں؟

۱۸۸۵ء میں جسٹس بدر الدین طیب جی (جو کانگریس تھے) اور کانگریس کے بانی لارڈ بیرم نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح سر سید احمد خان کو کانگریس میں شامل کر لیں۔ لیکن سر سید نے بدر الدین طیب جی سے پوچھا

”مجھے یہ تو بتائیے۔ کہ نیشنل کانگریس سے آپ کی مراد کیا ہے۔ کیا نیشنل کا لفظ استعمال کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کہ ہندوستان میں رہنے والے مختلف نسلوں اور فرقوں کے لوگ ایک ہی قوم ہیں۔ یا وہ ایک قوم ہو سکتے ہیں یا ان کی انگلیں اور ان کے مقاصد ایک ہیں؟ میرے خیال میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اگر یہ ناممکن ہے تو نیشنل کانگریس قسم کی کوئی چیز بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے تمام عوام کو یکساں فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ کیا آپ صرف نیشنل کانگریس کے الفاظ ہی سے یہ سمجھتے ہیں۔ کہ پورے ہندوستان کو صرف اس نام اور اس نام کے چکر سے فائدہ پہنچا سکتا ہے؟ میں ایمان داری سے سمجھتا ہوں۔ کہ یہ بات نہ صرف مسلمانوں کے لئے مہلک ہے بلکہ مستقبل میں ہندوستان کے لئے بھی بے سود ہے۔ میں ہر اس کانگریس سے خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو اور جو ہندوستان کے عوام کو ایک قوم تصور کرتی ہو، متفق نہیں ہو سکتا۔“

۱۸۸۶ء میں سر سید احمد خان محمدن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کر چکے تھے اس کے قیام کا مقصد قطعی طور پر غیر سیاسی تھا۔ لیکن جب دسمبر ۱۸۸۶ء میں مداس میں کانگریس کا تیسرا اجلاس جسٹس بدر الدین طیب جی کی صدارت میں منعقد ہوا تو سر سید احمد خان بھی کھل کر کانگریس

یہ کے مقابلے نہ ہو گئے۔ اس موقع پر برطانیہ کے پریس نے بھی واضح طور پر یہ بات کی۔ بٹنک کانگریس کو مسلمانوں کی تائید و حمایت باقاعدہ حاصل نہ ہوگی اسے ایک قومی تحریک سمجھا جاسکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ کانگریس نے مسلمانوں کی حمایت کا ثبوت فراہم کرنے کے بعد رالہ پٹیہ جی کو تیسرے اجلاس کی صدارت کے لئے منتخب کر لیا۔ حالانکہ اس وقت تک اس کے ساتھ جو مسلمان تھے انہیں انگلیوں پر گن جاسکتا ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ طیب جی جو سے اس اجلاس میں پچھتر مسلمان مندوبین شریک ہو گئے۔ اس موقع پر سر سید احمد خان نے بیان ہوئے۔ کیونکہ کانگریس کو اپنے اس دعویٰ کا ثبوت فراہم کرنے میں کامیابی ہوتی جا رہی تھی۔ کانگریس قومی سطح کی جماعت تھی۔ چنانچہ فوراً بعد ہی انہوں نے ملک بھر کا دورہ شروع کر دیا۔ جا بجا جلے منعقد کر کے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ اگر انہوں نے کانگریس کا ساتھ دینا شروع کر دیا تو ہمیں نتائج برآمد ہوں گے۔

۱۸۸۷ء میں سر سید احمد خان نے ایم۔ اے۔ او کالج کے پرنسپل فیروز بیگ کی اعانت پر یونیورسٹی انڈیا پیپریا ہنگ ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس کی رکنیت بلا امتیاز مذہب سب کے لئے تھی۔ اس تنظیم میں مسلمان نواب، ہندو راجے، کچھ انگریز اور دیگر معززین شامل ہو گئے۔ کانگریس مخالف میں سر سید کی یہ بڑی کامیابی تھی۔

علی گڑھ گزٹ نمبر ۲۸ اگست ۱۸۸۸ء میں اس ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد کے لئے لکھے گئے۔ ان کے مطابق اہم ترین مقصد یہ تھا کہ کانگریس کے اس پراپیگنڈے کا مؤثر جواب دیا جائے جو وہ ملک کے اندر اور بیرون ملک یہ ثابت کرنے کے لئے کر رہی تھی کہ ہندوستان ہم اقوام، ہندوستانی کی تمام اقوام، ہندوستانی سربراہان قبائل اور ریاستوں کے فرمانروا اس کے ساتھ تھے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں امن و امان قائم رکھا جائے۔ جس میں اس کے اپنے مقاصد کی خاطر غلط فہمی رہتی ہے۔

اس ایسوسی ایشن نے انگلستان اور ہندوستان میں بہت سے مضامین چھاپ کر تقسیم کئے۔ دسمبر ۱۸۹۳ء میں انہوں نے ایک اور تنظیم اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف انڈیا قائم کی اور واضح طور پر کہا کہ وقت کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں پر مشتمل ایک تنظیم کا قیام عمل میں لایا جائے۔ بلدی اور اعظم گڑھ کے فسادات، کانگریس کے استہجابات شامل ہیں۔ لہذا مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اپنے سیاسی مقاصد کے تحفظ کے لئے

علیحدہ تنظیم قائم کریں۔ مسلمانوں کو سیاسی احتجاج سے دور رکھا بھی اس تنظیم کے مقاصد میں تھا۔ ہندوؤں کے قہقہے اور نامناسب رویہ کے باوجود سرسید احمد خان نے اس وقت بھی مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ گاتھے ذبح نہ کریں۔ کیونکہ اس طرح ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔

## کانگریس سے مسلمانوں کی علیحدگی

۱۸۸۶ء میں کانگریس میں موجود مسلمانوں کے مطالبہ کے باعث کشمکش کا آغاز ہو گیا اور سرسید نے کئی سال پہلے جو پیشگوئی کی تھی کہ ”ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں اور یہ دونوں ایک پرچم تلے اور ایک پلیٹ فارم پر کبھی یکجا نہیں ہو سکتیں“، پوری ہوئی۔ کانگریس میں موجود مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ مرکزی اور صوبائی کونسلوں میں جو نمائندے جیسے جائیں ان کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں یکساں ہونا ضروری ہے لیکن کانگریس نے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے مسلمان کانگریس سے الگ ہو گئے۔ وہ مسلمان جو سرسید احمد خان کے رویہ کو خیر نہ کہا سمجھتے تھے۔ اب محسوس کرنے لگے کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا، درست تھا۔ چنانچہ اس موقع پر حکومت کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرنا بھی بہت ضروری تھا۔ سرسید احمد خان نے، مشہوروں کے قریباً ۴۵ ہزار مسلمانوں کے دستخطوں کے ساتھ حکومت کو ایک یادداشت روانہ کی۔ جو برطانیہ کے ایران عام میں پہنچائی گئی۔ اسی قسم کی ایک یادداشت کلکتہ کی محمدی طریقہ سوسائٹی نے بھی روانہ کی۔

۱۸۹۲ء میں انڈین کونسل ایکٹ آگیا۔ جو ۱۸۶۱ء کے ایکٹ کی ترمیم شدہ صورت میں تھا۔ مگر مسلمان اس ایکٹ سے مطمئن نہ تھے۔ (دیکھئے باب ۱۱) ہندو کونسل کی نشستوں پر قبضہ کرنے کے لئے جیتا ب نظر آتا تھا۔ لیکن مسلمان یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہندو، جو تعلیمی اور اقتصادی معاملات میں اس سے بہت آگے نکل چکا ہے، اب اس کے لئے مزید پریشانیوں کے اسباب پیدا کر رہے گا۔ اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان کے درمیان خاموش کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ہندوؤں نے اپنے فوجیوں کو نظم اور مسلح کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ تلک نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اگر مسلمانوں کو کونسلوں میں مناسب نمائندگی نہ ملتی تو ان کا جینا دشوار ہو جاتا۔ ۱۸۹۷ء میں سرسید احمد خان کے صاحبزادے سید محمود نے ایک سکیم پیش کی جس میں یہ بات واضح کی گئی تھی۔ کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہے جس کی روایات، مذہب اور مفادات ہندو سے بالکل مختلف ہیں۔ لہذا لوکل باڈیوں اور مرکزی و صوبائی کونسلوں میں ان کے لئے جدا گانہ انتخابات کے ذریعہ علیحدہ

نشتیں ہونا ضروری ہیں۔ سکیم میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر کانگریس مسلمانوں کے اس مطالبے سے متفق ہو جائے تو مسلمان اس کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات واضح تھی کہ کانگریس کسی صورت بھی اس سکیم کو قبول نہ کرے گی اور قدرتی طور پر مسلمانوں میں مسلم قومیت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔

سر سید نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ کہ مسلمان اپنے ملک میں دہ بدترین دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ ایک ہندو اور دوسرا انگریز! انہوں نے محسوس کیا کہ اس موقع پر ہندو کے تعصب اور مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوششوں کے خلاف محاذ قائم کرنا۔ انگریز کے ساتھ شکر لینے کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کو حکومت کے خلاف احتجاج دوسرے رکھا اور انگریزوں کے ساتھ مناسب حد تک دوستانہ رویہ اختیار کیا۔ شاید اسی وجہ سے کانگریس نے ان پر انگریز کی چالوں کا الزام عائد کیا۔ حالانکہ جو شخص انتہائی نازک دور میں رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر انگریز کی دشمنی مول لے سکتا تھا، اسے چالوں کیسے کہا جاسکتا تھا؟

کانگریس کے حامی والٹر اسٹراٹھ ہند لارڈ ڈفرن بھی اب حالات کی نزاکت کو محسوس کر رہے تھے اور انہیں اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ ہندو اور مسلمان کا ساتھ ناممکن ہے۔ جس کانگریس کو انہوں نے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا وہ ہندوستانی کے ہندوؤں کی محبت کا مرکز تو بن سکتی تھی اور ان کی قیادت بھی سنبھال سکتی تھی لیکن وہ کسی طور بھی مسلمانوں کی نمائندگی کے قابل نہ تھی کیونکہ مسلمان اور ہندو کے درمیان بنیادی طور پر ملتے اختلافات تھے۔ کہ مسلمانوں کا کانگریس سے ملوث ہونا ناممکن تھا۔ ڈفرن کے ساتھی اور کانگریس کے بااؤم لارڈ ہیوم کا نظریہ بھی کافی حد تک تبدیل ہو چکا تھا لارڈ ہیوم نے جنس طیب جی کے نام ۲۲ جنوری ۱۸۸۸ء کو ایک ذاتی خط میں لکھا۔

"لارڈ ڈفرن اب ہمارے خلاف ہو چکے ہیں۔ شاید وہ مسلمانوں کی قوت سے خائف بھی ہیں۔ ہماری حیثیت ان کے نزدیک ایک ایسی جماعت کی طرح ہے۔ کہ جب ہماری کوئی بات انہیں پسند آجائے۔ تو وہ قبول کر لیتے ہیں اور ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن جب ہماری بات انہیں پسند نہ آئے تو وہ اُسے آسانی سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جہاں تک سرسید کا تعلق ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کہ ان کی شخصیت میں نمایاں انقلاب کیسے آگیا۔ مسلمان بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اور وہ انگریز افسروں میں بھی مقبول ہیں۔"

دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ لارڈ ہیوم ایک کانگریسی سے یہ سوال کر رہا تھا کہ۔ "سید کی شخصیت بدل

کیوں گئی ؟ لارڈ ہیوم نے کتنی آسانی کے ساتھ حالات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ قدم قدم پر محسوس کر رہے تھے کہ کانگریس مسلمان پر غلبہ حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہی اور ایک قومیت کی آڑ میں اس نے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی قدیم روایات سے محروم کرنے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ایک سرسید ہی کیا، لارڈ ہیوم نے ان مسلمانوں کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ جو سرسید کے مخالف تھے۔ اور کانگریس میں شامل ہو گئے تھے۔ یہی بہت جلد کانگریس کے ناپاک عزائم کے پیش نظر انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

## باب

## مسئلہ ایک کا تیسرا

مسئلہ میں ہندوؤں سے جو انہوں نے ہندی مذہب شروع ہوا تھا، رفتہ رفتہ پورے ملک میں پھیل گیا لیکن ہندوؤں کی طرف سے یہ تحریری اور متعصبانہ اقدام مسلمانوں کے لئے اس اعتبار سے بہت سودمند ثابت ہوا کہ انہیں ہندوؤں کی ذہنیت اور ان کے پس پر وہ عزائم کو چڑھنے اور جانچنے کا موقع مل گیا۔ نیز اس تنازعہ نے مسلمانوں میں بیداری کی جولہ پیدا کی اس کی وجہ سے مسلمانوں میں کانگریس کے پھیلاؤ کو روکنے میں بڑی مدد ملی۔ کانگریس اس وقت ملک کی اہم سیاسی تنظیم تھی اسی لئے مسلمان اس کے پرچم تلے اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔ جب طاغریس قائم ہوئی تو صرف دو مسلمان اس میں شامل نئے چار سال کے اندر اندر کانگریس میں مسلمان مندوبین کی تعداد ۲۲ ہو گئی تھی اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مسئلہ میں معدومے چند مسلمان مندوبین کے مقابلے میں ہندو مندوبین کی تعداد ۹۶۵ تھی۔

ذاتی طور پر مسلمانوں نے اس تنازعہ سے سبق حاصل کیا اور اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

مسئلہ میں شمال مغربی سواروں کا لیفٹیننٹ گورنر سر انتھونی میکڈونلڈ مندر ہوا۔ وہ ہندوؤں کے حق میں تھا چنانچہ اردو کے خلاف ہندوؤں کی مہم اور ناگہری رسم الخط میں ہندی کی ترمیم کا مطالبہ تیز تر ہو گیا۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ گورنر فوری طور پر ہندوؤں کا یہ مطالبہ

تسلیم نہ کر سکا، تاہم ۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو گورنر نے ایک قرارداد کی اشاعت کے ذریعہ اعلان کیا کہ بعض سرکاری اغراض کے لئے سرکاری دفاتر میں ہندی، ناگری رسم الخط میں استعمال ہوگی۔ مزید کہا گیا کہ شمال مغربی صوبوں میں ہندی کو عدالتی زبان کا درجہ دیا جائے گا اور آئندہ صرف ایسے لوگوں کی تقرری کی جائے گی جو ان سرکاری دفاتروں میں انگلش کے ساتھ جہاں قطعی طور پر انگریزی استعمال ہوتی ہو، جو بیک وقت اردو اور ہندی جانتے ہوں۔ سندھوں نے اس قرارداد کا خیر مقدم کیا لیکن اس کے برعکس مسلمانوں میں بے چینی کی زبردست لہر دوڑ گئی کیونکہ انہیں سرکاری ملازمتوں کے سلسلہ میں اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ اردو مسئلہ سے سرکاری زبان چلی آ رہی تھی۔ اس کے بدل جانے کا واضح مطلب یہ تھا کہ مسلمان تمام سرکاری ملازمتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ مسلمان اخباروں نے بھی حکومت کے اس اقدام پر زبردست احتجاج کیا۔ ملک کے کونے کونے میں احتجاجی جلسے منعقد کئے گئے آخر اگست ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ کے رہنماؤں نے کھنٹو میں ایک اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔ علی گڑھ کالج کے سکریٹری نواب حسن الملک اس انجمن کے صدر اور بیرسٹر حمید علی خاں، سکریٹری چنے گئے۔ انجمن نے ہندی کی ترویج کے خلاف فوری طور پر زبردست مہم چلانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں سرسید وفات پا چکے تھے۔ اور اب علی گڑھ کی تمام ذمہ داریاں نواب حسن الملک پر آ پڑی تھیں۔ نواب حسن الملک نے ۱۳ مئی ۱۹۴۷ء کو علی گڑھ میں ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کا ایک وفد گورنر سے ملے اور اسے اردو کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرے۔ اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ہندوؤں کی مخالفت سے بہر صورت احتراز کیا جائے۔ لہذا مسلمانوں کا ایک وفد گورنر مکمل اہل کے پاس پہنچا لیکن گورنر مسلمانوں کی اس جرأت پر چراخ پا ہو گیا۔ وہ اپنی بات کو حرف آخر سمجھتا تھا۔ اُس نے مسلمان وفد کے ساتھ جو سلوک کیا، اُس میں مسلمانوں سے خصامت کا انداز نمایاں تھا۔ کچھ دنوں بعد گورنر خود علی گڑھ کالج پہنچا اور اُس نے کالج کے سرپرستوں کا اجلاس طلب کیا۔ گورنر نے واضح طور پر یہ کہہ دیا کہ اگر نواب حسن الملک علی گڑھ کالج کے سکریٹری اور اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے صدر رہے تو حکومت، کالج کی مالی امداد بند کرنے پر مجبور ہو جائے گی گورنر نے اپنی پست ذہنیت کا مزید مظاہرہ یوں کیا کہ ایسے دولت مند مسلمانوں کو جو کالج کے لئے امداد فراہم کرتے تھے، یا کر سکتے تھے، اعتبار کیا کہ اگر انہوں نے کالج کی مالی امداد کرنے کی کوشش کی تو حکومت کسی نہ کسی انداز میں اُن کے خلاف کارروائی کرے گی۔ بہر حال کالج کی اہمیت کے شدید احساس



کے ہر مجاہد کے مگر نواب حسن الملک کے کالج کے بعد سے سے استفادہ آیا۔

مسلمان اخباروں اور مسلمان انجمنوں نے نہایت جرأت سے کام لیتے ہوئے گورنر مکہ اہل  
کے خلاف کھٹا اور قراردادیں منظور کیں۔ ساتھ ہی نواب حسن الملک کو استعفا واپس لینے پر مجبور کیا۔  
اس موقع پر مسلمان رہنماؤں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ ان کی ایک اہم تنظیم کا قیام  
بہت ضروری تھا۔ بعد ہی حسن اور نواب وقار الملک کی اس تجویز کی مخالفت نواب حسن الملک نے  
کی جو کہ وہ سرسید کی ہدایات کے مطابق مسلمانوں کو سیاست سے دور دور رکھنا چاہتے تھے لیکن  
یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ اگر مسلمانوں نے ایک سیاسی تنظیم قائم نہ کی تو وہ کاتر میں کا رخ کریں گے  
تو دقن طور پر اس تنظیم کے قیام کا فیصلہ بدل دیا گیا۔ بعد ہی جنوری میں ایک اجلاس طلب کر لیا گیا۔  
مکہ مکرمہ کی فرعونیت سے ۱۹۰۱ء میں مسلمانوں کو نجات مل گئی۔ اور سر جیمز لائوش نے گورنر  
مغرب ہوتے۔ نئے گورنر نے مخاطب پالیسی اختیار کی اور مسلمانوں کے مطالبات پر بہت زیادہ غور کا وعدہ کیا۔

## پہلا قدم

مکھنڈ کا اجلاس ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کی طرف پہلا قدم تھا۔ یہ اجلاس محمد علی جویش  
کا نفرس کے زیر اہتمام اکتوبر ۱۹۰۱ء میں منعقد ہوا اور اس نے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے قیام کے  
سلسلے میں نواب وقار الملک کی سکیم کو منظور کر لیا۔ نواب وقار الملک سے درخواست کی گئی کہ وہ  
ملک کے کونے کونے میں اس جماعت کی شاخیں قائم کریں مگر کچھ عرصے بعد ہی موصوف جج کے تے  
پہلے گئے۔ اور نئی سیاسی تنظیم کا کام رک گیا۔

مکھنڈ کے اجلاس میں جو مقاصد پیش کئے گئے وہ یہ تھے۔

- ۱۔ مسلمانوں کا قطعہ نظر حکومت تک پہنچایا جائے۔
- ۲۔ مسلمانوں کو اپنے حالات بہتر بنانے کے لئے بیدار کیا جائے۔
- ۳۔ مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت سے روکا جائے۔
- ۴۔ کانگریس کے اس مطالبے کی مخالفت کی جائے کہ ملک میں جمہوری ادارے قائم ہوں اور  
انڈین سول سروس کے مقابلے کے امتحانات بیک وقت انگلستان اور ہندوستان میں ہوں۔

## تقسیم بنگال

برطانوی حکومت کے تحت بنگال کو ایک بہت بڑی انتظامی وحدت کی حیثیت حاصل تھی جب بنگال میں انگریزوں کی حکومت مستحکم ہو گئی تو یہ محسوس کیا گیا کہ انتظامی آسانیوں کی خاطر بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ۱۸۵۷ء میں آسام کا انتظام و انصرام علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۸۹۲ء کی اصلاحات کے بعد حکومت نے چٹاگانگ کو بھی علیحدہ کر کے آسام کے صوبے میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی۔ لیکن بعد ازاں اسے ملتوی کر دیا گیا۔ لارڈ کرزن نے انتظامی ضروریات کے تحت اس سوال کو دوبارہ اٹھایا اور بنگال کو دو حصوں یعنی مسلم بنگال اور ہندو بنگال میں تقسیم کرنے کا ارادہ کیا۔ بنگال کے شمالی حصے میں مسلمانوں اور مغربی حصے میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ابتداء میں ہندو اور مسلمانوں نے اس سکیم کی مخالفت کی لیکن جلد ہی مسلمان رہنماؤں نے اپنے حرام پر تقسیم کی اہمیت واضح کی۔ لارڈ کرزن نے بھی فروری ۱۹۰۵ء میں بنگال کے مختلف صوبوں کا دورہ کیا اور عوام کو سکیم کے بارے میں آگاہ کیا۔ لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کو قانونی صورت دینے کے لئے ججیٹو کونسل کے ذریعہ قانون منظور کیا۔ اس قانون کے نفاذ کے کچھ عرصہ بعد اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ملکوٹے نئے صوبے کا گورنر مقرر کیا گیا آئندہ ماہ اُس نے لارڈ ملکوٹ کو بطور گورنر جارج دے دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بنگال کی تقسیم لارڈ کرزن کی اختراع نہ تھی۔ یہ تقسیم ۱۸۵۷ء میں لارڈ ڈلہوزی کے ذہن میں انتظامی دشواریوں کے تحت آئی۔ ۱۸۵۷ء میں بنگال کے بیٹھینٹ گورنر جارج کپیل نے جی بنگال کی اسی نوعیت کی تقسیم کی کوشش کی تھی جو ۱۹۰۵ء میں کرزن کی طرف سے عملی کی گئی۔ اول الذکر کی سفارش ہی پر ۱۸۵۷ء میں آسام کو بنگال سے علیحدہ کر کے ایک چیف کمشنر کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس کے باوجود بنگال کا رقبہ ایک لاکھ ۹۰ ہزار میل اور آبادی قریباً پورے آٹھ کروڑ تھی۔ مواصلات کا انتظام نہایت ناقص تھا لہذا تمام علاقوں پر حکومت کی نگرانی اور گرفت ناممکن تھی۔ انہی وجوہات کی بنا پر بنگالی کسانوں کی حالت بھی قابل رحم تھی تعلیم کی ترویج اور جرائم کے خاتمے میں بہت سی مشکلات پیش آرہی تھیں انڈیئریں صوبوں، بنگال، آسام اور صوبہ ہائے متوسط کے درمیان تقاضا مقامی لوگ اس صورت حال سے پریشان تھے اور درحقیقت انہی لوگوں کی درخواستوں پر بنگال کی تقسیم کا معاملہ لارڈ کرزن کے سامنے آیا۔

در اصل ہندوؤں کو خطرہ یہ تھا کہ مسلمان اکثریت والے علاقوں کا "مسلم بنگال" مسلمانوں

کا مرکز نہ بن جائے۔ مسلمان یہ چاہتے تھے کہ تقسیم تو بے شک ہو لیکن آسام کے فضائل و صوبے کے لئے اگر ایک ایسی ہی کونسل قائم کر دی جائے جیسی بنگال میں قائم تھی اور اسی طرح علیحدہ بورڈ آف ریونیو بنایا جائے تو انہیں کوئی اعتراض نہ سمجھ۔

اسی سال کرڑی نے بہت سے اصلاح کا دورہ کیا تاکہ تقسیم کے بارے میں حوام کی رشتے معلوم کر سکیں۔ لہذا وہ ایسی پر انہوں نے حوام کی آراء کی روشنی میں سکیم میں کچھ ترمیم کی اور ۱۹۰۵ء کو بنگال تقسیم کر دیا گیا۔

تقسیم بنگال کے خلاف احتجاج کا سلسلہ کھلنے سے شروع ہوا۔ کلکتہ دارالمیو سی ایشن جس کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی، نے محسوس کیا کہ تقسیم بنگال بے بعد قدرتی طور پر ایک علیحدہ بانی کو رٹ بھی قائم کی جائے گی تاکہ نئے صوبے کی آبادی کے لئے آسائیاں فراہم کی جاسکیں۔ اس صورت میں انہیں اقتصادی اور سیاسی طور پر نقصان اٹھانا پڑے گا۔

جلد ہی احتجاجی مسدود قرار دینے والے تحریکیوں اور غنڈہ گردی میں تبدیل ہو گیا۔ دراصل ہندو کو سب سے بڑی تکلیف یہ تھی کہ مسلمان کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک گوشہ عافیت یوں نصیب ہوا کہ ہندوؤں نے تقسیم کو دھڑکتی ماما کے قتل سے تعبیر کیا اور کالی ماما زمین کی دیوی کی زبردست توہین قرار دیا۔ ہندوے ماترم کا ترانہ ابھرا جو بنکم چندر چیٹرجی کے ناول آنند مت سے لیا گیا تھا جس ناول کا مرکزی خیال ششدر میں سنیا سیروں کی مسلمان حکومت کے خلاف بغاوت پر مبنی تھا۔ ہندوؤں کی طرف سے ان اشتعال انگیز کارروائیوں کے باعث جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ کانگرس نے پورے ہندوستان میں تقسیم کے خلاف احتجاجی مظاہرے شروع کر دیئے۔ ہندوؤں نے انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا، سرکاری تحریک چلائی اور مسلمانوں پر مسلح حملے شروع کر دیئے۔ اس موقع پر برہمن سماج، پارٹھنا سماج، آریہ سماج، تھیرو سونیکل سوسائٹی، سنگھ سنی، غرضیکہ تمام ہندو تنظیمیں کھل کر مسلمانوں کے خلاف ہو گئیں۔ ان تنظیموں نے فراخ دلی اور دوستی کا جونا قابو نہیں رکھا تھا، وہ تقسیم بنگال کے موقع پر خود ہی متزکی مسلمانوں کو تنگ کرنے کے لئے ہندوؤں نے مسجدوں کے سامنے سنگھ اور بابے بھلنے شروع کر دیئے۔

## شملہ وفد

۱۹۰۵ء میں کنڈن کی جگہ منگو ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد برطانیہ میں لبرل وزارت قائم ہو گئی اور جان مورے کو سکریٹری آف سٹیٹ برائے امور ہند مقرر کیا گیا ہندوؤں نے ہوا کا رخ اپنے حق میں دیکھا تو تیسرا تقسیم بنگال کے لئے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ دراصل مورے خود بھی اس تقسیم کے خلاف تھے۔ چنانچہ نواب محمد علی صاحبہ نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو متحد کر کے ان کے حقوق کی حفاظت میں اقدامات کئے جائیں اور ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے سے ملاقات کرے۔ ستمبر ۱۹۰۵ء میں مسلمانوں کا ایک خاص اجلاس کھنٹر میں منعقد ہوا جس میں وائسرائے کو پیش کی جانے والی یادداشت پر بحث کے بعد آغاخان کی قیادت میں یکم اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد شملہ پہنچ گیا۔ اس وفد میں ہندوستان کے ۵ مسلمان رہنما شامل تھے آغاخان نے مسلمانوں کی طرف سے یادداشت پڑھی جس کا اقتباس یہ ہے :

۱۔ سیاسی اداروں کے لئے انتخاب کا طریقہ ایسا ہو جس کے ذریعے مسلمان مخصوص حلقوں سے اپنے نمائندے منتخب کر سکیں۔

۲۔ مسلمانوں کی تاریخی اہمیت، ان کی روایات اور سیاسی حیثیت کے اعتبار سے زیادہ نشستیں دی جائیں نیز ان کی آبادی کے تناسب کو پیش نظر رکھا جائے۔

۳۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے تناسب کا تعین کیا جائے نیز ایگزیکٹو کونسل کے اراکین، آئی کورٹ کے ججوں اور چیف کورٹ کے ججوں کے عہدوں پر مسلمانوں کا تقرر کیا جائے۔

۴۔ یونیورسٹیوں میں بھی مسلمانوں کے لئے علیحدہ نشستیں محفوظ کی جائیں۔

۵۔ ایک مسلمان یونیورسٹی کے قیام کے لئے حکومت کی طرف سے سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۶۔ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور ان کی جداگانہ معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ اور یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کے طریق کار کو تسلیم کیا جائے۔

لارڈ مرٹون نے یادداشت پڑھنے کے بعد یقین دلایا کہ وہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق و مفادات کے

تختہ کی پوزی کو شش کر دیں گے۔ نیز حکومت اس امر کا خاص خیال رکھ لے گی کہ انگریز حکومت  
پہلے مسلمانوں کا احترام قائم رہے اور مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور قومی روایات کا احترام قائم رہے۔  
لارڈ کنٹون نے مزید کہا

”میں اس بات سے بالکل متفق ہوں کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ حیثیت کا تعین ضروری  
ہے۔ میونسپل بورڈ ہریاڈسٹرکٹ بورڈ یا مجلس قانون۔ مسلمانوں کی علیحدہ حیثیت کا  
تعین بہر حال ضروری ہے۔“

لارڈ کنٹون نے جو معاہدہ انداز اختیار کیا تھا اس کی کچھ وجوہات تھیں۔

- ۱۔ ہندوؤں کے بعد ہندوستان میں مسلمان ہی دوسری بڑی اکثریت تھے اور ان کی علیحدہ  
حیثیت کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔
- ۲۔ مشرقی بنگال اور آسام میں نئے سرے کے نیٹینٹ گورنر فکر کے استغفار اور تقسیم  
بنگال کی تفسیح کے حق میں غائبوں کے بعد مسلمانوں کی طرف سے بھی احتجاجی کاروائیاں  
کاشدہ خطرہ لاحق تھا۔

بہر حال وفد کامیاب رہا۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ مسلمان جو تاخیر اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم  
قائم کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کریں۔

شمارہ ۱۹۰۶ء میں مندرجہ ذیل رہنما شامل تھے۔

ہزاری نش آغا خان (قائد)۔ شہزادہ بختیار شاہ، کلکتہ۔ ملک عروجیات خان، لوانا، شاہ پور۔  
میاں محمد شاہ دین، بارایٹ لاہور۔ سید شرف الدین، بارایٹ لاہور۔ نواب سید نواب علی  
چوہدری، ممبئی۔ سید امیر حسن خان، کلکتہ۔ نواب ناصر حسین خان، خیال، کلکتہ۔ مرزا شہناز  
علی بیگ، مرشد آباد۔ سید علی امام، بارایٹ لاہور۔ نواب سرفراز حسن خان، ٹپنہ۔ احمد محمد الدین  
مدراں۔ مولوی رفیع الدین احمد، پونہ۔ ابراہیم بھائی آدم جی پیر بھائی، بمبئی۔ مسٹر عبدالکرم  
بارایٹ لاہور۔ کلکتہ۔ اللہ داد شاہ، خیرپور۔ مولانا ایچ۔ ایم۔ مالک، ناگ پور۔ خلیفہ سید محمد حسین  
پٹیل۔ خواجہ یوسف شاہ، امرتسر۔ میاں محمد شفیع، بارایٹ لاہور۔ لاہور۔ شیخ غلام صادق، امرتسر۔  
عکیم محمد اسماعیل خان، دلی۔ مولوی احتشام علی، کھنڈ۔ سید کریمت حسین، بارایٹ لاہور۔ الد آباد۔  
مسٹر عبدالسلام خان، مراد آباد۔ نواب منزل اللہ، علی گڑھ۔ حاجی محمد اسماعیل خان، علی گڑھ۔  
صاحبزادہ آفتاب احمد خان، علی گڑھ۔ نواب وفار الملک۔ مولوی مشتاق حسین، امرہ۔ مولوی

حبیب الرحمن خان شیروانی، علی گڑھ - سید سردار علی، بمبئی - فراب محسن الملک سید مہدی علی، علی گڑھ (دسکر پڑی)۔

## آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

وائسرائے ہند لارڈ ڈلہؤ سے ملاقات کے بعد مسلمانوں کے وفد نے شملہ ہی میں مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کے قیام کے معاملے پر تدارک خیال شروع کر دیا۔ وہیں یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ قومی سطح پر مسلمان سیاسی تنظیم کا قیام محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے آئندہ سالانہ اجلاس میں کر دیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا۔ کہ اس تنظیم کے اغراض و مقاصد اور نوعیت کا سختی سے مسلمانوں کے اس نمائندہ اجلاس میں میں کیا جائے۔ جو دسمبر کے آخری ہفتہ میں اور محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے اختتام پر منعقد ہونا تھا۔ دسمبر کے وسط میں ڈھاکہ کے فراب سلیم اہلہ نے کل ہند کنفیڈریسی کے بارے میں ایک جامع لائحہ عمل پیش کیا۔ جس میں مسلمانوں کی مجوزہ سیاسی تنظیم کا نام ”آل انڈیا مسلم کنفیڈریسی“ تجویز کیا گیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ نام نہاد انڈین نیشنل کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو کم کیا جائے۔ چنانچہ محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے اختتام پر ۳ دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہندوستان بھر کے مسلمان رہنماؤں کا ایک نمائندہ اجلاس منعقد ہوا۔ جس کی صدارت فراب و قدار الملک نے کی۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا۔

”آج ہمارا اجتماع جس مقصد کے لئے ہوا ہے۔ وہ اچھی نہیں۔ اس کی ضرورت تو اسی دن پیدا ہو گئی تھی۔ جس دن انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی تھی۔ ہم سر سید احمد خاں مرحوم کی پالیسی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کانگریس کی روز افزوں قوت کو محسوس کرتے ہوئے نہایت بے خوفی سے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا۔ اگر انہیں اپنی سلامتی درکار ہے۔ تو وہ کانگریس میں شریک نہ ہوں۔ آج سر سید ہمارے درمیان موجود نہیں۔

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ مرحوم کی رائے کتنی صائب تھی۔ اس رائے کی اہمیت اب نمایاں ہو رہی ہے۔ کانگریس کے رویے کے پیش نظر ہی سر سید احمد مرحوم نے مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کے تحفظ کی جدوجہد کا سبق دیا تھا۔ مسلمان، تقسیم بنگال اور مجلس قانون ساز میں توسیع کے سرکاری ارادے کا علم ہونے کے بعد وائسرائے ہند سے ملے اور انہیں اپنے مطالبات سے آگاہ کیا۔ نیز وہ نا انصافیاں بھی بتائیں۔ جو

دہت سے مسلمانوں کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کے وفد نے وائسرائے سے جو باتیں کہیں اور جواباً انہیں وائسرائے کی طرف سے جو یقین دہانی کرائی گئی۔ وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ وائسرائے سے ملاقات کے فوراً بعد مسلمانوں نے حالات پر غور کرنے کے لئے شکرہ میں باہم تبادلہ خیال کیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا۔ کہ وہ سمجھیں تمام مغربوں کے مسلمان نمائندوں کا ڈھاکہ میں ایک اجلاس منعقد کر کے مستقل حل تلاش کیا جائے۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ کہ اگر فوری طور پر تدابیر اختیار نہ کی گئیں اور اگر کسی وقت ہندوستان سے برطانوی اقتدار اٹھ جائے۔ تو ہندو بڑی آسانی کے ساتھ ہم پر غلبہ پا کر ہمیں اپنا غلام بنا لے گا۔ یہ بات ہم اپنے ہی دل سے پوچھ سکتے ہیں کہ اگر ایسا ہو گیا۔ تو ہمارا مذہب، ثقافت، معیشت، جان و مال اور آبرو کس کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ آج برطانوی حکومت کی ہندوستان پر مضبوط گرفت کے باوجود ہمیں قدم قدم پر مشکلات و مصائب کا سامن کرنا پڑ رہا ہے۔ تو کل جب تنگ نظر ہندو ہمیں اپنی غلامی میں لے لے گا تو ہمارا کیا انجام ہو گا ؟

لہذا ہمارا یہ فرض اولین ہے۔ کہ ہم ایک سیاسی تنظیم قائم کریں۔ اور حق الوسع کو شش کریم کریم کر اپنے دوستوں کو غلط راستوں پر چلنے سے روک دیں۔ ہم ہر ایک کے ساتھ حسن اخلاق اور حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔“

نواب وقار الملک کی اس تقریر کے بعد نواب سلیم اللہ خان نے ایک قرارداد پیش کی جس کی تائید حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی اور مولانا غفر علی خان نے کی۔

قرارداد یہ تھی :

۱۔ یہ اجلاس جو ڈھاکہ میں جمع ہونے والے ہندوستان کے مختلف حصوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے، فیصلہ کرتا ہے۔ کہ ایک سیاسی تنظیم کا قیام عمل میں لایا جائے جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ ہو اور جس کے اغراض و مقاصد یہ ہوں :

۱۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں حکومت برطانیہ کے لئے وفاداری کے جذبات کو ترقی دینا اور کسی آئندہ تجویز و تدبیر کی نسبت اگر حکومت کے ارادوں سے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہو تو اسے دور کرنا۔

(ب) مسلمان ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ اور مسلمانوں کی ضروریات اور امنگوں کی حکومت کے سامنے ترجمانی کرنا۔

(ج) مسلم لیگ کے ان اغراض و مقاصد کو نکٹیس پہنچائے بغیر دوسری جماعتوں کے خلاف مسلمانوں میں جذبات کی پرورش کا افساد کرنا۔

تمام صوبوں کی نمائندگی کرنے والے مسلمانوں پر مشتمل ایک جمہوری کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ جس کے جو انٹسٹ سیکرٹری نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مقرر کئے گئے۔ کمیٹی مسٹڈ اراکین پر مشتمل تھی۔ اور اس کے قیام کا مقصد مسلم لیگ کے لئے دستور وضع کرنا تھا جس کے بعد مسلم لیگ کے ایک نمائندہ اجلاس میں اس پر غور و خوض ہونا تھا۔  
مسلم لیگ کے اس جلسہ تاسیس میں یہ نمایاں لوگ شامل تھے۔

نثار احمد خان، حسینی، صہبہ وردی، عبدالرحمن صدیقی، مولانا محمد علی، سید غلام حسین، غازی عبدالعزیز، شوکت علی، سید بقاء الحسن، فضل محمد خان، شیخ عبداللہ، عبدالحجید، سید نبی اللہ، عبدالسلام رفیقی، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، نواب محمد علی، راجہ نوشاد علی خان، نواب مسریم اللہ خان اشرف الدین، نواب محسن الملک، سر رفیع الدین احمد، مولانا خضر علی خان، خورشید علی، عبدالکریم، انوار احمد، نجم الدین، ظہور احمد، شاہ مصطفیٰ، وزیر حسن، شمس الدین احمد خان، محمد یوسف، چوہدری غلام مصطفیٰ، سید ظہور احمد، نواب سید نواب علی، مسٹر محمد علی جسٹس شاہ دین و غیرہ۔

دستور پر غور کرنے اور اس کی منظوری دینے کے لئے مسلم لیگ کا پہلا اجلاس کراچی میں ۲۹ اور ۳۰ دسمبر ۱۹۴۶ء کو منعقد ہوا۔ صدارت بمبئی کے سر آدم جی پیر بھائی نے کی۔ اس اجلاس نے دستور کی منظوری دے دی۔ تاہم اس موقع پر دستور کمیٹی میں کچھ مزید اراکین بھی شامل کر لئے گئے تھے اور اس کے بعد دستور کو حتمی صورت دی گئی تھی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۴۷ء کو دستور کی توثیق علی گڑھ میں کی گئی۔ یہ مسلم لیگ کا دوسرا باقاعدہ اجلاس تھا۔ جس کی صدارت مسٹر شاہ دین نے کی۔ اسی اجلاس میں ہزاری نس آغا خان کو مسلم لیگ کا صدر اور سید حسن بگرامی کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ بہت سے اہم شہروں میں اس سال کے وسط تک مسلم لیگ کی شاخیں کھول دی گئیں۔ ایک شاخ لندن میں بھی قائم کی گئی۔ جس کے صدر سید امیر علی اور سیکرٹری سید ابی جس تھے۔ نواب محسن الملک اکتوبر ۱۹۴۷ء میں انتقال کر گئے تھے چنانچہ



ان کی جگہ علی گڑھ کالج کے اعزازی سیکریٹری کا جہدہ نواب وقار الملک نے سنبھال لیا تھا۔  
 پہلی بار ہندوستان کے مسلمانوں کو قومیت کی بنیادوں پر اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم  
 مسلم لیگ اور اس کے ٹھوس دستور کے ساتھ میدان عمل میں آنے کے لیے مسلم لیگ نے بڑے صغیر  
 کے مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ ہر شعبہ زندگی میں کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ اس وقت مسلمانوں  
 کے سامنے سب سے اہم مسئلہ مسلمانوں کی باقاعدہ نمائندگی تھا۔ مسلمانوں نے بیکراکٹر برکٹ  
 کو تمام کونسلوں و مقامی اور صوبائی اور مرکز میں مسلمانوں کو نمائندگی دینے سے متعلق دوسرے  
 جہد کے سامنے اپنے مطالبات پیش کر دیئے تھے اور یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ یہ نمائندگی مسلمان  
 ووٹوں کے ذریعہ ملنی چاہیے۔

اب صورت یہ تھی۔ کہ مسلم لیگ جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کر رہی تھی اور کانگریس  
 ہر قدم پر اس کی مخالفت کو اپنا شعار بناتے ہوئے تھی۔ مسلمانوں کو ۱۸۸۲ء کے میونسپل  
 اور ڈسٹرکٹ کونسل ایکٹ اور کونسل ایکٹ کے تحت مخلوط انتخابات کا بیخ بخر بھرا تھا۔  
 اس کی ایک واضح مثال یہ تھی کہ کلکتہ کے میونسپل انتخابات میں ۱۰ نشستوں میں ایک بھی مسلمانوں  
 کو نہ مل سکی۔ اب مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی  
 ثقافتی اور معاشرتی و اقتصادی حقوق کا تحفظ کیسے کیا جائے۔ اگر انہیں ہندوؤں کے ساتھ  
 مل کر ہی زندگی گزارنا ہے۔ تو جداگانہ انتخابات ہی واحد حل ہے۔ نیز ہندو کی تنگ نظری،  
 نا انصافی اور چہرہ دہستی سے محظوظ رہنے کے لئے مسلمان اور ہندو کی نمائندگی میں توازن بھی  
 ضروری ہے۔ کیونکہ کانگریس مسلمانوں کو اپنے مقابلے پر دیکھنا پسند نہ کرتی تھی۔ لہذا جداگانہ  
 انتخابات کے معاملہ میں اس نے اپنی معاندانہ پالیسی برقرار رکھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس  
 اور ہندوؤں سے مسلمانوں کی نفرت اور بیزاری فزوں نہ ہو گئی۔ جب اصلاحات سے متعلق  
 حکومت نے مسلم لیگ اور کانگریس کو مراستے روانہ کئے تو مسلم لیگ نے اس بات سے اتفاق  
 کیا کہ مرکزی دامپینر علی کونسل میں کچھ مدت تک سرکاری اراکین اکثریت میں رہیں گے۔ تاہم  
 جہاں تک صوبائی کونسلوں کا تعلق تھا۔ ان کے لئے مسلمان علیحدہ حلقوں سے اپنے نمائندے  
 منتخب کریں گے۔ نیز جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں ان کی سیاسی اہمیت کو  
 مد نظر رکھتے ہوئے آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دی جائیں۔ اور میونسپل ڈسٹرکٹ  
 بورڈوں میں جداگانہ انتخاب کے اصول پر عمل کیا جائے۔

مشکل یہ تھی۔ کہ انگریز جداگانہ انتخاب کے مطالبہ کو ہندوستان کے کئی قوموں والے ملک اور مسلمان قوم کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ کانگریس، جداگانہ انتخابات کے آئینے میں اپنی تنگ دلی کی شکست دیکھ رہی تھی لیکن اس کے باوجود ہندوستان بھر میں دو ایسے ہندو بھی تھے۔ جنہوں نے جداگانہ طریق انتخاب کی حمایت مکمل کر لی۔ ان میں ایک لارڈ سنہا اور دوسرے مسٹر گوکھلے تھے۔

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو حکومت برطانیہ کی طرف سے نائب وزیر ہند نے جو اعلان کیا۔ وہ مسلمانوں کی پہلی حیثیت تھی۔ کہا گیا :-

”مسلمانوں کے لئے علیحدہ انتخابی رجسٹر ہوگا۔ گو اس اصول کے تحت بغاہر لوگوں میں فرق قائم ہوگا۔ اور مذہبی بنیادوں پر وہ دو گروہوں میں منقسم ہو جائیں گے۔ مگر تاریخی روایات میں اس کی بڑی بہت گہری ہیں۔ معاشرتی رسم و رواج کے اختلاف کو آخر کیونکر نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟“

### منظور ہونے والی اصلاحات

منظور ہونے والے سکیم میں یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی۔ کہ ہندوستان میں کچھ نہایت سی نسلیں اور مذہبی جماعتوں پر مشکل آبادی موجود ہے لہذا نمائندگی کا حق بھی اسی بنیاد پر دیا جانا چاہیے۔ اس سکیم کے تحت جب نئے ضابطے مرتب کئے گئے۔ تو مرکزی کونسل میں مسلمانوں کو وہ نشستیں دی گئیں۔ بھٹی، بنگال، بہار، اڑیسہ، مدراس اور صوبہ ہائے متحدہ میں جداگانہ انتخابات کے اصول پر ایک نمائندہ تسلیم کیا گیا۔ مسلمانوں کو یہ حق بھی دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو غیر مسلم حلقوں سے بھی انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔ گورنر جنرل کو یہ اختیار دیا گیا۔ کہ وہ پنجاب سے ایک مسلمان نمائندہ کی نامزدگی کر سکتے ہیں۔ مذکورہ اصلاحات کے تحت حکومت کو اختیار تھا کہ لفٹنٹ گورنر کے زیر انتظام صوبوں میں ایگزیکٹو کونسلیں قائم کرے۔ مدراس اور بمبئی میں تین تین کی جگہ چار چار کونسل رکھے گئے۔ تاہم ان میں سرکاری افسروں کی تعداد دو سے زائد نہ ہو سکتی تھی۔ بہار، اور اڑیسہ کے نئے صوبوں کو لفٹینٹ گورنروں کے زیر انتظام کر دیا گیا۔ اور ان گورنروں کی مدد کے لئے ایگزیکٹو کونسلیں قائم کر دی گئیں۔

صوبائی مجالس قانون ساز کی نشستوں میں بھی اضافہ کیا گیا۔ بڑے صوبوں کی کونسلوں

کے لئے اراکین کی زیادہ سے زیادہ تعداد یکپاش مقرر کی گئی۔ چھوٹے صوبوں مثلاً پنجاب اور برما کے لئے ۵۰ نشستوں کا تعین کیا گیا۔

منٹو مورے سکیم سے ہندوستان کے سیاسی درجہ میں تواضع نہ ہوا۔ البتہ مجموعی طور پر ہندوان اصلاحات کے لئے انگریزوں کے شکر گزار تھے۔ لیکن انہیں دکھ اس بات کا تھا کہ مسلمانوں کو خاص مراعات کیوں دی گئیں؟ مسلمانوں کو ان اصلاحات سے فائدہ نہ پہنچا۔ یہ درست ہے کہ وہ ہندو کے خاصانہ ہتھکنڈوں سے محفوظ ہو گئے۔ لیکن آبادی کے تناسب کے اعتبار سے ان کو بہت کم نشستیں ملیں۔ اس کا اندازہ درج ذیل اعداد و شمار سے کیا جاسکتا ہے۔

صوبہ	آبادی	نشستیں
صوبہ متحدہ	۱۴ فیصد	۸ فیصد
پنجاب	۳۵ فیصد	۷ فیصد
بھٹی	۲۰ فیصد	۵ فیصد

بہار اور اڑیسہ کی علیحدگی کے بعد مشرقی اور مغربی بنگال جب دوبارہ متحدہ صوبہ بنائے گئے۔ تو مسلمانوں کی کل آبادی ۲۶ فیصد تھی مگر نشستوں کا تناسب صرف ۶ فیصد تھا۔ منٹو مورے اصلاحات کا تفصیلی جائزہ دیکھئے باب ۱۱

## باب ۲

# تسلیخ تقسیم بنگال

## ترکے کا مسئلہ

ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ نے مسلم لیگ کے قیام میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ڈھاکہ میں انہی کی تحریک پر اجلاس بلایا گیا اور اس سے قبل مسلم لیگ کے قیام کی تجویز پر غور کیا گیا تھا۔ نواب سلیم اللہ ہی پہلے شخص تھے جنہوں نے بنگال کی تقسیم کی تجویز پیش کی جو برطانوی حکام نے قبول کر لی تھی۔

۱۹۱۰ء میں جارج پنجم انگلستان کے تخت پر بیٹھے۔ اسی سال لارڈ مٹلے کی جگہ لارڈ ہارڈنگ ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ نئے وائسرائے نے ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دلی میں بادشاہ کی تاجپوشی کا دربار منعقد کیا اس موقع پر بہت سے اہم اعلان کئے گئے ان میں اہم ترین کلکتہ کی جگہ دلی کو دارالحکومت بنانے اور مشرقی بنگال اور آسام کے حالیہ تشکیل کردہ صوبے کو ختم کر کے بنگال کو گورنری صوبے کا درجہ دینے سے متعلق تھا۔ نواب سلیم اللہ کو ۱۹۱۱ء میں یہ فرمان شاہی سنی کر سخت صدمہ ہوا۔ انگریز نے تسلیخ تقسیم بنگال کا زخم دھونے اور اشک مٹوانے کے لئے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کا تحفہ دینے کی کوشش کی۔ دارالحکومت، کلکتہ سے دلی منتقل کرنے کا مطالبہ لارڈ ولیم بینٹن کے وقت سے

پہلو اور تھا۔ کیونکہ دلی شہر سے نزدیک تھا اور خود حکومتِ ہند کا گہرائی دار حکومت بھی تھا۔ علاوہ ازیں دلی میں میٹروپولیٹن کی مرکزی حیثیت کے باعث یہ صغیر کا انتظام و انصرام بہتر طریق پر کیا جاسکتا تھا تقسیمِ بنگال کی تیسیخ کے بارے میں انگریز حکومت نے یہ جواز پیش کیا کہ دراصل تقسیم کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا گیا بلکہ بعض تجربات کے بعد انتظامات کے سلسلے میں نیا اہتمام ضروری تھا۔

حکومت نے تقسیمِ بنگال کی تیسیخ کا جواز ضرور پیش کیا لیکن وہ بلاشبہ حقائق کے برعکس تھا تقسیمِ بنگال کے وقت سے بنگال کے ہندوؤں میں نیم فوجی تحریک شروع پر تھی اور ہندو تحریکیں کانگریس کے ایشیاد کے ساتھ ہندو فوجیوں کو مسلح کر کے مسلمانوں کے خلاف باقاعدہ تیاریاں کر رہی تھیں۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں خود شاہ انگلستان نے لارڈ ہارڈنگ کو یہ ہدایت کی کہ وہ بنگال کے دو حصوں میں منقسم سرے کو دوبارہ متحد کر دیں کیونکہ اس طرح بنگالی ہندوؤں میں بے اطمینانی ختم ہوگی اور بنگال میں تحریبی کاروائیاں ختم ہونے میں مدد ملے گی۔ لارڈ ہارڈنگ بذاتِ خود اس تجویز کے خلاف تھے اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تقسیم کو خسران کر کے جرائم اور تحریبی کاروائیوں میں کمی کی جگہ اضافہ ہو جائے گا نیز انتظام میں بھی بہت سی بدعنوانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ لیکن لارڈ ہارڈنگ بادشاہ کے فرمان کے سامنے مجبور تھے اس موقع پر نواب سلیم اللہ نے کہا کہ تقسیم بنگال کی تیسیخ، تحریبی کاروائیوں اور جرائم کی حوصلہ افزائی کا باعث بنے گی۔ حکومت کے اس اقدام سے حوام کے ذہنوں میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ حکومت کو بعض عناصر کے اوجھے ہتھیاروں کے سامنے گھٹے ٹیکنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

## ترکی اور دیگر مسائل

یہ ایک ایسا دور تھا جس نے مسلمانوں کو دیگر بہت سے مسائل سے دوچار کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کے اضطراب میں تیسیخِ تقسیمِ بنگال کے ساتھ ساتھ ان مسائل کا بھی نمایاں حصہ تھا۔ عالم اسلام پر مصائب اور مشکلات کے بار ل چھائے ہوئے تھے۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے ترکی کے شہر ابلس دتھ پیولی اپر کسی اشتعال کے بغیر حملہ کر کے مسلمانوں میں شدید بے چینی پیدا کر دی تھی اٹلی اور ترکی کے درمیان عداوت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ابلس میں اکثریت مسلمانوں کی تھی جو نسلاً عرب اور ترک تھے۔ اٹلی کے وزیر خارجہ نے دو دسمبر ۱۹۱۱ء کو اپنی پارلیمان میں اس اعلان

کے باوجود کہ اٹلی طرابلس کو ترکی کا حصہ تسلیم کرتا ہے، یہ ہمارا حائد کاروائی کی۔ دراصل اٹلی کو یہ بات بڑی طرح کھٹک رہی تھی کہ فرانس، نیپولس پر قابض کیوں ہے؟ جبکہ اٹلی، نیپولس پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ فرانس نے اپنا دامن بچانے کے لئے اٹلی کو یہ سبق پڑھایا کہ وہ طرابلس پر قبضہ کر لے۔ گراس بارے میں فرانس نے کوئی باضابطہ اجازت نہ دی تھی لیکن طرابلس پر اٹلی کے حملے کے وقت فرانس کی خاموشی اور مصر کی غیر جانبداری کا اعلان فرانس کی بددیانتی کا واضح ثبوت تھا۔ ترکوں کو مصر کے رائے طرابلس میں فروج بھیجنے سے روک دیا گیا جبکہ مصر اُس وقت تک ترکوں کا ملک تھا اور برطانیہ کو ایسے کسی اقدام کا حق نہیں پہنچتا تھا۔ غرضیکہ ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا کیونکہ سلطان ترکی عبدالحمید دوم کو عالم اسلام کا خلیفہ تسلیم کیا جاتا تھا لہذا ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطراب ایک قدر قیام کرتا تھا۔

ایک ہی سال بعد اکتوبر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی چار ریاستوں مانیٹو، نیگرو، سرویا، بلغاریہ اور یونان نے پیسے سے کئے گئے ایک خفیہ معاہدے کے تحت اس پہلے ترکی پر حملہ کر دیا کہ سلطنت عثمانیہ میں عیسائیوں پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ ترکی کے لئے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ پہلے ہی طرابلس میں اٹلی کے ساتھ بندہ آزمائش اور بیک وقت دو محاذوں پر لڑنا اُس کے لئے دشوار تھا۔ لہذا ترکی نے اٹلی کے ساتھ صلح کر لی اور طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا۔ اُدھر اٹلی نے بحیرہ ایجیئن کے جزائر سے اپنی فوج ہٹانے پر رضامندی ظاہر کر دی مگر بعد میں اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا۔ ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء کو لندن میں برطانیہ کی مداخلت پر مذکورہ بالا چاروں عیسائی ریاستوں کے ساتھ ترکی کا ایک معاہدہ طے پایا، اس طرح جنگ بند ہوئی اور بلقان پر ترکوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

اس موقع پر بڑے صغیر کے مسلمانوں نے ترکی کی مدد کے لئے ایک طبی مشن روانہ کیا۔ اس کی قیادت ڈاکٹر انصاری کر رہے تھے۔ مشن کا مقصد یہ تھا کہ زخمی ترکی سپاہیوں کی ہر ممکن مدد کی جائے۔ علاوہ ازیں سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے ایک انجمن خدام کعبہ کی بھی تشکیل کی۔

## علی گڑھ کالج اور کانپور مسجد

مسلمانوں میں اضطراب کا ایک اور سبب یہ تھا کہ حکومت نے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ

کریونپورسٹی کا درجہ دینے سے انکار کر دیا تھا شروع میں حکومت ہند نے مسلمانوں کے سامنے یہ شرط پیش کر دی کہ پہلے وہ اس مقصد کے لئے ۳۰ لاکھ روپیہ جمع کر لیں اس کے بعد حکومت ان کے مطالبے پر غور کرے گی۔ حکومت کی توقع کے خلاف مسلمانوں نے یہ شرط منظور کر لی۔ فوری طور پر محمود آباد کے راجہ علی محمد خان، آغا خان اور مولانا شوکت علی نے چندہ جمع کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ جب حکومت نے یہ دیکھا کہ مسلمان نہایت فراخ دلی کے ساتھ چندہ دے رہے ہیں اور یہ رقم جلد ہی اکٹھی ہو جائے گی تو اس نے مزید رکاوٹیں پیدا کرنا شروع کر دیں۔ حکومت نے نئی شرط یہ پیش کی کہ اس کریونپورسٹی کو خود مختار ادارے کی حیثیت حاصل نہ ہوگی، نہ ہی اس کے ساتھ علی گڑھتہ باہر کوئی تعلیمی ادارہ الحاق کر سکے گا۔ مسلمان حکومت سے اس بددیانتی کی توقع نہ کرتے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس طرح کریونپورسٹی کے قیام کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جائے گا اور اگر بیرونی تعلیمی اداروں کا الحاق نہ ہو تو کریونپورسٹی کے قیام کا فائدہ بھی لیا، چنانچہ مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وائسرائے سے ملاقات کر کے یہ معاملہ پر تبادلہ خیال کیا جائے لیکن اسی اثناء میں جنگ عالمگیر کے آغاز کی وجہ سے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا اور مسلمانوں کا اضطراب بدستور رہا۔

ابھی یہ مسائل سامنے تھے کہ کانپور کی مسجد کا تنازعہ شروع ہو گیا۔ جولائی ۱۹۱۳ء میں کانپور کے میونسپل حکام نے رٹک نکالنے کے لئے ایک مسجد کو شہید کر دیا۔ مسلمانوں کی مقامی آبادی نے اس اقدام پر بھرپور احتجاج کیا لیکن ان کی آواز کو دبانے کی پوری کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ مسجد کا جو حصہ شہید کیا گیا تھا اسے از سر نو تعمیر کیا جائے۔ صوبے کے گورنر نے بھی مسلمانوں کے خلاف فیصلہ دیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مسجد کے اُس حصے کو خود تعمیر کریں گے۔ لہذا جب مسلمانوں نے تعمیر کا کام شروع کیا تو پولیس نے ان پر گولی چلا دی۔ اس انسانیت سوز اقدام سے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے اور سینکڑوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ صورت یہ تھی کہ یہ مسجد مسجد محمدی بازار، اور ایک مندر دونوں ہی لئے۔ بی روڈ پر واقع تھی۔ رٹک کو سیدھا کرنے کے لئے اصولی طور پر مندر دو میں آتا تھا لیکن میونسپل حکام نے مسجد کو نشانہ بنایا یہ اقدام صرف اس لئے کیا گیا کہ میونسپل بورڈ میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ۱۳ نومبر ۱۹۱۳ء کو لیفٹیننٹ گورنر سر جیمز میسٹن خود کانپور آیا تھا اور اس نے مسلمانوں کے وفد کو قہقہے دلائے تھا کہ مسجد یا مندر، کسی کا کوئی حصہ گرا یا نہ جائے گا۔ لیکن بعد ازاں میونسپل

کے ہندو پیغمبروں نے گورنر کو یہ کہہ کر کہ مسجد شہید نہیں کی جائے گی، بلکہ صرف اس کا ایک برآمدہ جو بڑے کے ساتھ لگتا ہے، گرایا جائے گا۔ حالانکہ اس تجویز کی منظوری جوڑنے نہیں دی گئی تھی اس کے باوجود کانپور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ٹانکر نے اس اقدام کی منظوری دے دی۔ مسلمانوں نے جب دوبارہ گورنر سے رجوع کیا تو اس نے مسلمانوں کی درخواست ٹھکرا دی۔ ۳۱ جولائی ۱۹۱۳ء کو گورنر نے اپنا حکم کانپور آکر دوبارہ مسجد کا معائنہ کیا لیکن دوسرے ہی دن مستعفی پولیس نے مسجد کا محاصرہ کر لیا، مکمل ناکہ بندی کر دی اور مسجد کے برآمدے کو زہن بوس کر دیا۔ مسلمانوں نے اسی دن دوپہر کو حیدر گاہ میں زبردست جلسہ منعقد کیا اور حکومت کی وجہ اس نامناسب اور پست اقدام کی طرف مبذول کرائی۔ مسلمان اخباروں نے بھی شرمیلیا لکھیں حکومت نے سنی ان سنی کر دی۔ مجبور ہو کر کانپور کے مسلمانوں نے مسجد کے شہید کئے جانے والے جتنے کی دوبارہ تعمیر اور اس سلسلے میں ہر قسم کی قربانی دینے کا عزم کر لیا۔ ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو دوبارہ تعمیر کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ اپنا ٹک پولیس آئی اور مسلمانوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ اس خبر نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہرست غم و غصہ کی لہر دوڑا دی۔ گورنر نے آگہ میں تقریر کرتے ہوئے حکومت کے اقدام کو جائز قرار دیا۔ جب ۱۹ اگست کو راجہ صاحب محمود آباد کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک وفد گورنر سے ملا تو اس نے یہ پیشکش کی کہ اگر مسلمانوں کو برآمدہ ہی بنانا ہے تو مسجد کے شمالی حصے کی طرف انہیں جگہ مہیا کر دی جائے گی۔

ملک آگہ آل انڈیا مسلم لیگ نے ستمبر ۱۹۱۳ء میں مسٹر محمد علی اور سید وزیر حسن پر مشتمل ایک وفد انگلستان بھیجا تاکہ یہ وفد وہاں اپنے موقف کی وضاحت کر سکے۔ لندن میں سکریٹری آف سیٹھ برائے امور ہند اور کابینہ کے دوسرے اراکین میں کسی نے بھی وفد سے ملاقات نہ کی۔ تاہم یہ وفد وہاں کے اخبارات اور عوام کی رائے ہمارا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

علامہ ازہبی اس وفد کو ایک اور بڑی کامیابی یہ بھی حاصل ہوئی کہ واپسی سے پہلے اس نے مسٹر محمد علی جناح کو جو ان دنوں لندن میں تھے مسلم لیگ میں شمولیت پر آمادہ کر لیا۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ اور حکومت ہند کے رکن قانونی سید امام علی کانپور پہنچے۔ وائسرائے نے مسجد کی آرائش کے لئے اپنی جیب سے عطیہ دیا اور شہید ہونے والے مسلمانوں کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا۔ انہوں نے مسجد کے معاملے



میں ملوث مسلمانوں کے غلوں مقدمات واپس لینے کا فیصلہ بھی سنایا۔ مسجد کا جو حصہ شہید کیا گیا تھا، اُس کے بارے میں دائرہ اُٹنے نے یہ فیصلہ دیا کہ ہفت کی بلندی پر ایک محراب بنا دی جائے جس کے اوپر برآمدہ اُسی صورت میں ہو جس صورت میں پہلے نیچے موجود تھا تاکہ شرک نیچے سے گزر جائے اور مسجد بھی پہلی شکل میں قائم رہے۔ اس طرح مسلمانوں نے سکون کا سانس لیا اس معاملے میں محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی، منظر الحق، ظفر علی خاں اور مولانا عبدالباقی نے گراں قدر خدمات سر انجام دیں۔

## باب ۱۳

## مسلم لیگ - ایک نیا دور

جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں بیان کر چکے ہیں، ہندوستان کے مسلمان کو ناگوں مسائل میں گھرے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی نے ان میں مزید اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ عیسائی، دنیا بھر کے مسلمانوں کو کچل کر ہمیشہ کے لئے بستیوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ان دنوں مولانا ظفر علی خاں نے مدد نامہ ”زمیندار“، محمد علی نے ”کامریٹے“ اور صدر میں ”اور ابو الکلام آزاد نے ”الہلال“ میں نہایت جرأت مندانہ اور مدبرانہ ادائیگے سپرد قلم کئے۔ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی نفرت اور پزیری کا ایک قدرتی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مسلمان سیاسی جدوجہد میں ہندوؤں سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ رہنمایہ بات بھی شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے کہ صرف حقوق اور مفادات کے تحفظ کے نام پر ان کے سیاسی مقاصد کا حصول ناممکن تھا۔ وہ جس منزل کی طرف قدم بڑھا رہے تھے اس کے حصول کے لئے بڑے دشوار گزار راستوں اور رکاوٹوں سے گزرنا تھا اور اس طویل سفر کے لئے مسلمانوں کو ایک مضبوط قیادت کی ضرورت تھی۔ مسلم لیگ رہنماؤں میں یا احساس بھی نام جو چلا تھا کہ جماعت کی قیادت کے لئے نیا عون اور نیا ولولہ درکار ہوگا۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا۔ کچھ عرصہ پہلے جب مسٹر محمد علی اور سید وزیر حسن کانپور کی مسجد محل ازار کے تنازعہ کے سلسلے میں لندن گئے تھے تو وہاں انہوں نے محمد علی جنات سے درخواست کر کے انہیں مسلم لیگ کارکن بنایا تھا۔

جہاں تک مسلم لیگ میں محمد علی جناح کی باقاعدہ شمولیت کا مسالہ تھا، اسے بلاشبہ مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک اہم موڑ شمار کیا جاسکتا ہے۔ نئی قیادت بمبئی آنے کے بعد جب ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو مسلم لیگ نے محمد علی جناح کی تجویز پر ایک قرارداد منظور کی جس کا منہجہ یہ تھا کہ :

”مسلم لیگ تاج برطانیہ کے زیر سایہ آئینی وسائل کے تحت ایک ایسا طرز حکومت خود اختیاریہ حاصل کرنے کی جہد کرے۔ جو ہندوستان کے لئے مناسب ہر نیز اس مقصد کے حصول کی خاطر ہندوستانی عوام میں خدمت کا جذبہ پیدا کر کے مختلف طبقوں کے مابین تعاون پیدا کرے اور موجودہ انتظام حکومت میں اصلاح کے بعد استحکام قائم کرے۔“

مسلم لیگ کی اس قرارداد کی سب سے بڑی غوی یہ تھی کہ اس میں مسلمانوں کی ترقی کی بید گنجائش تھی۔ شاید اس وقت کانگریس کے رہنما اس قرارداد کے وسیع تر منہجہ کو نہ پاسے اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اب سیاسی مفاد کے اعتبار سے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ مسلم لیگ کی قراردادوں میں اس بات پر بالخصوص زور دیا گیا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والی تمام اقوام کی ترقی اور تباہی مستقبل کی خاطر ان میں زیادہ سے زیادہ تعاون کی کوشش کی جائے اور ماحول کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنایا جائے۔ خود ہندو رہنماؤں نے مسلم لیگ کی اس قرارداد کی کھل کر تائید کی۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس کے مخاطبوں میں اس امر کی مخالفت نہ تھی کہ کوئی شخص ایک وقت میں صرف ایک ہی جماعت کا رکن ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر محمد علی جناح دونوں پلیٹ فارموں سے بات کر رہے تھے۔

۲۰ دسمبر ۱۹۱۳ء کو آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقد کراچی میں بھی مسلم لیگ کی اس قرارداد کا خیر مقدم کیا گیا۔ اجلاس کے صدر مشر بھی ہندو تھے اس لئے کہا ”ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی ترجیحات ایک مقصد پر مرکوز کر دینا چاہئیں۔ آج ہم جس ہندوستان میں رہ رہے ہیں وہ ہندو کا ہے نہ مسلمان کا، لہذا انگریزوں کا نہ یورپین کا! آج کا ہندوستان وہ ہے جس میں ہم سب شریک ہیں۔ یہ ترجیح رکھنا ضروری ہے کہ مستقبل کا ہندوستان زیادہ غلبہ زیادہ طاقت ور اور زیادہ روشن ہوگا۔ وہ ہندوستان جو ایشیاء کے وقت میں تھا، نہ اب رہے گا۔“

مسلم لیگ نے اس چیز کو قبل از وقت محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے وہ مغربی پارلیمانی نظام جو برطانوی نوآبادیوں میں قائم تھا۔ کسی صورت بھی مناسب نہ لگتا۔ کانگریس کے مسٹر گوگلے کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان پر ہندوستانیوں کے مفادات کے مطابق حکومت بنانا چاہئے اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک ایسا طرز حکومت اختیار کرنا چاہئے۔ جو سلطنت برطانیہ کی نوآبادیوں میں خود مختار حکومتوں کی صورت میں قائم ہے۔ اس وقت برطانوی نوآبادیوں میں جو نظام حکومت تھا وہ برطانوی پارلیمانی نظام کی بنیادوں پر اور اکثریت کی حکومت کے اصول پر قائم تھا وہاں ایک مغلوط معاشرہ موجود تھا۔ چنانچہ یہ طبعی ہندوستان میں حکومت کے لئے مناسب نہ تھا۔ اسی وجہ سے مسلم لیگ ہنہامیاں محمد شفیع نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اس نوع کا طرز حکومت مسلمانوں کے لئے سیاسی اعتبار سے غیر محفوظ ہوگا۔

کانگریسی رہنماؤں میں خاصے اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ دوسری طرف مولانا محمد علی اور شوکت علی عالم اسلام کے مسائل میں بُری طرح الجھے ہوئے تھے۔ محمد علی جناح پوری توجہ کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے کلیٹ فارمز سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد کے لئے جدوجہد میں مصروف تھے۔ ۱۹۱۵ء میں کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تھا محمد علی جناح نے مسلم لیگ سے کہا کہ وہ بھی اپنا اجلاس بمبئی میں منعقد کرے۔ مگر مسلم لیگ کو نسل نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں بعض امور پر اختلاف کے باعث ایک گروہ نے یہ غلط فہمی پیدا کر دی کہ مسلم لیگ کو کانگریس میں ضم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ محمد علی جناح نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ایک بیان دیا کہ متعدد صرف دونوں جماعتوں کے درمیان اشتراک عمل ہے۔ مسلم لیگ کو کانگریس میں ضم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلم لیگ ایک علیحدہ اور آزاد سیاسی جماعت کی صورت میں کام کرتی رہے گی لیکن اس کے باوجود جب اجلاس منعقد ہوا تو کچھ لوگوں نے ہنگامہ آرائی کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے روز اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ اس کی یہی سہی کارروائی تاج محل میں ہوئی۔ اسی ہٹل میں محمد علی جناح نے ایک قرارداد کے ذریعہ یہ تجویز پیش کی کہ ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو دیگر سیاسی جماعتوں سے مشورہ کے بعد آئینی اصلاحات کے بارے میں ایک واضح عمل مرتب کرے اور اس میں مسلمانوں کی بنیادی ضروریات اور مفادات کا خاص خیال رکھا جائے۔

کانگریس نے بھی اپنی کمیٹی سے کہا کہ مسلم لیگ کمیٹی کے ساتھ ملی حکومت کا اختیاری کا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے تاکہ دونوں سیاسی جماعتیں آئینی اصلاحات کے سلسلہ میں متفقہ طور پر حکومت برطانیہ کو سکیم پیش کر سکیں۔ اس سلسلہ میں تبادلہ خیال کا آغاز اپریل ۱۹۱۶ء میں ہوا۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں دوسرا اجلاس ہوا۔ یہ کانگریس اور مسلم لیگ کی کمیٹیوں کا مشترکہ اجلاس تھا۔ اس کا اسکیم مرتب کر لی گئی۔ اس کے بعد کھنوپلی مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس منعقد ہوئے۔ مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح تھے۔ دونوں جماعتوں کی کمیٹیوں نے جو مشترکہ سکیم مرتب کی تھی اس کی توثیق دونوں جماعتوں نے کر دی جسے کانگریس اور مسلم لیگ کے مشترکہ مطالبہ کی صورت میں حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

### ریشمی رومال سازش

۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں کچھ طالب علم اور سیاسی کارکن آزادی ہند کے لیے کام کرنے کی غرض سے ہندوستان سے بھاگ گئے۔ ان میں ۵ اطلہہ شامل تھے اور تقریباً سبھی لاہور کے لوگوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ۵ فروری ۱۹۱۵ء کو یہ لوگ ترکی جانے کی غرض سے افغانستان پہنچے۔ ان کے ساتھ پشاور اور کراٹ کے کچھ سیاسی کارکن بھی شامل ہو گئے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے بھی ان گروہ کا ساتھ دیا۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں راجہ ہند پرتاپ کی قیادت میں ہندوستانیوں، جرنیلوں اور ترکوں پر مشتمل ایک وفد بھی ایران کے راستے کابل جا پہنچا، جہاں یہ سب اکٹھے ہو گئے۔ اس گروہ کا اصل مقصد افغان حکومت کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کرنا تھا تاکہ وہ ہندوستانی فوجوں کو اپنی سرحدوں پر جنگ میں مصروف کر لیں۔ کہا جاتا ہے کہ درپردہ راجہ ہند پرتاپ کا مشن یہ تھا کہ وہ نیپال کے راجہ کی مدد سے ہندوستان میں ہندو حکومت قائم کر لے۔ دریں اثناء دارالعلوم دیوبند کا ایک وفد محمد الحسن کی قیادت میں جہاز روانہ ہوا تاکہ جیسے بھی ممکن ہو ترکوں کی مدد کی جائے۔ اس وفد نے وہاں قیام کے دوران حجاز کے ترکی فوجی گورنر غالب پاشا سے جہاد کا اعلان کروایا اور ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ اپیل کی گئی کہ وہ ترکی کے لئے آدمی، رقم اور مزید جو کچھ بھی ممکن ہو، فراہم کر دیں۔ عبید اللہ سندھی نے جو کابل میں اس تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ حجاز میں منیم کردپ کے قائد دیوبند کے محمد الحسن کو ایک ریشمی رومال پر خفیہ پیغام لکھ کر بھیجا۔ اس

پنجام کے عریضے انھیں تمام سرگرمیوں سے آگاہ کیا گیا تھا۔ یہ رومال ایک شخص شیخ عبدالحی کو دیا گیا تاکہ وہ اسے ایک اور شخص عبد الرحیم کے سپرد کر دے۔ عبد الرحیم کا کام یہ تھا کہ یہ رومال اپنے کسی مستند خاص کے ذریعہ یا خود جواز باکر محمد الحسن کے سپرد کرے۔ لیکن منزل مقصود پر پہنچنے سے قبل یہ رومال کسی نہ کسی طرح حکومت کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور حکومت نے اس کا نام "ریشمی رومال سازش" رکھ دیا۔

### معادہ لکھنؤ

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے، مسلم لیگ کے اجلاس دسمبر ۱۹۱۶ء کی صدارت محمد علی جناح کو کرنا تھی۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئر مین راجسہ محمد آباد نے مسلم لیگ کے اجلاس کے انتظامات کئے۔ لکھنؤ کی قبضہ باغ بارہ درہی میں یہ اجلاس ۳۰ اور ۳۱ دسمبر کو منعقد ہوا۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے ان حالات کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا، جن کے تحت مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کرنے کے لئے مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ انہوں نے کہا:

"مسلمانوں نے عہد کو سیاسی جدوجہد کے لئے منظم کرنے کی جس ضرورت کو محسوس کیا وہ بلاشبہ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی۔ بصورت دیگر برطانیہ کے لیبرل پارٹی سے تعلق رکھنے والے سیکرٹری آف سٹیٹ نے جو تبدیلیاں تجویز کی تھیں ان کے تحت مسلمانوں کی جدوجہد حیثیت ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ جاتی۔ بلاشبہ مسلمانوں کے لئے ایسے نازک وقت میں اور کوئی راستہ نہ تھا کہ اپنی روایات کے تحت یہ بات واضح کر دیتے کہ وہ یقینی طور پر جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ وہ تعداد میں کم ہیں۔ لیکن صرف منظم سیاسی جدوجہد ہی اپنی قوت دے سکتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے سلسلہ میں جن اصولوں کو بنیاد بنایا گیا تھا ان میں بنیادی اصول یقیناً یہی تھا کہ مسلمان جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں اور ہندوستان میں خواہ کوئی بھی آئینی رد و بدل ہو۔ وہ اپنی سیاسی نشوونما کے خیال کو کسی صورت بھی دل سے نہیں نکال سکتے۔ آئل انڈیا مسلم لیگ کانگریس کے نشانہ بشاد چل کر ایسی ہر کوشش میں حصہ لینے کے لئے تیار رہے جو بحیثیت جمہوری ملک کی ترقی اور اس کے مفادات میں ہو۔"

اس موقع پر محمد علی جناح نے یہ بھی کہا کہ وہ عوامی زندگی میں چار شعبہ ایک کٹر کانگریسی تھے۔ لیکن یہ کہنا غلط تھا کہ وہ مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ انہوں نے کہا نہ سی بھی اقلیت کو اپنے سیاسی حقوق اور مفادات کے تحفظ کا مکمل حق پہنچتا ہے لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اقلیت اپنے سیاسی وجود کو قائم رکھ سکے۔

”معاہدہ کنٹنٹ“ (کنٹنٹ پیکیٹ) کے نام سے جس معاہدہ کو یاد کیا جاتا ہے وہ دراصل اسی سکیم کا دوسرا نام ہے، جو مسلم لیگ اور کانگریس کی کمیٹیوں نے مل کر مرتب کی تھی۔ اس سکیم کا مفہوم یہ تھا کہ صوبائی کونسلوں میں جداگانہ انتخابات کے ذریعہ مسلمانوں کو نمائندگی حاصل ہو اور اس کا تا سب یہ ہو:

پنجاب	_____	منتخب اراکین کونسل کی نصف تعداد
پٹی	_____	منتخب اراکین کا ۳۰ فیصد
بلکال	_____	منتخب اراکین کا ۳۰
۱۶	_____	” ” ” ” ۲۵
سکپی	_____	” ” ” ” ۱۵
دراس	_____	” ” ” ” ۱۵
مبئی	_____	منتخب اراکین کا ایک تہائی

شرط یہ تھی کہ صوبائی مجالس قانون ساز اور مرکزی مجلس قانون ساز کے انتخابات میں مسلمان اپنے مخصوص حلقوں کے ہر ایک دو سرے حلقے سے کھڑے ہوں۔ نیز اگر کوئی غیر سرکاری رکن ایسا مسودہ قانون یا مسودہ قانون کی کوئی دفعہ یا کوئی ایسی قرار داد پیش کرے جس سے کوئی ایک فرقہ متاثر ہوتا ہو، تو کسی مجلس قانون ساز (بشمول مرکزی کونسل) میں کارروائی نہ کی جائے گی بشرطیکہ متاثر ہونے والے فرقہ کی تین چوتھائی تعداد ایسے مسودہ قانون، مسودہ قانون کی کسی دفعہ یا قرار داد کی مخالفت کرے۔

معاہدہ کنٹنٹ محمد علی جناح کی زندگی کا نہ صرف ایک بہت بڑا کارنامہ تھا بلکہ اس معاہدے کی بنا پر مسلم لیگ کو آگے قدم بڑھانے کے مواقع بھی نصیب ہوئے۔ محمد علی جناح نے انتہائی پیسیدہ معاملت کو جس انداز میں سلجایا تھا اور باہم غلط فہمیوں میں مبتلا فرقوں میں جس انداز سے مفاہمت پیدا کی تھی اس کی مثال ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں کم ملتی ہے۔

کچھ لوگوں نے اس معاہدے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات ہمیشہ کے لئے کشیدہ ہو گئے، ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد پڑی۔ اور جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو وہ پنجاب اور بنگال کے بہت سے علاقوں سے محروم ہو گیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاہدے کے تحت کانگریس نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کو تسلیم کیا جبکہ وہ پہلے دن سے ہی مسلمانوں کے لئے علیحدہ نمائندگی کی مخالفت کر رہی تھی اور جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم نہ کرتی تھی۔ علاوہ ازیں مسلم اقلیت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی کا توازن قائم کیا گیا۔ یہ درست ہے کہ پنجاب اور بنگال جیسے اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو اکثریت کی بنا پر حاصل مفادات سے محروم ہونا پڑا۔ مثلاً پنجاب میں آبادی کے اعتبار سے ان کی قوت نمائندگی ۱۰ میں ۹ اور پنجاب میں تین چوتھائی بنتی تھی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مسلمانوں کی یہ جیت بہت بڑی تھی کہ انہوں نے کانگریس سے اپنی علیحدہ نمائندگی تسلیم کر لی اور اسی طرح بنیاد پر اسے جدوجہد پاکستان میں بہت سی آسائیاں میسر آئیں۔ ایک یہ بھی قابل غور ہے کہ ۱۹۰۶ء میں تقسیم بنگال کے وقت مغربی بنگال میں ہندوؤں اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہندوؤں نے تقسیم بنگال کے موقع پر جو ہنگامہ کیا اس کی بنیاد نہ صرف یہ تھی کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ صوبے کے قیام کے باعث انہیں ایک مرکز نصیب ہو گا۔ بلکہ یہ بھی کہ وہ صوبے کے کبھی ایک حصے میں مسلمانوں کی اکثریت کو برداشت نہ کر سکے۔ شاید انہی بنیادوں پر متعصب ہندو یہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمان صوبے کا قیام بجاے خود ایک مسلمان مملکت کے قیام کی تمہید بن جائے۔ مگر اس وقت پاکستان کا تصور وجود میں نہ آیا تھا، لیکن ہندو کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ وہ مسلمان کو شپٹا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر ۱۹۱۱ء میں بنگال میں مسلمان اکثریت کی بنیاد پر حق نمائندگی کا مطالبہ کیا جاتا تو ہندو بنگال یا پنجاب، کسی کے معاملے میں بھی اس پر صاف نہ کرتے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء کا یہ تاریخی معاہدہ اگر طے نہ پاتا تو مسلمانوں کو مرکز میں ایک تہائی، صوبوں میں توازن (WEIGHTAGE) پنجاب میں جداگانہ انتخاب کے ساتھ ۵۰ فیصد اور بنگال میں پانچ مسلمان (۲۳ فیصد مسلمانوں کے مقابلے میں) نشستوں کی جگہ ۲۰ فیصد مسلم نمائندگی کے وہ سیاسی مفادات حاصل ہو سکتے جو انہیں پاکستان کے معرض وجود میں آنے تک حاصل رہے۔



## پہلی جنگِ عالمگیر

۱۴ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی تھی۔ ترکی اور جرمن اتحادی تھے و ترکی نے جنگ کے چند ماہ بعد اتحاد قائم کیا، اور برطانیہ کے خلاف جنگ میں معروف تھے۔ ہندوستان انگریز کا محکمہ یعنی ترکی کا دوست تھا۔ لہذا ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطرابِ قدرتی تھا۔ انھیں لگتا تھا۔ انگلستان کے ایک اخبار لندن ٹائمز نے ایک مضمون میں ترکوں کے بارے میں نویں کینئر افغانا استعمال کئے جس کے جواب میں مولانا محمد علی نے ایک مضمون لکھا اور برطانیہ کے خلاف ترکوں کی جنگ کو سختی بجا نب قرار دیا۔ حکومتِ برطانیہ نے مولانا محمد علی کے اخبار کا نمبر پر پابندی عائد کر کے مولانا محمد علی اور مولانا شریعت علی کو عدالت میں نظر بند کر دیا۔ نظر بندی کے دوران مختلف مقامات پر لے جایا جاتا۔ ۱-۱۹۱۵ء میں جب دونوں بھائیوں نے چند وارڈز میں ایک مسجد بنوائی تو انہیں پیتول جیل میں بھیج دیا گیا۔ کچھ دیگر مسلمانوں کی گرفتاریاں بھی ہوئیں جن میں مولانا حسرت موہانی بھی شامل تھے۔

اس دوران وائسرائے ہند نے ایک بیان کے ذریعہ ترکوں کے جرموں کے ساتھ اتحادی ہونے کی مذمت کی اور کہا کہ جدہ کی بندرگاہ، عرب اور عراق کے مقدس مقامات پر بھارتی افواج کے حملوں سے محفوظ رہیں گے۔ سوائے اس صورت کے کہ ہندوستان کے حاجیوں اور زائرین کے معاملات میں مداخلت ہو نومبر ۱۹۱۴ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم نے وائسرائے کے اس بیان کی توثیق کر دی۔ بعد ازاں فرانس اور روس نے بھی یہی اعلان کیا کہ مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات کا احترام اور تحفظ کیا جائے۔ ان اعلانات کے باوجود ہندوستان کے مسلمان اس نئے مسئلے کے لئے مطمئن نہ تھے کہ انگریز حکومت کی فوج کے مسلمان سپاہیوں کو ترکوں کے مقابلے میں جنگ کے لئے بھیجا جا رہا تھا کیونکہ مسلمان اپنے عقیدے کی رو سے مسلمان کو قتل کرنا حرام سمجھتے ہیں لہذا اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ ہندوستان کا مسلمان سپاہی اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خلاف بڑا کرتا تھا۔ اس ابتداء میں برطانوی حکومت نے ٹرینچین جین سے وعدہ کیا کہ جنگ ختم ہوتے ہی عرب کو خود مختاری وے دی جائے گی اور انہیں حاکمِ عرب مقرر کر دیا جائے گا۔ شریفِ مسیحی نے ترکوں کے خلاف فسادت کر دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ محفوظ نہ رہ سکے۔ مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا

مرحوب انگریز کی چال میں اگر نہ صرف یہ کہ جنگ کے بعد بھی خود مختار نہ ہو سکیں گے بلکہ ملکی سلطنت بھی نیست و نابود ہو کر رہ جائے گی۔

دوسری طرف انگریزوں نے ہندوستان کے لوگوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے انہیں خود مختار حکومت کے سبز بانگ دکھائے اور ہندوستانیوں کو تقسیم کر کے اپنا آؤ سیدھا کرنے کا جال پھیلایا۔ برطانوی وزیر اعظم نے واضح طور پر کہا کہ ہندوستان کے مسئلہ کو ایک نئے زاویہ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ ہندوؤں کے لئے جہلا اس سے بہتر اور کیا موقع ہو سکتا تھا۔ انہوں نے جنگ کی پالیسی کے بارے میں انگریزوں کی حمایت شروع کر دی۔

اگرچہ انگریز حاکموں کے شاہد بشاد میدان جنگ میں اپنی پوری قوت کے ساتھ اتحادیوں کی فتح و نصرت کے مقصد کے لئے لڑے تو یہ جنگ ہمارے اپنے مقصد کے حصول کا سبب بھی ہو گی۔ اس کے بعد ہم انگریزوں سے بڑی آسانی کے ساتھ، مستقبل قریب میں نہیں بلکہ فوری طور پر وطنی حکومت (HOME RULE) حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

یہ اتحاد ہندوؤں کے نزدیک آزادی کے سب سے بڑے مجاہد، انگریز کے دشمن اور مسیحی رہنما گاندھی کے تھے۔ گاندھی کی اس اہم خدمت کے صلے میں انہیں قیصر ہند میں بھی عطا کیا گیا ہے انہوں نے بعد شکر یہ قبول کر لیا مگر مسلمانوں میں کوئی گاندھی نہ تھا جو حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض حکومتوں کی تباہی کے حق میں انسانیت سوز نعرے بلند کرتا۔ گاندھی نے مسلمان کے دلوں پر یہ نمک اس وقت چھڑکا جب وہ مسلمان حکومتوں کے خلاف انگریز کی چہرہ دستیوں اور مظالم پر احتجاج کر رہے تھے اور مقامات مقدسہ کے لئے تڑپ رہے تھے۔

## وطنی حکومت کا نعرہ

اسی دوران ہندوستان میں ایک نئی تنظیم جوم رول لیگ کے نام سے وجود میں آئی جس کے رہنما اپنی بینیت اور ملک تھے۔ اس تنظیم کے نعروں میں تشدد اور تلخی کا انداز نمایاں تھا۔ تنظیم وطنی حکومت کا قیام اپنا حق سمجھتی تھی۔ جب مظاہرے زور پکڑ گئے تو اگست ۱۹۱۷ء میں برطانوی مایہ ناز عوام نے ہندوستان کے لئے قومی طور پر آئینی پیش قدمی کا اعلان کر دیا۔

مدارس حکومت نے مندرجہ ذیل بینیت اور ان کے ساتھیوں کو نظر بند کر دیا۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے بھی وطنی حکومت کے بارے میں اقدام کیا اور جوم رول لیگ کے اراکین کی

درخواست پر لیگ کے اجلاس کی صدارت قبول کر لی۔ انگریز کو یہ بات ناگوار گزری اور جلی کو نسل کے سلسلے میں محمد علی جناح اور لارڈ ونگٹن کے درمیان اتنے شدید اختلافات پیدا ہو گئے کہ محمد علی جناح نے برطانیہ سے نفرت لگایا۔

’میں دیکھ لوں گا کہ بمبئی کے لوگ لارڈ ونگٹن کو الوداعی دعوت کیسے دیتے ہیں‘ بمبئی کا جناح ہال اسی جرات کی یادگار بن گیا۔ ہندوؤں بعد مسلم لیگ اور کانگریس کا خستہ کار اجلاس ہوا۔ اجلاس نے کچھ قراردادیں منظور کیں اور مشترکہ بیان جاری کیا۔ بیان میں وائسرائے ہند اور بعض صوبوں کے گورنروں کی اس پالیسی کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا کہ وہ جان بوجھ کر ان اصولوں کو غلط رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں جو ایک یادداشت کے ذریعہ امپیریل ایجیلیٹیو اسمبلی کے ۱۹۱۱ء کیسی نے دلائل کی تھی۔

### جناح کا مطالبہ، پالیسی کا اعلان

۲۰ اگست، ۱۹۱۶ء کو مسٹر مونٹگیو نے وزیر امور ہند مقرر ہونے کے بعد ایک بیان دیا کہ برطانوی حکومت، حکومت ہند کی اس پالیسی سے متفق ہے کہ ہندوستانیوں کو ہر شعبے میں شریک کیا جائے اور حکومت خود اختیاری میں تدریج اضافہ کیا جائے۔ برطانوی حکومت کے جیٹلینٹنگ کی حیثیت سے ہندوستان میں رفتہ رفتہ ایک ذمہ دار حکومت قائم ہو۔ ان معاملات پر وائسرائے ہند سے گفتگو کی جائے اور اس کے مشورے سے صوبائی حکومتوں کی آراء پر غور و خوض کیا جائے۔ علاوہ ازیں دیگر تجاویز پر بحث و تجویس کے بعد مناسب وقت پر ان تجاویز کو پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جائے۔

مسٹر مونٹگیو نے اس پالیسی کا اعلان محمد علی جناح کے مطالبہ پر کیا۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں وہ ہندوستان آئے۔ ان کے ہمراہ پانچ افراد تھے۔ اس مشن نے مختلف صوبوں کا دورہ کر کے ہر طبقہ و خیال کے لوگوں سے تبادلی خیال کیا۔ اس موقع پر مولانا محمد علی نے، جو نظر بند تھے مشن سے ملنے کی اجازت طلب کی لیکن اجازت نہ دی گئی۔ چنانچہ علی گڑھ کالج کے اعوانی سیکرٹری نواب محمد اسحق کی قیادت میں ایک وفد مونٹگیو سے ملنے دلی پہنچا۔ وفد کو اس شرط پر ملاقات کی اجازت دی گئی کہ وہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے بارے میں کوئی بات نہ کرے۔ لیکن مسلمان وفد اپنی مدافعتی غیرت کا ثبوت دیتے ہوئے واضح طور پر بتا دیا کہ وفد، مسلمانوں کے نمائندے کے طور پر

کہا ہے کہ ذاتی حیثیت میں، لہذا وہ اپنے خطاب میں کسی ترمیم کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ یہ بات حکومت کے لئے قابل قبول نہ تھی۔ لہذا وفد واپس چلا آیا۔ دیگر جہد اور مسلمان رہنماؤں کی ملاقات موٹیکو مشن سے ہوئی۔

موٹیکو کے مذکورہ بالا اعلان میں یہ بات واضح نہیں تھی کہ ہندوستان کو کیا دیا جائے گا؟ لیکن اس ابہام کے باوجود ہندوستان اور انگلستان کے بیسائی اس سیکیم کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ جون ۱۹۱۸ء میں موٹیکو کمپن فورڈ رپورٹ شائع کر دی گئی دیکھئے باب ۱، لیکن یہ رپورٹ کانگریس اور مسلم لیگ کی بعض تجاویز سے متصادم تھی۔ کانگریس نے اصلاحات میں بعض ترمیم کے ساتھ قبولیت کی قرارداد منظور کر لی۔ تاہم انہیں مایوس کن بھی کہا۔ مسلم لیگ نے اپنی قرارداد میں صرف اتنا کہا کہ بعض ترمیم کے ساتھ یہ اصلاحات منظور کر لی جائیں۔ محمد علی جناح نے ایک بیان جاری کیا جس میں اعلان کے اس حصہ سے اختلاف کیا گیا تھا کہ ترقی کے ساتھ ساتھ صوبوں میں دوسرا حکومت قائم کی جائے گی۔ محمد علی جناح کا کہنا یہ تھا کہ خود مختار حکومتیں صوبوں اور مرکز میں بیک وقت ترقی کے راستے پر کاغذ ہوں۔ نیز قانون کا ہر مسودہ تاجیکی اور پارلیمانی ضوابط کی مطابقت سے منظور کیا جائے صرف اس عامہ، انتظام و انصرام اور تحفظ سے متعلق قوانین کے لئے مگر ریزرو لیا کونسل کے سرٹیفکیٹ سے کام لیا جائے۔

## رویلٹ ایکٹ

۱۹۱۷ء کے آخر میں حکومت ہندوستان نے ایک کیٹی قائم کی جس کے سربراہ مسٹر جٹس ایس۔ اے۔ رویلٹ تھے۔ کیٹی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ وہ ملک کے اندر موجود سازشوں اور ان کی نوعیت کے بارے میں تحقیقات کرنے کے بعد ایسی تدابیر کی سفارش کرے جن کے ذریعہ حالات پر قابو پایا جاسکے اور ان سازشوں کی روک تھام کی جاسکے۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں اس کیٹی نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی۔ اسی رپورٹ کی بنیاد پر حکومت ہند نے فروری ۱۹۱۹ء میں دو مسودات قانون مرکزی اسمبلی میں پیش کر دیئے۔ ان میں ایک انڈین کریمنل لا (امینڈمنٹ)

بل (۱) INDIAN CRIMINAL LAW (AMMENDMENT) BILL 1

اور دوسرا دی کریمنل لا (ایمرجنسی پاورز، بل (۲) CRIMINAL LAW (EMERGENCY)

POWERS) BILL II تھا۔ مرکزی اسمبلی نے مارچ ۱۹۱۹ء میں ان کی منظوری دے دی۔

یہی عدلیٹ ایکٹ ہے جس کے تحت انفرادی ذراہوں اور سیاسی سرگرمیوں پر متحدہ پارٹیاں  
ماندہ کر دی گئیں۔ حالانکہ جنگ کے بعد (۱۹۰۶ء) میں ختم ہو چکی تھی، ایسے ظالمانہ قوانین کی کوئی  
محدود نہ تھی اسمبلی میں پیش ہونے سے پہلے بھی مختلف سیاسی جماعتوں نے اس کی شدید مخالفت  
کی تھی۔ چنانچہ اس ایکٹ کی منظوری کے بعد ہندوستانیوں کے شہرت میں اضافہ ہو گیا اور یہ خیال  
پیدا ہوا کہ حکومت "شعبہ" کا نامزدہ اٹھا کر ہندوستانیوں کو ان کے بعض رہنماؤں سے محروم  
کرنا چاہتی ہے کیونکہ ایکٹ میں یہ بات بھی موجود تھی کہ حکومت "تقدمہ چلائے بغیر" سیاسی مشتبہ  
لوگوں کو سزا دے سکتی ہے۔

محمد علی جناح نے اسمبلی میں بھی اس مسودہ قانون کی شدید مخالفت کی اور واضح طور پر کہا  
کہ کسی مذہب حکومت میں ایسے جاہلہ قوانین کی توثیق نہیں کی جاسکتی۔ ایکٹ کی منظوری کے  
بعد انہوں نے وائسرائے کے نام ایک خط لکھا اور احتجاج کے طور پر امپیریل میجسٹریٹس کونسل کی  
رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔

گاندھی نے ایکٹ کی منظوری سے قبل ہی شدید مخالفت کا آغاز کیا اور اس کے خلاف ہتھیار  
کھینے کی دھمکی بھی دی۔

## ستیاگرہ تحریک

گاندھی نے ایک حلف نامہ تیار کیا:  
"ستیاگرہ ہی یہ حلف اٹھاتا ہے کہ اگر رویت ایکٹ منظور کر لیا گیا اور اسے  
قانون کی صورت دے دی گئی تو وہ ان قوانین کی پابندی نہیں کرے گا تا وقتیکہ  
یہ قوانین واپس نہ لے لئے جائیں۔"

گاندھی نے اس حلف نامے پر دستخط کرانے کی مہم شروع کر دی۔ لیکن اس مہم کا حکومت  
پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لہذا گاندھی نے ایکٹ منظور ہوتے ہی آئندہ اتوار کا دن مقرر کیا۔ لوگوں سے  
اس جاہلہ قانون کے خاتمہ کے لئے دھماکی اپیل کی اور ہدایت کی کہ اتوار (۲۰ مارچ) کو عام  
ہڑتال کی جائے اور روزہ رکھا جائے۔ بعد ازاں احتجاج کے لئے ۶۔ اپریل مقرر کی گئی لیکن  
۲۰ مارچ کو بھی لوگوں نے دلی میں جلوس نکالا جس پر پولیس نے فائرنگ کر دی۔ ۶۔ اپریل کو  
دوبارہ ہڑتال ہوئی۔ جلے منعقد کئے گئے اور جلوس نکائے گئے۔ گاندھی، بمبئی میں کامیابی کے بعد

پنجاب آنے کے لئے جب دلی پہنچے تو انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ پنجاب میں داخل نہ ہوں۔ جب گاندھی نے حکم ماننے سے انکار کر دیا تو انہیں گرفتار کر کے دوبارہ بمبئی بھیج دیا گیا۔ ۱۱ اپریل ۱۹۴۸ کو امرتسر میں جلسہ منعقد ہوا تھا مگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جلسے کے ہتھم ڈاکٹر کپلہار ڈاکٹر تیبہ پال کو ملاقات کے بہانے بلایا اور خاموشی کے ساتھ گرفتار کر کے کسی نامعلوم جگہ بھیج دیا۔ گاندھی کی گرفتاری اور پنجاب میں داخلے پر پابندی اور اس کے بعد امرتسر میں دو روزہ ہٹوں سے یہ سلوک ہندوستانیوں کیلئے اشتعال کا باعث بنا۔ لوگوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ امرتسر کے بیٹے کا رنج کیا جسے فوج نے روکنے کی کوشش کی لیکن عوام نے فوج پر زبردست تنگ باری کی جس کے جواب میں گولی چلا دی گئی۔ ہندوستانیوں نے غصے میں آکر پانچ انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جس کے بعد امرتسر فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن حکومت، بمبئی، احمد آباد، دہلی اور لاہور میں ہٹاٹے شروع ہو گئے جہاں بہت سی عمارات کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

### جلینوالہ باغ کا حادثہ

یہ ہتھمہ دن بدون نازل صورت اختیار کرتا گیا۔ شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جہاں عوام اور پولیس کے درمیان تصادم نہ ہو اور۔ پولیس کے لئے لاکھوں چارج یا ایک آؤ گیس تو کیا فائرنگ بھی ایک معمول بن چکی تھی۔ اور عوام ہیکاری عمارت کو روزانہ نذرِ آتش کر رہے تھے۔ ۱۱ اپریل ۱۹۴۸ء، یعنی ہنگامہ کے آغاز کے دن سے پورے ہندوستان میں یہ آگ پھیلی جا رہی تھی۔ ۱۲ اپریل کو فوجی کمانڈر جنرل ڈائر نے امرتسر کا کنٹرول سنبھال لیا۔ فوجیوں میں گشت کر رہی تھی اور عام جیلے منعقد کرنے کی فائنت کر دی گئی تھی، اس کے باوجود ۱۳ اپریل کو جلینوالہ باغ امرتسر میں ایک جلسہ عام کا اہتمام کیا گیا۔ یہ باغ چار دیواری کے اندر تھا اور داخلہ یا باہر نکلنے کے لئے چند چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔ جب امرتسر کے عوام اس باغ میں پُر امن طریق پر جمع ہو گئے تو جنرل ڈائر نے فوج اور مشین گنوں کے ساتھ باغ کا رخ کیا۔ اس نے عوام کو اتہاہ اور منتشر ہونے کا موقع فراہم کئے بغیر فائرنگ شروع کر دی۔ لوگ راستوں کی کمی کی وجہ سے اپنی جان بھی نہ بچا سکے۔ ڈائر کے اس دہشیانہ اقدام کے باعث نیتھے مرد، عورتیں اور بچے گولیوں کی بوچھاڑ کی زد میں ہو کر دھڑ دھڑ مرنے لگے۔ درندہ صفت جنرل ڈائر نے فائرنگ اس وقت بند کی جب گولیاں ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد وہ فوج کو واپس لے گیا۔ باغ کے اندر لاشوں کے پٹے

لے ہوئے تھے۔ لاتعداد زخمی مائشوں کے تلے دبے گراہ رہتے تھے۔ ان زخمیوں کو ہسپتال پہنچا کر طبی امداد فراہم کرنے کا بھی کوئی انتظام نہ کیا گیا کیونکہ جرنل آئر نے صاف کہہ دیا تھا کہ یہ سس کے مراضی میں شامل نہیں۔ اس کا فرض صرف اتنا تھا کہ وہ لوگوں کو ایسا سبق دے جس سے جتنا زندگی فراموش نہ کر سکیں۔

## مارشل لاء کا نفاذ

اس کے فوراً بعد یونیٹنٹ گورنر سر مائیکل اور ڈوآئر نے صوبے میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس دوران تعلیم یافتہ اور معزز شہریوں پر جو مظالم ڈھانے لگے وہ تاریخ میں انگریزوں کے دہان پر ایک بدنامہ واقعہ کی صورت میں ہمیشہ موجود رہیں گے۔ ریل گاڑیوں میں سفر کرنے کی اجازت صرف ان لوگوں کو تھی جن کو پاس جاری کئے گئے تھے۔ فوج نے عورتوں کی بے عزتی کی۔ امرت سر کے ایک بازار میں لوگوں کو پیٹ کے بل ریگھنے پر مجبور کیا گیا۔ اگر کوئی شخص سانس لینے کی خاطر رکنے کی کوشش کرتا تو اس کی پشت پر رائفلوں کے دتے مارے جاتے۔ معزز شہریوں کے مکانات پر مارشل لاء کے حکام کی طرف سے پوشہ چسپاں کر دینے جاتے اور حکم دیا جاتا کہ اگر یہ پوشہ کسی نے مٹائے کئے تو ملک مکان کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ میاں فضل حسین، پیر نازع الدین اور خلیفہ شجاع الدین جیسے معزز شہریوں اور ممتاز رہنماؤں کو ان پوشوں کی مخالفت کے لئے رات رات بھر اپنے گھروں کے باہر کھڑے دھنا پڑتا۔ لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ کوہ جہاں بھی کسی انگریز کو دیکھیں فوراً سلام کریں۔ اگر سواری پر ہوں تو اتار کر آگاہ بجا لائیں۔ ایک تائیک اور ۲۵ فٹ اور ۱۲ فٹ طویل دوربین کرے میں ۲۵ آدمیوں کو ایک ہفتہ تک محبوس رکھا گیا۔ جو لوگ فوجی عدالتوں کے سامنے پیش ہوتے انہیں وکیل صفائی کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ شاید ہی سزائے موت اور عرقید سے کم کوئی سزا دی گئی ہو۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان بھر میں ہندو مسلم کی جے کے نعرے لگ رہے تھے۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ہی برتن میں کھانسی کو ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ لگایا۔ جب لاہور میں ان واقعات کی اطلاع ملی تو یہاں بھی ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی۔ انارکلی سے ایک میس بائی کورٹ کی طرف بڑھا، پولیس اور فوج نے اسے ۱۵ منٹ کے اندر منتشر ہونے کا حکم دیا، اسی کے بعد گولی چلا دی۔ کچھ دیر بعد بہت سے طالب علم جن میں راجہ

غضنفر علی خاں بھی شامل تھے۔ ماں روڈ پر پہنچ گئے۔ پولیس نے ان پر بھی لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ یہ مجمع منتشر ہونے کے بعد دوبارہ لوہاری دروازے میں جمع ہو گیا، پولیس نے اس پر پھر گولی چلائی۔ اگلے دن ناز جیو کے موقع پر شاہی مسجد لوگوں سے اٹی پڑی تھی، ہندو بھی کئی تعداد میں موجود تھے۔ کچھ ہندو رہنماؤں نے نماز کے بعد لوگوں سے خطاب کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شام کو گورنمنٹ ہاؤس میں افسروں کے اجلاس میں پولیس کی یہ رپورٹ پہنچی کہ لوگوں نے ڈنڈا فوج قائم کر لی ہے اور عجم کی نماز کے موقع پر سب لوگوں کے پاس ڈنڈے موجود تھے۔ گورنمنٹ سہتہ کے دن لوگوں کو ہراساں کرنے کے لئے مسلح فوج سے شہر کی سڑکوں پر ریڈ کرائی اور دو فوجی چکیاں قائم کر دیں۔ لوگ پھر اکٹھے ہو گئے اور شاہی مسجد کے قریب ایک بار پھر گولی چلا دی گئی۔ اپریل اور مئی تک مارشل لاء کے تحت مقدمات چلتے رہے۔

ہندوستانیوں کے خون سے بولی کیلئے کے بعد حاکموں نے لاڈلہنٹر کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کر دیا۔ اس کمیشن میں پنڈت جگت نرائن، سرچن لال اور صاحبزادہ سلطان احمد شامل تھے۔ جنرل ڈائر سے کمان واپس لے کر انگلستان بھیج دیا گیا۔ اس موقع پر ہندوستان میں مقیم بہت سے انگریزوں نے چندہ جمن کے جنرل ڈائر کو بطور نذرانہ پیش کیا جو اس کی "اعلیٰ خدمات" کا صلہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد گورنر ٹائیکل کو اس کے عہدے سے ریٹائر کر دیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مرکزی حکومت کی پیشگی منظوری اور ایک خاص ضابطہ کے بغیر مارشل لاء نافذ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ڈائر نے اپنے اختیارات سے تحفظ کرتے ہوئے یہ اقدام کیا۔ کمیشن کے سامنے شہادتوں کے دوران یہ بات بھی کہل کر اتر سہ میں ۲۴ گھنٹے تک پانی اور بجلی کی سپلائی بند رکھی گئی۔ اس موقع پر ایک ہندو نرس راج جو ٹیکٹ کلکٹر ہرچکھا تھا، انگریزوں کے ساتھ مل کر غداری کرتا رہا اور دوسری طرف ہندوستانیوں کے ساتھ وفاداری کا مظاہرہ بھی کرتا رہا۔ اس شخص نے امرت سر میں ۳ سبکوں کو لوٹا اور وہاں کے انجیئرز ملازمین کو قتل کیا تھا۔ ۱۲۔ اپریل کو اس نے روڈ ایکٹ کے خلاف مظاہرہ کی سکیم بنانے کے لئے ایک سکول میں جلسہ منعقد کیا اور اس کی صدارت بھی کی۔ اسی نے یہ اعلان کیا کہ وہ جلیا نوالہ بانہ میں ڈاکٹر کچلہ اور ڈاکٹر ستیہ پال کے پیغامات سنائے گا۔ یہی شخص ۱۲۔ اپریل کو جلیا نوالہ بانہ کے جلسہ کا منتظم بھی تھا۔



یہی اس کے باوجود اس کی گرفتاری عمل میں نہ آئی۔ اسے کمیشن کے سامنے سلفانی کوہ بنا کر پیش کیا گیا اور اس نے ایک انگریز خاتون مرس شروڈ پر حملہ کرنے والوں کی شناخت بھی کی لیکن مارشل لا، ٹریبونل نے اسے رہا کر دیا۔

تحریکِ خلافت و عدم تعاون

تبرک ۱۳۴۰ء تک بہت سے علاقوں سے محروم ہو چکے تھے۔ ترکی کی پہلی جنگ عالمگیر میں شرکت اور اُس کے بعد بہت سے علاقوں سے محرومی نے ہندوستان کے مسلمانوں کو متفکر کر دیا تھا۔ مسلمان یوں بھی زیادہ فکر مند تھے کہ ترکی، دنیا بھر میں مسلمانوں کی تنہا آواز حکومت تھی اور شکست کی صورت میں مسلمانوں کا یہ مرکز بھی ختم ہو جاتا۔ وہی بات ہوئی جس کا اندیشہ تھا۔ جرمنی کو شکست ہوئی، ترکی اس کا حلیف تھا لہذا شکست کے اثرات قدرتی طور پر ترکی پر بھی مرتب ہوئے۔ صلح کے ایک ہیٹھامی معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے ذریعے ترکی کے لئے یہ شرائط تھیں کہ وہ اپنی تمام فوج ختم کر دے گا، اس کے جنگی جہاز ضبط کر لئے جائیں گے، ایشیائے کوچک اور عرب میں سرحدات کے علاوہ ملک کا اندرونی انتظام ترکی کے پاس رہے گا اور ریلوے کی نگرانی اور استعمال کے مستحق اتحادی ہوں گے۔

یہی وہ حالات تھے جن کی وجہ سے مسلمان بے حد پریشان نظر آتے تھے۔ مسلمانوں کو اس بات کا بھی بے حد رنج تھا کہ جنگ میں انہوں نے مسلمان بھائیوں کے خلاف ہاتھ اٹھایا۔ لیکن اس کے باوجود انگریز کے رویے میں معمولی سا فرق بھی نہ آیا تھا۔ جس وقت صلح کا ہنگامی معاہدہ ہوا، محمد علی اور شوکت علی بدستور نظر بند تھے۔ قسطنطنیہ اور موصل پر انگریزوں کی جارحیت نے ہندوستان کے مسلمانوں کے زنجیوں پر مزید نمک پاشی کی۔ مدراس، ککینو اور دہلی کے علاوہ ہندوستان کے اور بہت سے مقامات پر احتجاجی جلسے منعقد ہوئے۔ اسی دوران بھٹی کے کچھ

حتمل لوگوں نے مجلس خلافت کے نام سے ایک انجمن قائم کر دی۔ اس انجمن کو گھنوں کی مسلم کانفرنس میں آل انڈیا سنٹرل خلافت کمیٹی کا نام دے دیا گیا۔ مسلم کانفرنس نے اس کمیٹی کا مرکز بنی بنایا۔ کمیٹی کے صدر سیٹھ چوڑانی اور سیکرٹری حامی احمد صدیقی مقرر ہوئے۔

خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت فضل الحق نے کی۔ اس کانفرنس میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مہوی اور گاندھی بھی شریک ہوئے۔ کانفرنس میں کچھ قراردادیں منظور کی گئیں اور مسلمانوں کے مفادات متفقہ پر اتحادی فوجوں کے انسانیت سوز اقدامات کی شدید مذمت کی گئی۔ صلح کا جو جنس منایا جا رہا تھا مسلمانوں کو اس میں شرکت سے باز رہنے کی ہدایت تھی۔ قراردادیں کیا گیا کہ اگر صلح کانفرنس کا فیصلہ مسلمانوں کی مرضی کے برعکس ہو تو بغیر کلی بال کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے گا۔ لیکن گاندھی نے اس قرارداد کی مخالفت اس بنیاد پر کی کہ ولایتی مال کا بائیکاٹ اس مسئلے کا مناسب حل نہیں۔ مولانا حسرت موہانی کو اس پر اصرار تھا۔ بہر حال دوسرے دن یہ قرارداد منظور کر لی گئی۔

کانفرنس کا ایک خاص اجلاس بھی منعقد ہوا جس کی صدارت گاندھی نے کی۔ اس اجلاس کے لئے آصف علی کی طرف سے جاری کردہ دعوت نامے میں گورکھپار غور کرنے کے مسئلہ کا پیوند بھی ٹھکانا گیا۔ لیکن گاندھی اس مسئلہ کی نزاکت کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ہندو ایک مذہبی معاملہ ہیں اپنی حدود دیاں پیش کر کے کسی سوا بازی حکومت کی بات نہیں سمجھتے۔ اگر اس کانفرنس میں کچھ ہندو ایسے خیالات سے کمر لے رہے ہوں تو چاہئے کہ انہیں دل سے نکالی دیں۔ لیکن اس کے بعد جب بھی صلح کانفرنس ہوئی تو ہندوؤں نے ترکیب کاؤ گشی کا مطالبہ ضرور کیا۔

دیہاتیوں دن بعد مسلمان علماء کا ایک اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس میں جمعیت العلماء ہند کا قیام عمل میں لایا گیا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس امرتسر میں ہوئے۔ دوسرے دن خلافت کانفرنس کا دوسرا اجلاس اور تیسرے دن جمعیت العلماء کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ اسی دوران مونٹگو چیمفورڈ اصلاحات منظور ہوئیں۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی رہا کر دیئے گئے۔ وہ جیل سے نکلتے ہی امرتسر پہنچے اور تمام رہنماؤں سے خلافت کے مسئلے پر بات چیت شروع کر دی۔ خلافت کانفرنس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ خلافت اور جزائر عرب کے بارے میں مسلمانوں کے مطالبات پیش کر دینے کے لئے مولانا محمد علی کی قیادت

میں ایک وفد انگلستان جائے، نیز خلافتِ فتنہ کے لئے ۱۰ لاکھ روپیہ جمع کیا جائے۔ اس وفد کے انگلستان جانے سے پہلے مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک مشترکہ وفد ۱۹۲۰ء جنوری ۱۱ کو انسٹرائے ہند سے ملے۔ وفد نے وائسرائے کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ ترکی کی سالمیت اور خلیفہ کی معیشت کو ہر حال میں قائم رکھا جائے۔ اگر حکومت برطانیہ نے ترکی کے بارے میں اپنے تمام وعدے پورے نہ کئے تو برطانیہ کا اخلاقی وقار بُری طرح بھجگا۔

وائسرائے نے وفد کو مایوسیوں کے سوا کچھ نہ دیا۔ اس کا ایک بیان میں مسلمانوں نے واضح طور پر بتا دیا کہ اگر صلح کے معاہدے کی شرائط، مسلمانوں کے مذہبی جذبات کے برعکس ہوں تو مسلمان حکومت برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداریاں زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکیں گے۔ بیان میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ بہر حال سلطانِ ترکی کے اختیار اور انتظام میں رہنے چاہئیں۔

فروری ۱۹۲۰ء میں خلافتِ فتنہ کا تیسرا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس میں انگلستان بھیجے جانے والے وفد کا معاملہ بھی طے ہونا تھا۔ چنانچہ اجلاس نے ایک نہایت اہم قرار داد منظور کی اور حکومت برطانیہ کو انتباہ کیا کہ مسلمانوں کا جو وفد مطالبات سے کرا انگلستان جا رہا ہے اگر ان میں کوئی کمی کی گئی تو مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو سخت ٹھیس پہنچے گی، ان مطالبات میں صرف ہندوستان کے مسلمان بلکہ ہندو بھی برابر کے شریک ہیں اور اگر کوئی غلط فیصلہ کیا گیا تو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

مطالبہ یہ تھا کہ برطانوی اور اتحادی، جنگ کے وقت کئے گئے تمام وعدوں کو حوت پختہ پورا کریں۔

## وزیرِ اعظم سے ملاقات

خلافتِ وفد مارچ ۱۹۲۰ء میں انگلستان روانہ ہو گیا۔ وفد میں مولانا محمد علی، حسن محمد حیات، مولانا سید سلیمان ندوی، مولوی ابوالقاسم، محمد شعیب قریشی، عبدالرحمان صدیقی اور شیر حسین قندلانی شامل تھے۔ مولانا محمد علی قائد اور حسن محمد حیات وفد کے سیکرٹری تھے۔ وزیرِ ہند کے نمائندہ فوٹسٹر کے بعد وفد کی ملاقات برطانیہ کے وزیرِ اعظم لارڈ ہارچی سے ہوئی مولانا محمد علی نے

وزیر اعظم کو ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا لیکن فائدہ جارج نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ یہ جواب دیا کہ جن اصولوں پر عیسائی حاکم کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہے۔ انہی اصولوں کی بنیاد پر ترکوں کے ساتھ معاملہ طے پائے گا۔ جو علاقے ترک نہیں ہیں ان پر قبضہ پرستور ہے گا تاہم ترکوں کو اپنی سرزمین پر دنیاوی اختیارات کے استعمال کی اجازت ہوگی۔

دوسرے الفاظ میں وزیر اعظم برطانیہ لائٹڈ جارج نے ہندوستان کے مسلمانوں کو کورا جواب دے دیا تھا۔ اس طرح برطانیہ نے اپنے تمام گزشتہ اعلانات اور معاہدوں کو فراموش کر کے اپنی قدیم روایات و قانوں رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمان انگریزوں سے سزا و نعرت کرنے لگے۔ خلافت بیٹی نے فیصلہ کیا کہ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو انگریز کی اس بھاری کھجاک کے طے پر یوم ماتم منایا جائے۔ اس روز تمام ہسپتال بند، دکانیں لی جائیں اور مسلمان روزے رکھیں۔

## کشاکش کا آغاز

۱۹ مارچ کو مولانا شوکت علی نے ایک قرارداد تیار کی جس میں کہا گیا تھا کہ اگر ضلع کی شرائط مسلمانوں کی توکات پر پوری نہ اتریں تو مسلمان تاج برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری ختم کر دیں گے۔ اس قرارداد سے جواب میں حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ ۱۹ مارچ کو 'ہندو مسلم' کی تقریبات نہیں ہونی ضروری بلکہ مسلم شریعت نہیں کر سکتا۔ اگر ترک کی خلافت کا فرض میں کئے گئے۔ اس وعدے کی روشنی میں کہ اگر خلافت کے سلسلے میں ہندو مسلم مشترکہ تحریک چلانے کا وقت آیا تو تحریک کی قیادت کا ذمہ سہی کریں گے، وقت آگیا، گاندھی نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اعلان کیا کہ اگر ترک کی کو ضلع کی ایسی شرائط پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جائے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کے برعکس ہوں تو عدم تعاون کی تحریک شروع کی جائے گی۔ اگلے دن انہوں نے عدم تعاون کے بارے میں بتایا کہ یہ فیصلہ باقی ہے کہ اگر مسلمانوں کے مطالبات پورے نہ ہوئے تو عدم تعاون کے لئے کیا انداز اختیار کیا جائے، جنگ کھلی ہو یا چھپی ہوئی، بہر حال انسانی تعاون کے تحت عدم تعاون کے لئے عدم تشدد کا انداز اختیار کیا جائے۔ جب کسی کے مذہبی جذبات سے کھینچنے کی کوشش کی جائے تو عدم تعاون فرض ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ انگلستان تو ہندوستانیوں کے حقوق کو پامال کرتا رہے اور ہندوستانی عوام مجبور و انکسار کے ساتھ اس پامانی پر تسلیم خم کرتے رہیں۔ جو چیز مسلمانوں کے لئے زندگی اور موت کا معاملہ ہے اسے کسی صورت بھی اور کوئی بھی قبول کرنے

پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔

گاندھی نے سرکاری ملازموں سے اپیل کی کہ وہ خواہ کسی بھی ٹنڈے پر ہوں، انہیں ملازمت ترک کر دینا چاہئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ رضا کارانہ طور پر یہ اقدام کریں تاہم فوج کو فی الحال اس اقدام کا مشورہ نہیں دیا جاتا۔ لیکن ہے وہ وقت بھی آجائے لیکن ابھی اس کا انتظار کرنا ضروری ہے۔

خلافت و فدکی و ایسی سے پہلے ہی اتحادیوں کے نمائندوں کا ایک اجلاس پیرس میں ہوا جس نے ترکی کے لئے معاہدے کی شرائط مرتب کیں۔ شرائط کے مطابق سلطان ترکی کو اتحادیوں کی حمایت کے ساتھ قسطنطنیہ پر حکومت کرنا تھی۔ اتحادیوں کو ایشیائی ترکی کے کسی حصے اور آبنائے پر قبضہ کا اختیار تھا۔ چھ ریاستوں پر مشتمل ایک نئی ریاست آرمینیا کے قیام کی تجویز تھی۔ حدود کا تعین امریکہ کی مدد سے کیا جانا تھا۔ عرب کے بارے میں ترکی کو اپنے تمام عوامی سے دست بردار ہونا اور شام، عراق و اردن کی حکم برداری علی الترتیب فرانس اور برطانیہ کو دی جانا تھی۔ عدلیہ اٹلی کے سپرد اور سمیرنا اور مغربی اناطولیہ یونان کے سپرد کیا جانا تھا۔

پیشہ اٹل انگریز کے انتظام اور اس کی روایتی پستی کی غمازی کر رہی تھیں۔ ان شرائط پر دنیا بھر کے مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا۔ سچی کہ سلطان ترکی نے بھی ایسی مسلسل دباؤ سے مجبور ہو کر آخر کار ترکی نے بھی ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو اس معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ ۱۴ مئی ۱۹۲۰ء کو اس معاہدے کی اشاعت ہندوستان میں ہو چکی تھی۔ جب اس پر دستخط ہوئے تو ہندوستان کے عوام میں شدید اضطراب پھیل گیا۔ ۲۔ جون کو لاہور میں ہندو آل پارٹیز کانفرنس نے بھی باضابطہ طور پر عدم تعاون کی تجویز منظور کر لی۔ گاندھی، سینٹ الیدی، کچلو، حاجی محمد صدیق کھتری، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ابوالکلام آزاد اس کمیٹی کے رکن تھے۔

یہ فیصلہ تو کیا ہی ہاچکا تھا کہ حکومت سے تعاون ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ خلافت کمیٹی نے یکم اگست ۱۹۲۰ء کو ملک بھر میں مال کساد کی گاندھی نے قیادت سنبھالی اور حکومت کی طرف سے دیئے گئے تمام تحفے واپس کر دیئے۔ گاندھی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور لوگوں کو پٹامیں رہنے کی تلقین کی۔

## تحریکِ عدمِ تعاون

کانگریس نے ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کو اپنے اجلاس نکلنے میں اکثریت رائے سے گاندھی کی یہ قرارداد منظور کر لی کہ ہر ہندوستانی خواہ وہ غیر مسلم ہو، کا فرض ہے کہ خلافت کے مسئلہ پر مسلمانوں کا ساتھ دے۔ قرارداد میں حکومت کے اس اقدام کی مذمت بھی کی گئی کہ اُس نے ایسے تمام لوگوں کو بری کر دیا جنہوں نے پنجاب میں عوام پر ظلم ڈھایا تھا۔ لہذا عہدِ رس ہوتا ہے کہ حکومت برطانیہ اور حکومتِ ہند کو ہندوستان کے لوگوں سے کوئی بھدردہی نہیں۔

اسی دوران نکلنے ہی میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی منعقد ہوا جس کی صدارت محمد علی جناح نے کی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت تک محمد علی جناح بدستور کانگریس کے باقاعدہ رکن تھے۔ انہوں نے انتہائی محتاط رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ محمد علی جناح نے صدارتی تقریر کے دوران کانگریس کی تجاویز کی طرف مسلم لیگی رہنماؤں کی توجہ مبذول کرائی تاہم انہوں نے بذاتِ خود ان تجاویز کے بارے میں خاموشی اختیار کیے رکھی۔

کانگریس کے اجلاس کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی۔ اس دوران ایک جنگلانی ہندو کانگریسی نے گاندھی کی تجاویز میں اس مفہوم کی تجویز بھی شامل کی کہ عدمِ تعاون کے پروگرام میں 'سوراج' کا مقصد بھی شامل کیا جائے۔ گو اس موقع پر بھی گاندھی اسی بات کو دہرانا چاہتے تھے جو انہوں نے خلافت کا انفرنس کے دوران کہی تھی کہ ہندو ایک مذہبی معاملہ میں اپنی بھدردیاں پیش کر کے سوراہی کو باعوت بات نہیں سمجھتے، لیکن اجلاس کے کچھ مسلمان نمائندوں ہی کی درخواست پر یہ ترمیم منظور کر لی گئی۔ اس طرح خلافت کا مسئلہ اور کانگریس کے مقاصد باہم گڈھ جو گئے۔ اس فیصلے کی توثیق دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے اجلاس ناگپور میں کر دی گئی۔ اس اجلاس میں محمد علی جناح واحد شخص تھے جنہوں نے عدمِ تعاون کی تجاویز کے خلاف تقریر کی۔ اُن کا خیال تھا کہ اس اقدام سے عداوت کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب محمد علی جناح نے کانگریس کی رکنیت سے استعفا دیا اور آخری سال تک کے لئے مسلم لیگ کے ساتھ منسلک ہو کر رہ گئے۔

عدمِ تعاون کی تحریک تو منظور ہو چکی تھی۔ انہی دنوں جب نئے آئین کے تحت مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو کانگریس کے اجلاس ناگپور کے فیصلے کے

اتباع میں بہت سے امیدواروں نے اپنے کاندھات نامزدگی واپس لے لئے۔ کچھ دنوں بعد نوٹکیلیں اسمبلی اپنے کام کا آغاز کر چکی تھی، لیکن دوسری طرف جمیعت العلما نے ہند نے سیکرٹریوں طہار کے دستخطوں کے ساتھ یہ فتویٰ شائع کر دیا کہ انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون مذہبی فریضہ اور ہندوستان دارالحرب ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ہجرت شروع کر دی۔ اگست ۱۹۴۱ء میں صوبہ سرحد، سندھ اور پنجاب کے مسلمانوں نے افغانستان کو ہجرت شروع کی۔ مسلمانوں نے اپنا تمام اثاثہ سستے داموں فروخت کر دیا۔ ایک ادارے کے مطابق تقریباً ۸۰ ہزار مسلمان افغانستان کی سرحد پر پہنچ گئے لیکن انہیں وہاں بھی امان نہ مل سکی۔ ان کی یہ توقع غلط ثابت ہوئی کہ افغانستان کی مسلمان حکومت انہیں خوش آمدید کہے گی۔ افغان حکومت نے انہیں سرحدوں ہی پر روک لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان واپس آنے لگے اور بہت سے لوگ روہ کی صورتوں کے باعث جاں بحق ہو گئے۔

### نظریاتی تقریریں

گاندھی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تحریک خلافت اور 'سوراج' کے سلسلے میں طوفانی دورہ کر رہے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاندھی اور مولانا شوکت علی کے نظریات میں ہم آہنگی نہ پائی جاتی تھی۔ ایک بنیادی بات یہ تھی کہ گاندھی ابھی لوگوں کو اس کے لئے تیار کر رہے تھے کہ بوقت ضرورت وہ کسی بھی اقدام کے لئے تیار رہیں نیز رضا کاروں کی بھرتی پر زور دے رہے تھے، مگر اس کے برعکس مولانا محمد علی یہ سمجھتے تھے کہ عدم تعاون کا وقت آچکا تھا اور اب حکومت سے ٹکرانے میں دیر نہیں کرنا چاہئے تھی۔ انہی دنوں حکومت نے کونسل لارڈ امینٹنٹ ایکٹ منظور کیا اور رضا کاروں کی بھرتی کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ عدم تعاون تو بنیادین ہی چکا تھا لہذا اگر غازیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۴۱ء اور جنوری ۱۹۴۲ء کے دوران کم از کم ۲۰ ہزار ہندو مسلمان رضا کاروں سے جلیں بھر چکی تھیں۔ ظاہر ہے اتحاد کا اعلیٰ ترین مظاہرہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اتحاد میں حقیقی کا عنصر غالب تھا۔ شیعہ مسلمان رضا کاروں کی خاطر اور ہندو رضا کار 'سوراج' کی خاطر گرفتاریوں کے لئے پیش ہو رہے تھے۔ اگر دیکھا جائے تو عدم تعاون کی باضابطہ تحریک کے آغاز سے قبل ہی سول نافرمانی کی ہم شروع ہو چکی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مولانا محمد علی اپنی تقاریر میں



ہندستان سے انگریز سامراج کے خاتمہ اور مسلمانوں پر ہندوستان کو آزاد کرانے کے فرض کی بات کرتے تو ہندو۔

دیکھ لیتے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سنی ۱۹۲۱ء میں گاندھی نے اپنے اخبار میں یہ بات کہی کہ اب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں سے غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ختم نہیں ہوئیں۔ مجدد سمجھتے ہیں کہ ہندوستان سے انگریز چلا گیا تو مسلمان بعض دیگر مسلمان طاقتوں کے ذریعے ہندوستان میں ہندو حکومت قائم کر لیں گے جبکہ مسلمانوں کا اندیشہ یہ ہے کہ انگریز کے بعد ہندو اکثریت ان پر غلبہ حاصل کرے گی۔

۱۹۲۱ء جولائی ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی جتوئی کی صدارت میں پھر خلافت کا فرض کا انعقاد ہوا۔ انگریزوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی شرکت کو نہ بھی اعتبار سے ناجائز قرار دے دیا۔ ایک قرارداد میں حکومت برطانیہ کو تنبیہ کی گئی کہ اگر ترکی کے خلافت برطانیہ کی طرف سے کوئی جارحانہ اقدام کیا گیا تو ہندوستانی مسلمان ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیں گے اور جب کانگریس کا آئندہ اجلاس منعقد ہوگا تو سنی انڈین ری پبلک کا پرچم بلند کر دیا جائے گا۔ مولانا کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں جب پرنس آف ویلز بمبئی پہنچے تو زبردست مظاہرہ کیا گیا۔ فوج نے مظاہرین پر گولی چلائی جس کے نتیجے میں ۵۵ افراد ہلاک ہو گئے۔ ساتھ ہی مدراس میں فسادات شروع ہوئے اور کچھ دنوں بعد مالابار کی پہاڑیوں میں چوٹوں نے بغاوت کر دی۔ سرپٹوں نے ہندوستانی فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ۱۹۲۱ء رخصت ہوا تھا اور لاتعداد مسلمان اور ہندو رہنما جیلوں میں شمرنے جا چکے تھے۔ فروری ۱۹۲۲ء میں گورکھ پور کے ایک جیلے جو راجپوتی میں عوام اور پولیس میں زبردست تصادم ہو گیا، فائرنگ ہوئی، جب گولیاں ختم ہو گئیں تو پولیس نے تھامے میں چاہ لی اندھجھم کی آمد کے خوف سے دروازے بند کر دیے۔ عوام نے تھامے کو آگ لگا دی، نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس کے سب افراد زخمی ہو گئے۔ گاندھی نے تشدد کے اس واقعہ کا اہم گنا اثر قبول کیا کہ خودی طور پر کانگریس کی مجلس عاملہ سے سول نافرمانی کی تحریک بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ ۱۳ مارچ ۱۹۲۲ء کو حکومت نے گاندھی کو بھی گرفتار کر لیا۔

یہ بات یقینی سے نہیں کہی جاسکتی کہ گاندھی فی الواقعہ گورکھ پور میں تشدد کے اس واقعہ سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے سول نافرمانی کا سلسلہ ختم کر دیا یا انہیں مولانا محمد علی کا تدارک دیا۔ دیگر ہندو رہنماؤں کے خدشات کی بنیاد پر اس بات کا احساس تھا کہ خلافت اور

سوراج، کو ایک دوسرے کے ساتھ خشک کرنا بیاد ہی طور پر غلط تھا۔ تحریک یکانہم جوتی، ہندو اور مسلمانوں کا مصنوعی اتحاد بھی دودھ کے ابالی کی طرح میٹھ گیا۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی بنیاد اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔

دوسری طرف جب مولوں کو خلافت تحریک کی اطلاع ملی تو انہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کے بعد اپنے ایک رہنما حاجی محمد کی قیادت میں حکومت خلافت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جب پولیس مولوں کی بغاوت فرو کرنے میں ناکام ہو گئی تو فوج ان کے مقابلے پر تیار ہوئی۔ گورنر ملک فوج اور مولوں کے درمیان آنکھ چولی ہوتی رہی اور قریباً دو ہزار مولے اس معرکے میں مارے گئے۔ اس موقع پر انگریز فوج نے ایک بار پھر جیٹیا نوالہ باغ امرتسر میں جنرل ڈائر کی یاد تازہ کر دی۔ ایک فوجی آفسر نے تقریباً ۱۱۰ مولوں کو مال گاڑی کے ایک ڈبے میں بند کر کے کسی دوسری جگہ منتقل کیا۔ بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ شام کو جب ڈبے کے دروازے کھولے گئے تو ۱۶ مولے گرمی اور پیاس کی شدت سے سوچکے تھے اور باقی جاں بلب تھے۔ انگریز کے لئے اس سے بہتر موقع کوئی نہ تھا کہ ہندو مسلم اتحاد (گو یہ اتحاد برائے نام تھا) پر کارہی ضرب لگائی جائے۔ اس نے یہ خبر سنا لی کہ دراصل مولوں نے مذہبی جنون کے تحت ہندو زمینداروں اور دیگر متحمل ہندوؤں پر حملے کئے تھے۔ لہذا فوج کو ہندوؤں کی حفاظت کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔ اس خبر کے چھپتے ہی ہندوستان میں جگہ جگہ ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے۔

### تحریک خلافت کا انجام

بہت سے رہنما جیلوں سے اچکے تھے۔ باہم مشورے کے بعد انہوں نے یہ کوشش شروع کر دی کہ جن اسمبلیوں کا بائیکاٹ کیا گیا تھا وہ ختم کر کے آئندہ انتخابات میں حصہ لیں۔ اس طرح کانگریس نے انتخابات کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔ گاندھی نے کھدر پہننے، اچر نہ چلانے اور تشدد کو مسترد کرنے کی تلقین شروع کر دی۔ مسلمانوں کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ انہوں نے عدم تعاون کو مذہبی فریضہ قرار دیا تھا۔ لہذا وہ انتخابات سے دور دور رہے۔ دوسرے ترکہ میں مصطفیٰ اکمال اقامت ترک نے جدوجہد شروع کر دی تھی اور سلطان کو طعنے لگنے کے ترکہ کو جھوٹا بنا دیا تھا لہذا خلافت کا فوجی ترکہ کے لئے اٹھا تھا، خود ترکہ ہی میں ختم ہو کر رہ گیا۔ اس طرح ہندوستان میں خلافت کی تحریک علی طور پر ختم ہو کر رہ گئی۔

## تحریک خلافت اور اعتراضات

تحریک خلافت کے ختم ہوتے ہی خلافت کیٹی بھی مٹا معطل ہو کر رہ گئی۔ موقوفہ پرست تو ہی تاک میں تھے۔ انہوں نے تحریک خلافت اور اس کے رہنماؤں کے بارے میں طرح طرح باتیں شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ہدف تنقید مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بنایا گیا۔ جب ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کا آغاز ہو گیا تو مخالفین نے اس کی تمام داری ان پر عائد کی اور دیگر دشواروں کے لئے بھی تحریک خلافت اور اس کے رہنماؤں کو ذمہ دار قرار دیا۔

تحریک خلافت پر ایک اعتراض تو یہ تھا کہ ترکی کے مسئلہ میں انتہائی دلچسپی کا اظہار اپنے مال کی قیمت پر کیوں کیا گیا اور اس طرح مسلمانان ہند کی قوت عمل کا ضیاع ہوا۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد اور گاندھی کو قائم تسلیم کر لینے کے بعد مسلمانوں پر ہندوؤں برتری قائم ہو گئی۔

ہم تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ مسلمانوں نے ایک غیر ملکی مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنایا تو اس کے بارے میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ مقررین بلاشبہ بنیادی اسلامی عقاید اور اسلامی بات سے کہتا رہے ہوتے۔ اسلام ایک آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے۔ یہ کسی وطن کا نام ہے نہ کسی قوم کا! جب قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا کہ تمام مسلمان بھائیوں کی طرح ہیں تو پھر سرزمین، نسل یا ایسی کسی دوسری تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلمان کے لئے ہر وہ زمین مقدس ہے جہاں اس کا جو ہے خلافت ترکی کی تھی یا یہ مسئلہ کسی دوسرے اسلامی ملک سے متعلق ہوتا، ہندوستان کے مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ عالم اسلام کا مسئلہ تھا۔ اگر مشکل اور مصیبت کے موقع مسلمان، مسلمان کی مدد نہ کرے تو اسلام کے آفاقی تصور اور اس کی عالمگیریت کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں جب دشمنوں سے مقامات مقدسہ کے تحفظ کا سوال پیدا ہوا تو کیا ہندوستان یا اس کے دوسرے ملک میں بسنے والے مسلمان یہ کہہ کر جان چھڑا سکتے تھے کہ یہ ان کے وطن کا مسئلہ نہیں؟ کیا تمام مقامات مقدسہ ہمارے لئے "غیر" ہیں؟ اس لئے کہ وہ "غیر" تصور "تحت ہمارے وطن" میں واقع نہیں۔ دراصل مقررین وطنیت کے جس تصور کے تحت یہ اعتراض کر رہے تھے، وہ تصور اسلامی نہیں۔ لہذا ہندوستان کے مسلمانوں نے مقامات

ہندو کی مخالفت اور ترکی کی سرزمین کی پچانے کے لئے جو تحریک چلائی وہ قطعی طور پر اسلامی تحریک تھی۔ اس کا تعلق کسی ذاتی مخالفت یا دوستی سے تھا۔ یہ تحریک کلیتاً اسلامی عقائد اور مسلمانوں کے لئے درد اور کسک کے تحت چلائی گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ تحریک خلافت میں ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کے باوجود مولانا محمد علی قاسم علیوں میں بر ملا کتے کا انگریز سامراج سے ہندوستان کو نجات دینا مسلمانوں کا فرض ہے۔ انہی تقاریر کی بنیاد پر ہندوؤں میں اس شبہ نے بھی جنم لیا کہ مسلمان ہندوؤں کو غیر مکی مسلمان طاقتوں کے ذریعہ مغلوب کرنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو آخر دم تک گاندھی اور مولانا محمد علی کی تقاریر میں ہم آہنگی کیوں پیدا نہ ہو سکی؟

جہاں تک گاندھی کی قیادت میں ہونے والے سوال تھا تو حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۷ء میں گاندھی کی بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد قائم ہو چکا تھا جس کے سلسلے میں خود محمد علی جناح نے بھرپور کوشش کی تھی۔ مگر سیاسی حالات تھے کہ اچھے پلے جا رہے تھے۔ ادھر مونٹگو، چیمفورڈ اصلاحات کی آمد، ادھر جنگ کا آغاز۔ قانون تحفظ کا نفاذ۔ ہندو مسلمان رہنماؤں کی گرفتاریاں اور پریس ایکٹ کے تحت زبان بندی کا اقدام۔ جنگ ختم ہوئی تو روپیٹ ایکٹ آگیا۔ اسی ایکٹ کے خلاف احتجاج ہندوستان میں مارشل لا کے نفاذ کا سبب ہوا۔ مارشل لا کے دوران انگریزوں نے ہندوستان میں بوجہ مظالم ڈھائے وہ ہلاک و بربادیوں کو بھی ڈھاتے ہیں۔ اس موقع پر ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندوستان کے رہنے والے تمام باشندے، بلا امتیاز مذہب، انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہو جاتے۔ گاندھی کی سستی گروہ تحریک تمبید بن چکی تھی۔ خلافت کا مسئلہ شروع سے مسلمانوں میں اضطراب کا باعث تھا۔ اگر یہ سب عناصر مل کر۔ ایک متحدہ محاذ کی صورت میں انگریز کے خلاف ٹٹ گئے تو اس میں برائی کیا تھی۔ یہ بات واضح ہے کہ اس دوران بھی مولانا محمد علی تحریک خلافت کے ”کمان دار“ کی حیثیت میں کام کر رہے تھے۔ یہ کتنا غلط ہو گا کہ گاندھی کی قیادت نے ہند کی برتری قائم کی۔ اگر مسلمانوں نے گاندھی کی قیادت کو اپنے اوپر مستط کر لیا ہوتا تو فوراً وہ فسادات نہ ہوتے۔ علاوہ ازیں اس تحریک کے تمام عرصہ میں ایک موقع بھی ایسا نہ آیا کہ مسلمانوں نے اپنی قیادت کا دامن چھٹک کر ہند پر اندھے اتحاد کا مظاہرہ کیا ہو۔ مولانا حسرت موہانی، محمد علی جناح، اسرار علی، رب نشتہ، مولانا شوکت علی۔ اور ایسے متعدد نمایاں مسلمان رہنما۔ تحریک خلافت کے سرگرم رکن رہے۔ انہی لوگوں نے آگے چل کر قوم کے لئے واضح اور ٹھوس خطوط کا تعین کیا۔

باب

## ہندوستان کی سیاست

۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۲ء

### ہندو مسلم فسادات اور شدھی

قریب خلافت اپنے انجام کو پہنچی۔ گاندھی نے تحریک عدم تعاون ترک کر دی، مہلوں کی بناوٹ پھیل رہی تھی اور ہندو مسلمان میں تفریق پیدا کرنے کے لئے انگریزوں کی یہ منگاری پھیل لائی کہ مہلوں نے بناوٹ نہیں کی تھی بلکہ ہندوؤں کو نشانہ بنانا تھا۔ لہذا ہندوستانی کے کوٹے کوٹے میں ہندو مسلم اتحاد کی جگہ فسادات اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہندوؤں نے انگریزوں کی بات پر ایمان لاتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف مسلح جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ انگریز تو خیر بڑی دیر سے اس وقت کا منتظر تھا کہ مسلمان اور ہندو کو ایک دوسرے کے خون کا پیسا مانا کر اپنی حکومت قائم رکھے۔ لہذا اس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے متعصب ہندو رہنما سوامی شرما کو روکا کر دیا اور اسے شدھی کی تحریک کا اذہر نو آغاز کرنے کی کھلی چٹائی لی گئی۔ سوامی شرما نند جیل سے آئے ہی اپنے معین میں مصروف ہو گیا۔ اور حال لاجپت رائے نے ہندو سنگٹھن تحریک کا آغاز کرتے ہی ہندو جواڑوں کو دست دوست، لاپٹی یا تلوار کی جنگ کی تربیت دینے کے لئے لاتعداد مراکز قائم کر دیئے۔ سب سے پہلا ہندو مسلم فسادات ان میں ہوا۔ پھر دیکھتے دیکھتے ہندوستان کا کوئی بڑا شہر ان ہنگاموں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی جائیداد کوٹھنے میں پہلا جوش و

خروش دکھایا۔

سوامی شرودھانند جس کا اصل نام فشی رام تھا، کسی وقت پنجاب پولیس میں سب انسپکٹر ہوا کرتا تھا۔ بعد ازاں اس نے کچھ عرصہ ولایت کی اور پھر سیاسی بن کر ہرودار میں دھونی دھاگر بیٹھ گیا۔ وہیں سے اسے سوامی شرودھانند کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ جب رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرے ہوئے تو اس نے ان میں بھی تھوڑا بہت حصہ لیا۔ اس نے مسلمانوں کے دل میں اپنی تمکاری اور چرب زبانی سے اتنا گھر کر لیا کہ رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہروں کے دوران ایک بار مسلمانوں نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھایا اور جامع مسجد میں لے گئے۔ مسلمان بااوقات حماقت کی حد تک جذباتی ہو جاتے ہیں۔ سوامی شرودھانند کے لئے جامع مسجد بلا کے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے کا اعزاز بھی مسلمانوں کی اسی حماقت کا نتیجہ تھا۔ تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں حکومت نے اسے جیل بھیج دیا۔ جیل سے معافی ہوتے ہی باہر نکلا تو اس نے اپنا مکہ شرمی کا سفر لگا دیا۔ اس کے سفر کی منطق یہ تھی کہ ہندوستان میں جتنے بھی مسلمان موجود ہیں، سب ہندوؤں کی اولاد سے ہیں۔ لہذا ہندوؤں کا مقدس فرض یہ ہے کہ ان سب مسلمانوں کو ہندو بنا دیا جائے۔ سوامی شرودھانند نے یہ مهم آگہ کے دیسی ملاؤں سے شروع کی، جہاں تو بکاہ، ہزار ایسے راجپوت موجود تھے جو برائے نام مسلمان اور ہندو اذرسومات کے پابند تھے۔ اس حقیقت سے فرار نہیں کہ شرمی ہم کی ابتداء میں ان راجپوت قبائل نے بار بار مسلمان مولویوں کو دعوت دی کہ ان کے ملاؤں میں آکر جیسے منتقد کریں اور ہندوؤں سے مناظرہ کریں۔ لیکن کسی بھی مسلمان عالم یا مولوی نے ان کی بات پر کان نہ دھرا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ملاؤں راجپوت جو ہندوئے مسلمان ہوئے تھے، دوبارہ ہندو ہو گئے۔ بہر حال ان کے مشدہ ہوتے ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں شدید بے چینی پیدا ہو گئی۔ کچھ مسلمان تبلیغی جماعتیں بھی قائم کی گئیں۔ غالباً مسلمانوں میں واحد شخص راجہ غنیش علی خاں تھے، جو ان راجپوتوں کے پاس گئے لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ انہیں دوبارہ دائرہ اسلام میں شامل کرنا بے سود ہو گا، کیونکہ ہندو اور مسلمان کے چکر میں اور مولویوں کی غفلت اور عدم توجہی کے باعث ان راجپوتوں نے ایک عجیب رویہ اختیار کر لیا تھا۔ ان کے پاس کوئی جاتا تو وہ زمینداروں کے قرضوں اور یہی اراضی یا لگان کے بتایا جات کی بات کر گئے رقم اینٹھنے کی کوشش کرتے اور ہندو مسلمان دونوں سے یہ کہتے کہ وہ دل سے ان ہی کے مذہب کے ساتھ ہیں۔ اگر شروع میں ہی مسلمانوں کی طرف سے

کوئی اقدام کیا جاتا تو شاید انہیں پیسے کی یہ پاٹ نہ لگتی۔ ابتداء تو اس وقت مونی تھی جب سوامی شرما صاحب کے چیلے چانٹوں نے ان ماچھرتوں کو پیسہ کالا لپٹ دیا اور راجپوتوں نے اس روپے کو کافی کاغذیہ بنالیا۔

سوامی شرما صاحب ایک مسلمانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترا۔ اس کے قتل کے بعد فسادات اور بلبوں میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔

ہندو ہما سبھا، معامہ کھنڈ کے وقت سے اس بات کے لئے کوشاں تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد ہو جائے۔ اس کے سربراہ پنڈت مدن موہن مالویہ تھے۔ ایک اور رہنما لالہ ہر دیال بھی تھا جس نے کھلے ہندوؤں یہ تصور بلند کیا کہ اگر ہندوؤں نے فوجی تربیت حاصل نہ کی، ہندوستان میں ہندو راج قائم نہ کیا، مسلمانوں کو ہندو نہ بنایا اور افغانستان اور سرحد کے علاقوں کو فتح کر کے وہاں کے عوام کو ہندومت میں شامل نہ کیا تو ہندوؤں کا مستقبل تاریک ہو کر رہ جائے گا۔ لالہ ہر دیال نے کہا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں صرف اس صورت میں رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ ہندووانی نام اختیار کریں۔ ہندوؤں کی مذہبی تعاقب میں شرکت کریں ہندوؤں کے بزرگوں کے ترانے گائیں، ہندوؤں ایسا لباس پہنیں، ان کی رسومات کو اپنائیں اور خود کو مسلمان کہنا چھوڑ دیں۔ البتہ اگر اس کے بعد بھی وہ اپنے مذہبی عقائد چھوڑنا چاہیں تو انہیں اپنے نظریے پر عبادت کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے لیکن انہیں "مستند" ہندو کہلا نا ہوگا۔ مسلم لیگ نے ہر موقع پر یہ کوشش کی کہ ہندو اور مسلمان اتحاد کا مظاہرہ کریں۔ لیکن مذکرہ بالا ہندو تحریکوں کی وجہ سے ایسی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے تعصب کا عالم یہ تھا کہ وہ نمایاں کانگریسی مسلمانوں کو بھی برداشت نہ کرتے۔ جب دلی میں مرکزی اسمبلی کے لئے مخلوط بنیادوں پر انتخابات ہوئے تو آصف علی بھی امیدواروں میں شامل تھے۔ وہ خود کانگریسی تھے اور کانگریس کے اندر بھی انہیں نمایاں مقام حاصل نہ تھا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے ان کی شدید مخالفت کی حتیٰ کہ وہ انتخابات ہار گئے۔ اس موقع پر گورنمنٹ مونی لال نہرو نے ہندو تعصب کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا البتہ یہ کہہ دیا کہ پنڈت مدن موہن نے مخلوط حلقہ نیابت میں آصف علی کی شدید مخالفت کے مخلوط انتخابات کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔

تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کو اپنا تک بند کر دینے کے بعد گاندھی، ہندو مسلم

اتحاد کا نقاب اتار کر اپنے اصل روپ میں ظاہر ہو گئے تھے۔ ہندوؤں کی طرف سے یہ مطالبہ زور پکڑ رہا تھا کہ ’گنوتھیا‘ بند کی جائے۔ گاندھی دو قدم اور بڑے، انہوں نے یہ نعرہ لگایا کہ اس وقت تک ’سوراج‘ حاصل نہیں کیا جاسکتا جب تک ہم گائے کے تختہ کے بارے میں کسی فیصلہ کن مرحلے پر نہیں پہنچ جاتے۔

گاندھی، جو زندگی بھر ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگاتے رہے اور جنہوں نے تحریکِ خلافت کے دنوں میں بڑے اتحاد کے ساتھ یہ بات کی تھی کہ ہندو مسلمانوں کے مذہبی معاملہ میں اپنی ہمدردیاں پیش کر کے سودا بازی کو فوت کی بات نہیں سمجھتے، نے اپنے اخبار ’ینگ انڈیا‘ میں جو مضمون لکھا وہ ہندو ذہنیت اور گاندھی کے بہروپ کی مکمل نقاب کشائی کرتا تھا۔

۱۔ مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی اولاد ہیں یا وہ لوگ جو ہم میں سے تھے اور اب ہم سے الگ ہو چکے ہیں۔ اگر ہیں اپنا وقار قائم رکھنا ہے تو ہمیں صرف تین طریقے تلاش کرنا پڑیں گے۔

۲۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو مسلمانوں کو ان کے اپنے قدیم علاقے میں واپس بھیج دیا جائے۔ اور

۳۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ان لوگوں کو ہندوستان میں رہایا بنا کر رکھا جائے۔

گاندھی کے اس مضمون کی اشاعت کے بعد مسلمان رہنا بیچ متفکر ہوئے۔ انہوں نے شدید کے تدارک کے لئے تبلیغی مشن قائم کرنا شروع کر دیئے۔ ایک انجمن تشکیل کی گئی جس کے سیکرٹری غلام حبیب نیرنگ تھے۔ اس انجمن نے مختلف مقامات پر تبلیغی مشن بھیج کر خاطر ظاہر کا میا پی حاصل کی۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں میں اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ اور حکومت خود اختیاری کے قیام کا جذبہ فزوں تر ہو گیا۔ ۱۹۲۲ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا اور پایا۔ محمد علی جناح نے اس اجلاس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ملک کی اسمبلیوں اور میونسپل اور مقامی اداروں میں مسلمانوں کے لئے نمائندگی کا تناسب اور ملازمتوں میں ان کے لئے فی صد تناسب بہت ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسائل صرف اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں کہ کچھ دو اور کچھ دو کے اصول پر عمل کیا جائے۔ جب تک دونوں طرف دوستانہ جذبات اور ایک دوسرے کے مسائل کے حل کا احساس پیدا نہ ہو، عمل نہیں کیا جاسکتا۔ بد قسمتی سے ہندوستان میں شدید اور سنگٹھن تحریکوں نے گائے کے ذبیحہ کو جہادی اور ملک میں فساد کر لیا، مسلمانوں کو قتل کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بیزاری پیدا کر دی۔ اگر دہ دہ رہا وہ



نفع دہنے دے کے ہندو سے کام لیا ہائے کرمات معمول پر آتے ہیں۔  
 قائدِ عظمیٰ کی خواہش یہ تھی کہ وہ ایک بار پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایسی  
 فرائط پر مصالحت کر دیں جو مسلمانوں کے لئے بھی قابلِ اعتراض نہ ہو۔ علامہ ازیں وہ مسلم لیگ  
 کی تنظیم نو کے بعد اس کے کوٹے ہوئے وقار کو بحال کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ انہی کی کوششوں  
 سے کئی سال بعد ایک بار پھر مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں مختلف طبقہ و خیال کے مسلم لیگی  
 رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی صدیقی تقریر میں تمام پس منظر اور ناکامی  
 پر روشنی ڈالی۔

اس وقت صورت یہ تھی کہ تحریک عدم تعاون کے خاتمہ کے بعد سے مسلمانوں میں دُورِ گروہ  
 بن چکے تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جس نے مسلم قومیت کے نعروں کو یکسر فراموش کر کے کانگریس کا  
 دامن پکڑ لیا تھا۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو پہلے مسلم قومیت اور مسلمانوں کی عالمی سیاست کے  
 علم بردار تھے۔ یہ لوگ مل و جان سے کانگریس کے ساتھ جڑ گئے اور غالباً انہوں نے نازی صورتِ حال  
 کو محسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی جو کانگریس کی پالیسی نے پیدا کر دی تھی اور جو ہندو۔مسلم  
 اتحاد کو کیا، مسلمانوں کی جہانگیرہ حیثیت کو کلیتاً نظر انداز کر کے ہندو قومیت کے لئے زیادہ سے  
 زیادہ گنجائش پیدا کرنے میں مصروف تھی۔ دہرا گروہ وہ تھا جو اب بھی نہ صرف مسلم قومیت کے تصور  
 کو سینے سے لٹائے ہوئے تھا بلکہ ہندو کے غلبہ کے اندیشوں کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ یہ دہرا گروہ  
 کو موخر انداز گروہ کی وابستگی کانگریس کے ساتھ بھی رہی بلکہ اس کے باوجود مسلم قومیت کا جذبہ  
 اس کے دل سے الگ نہ ہو سکا۔ مثلاً مولانا محمد علی جوہر کانگریس کے صدر (۱۹۲۳ء میں) فقہانِ ہند کے  
 تھے، مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے اور مسلم قومیت کے تصور کو بھی الگ نہ کر سکے۔  
 مولانا ابوالکلام آزاد تو کانگریس کے ہورہے تھے مگر کچھ نئے لوگ۔ ایسے بھی تھے جو نازہ وطن  
 اور تانہ و لولوں کے ساتھ مسلمانوں کے لئے ٹرپ لے کر میدانِ عمل میں آکر آئے تھے۔ ان میں  
 راجہ بخش نگر علی خاں اور میاں فضل حسین قابلِ ذکر ہیں۔ ۲۴-۲۵ مئی ۱۹۲۳ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا  
 چوتھا اجلاس منعقد ہوا۔ اور اس اجلاس میں مسلمانوں کی طرف سے نئے مطالبات کا جو فارمولہ  
 مرتب کیا گیا وہ میاں فضل حسین کی کاوشوں کا نتیجہ تھے۔

### مسلم لیگ کا اجلاس لاہور

۱۹۲۳ء کے انتخابات ہو چکے تھے۔ راجہ بخش نگر علی خاں نے بھی ایک طالبِ علم کی حیثیت سے

ان انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ ان کے مقابلہ میں وہ امیدوار تھے اور دونوں ہی مسلمان۔ راجہ غنیشکر علی خاں چار ووٹوں سے ہار گئے۔ مگر انتخابی عذر داری داخل کر دی گئی۔ اتفاقاً یہ کہ جب دن لاہور کے صوبہ سرینام میں مسلم لیگ کے اجلاس کا انعقاد ہونا تھا، اسی روز راجہ غنیشکر علی خاں کی عذر داری کا فیصلہ تھا۔ راجہ صاحب چار ووٹوں سے ہارے تھے مگر عدالت کی تحقیقات کے بعد ان کے چار ووٹ بڑھ گئے۔ وہ عذر داری جیت گئے اور ان کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ بسنے وہ مزید عزم و ہمت کے ساتھ اس اجلاس میں شریک ہوئے۔

اجلاس میں میاں فضل حسین، چودھری خلیق الزماں، آصف علی، شیخ عبدالنقاد چودھری شہاب الدین، مولوی ابوالقاسم، ڈاکٹر ضیاء الدین، قدوائی، ملک برکت علی اور دیگر بہت سے رہنما موجود تھے۔ محمد علی جناح نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا،

”ہندوستان میں غیر ملکوں کی حکومت کی بناد کیوں پڑی اور یہ حکومت اب تک موجود کیوں ہے؟ اس کی واحد وجہ ہندو اور مسلمان میں اتحاد کا فقدان ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کے درمیان عدم اعتماد ہے۔ مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ جس دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ اتحاد پیدا ہو گیا اس دن کم از کم ایک نوآبادی کے درجہ کی حکومت ہندوستان کو نصیب ہو جائے گی۔ اگر ان دونوں کے درمیان کوئی پائدار سمجھوتہ ہو جائے تو بہت سی مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو انہیں بھی اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے آگے چلنا چاہئے آج کے اجلاس کا بڑا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کے مطالبات کے بارے میں ایک فارمولہ ترتیب دیا جائے جسے بنیاد بنا کر بالخصوص کانگریس کے ساتھ بات چیت کو آگے بڑھایا جاسکے۔“

محمد علی جناح نے اپنی تقریر کے دوران ملک کی صنعتی، تجارتی اور زرعی سرگرمیاں تیز کر۔ پر بھی زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ ملک کے کاشت کاروں اور مزدوروں کے حالات میں انقلاب پیدا کرنے کی شدید ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے مفادات کا مکمل تحفظ کر سکیں۔ انہوں نے قوم اہمیت کے دیگر مسائل مثلاً تعلیم، نمائندگی کے ذریعہ تنازعات کے فیصلے، ہندوستان کے دفاع اور ہندوستانی فوج میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی افسروں کی بھرتی کی طرف توجہ مبذول کرا دی اور اقلیتوں کے حقوق و مفادات کے مکمل تحفظ کی بات بھی کی۔ محمد علی جناح کا خیال تھا کہ اسمبلی

تذریع قومی اصلاحات کی طرف فوری توجہ مبذول کن ضروری ہے اور اگر حکومت کی طرف سے اس سلسلہ میں قتلِ بخشِ بدیہ اختیار نہ کیا جائے تو اس صورت میں پارلیمانی رکاوٹیں اور آئینی تعطل پیدا کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہوتی چاہئے۔ محمد علی جناح نے اپنے خطبہ صدارت کے اختتام میں یہ بھی کہا کہ موجودہ آئین کو ختم کر کے ایک ایسا آئین، جو عوام کے نمائندوں کے مشوروں سے ترتیب دیا جائے، اختیار کرنا ضروری ہے اور نئے آئین کے تحت تمام حقیقی کنٹرول اور ذمہ داریاں عوام کے ہاتھ میں آنا ضروری ہیں، تاکہ ہندوستان کے عوام ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اقوامِ عالم میں ایک نئی اور ذمہ دار حکومت کے قیام کے بعد اپنا مقام حاصل کر سکیں۔

سلیخ عبدالقادر کی طرف سے مستقبل کے آئین کے سلسلہ میں کسی بھی سکیم کے لئے مندرجہ ذیل اصولوں پر مبنی قرارداد منظور کی گئی،

- ۱۔ مرکز وفاقی طرز پر قائم ہو اور صوبوں کو مشترکہ امور کے معاملے میں اختیارات حاصل ہوں۔
  - ۲۔ اگر کسی صوبہ میں آبادی کے اعتبار سے کسی فرقہ کو اکثریت حاصل ہو تو اس اکثریت کو اقلیت یا مساوات کی صورت میں تبدیل نہ کیا جائے۔ یعنی ان دونوں میں توازن قائم نہ کیا جائے۔
  - ۳۔ ہر جگہ جداگانہ طریق انتخاب مروج ہو۔
  - ۴۔ چھوٹے درجہ کی ایسی اقلیتوں کو جو بآسانی اور خصوصی مراعات کے بغیر نمائندگی حاصل کرنے کے قابل نہ ہوں، مخصوص مراعات دی جائیں (مثلاً پنجاب اور بنگال)۔
  - ۵۔ مسلمان اکثریت کے خود مختار صوبوں، بشمول صوبہ سرحد کی تعداد تین کی جائے۔
- جہاں تک چھوٹے درجہ کی اقلیتوں کی مراعات کا سوال تھا، گو بنگال اور پنجاب کے صوبوں میں تو ہندو اس میں ملوث نہ ہونے تھے لہذا ان صوبوں میں مسلمان اکثریت کو کم کرنے یا ہندو اقلیت کو مخصوص مراعات دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا تاہم یوپی کی مسلم اقلیت پر اس کی نذر لاؤاڑتی تھی۔ چنانچہ یوپی کے نمائندوں نے قرارداد کے الفاظ میں رد و بدل کر کے اس وضاحت کی کہ یوپی کی یہی اور اس نوعیت کے دوسرے صوبوں میں مسلمان اقلیت کو ۱۹۱۶ء کے مادہ ۷ کے تحت جو مراعات حاصل تھیں وہ بدستور رہیں۔ سرفضل حسین کے اہماؤ پر الفاظ میں رد و بدل کیا گیا اور یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ جب عام اجلاس میں قراردادوں پر بحث ہو تو یہ ترمیم پیش کر دی جائے۔ دوسرے دن جب قرارداد عام بحث کے لئے پیش کی گئی تو ڈاکٹر ضیاء الدین نے مجوزہ ترمیم پیش کی۔

”جاس قافون ساز اوز نام منتخب اوروں میں فرقہ دارانہ فائدگی کا ایسا طبعی کار اختیار کیا جائے کہ اقلیتوں کو ہر صوبہ میں مناسب اور موثر فائدگی حاصل ہو جائے۔ تاہم یہ اصول اپنی جگہ موجود رہے کہ کسی اکثریتی فرقہ کو اقلیتی فرقہ میں تبدیل ہونے یا بدلنے یا اسے اکثریتی فرقہ کی سطح پر نہ آنے دیا جائے۔“

مولانا محمد علی اس ترمیم کے مخالف تھے۔ ان کے خیال میں یہ ترمیم انصاف کے تقاضوں کو پروا نہ کرتی تھی کیونکہ انصاف تو یہی ہے کہ تمام صوبوں میں تمام فرقوں کو اپنی آبادی کے تناسب فائدگی دی جائے البتہ بہت چھوٹی اقلیتوں کو خاص مراعات دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن ترمیم کے حق میں سرفضل حسین کا یہ کہنا تھا کہ اس مطالبہ کی بنیاد پکسی کے ساتھ کسی نا انصافی کا پسلا ہرگز نہیں نکلتا کیونکہ کسی صوبہ کی اکثریت کو اس کی اقلیت یا اس کے ساتھ اقلیت کے توازن میں تبدیل نہیں کیا جا رہا اور یہ اصول بیک وقت مسلم اور ہندو اکثریت دونوں کے لئے ہے۔ اگر یہ اصول بھی قائم رہے اور اقلیتی فرقوں کو مراعات بھی دی جاسکیں تو مضائقہ کیا ہے؟ مثلاً پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اگر ان صوبوں میں مسلم اکثریت کو اقلیت یا توازن میں تبدیل کرنے پر اقلیتوں کو کوئی رعایت مل جائے، تو مسلمانوں کو کوئی انکار نہ ہوگا۔ اسی طرح یوپی، جہاں ہندو اکثریت، پنجاب اور بنگال میں مسلمان اکثریت کے مقابلے میں تقریباً ۲۰ فیصد زیادہ تھی وہاں قدرتی طور پر اقلیتوں کو بعض مراعات دینے کے لئے مزید نمائش پیدا ہوتی تھی۔ سرفضل حسین کو یہ اعتراض بھی تھا کہ اگر مولانا محمد علی اس قرار واد پر اس وقت اظہار خیال کرتے جب وہ کانگریس کے زیر غور آتی تو بہتر تھا کہ مولانا محمد علی خود کانگریس کے صدر بھی تھے لیکن مولانا محمد علی کا کہنا یہ تھا کہ وہ مسلم لیگ کے رکن بھی تھے۔ لہذا انہیں حق پہنچا تھا کہ وہ اس اجلاس کی مجلس میں شرکت کرتے۔ اس اجلاس نے یہ ترمیم شدہ قرار واد اتفاق رائے سے منظور کر لی۔ جب مولانا محمد علی ملی پنچے قوانین نے انتخابات میں اپنا ایک بیان شائع کر لیا جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ لاہور کے اجلاس مسلم لیگ میں مسلمانوں کے مطالبات کی صحیح نمائندگی نہیں کی گئی۔

مسلم لیگ نے اپنے اس اجلاس میں کانگریس کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد ایک مشترکہ قابل قبول آئین مشرب کرنے کی جو تجویز پیش کی تھی، ہندو رہنماؤں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے موقف پر قائم رہے۔ مورخ محمد آصف نے اس بارے میں اپنی تصنیف ”تاریخ تحریک آزادی میں یوں اظہار خیال کیا

۵۔ اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ہندو رہنماؤں نے جہاں بوجھ کر تاریخ کے شمس خانی کو ٹھکرا دیا۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی ، سماجی اور سیاسی تفریق کو محسوس کرنے سے بھی انکار کر دیا ، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو رہنماؤں کی طرف سے اس اصل مسئلہ کو حل کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہ کی گئی جو ہندوستان کے سامنے پیش تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو یک وقت ایک ریاست کے اراکین کی حیثیت سے یکجا کرنا کیونکر ممکن بنایا جائے۔

## کراٹ کے فسادات

ستمبر ۱۹۲۰ء میں مورہ سرحد کے شہر کراٹ میں زبردست ہندو مسلم فساد پھیل گیا۔ ہندو رہنماؤں کو بھلائیہ تشریف اس بات پر ہوئی کہ نہاد میں ہندوؤں کا جانی نقصان زیادہ ہوا تھا۔ نہاد کی بنیاد یہ تھی کہ ہندوؤں نے ایک نظم پر مشتمل تہا پھر شائع کیا ، جس میں نہاد کعبہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نازیبا افواہا استعمال کئے گئے تھے۔ یہ کتابچہ کراٹ کی سناٹاں و حریم سماج کی طرف سے شائع کیا گیا۔ اس سماج کے سیکرٹری کو پہلے تو گرفتار کر دیا گیا لیکن جب ہندوؤں نے مظاہرہ کیا تو رہا کر دیا گیا۔ اس کی رہائی سے مسلمانوں میں غصہ فطرتی تھا جب مسلمانوں نے جو کس نکالا تو ۹۔ ستمبر کو ہندوؤں نے اس پر فائرنگ کر دی جس سے کئی مسلمان موقع پر ہلاک ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسی دن سے ایک دوسرے کو قتل کرنے ، جانناؤں کو آتش کرنے اور لوٹ مار کے واقعات عام ہو گئے۔ ہندو ، مسلمانوں کے مقابل میں زیادہ تعداد میں ہلاک ہوئے۔ بہت سے ہندو حسان پکانے کے لئے خود کو مسلمان ظاہر کرنے لگے اور بہت سوں نے مسلمانوں کے گھروں میں پناہ بھی لی۔ کچھ ہندو عارضی طور پر راولپنڈی چلے آئے۔ ہندو رہنماؤں نے بات کا تنگڑ ہناتے ہوئے یہ حق تعالیٰ کھڑا کر دیا کہ ہندوؤں کو قتل مکانی پر مجبور کیا گیا اور زبردستی مسلمان کیا گیا۔

مورہا شریکت علی اور گادگھی اس واقعہ کی حقیقتات کی غرض سے کراٹ روانہ ہوئے۔ لیکن دونوں کو وہاں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ راولپنڈی میں کیپٹن ٹھاکر ٹیڈ گئے ، شہادتیں لی گئیں۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں ، دونوں نے اتنے متضاد بیانات دیئے کہ واقعات میں مزید الجھ بڑھ پیدا ہو گیا۔ ان حالات میں یہ کہنا بڑا مشکل تھا کہ سچا کون ہے۔ تاہم مذکورہ بالا کتابچہ کی اشاعت بھلائے خود ایک واضح ثبوت تھا ، جو سناٹاں و حریموں کے اقدام کی نہادیت دے رہا تھا۔

اس کے دیتا، ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے پرچارک اور اہنسا کے پجاری، گاندھی جی نے اپنی میٹھی زبان میں فسادات کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کر دی اور یہ بھی فرمایا: میں یہ بات و شر اس کے ساتھ نہیں کر سکتا کہ پہلی گولی کسی نے چلائی؛ لیکن اگر میں یہ بھی فرض کروں کہ پہلی گولی ہندوؤں کی طرف سے چلی تھی، تب بھی یقینی طور پر اس کی وجہ ہندوؤں میں خوف و ہراس یا اپنی جان کی حفاظت کا جذبہ تھا۔ اس لئے اگر ہندوؤں کی یہ حرکت غلط بھی تھی یا اس کی کوئی وجہ تھی اس صورت میں بھی ہندوؤں کا یہ اقدام قابلِ معافی ہے۔ حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید مسلمانوں ہی کی طرف سے ہندوؤں کو ایسے اقدام پر مجبور کر دیا گیا ہو۔

مولانا شوکت علی کو گاندھی کے اس بیان سے سخت دکھ ہوا اور انہوں نے کہا،  
 "کہاٹ کے فسادات کسی ایک طرف کارروائی کا نتیجہ نہیں، میں ان کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو مورد الزام قرار دیتا ہوں، تاہم ایک مسلمان کی حیثیت سے میں یہ محسوس کر سکتا ہوں کہ مسلمانوں پر زیادہ الزام عائد کروں کیونکہ وہ تعداد اور طاقت کے اعتبار سے ہندوؤں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط تھے لہذا انہیں زیادہ سے زیادہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا۔"

مولانا شوکت علی نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ ہندوؤں کو بھائی سمجھتے ہوئے ان سے اچھا سلوک کریں اور ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ اچھے ہمسایوں کی طرح رہتے ہوئے انہیں اپنا سچا دوست اور مددگار سمجھیں۔

دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ "جماعتی" جنہوں نے اب تک دیگر علاقوں میں مسلمانوں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں اور ان کے کشت و خون اور ان کی اقتصادی و تعلیمی پسماندگی کے بارے میں اپنے ہونٹوں پر ہر سکوت ثبت کر رکھی تھی، کہاٹ کے حادثہ سے اتنے دلگیر ہو گئے کہ مارچ ۱۹۴۷ء سے ۲۱ دن کا برت رکھنے کا اعلان کر دیا۔ مزید دلچسپ بات یہ تھی کہ ان دنوں وہ دہلی میں مولانا شوکت علی کے بھائی، کانگرس کے صدر اور ایک محب وطن مسلمان مولانا محمد علی جوہر ہی کے حمان تھے۔ اس موقع پر برت سے ہندو اور مسلمان رہنماؤں نے انہیں برت رکھنے سے منع کیا۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ شاید ہندو اور مسلمان رہنما ان کے پتلے برت سے یا ان کی جسمانی حالت کے پیش نظر متفکر تھے۔ لیکن بعد ازاں جب وہ قدم قدم پر گاندھی کے برت کے عادی ہو گئے تو انہوں نے سمجھ پر واندگی۔ برت کا یہ سیاسی اختیار گاندھی نے پہلی بار استعمال کیا تھا۔

## اتحاد کانفرنس

مولانا محمد علی نے محسوس کیا کہ لادھی کے بہت سے حالات میں خاصی کشیدگی پیدا ہو سکتی تھی لہذا انہوں نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے تمام سیاسی جماعتوں اور فرقوں کے نمائندوں کو تار روانہ کئے اور وہ کی کمیونہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ کانفرنس کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ ماحول کی کشیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ ۲۹- ستمبر ۱۹۲۲ء کو کانفرنس ہوئی اور تقریباً تین سو نمائندوں نے شرکت کی۔ پنڈت مونی لال نہرو نے اس کی صدارت کی۔

اتحاد کانفرنس نے خاصی بحث و تمحیص کے بعد مزید غور و فکر کے لئے کچھ ضمنی کمیٹیاں بھی تشکیل کیں۔ یہ کانفرنس کامیاب رہی کچھ قراردادوں کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور ایک دوسرے کی مذہبی رسومات کے احترام پر زور دیا گیا، کچھ اصول وضع کئے گئے، آخری عام اجلاس میں عوام سے اتحاد کی اپیل کی گئی۔ اس کے بعد لادھی کو یہ خوشخبری سنانے کا فیصلہ کیا گیا کہ وہ جس اصول کے علمبردار تھے اسی اصول کی بنیاد پر ہر فرقہ کے نمائندہ لوگوں میں اتحاد قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ لادھی کو کانفرنس کی کامیابی کی خوشخبری سنائی گئی لیکن خوشخبری سنانے والوں کو سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ لادھی جی نے دو ٹوک الفاظ میں بت توڑنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنا برت ۸- اکتوبر ۱۹۲۲ء کو توڑا۔ کانفرنس تو بلاشبہ کامیاب ہوئی تھی کانفرنس کے فیصلوں کو کامیابی نصیب نہ ہو سکی اور مختلف مقامات پر فسادات کا سلسلہ جاری رہا۔

## مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی

دسمبر ۱۹۲۲ء میں مسلم لیگ کا ساتواں سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس کی صدارت سید رضا علی کر رہے تھے۔ اجلاس نے کوہاٹ میں جان و مال کی تباہی کی مذمت کی لیکن اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ کوہاٹ میں جو کچھ ہوا اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ہندوؤں کی طرف سے شدید صدمہ پہنچایا گیا تھا اور ہندوؤں ہی نے مسلمانوں پر ہاتھ اٹھانے میں پہل کی تھی یہ درست ہے کہ ہندوؤں کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑا لیکن اس امر میں بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ مسلمان بھی نقصان سے محفوظ نہ رہے تھے۔ مسلم لیگ نے کوہاٹ کے مسلمانوں سے یہ اپیل بھی کی کہ وہ ان مقامی ہندو شہریوں کو جو نقل مکانی کر کے راولپنڈی چلے گئے تھے، دوبارہ گھر آنے کی دعوت

ہیں اور ان کے ساتھ اپنے اختلافات کو نہایت خوشگوار ماحول میں ختم کریں۔ اس وقت  
 یہ لگتا کہ آئندہ ہندو، مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ مسلمان تشدد  
 سے باز رہیں گے اور کسی تنازعہ کی صورت میں ثالثی کے ذریعہ اختلافات کو ختم کرنے کی سعی کی جائے گی۔  
 اسی قرار داد میں مسلم لیگ نے ٹوٹر اقدام ذکر کرنے پر سرکاری حکام کی مذمت بھی کی۔

ایک اور قرار داد میں مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کے اس مطالبہ کو دہرایا گیا کہ حکومت صد  
 رحہ میں اصلاحات کرے اور اس صوبہ کو ملک کے دوسرے بڑے صوبوں کی سطح پر رہا جائے۔  
 سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے مختلف صوبوں کے نمائندوں پر مشتمل رہنماؤں کی  
 ایک خاص کمیٹی بھی تشکیل کی گئی جس میں ۳۲ رہنما شامل تھے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ ملک کی جماعتیں  
 تعاون ساز اور دوسرے منتخب اداروں، نیز سہول ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے سلسلہ میں  
 مطالبات مرتب کرے۔

اسی اجلاس میں گورنر جنرل کی طرف سے ۱۹۷۲ء کے کریمینل لاء ایڈمنٹ آرڈی نینس کے  
 نفاذ کی مذمت بھی کی گئی کیونکہ یہ آرڈی نینس انفرادی آزادی پر براؤ راست حملہ کے مترادف تھا۔  
 اس طرح انتظامیہ کو نہ صرف بے گناہ شہریوں کے ساتھ زیادتیوں بلکہ آئینی دائرے میں سیاسی  
 سرگرمیوں میں بھی مداخلت کا موقع ملتا تھا۔

اجلاس نے سیاسی صورت حال کی ذمہ داری حکومت پر عائد کرنے ہوئے مطالبہ کیا کہ  
 ہندوستانی عوام کے جو حقوق ایک ہر صد سے نصب کئے جا رہے تھے وہ فوری طور پر بحال کئے  
 جائیں کیونکہ اسی طریق سے ’سوراج‘ قائم ہو سکتا تھا۔

## آل پارٹیز کانفرنس

مولانا محمد علی نے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کی  
 ایک اور کوشش کی۔ انہوں نے لاگتوں کے صدر کی حیثیت میں تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں  
 کو بمبئی آنے کی دعوت دی، جہاں ۲۱ نومبر ۱۹۷۲ء سے کل ہند کانگریس کا اجلاس شروع ہو رہا تھا۔  
 اس اتحاد کی علامت کے طور پر انہوں نے ایک پارسی سرٹوٹا پلیٹ سے صدارت کرائی۔ گاندھی  
 چاہتے تھے کہ یہ اتحاد کانفرنس بمبئی میں منعقد ہونے کے دو ماہ بعد پھرتی میں طلب کی جائے۔  
 لیکن وہ اتحاد کانفرنس کے ’منصوبوں‘ کو یکسر مختلف انداز دے رہے تھے۔ ان کا مقصد



جانتے تھے کہ تمام جماعتیں کانگریس کے لیٹ فارم پر متحدہ رہیں اور سرائے اور ہندو مسلم اتحاد سے کوئی لائحہ عمل مرتب کریں جس کے بارے میں تفصیلی رپورٹ ۳۰ مارچ ۱۹۰۷ء تک اس میں پیش نہ کی جائے۔

۱۔ بمبئی کا اجلاس ۳۰ جنوری ۱۹۰۷ء کو پروگرام کے مطابق دہلی میں منعقد ہوا۔ صدارت سرائے کر رہے تھے۔ محمد علی جناح، علی براہران (مولانا محمد علی دودا)، شریعت علی، ڈاکٹر اے۔ اے۔ اصفہانی، سر محمد شفیع، ڈاکٹر کچو، سر عبد القیوم، پٹننڈ، منہا، اینی جینٹ، ڈاکٹر آزاد، مدین موہن مالویہ، سر وہی نائیڈو، جیگنند، اجندر پرشاد، لالہ لاجپت رائے، پنبل، اے۔ کمار اور۔ چن چندر پال موجود تھے۔ کانگریس نے اپنی تقریریں 'سوراج'، تمام پارٹیوں کے اتحاد اور کانگریس کے لیٹ فارم پر ان کے اجتماع کی بات کو گہرا یا۔ انہوں نے ایک اور ضمنی کمیٹی کی تشکیل کی تو ریزولوشن کی تاہم یہ کمیٹی اتحاد کے خطوط کا تعین کر سکے۔ یہ کمیٹی قائم ہوئی جس کے چار ممبر اراکین تھے۔ کمیٹی کے مقاصد یہ تھے،

۱۔ ایسی سفارشات۔ جن کے تحت تمام جماعتوں کو کانگریس کے لیٹ فارم یک جا کیا جائے۔

۲۔ تمام فرقوں کی نمائندگی کے لائحہ عمل کی ترتیب۔ اور مجلس تعاون ساز دیگر منتخب کاروں میں 'سوراج' کے تحت ان کی تقسیم۔

۳۔ سولی ملازمتوں میں تمام فرقوں کی مناسب نمائندگی اور اس کا طریق کار۔

۴۔ اور ایک کی ضروریات کے مطابق 'سوراج' کی سکیم کی ترتیب۔

اس موقع پر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی نمائندگی کی۔ ہندو مندوین کو مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کے مطالبات کا علم تو تھا ہی۔ لہذا ہندو مہاسبھا کے نمائندوں لالہ لاجپت رائے، سوامی شروہانند اور پٹنڈ مدین موہن مالویہ نے اس کانفرنس میں مسلم لیگ کے مطالبات کا تذکرہ کرنے سے قبل ہی پیش قدمی کی۔ مدین موہن مالویہ نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ مسلمانوں کے ہر مطالبہ پر غور کیا جاسکتا ہے مگر وہ کسی قیمت پر اپنی مسلم اکثریت (مسلم اکثریتی صوبوں میں) کو تسلیم نہیں کریں گے۔ مالویہ کا موقف یہ تھا کہ وہ فرقہ کی بنیادوں پر نمائندگی کے قائل نہیں۔ اگر اس پر اصرار کیا گیا تو کمیشن کیٹ سے آگے ایک قدم بھی نہ بڑھایا جائے گا۔ بالآخر دیگر مدین موہن مالویہ

یہ کہہ رہے تھے کہ مسلمان یا تو مخلوط انتخاب کے اصول کو مان لیں یا پھر اقلیتی حیثیت پر قائم رہیں مگر محمد علی جناح نے جوابی تقریر میں کہا کہ :

”کیا ہندو۔ اتنے ملاؤں میں اکثریت میں ہونے کے باوجود۔ صرف پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی برائے نام اکثریت پر بھی اعتماد نہیں کر سکتے ؟ اور اس عدم اعتماد کے باوجود وہ مسلمانوں سے اس امر کی توقع رکھیں گے کہ مسلمان ان پر انحصار اختیار کرتے چلے جائیں۔ جہاں تک معاہدہ کنکھو کا تعلق ہے وہ ایک مکمل خود مختار حکومت کے قیام کی طرف مجوزہ سکیم کا اولین اہم اقدام تھا۔ نیز یہ بات بھی قلمبسطہ نہ رہا کرتی کہ معاہدہ کنکھو کو مستقل حیثیت حاصل ہوگی۔“

پنجاب اور بنگال میں مخلوط انتخابات کا حوالہ دیتے ہوئے محمد علی جناح نے کہا : ”مسلمانوں کا کہنا یہ تھا کہ اس طریقہ انتخاب کے تحت ان کی قوت رائے دہی نہ ہونے کے برابر رہ جائے گی ، وہ دس یا پندرہ فیصد نشستیں بھی حاصل نہ کر سکیں گے علاوہ انہیں مختلف فرقوں کے درمیان منافقت کے باوجود لوگوں کے دلوں سے نہ ہی جذبات کو ختم نہیں کیا جاسکا۔ انتخابات میں انہوں نے اپنے ہم مذہب امیدواروں ہی کو ووٹ دیئے۔ نیز جب سے کانفرنس نے ’سوراج‘ کے قیام کی بات کی ہے ، تو یہ ضروری ہو گیا ہے کہ معاہدہ کنکھو پر بھی نظر ثانی کی جائے۔“

حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے پر صحیح معنوں میں اعتماد نہ تھا۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کا احساس یہ تھا کہ ان کی اکثریتی حیثیت بہر حال بحال کی جانی چاہئے۔ محمد علی جناح نے بھی کانفرنس میں اسی خیال کا اظہار کیا کہ معاہدہ کنکھو کا مقصد ہی یہ تھا کہ اقلیتوں کو دو طریقوں سے محفوظ کیا جائے۔ لہذا پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کی اکثریتی حیثیت کو اقلیتی حیثیت میں تبدیل نہ کیا جائے اور جہاں تک دوسرے صوبوں کا تعلق ہے تو معاہدہ کنکھو کے تحت اقلیتوں کے تحفظ کے لئے دونوں اصولوں پر عمل کیا جائے۔ نیز مولانا مازتوں کے سوال کو علیحدہ سوال کی حیثیت میں تسلیم کیا جائے۔

مگر لالہ لاجپت رائے بدستور علیحدہ قومیت کی نفی کرنے پر تلمے ہوئے تھے۔ ان کا موقف یہی تھا کہ فرقہ وارانہ نمائندگی کے ذریعہ قومیت کے مجموعی تصور کی نفی ہوگی اور ملک علائق تقسیم ہو کر رہ جائے گا۔ لالہ لاجپت رائے نے تمام حقائق اور حالات کی کسر انداز کرتے ہوئے یہی کہا کہ

اس سوال کو ہندوؤں یا مسلمانوں کے مفادات کے پیش نظر نہیں بلکہ ایک متحد قوم کے وسیع تر مفادات کے پیش نظر حل کرنا چاہئے تاکہ یہ متحد قوم۔۔ ان لوگوں کے خلاف نبو آزماتا ہو سکے۔ جو ہندوستانیوں کو خود مختار حکومت دینے سے کتر رہے تھے۔

جو ضمنی کمیٹی قائم کی گئی تھی اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک کا کام 'سوراج' کیلئے سکیم کا ڈھانچہ تیار کرنا اور دوسری کا کام ہندوؤں۔ مسلمانوں کے مسئلہ کا حل تھا۔ اول الذکر کمیٹی نے نو دوائیاتی مقصد کے سامنے جواب دہ کاہنہ اور (DOMINION STATUS) پر مبنی آئین کی سکیم کا ڈھانچہ مرتب کر لیا۔ یہ دوائیاتی مقصد، عوامی مجالس قانون ساز، مقامی اداروں، تعلیمی اداروں، ایوان ہائے تجارت، زمینداروں کی انجمنوں، ٹریڈ یونینوں وغیرہ کی طرف سے باواسطہ منتخب کی جانی تھی۔ مگر جہاں تک اس کمیٹی کا سوال تھا جسے ہندو مسلم مسائل کا حل تلاش کرنا تھا، بالکل ناکام رہی کیونکہ ہندو مندوین کسی صورت بھی اس معاملہ میں دلچسپی لینے پر آمادہ نظر نہ آتے تھے۔ چند ہندو رہنماؤں نے تو اس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت بھی نہ کی اور یہاں تراسش لے۔

چنانچہ جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچا جاسکا تو قحط پیدا ہو گیا اور کوشش کے باوجود ختم نہ کیا جاسکا آخر د مارچ ۱۹۲۵ء کو کانفرنس کے کنوینر، کانگری اور موٹی حل نہ ہونے کانفرنس کو غیر معیہ مدت کے لئے ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا اور یہ کہا کہ کانفرنس میں حاضری اتنی کم تھی کہ کسی فیصلہ پر پہنچنا ناممکن ہو گیا تھا۔ نیز حتمی نتائج پر پہنچنے کے لئے امکانات بھی روشن نظر نہ آتے تھے۔

اس ناکامی کے بعد ہندو رہنماؤں نے محمد علی جناح پر زور بھی مائد کیا کہ ان کے نقطہ نگاہ میں تبدیلی اچکی تھی اور اب ان پر قوت دارانہ رنگ غالب تھا۔ اس الزام کا جواب محمد علی بندت نے یہ دیا کہ انہوں نے کانفرنس میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ ان کے ذاتی خیالات قلعانہ تھے بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات تھے۔

تاہم۔۔ ہندو کے تعصب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کے دروازے ایک بار پھر اور ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے۔

### صوبہ سرحد کے لئے اصلاحات

۱۶ فروری ۱۹۲۶ء کو مرکزی اسمبلی میں ایک مسلمان رکن سید مرتضیٰ نے یہ قرارداد

پیش کی کہ مجلس قانون ساز اور وزیروں کی تقریروں کے بارے میں صوبہ سرحد میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کی مجوزہ شقوں کے نفاذ کے لئے گورنر جنرل سے درخواست کی جائے تاکہ اس طرح اہلیتوں کو محفوظ دیا جاسکے۔

یہ بڑی دلچسپ بات تھی کہ تمام صوبوں میں صرف ایک صوبہ سرحد تھا جہاں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کے اطلاق کو کسی نہ کسی بہانے ٹالا جا رہا تھا کیونکہ صوبہ سرحد، مسلم اکثریت کا صوبہ تھا لہذا ہندو اور انگریز مل کر یہ کوشش کر رہے تھے کہ اس ایکٹ کا اطلاق صوبہ سرحد پر نہ ہو۔

سیکرٹری، کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے اور اسمبلی میں 'سوراج' پارٹی کے بھی رکن تھے۔ اس پارٹی کی قیادت پنڈت موتی لعل نہرو کے ہاتھ میں تھی۔ جب انہوں نے یہ قرارداد پیش کی تو ان کی اپنی پارٹی کے اراکین نے اس بنا پر مخالفت شروع کر دی کہ ایک طرف ہندوستان کے لئے 'سوراج' کا مطالبہ جاری تھا تو دوسری طرف صوبہ سرحد پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء

کے اطلاق کی ناہیدیکسے کی جاسکتی تھی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی پارٹی ان صوبوں میں، جو ہندو اکثریت کے صوبے تھے، اسی ایکٹ کے اطلاق پر مقرر تھی نہ تھی۔ اس پارٹی کے متعصب ہندو۔ ہندوؤں نے تو یہاں تک کہا کہ صوبہ سرحد میں پہلے ہی فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں لہذا وہاں پر اکثریت کو ایسے اختیارات کیونکر تفویض کر دیئے جائیں کہ وہ اقلیت کو مزید سراسیمہ کرے۔

راجہ منظر علی خاں نے بھی اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے قرارداد کے حق میں بات کی اور مخالفت کرنے والوں سے یہ سوال کیا کہ اگر صوبہ سرحد میں فرقہ وارانہ فساد کی بنا پر اکثریت کو اختیارات سونپنے میں تاہل تھا تو وہ کون سا صوبہ تھا جہاں فسادات نہیں ہوئے تھے۔ کیا یہی فسادات یوپی کے اس صوبے میں نہیں ہوئے جو خود پنڈت موتی لعل نہرو کا وطن تھا اور کیا اس اعتبار سے یوپی کے لوگوں کو آزادی سے محروم کر دیا جاتا چاہئے تھا؟

اسی دوران 'سوراج' پارٹی نے اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سید مرتضیٰ، جنہوں نے صوبہ سرحد کے بارے میں قرارداد پیش کی تھی، 'سوراج' پارٹی سے اس امر کی اجازت طلب کی کہ جیت تک اسمبلی کے اندر ان کی قرارداد پر بحث ہو وہ اجلاس میں شریک رہیں۔ لیکن پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لعل نہرو نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ اس کے سید مرتضیٰ نے واضح الفاظ میں یہ بتا دیا کہ وہ اس قرارداد پر بحث میں ضرور حصہ لیں گے خواہ انہیں پارٹی سے محال بھی کیوں نہ دیا جائے۔

جب قرارداد پر بحث کا آغاز ہوا تو محمد علی جناح نے واضح الفاظ میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس سوال میں فرق دارانہ معاملے کو کسی قیمت پر بھی شامل نہ کیا جائے انہوں نے کہا کہ فسادات صوبہ سرحد میں ہوں یا کسی اور صوبے میں، بہر حال قابل مذمت ہوں گے۔ لیکن اس بات میں کوئی استدلال نہیں کہ صوبہ سرحد کے سوال کو ان خطوط پر نہ دیکھا جائے جن خطوط پر دوسرے صوبوں کے معاملات کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس نوعیت کے فسادات صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ غیر ملک میں بھی جوتے رہے ہیں۔ کینیڈا میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان فسادات پر لارڈ ڈاؤم کی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے جناح نے کہا کہ یہ فسادات دو پارٹیوں میں مختلف خیالات یا حکومت کے سلسلے میں مختلف متعابد کی بنیاد پر نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ دونوں کا تضاد تھا جو ایک دوسرے سے نفرت کر رہی تھیں اور سیاست سے الگ تھلک ہو کر سماجی زندگی میں خلل پیدا کر رہی تھیں وہاں حالت یہ ہو گئی تھی کہ مختلف معاشرے کے لوگ صرف ایک دوسرے سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اگر بچے بھی آپس میں جھگڑتے تو دو پارٹیاں بن جاتیں، یعنی ایک انگریز اور دوسری فرانسیسی پارٹی! محمد علی جناح نے کہا ہندوستان کے حالات مذکورہ واقعات سے بھی بدتر تھے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جسے ہندوستان کے تمام لوگ مل کر ہی حل کر سکتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے صوبہ سرحد کے مسئلے پر بات کی اور کہا کہ سر ڈینی بورے نے صوبہ سرحد کی جس تحقیقاتی کمیٹی کی صدارت کی تھی اس کی رپورٹ میں انہوں نے خود تسلیم کیا تھا کہ صوبہ سرحد کے لوگ ہندوستان کے دوسرے لوگوں سے انتظامی صلاحیتوں اور ذہانت میں کسی صورت بھی پیچھے نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس تجویز کا حوالہ دیا جس کے تحت صوبہ سرحد کو پنجاب میں دلف کرنے کے لئے کہا گیا تھا تاکہ اس طرح ہندو اقلیت کی چشمت بہتر ہو جائے۔ محمد علی جناح نے کہا کہ صوبہ سرحد کے لوگ پنجاب کے لوگوں سے مختلف تھے اور انہیں زبردستی پنجاب کے ساتھ منسلک کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ علاوہ ازیں صوبہ سرحد کو کوئی چھوٹا سا صوبہ نہ تھا وہاں ۴۰ لاکھ افراد کی آبادی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں یورپ میں ایسی ۴۰ لاکھ آبادی تھی۔ انہوں نے صوبہ سرحد کے لئے اصلاحات کو ناگزیر قرار دیا اور یہ سوال بھی کیا کہ صوبہ سرحد کے عوام کے لئے اصلاحات نافذ کرنے سے کیا فائدہ پہنچے گا اور اصلاحات کے نفاذ کی صورت میں ہندوؤں کو کیا نقصان پہنچے گا؟ محمد علی جناح نے ایک انگریزی روزنامے کے اداریہ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ صوبہ سرحد

لوگوں پر افسر شاہی کی دست درازیاں ظلم و ستم کی حد تک پہنچ چکی تھیں اور اسی وجہ سے صوبہ سرحد کی حکومت پر عام طور پر تنقید کی جا رہی تھی۔ اگر عوام کے نائنڈے یہی چاہتے تھے کہ صوبہ سرحد کے لوگ اس ظلم و ستم کے مسلسل شکار نہیں تو یہ ایک طبعہ بات ہوگی۔ محمد علی جناح نے حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ وہ صوبہ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کے سوال کا حتمی جواب دے کیونکہ اس کی خاموشی کی صورت میں مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ حکومت ہندوؤں کی طرف راہنمائی کر رہی تھی اور شاہد ہندوؤں سے خائف بھی تھا۔

محمد علی جناح کے دلائل اتنے مضبوط تھے کہ یہ قرارداد اسمبلی میں منظور کر لی گئی۔ لیکن اس کے باوجود ہندو تنظیموں کے مظاہروں اور حکومت کی بے بسی کے باعث آئندہ مزید کئی سال تک صوبہ سرحد کے مسلمان ان اصلاحات سے محروم رہے۔

## مسلمانوں کا اتحاد

۲۴ مئی ۱۹۲۵ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کے پچاس سال پورے ہو چکے تھے اور دسمبر ۱۹۲۵ء میں یونیورسٹی کی طرف سے گولڈن جوبلی منانے کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ مسلمان ہندوستان کے کونے کونے سے علی گڑھ پہنچ رہے تھے۔ اسی دوران علی گڑھ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس بھی منعقد ہونا قرار پائے۔ یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی میں ہزار ہا ہمان شریک ہوئے۔ اب تک ہندوستان میں مسلمانوں کا اس سے بڑا کوئی اجتماع نہیں ہوا تھا۔ اجلاس کی صدارت یونیورسٹی کی چانسلر اور ریاست بھوپال کی عکرم ان ہرنائی نس سلطان جلالپور نے کی۔ اس تقریب میں مسلمانوں کے ہر طبقہ خیال اور ہر سیاسی جماعت سے متعلق مسلمانوں نے شرکت کی۔ برطانیہ اور آئرلینڈ کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی شریک ہوئے۔ ایک وقت وہ صاحب ۵۰۰۰۰۰ میں ایچکو اور نیٹل کے نام سے یہاں ایک چھوٹی سی درس گاہ قائم کی گئی تھی اور کالج میں صرف سات پروفیسر اور گیارہ طالب علم تھے لیکن اب یہی چھوٹی سی جگہ ایک عظیم یونیورسٹی بن گئی تھی جہاں دو ہزار طالب علم تھے۔ یونیورسٹی کی اپنی مالیشان عمارات تھیں۔ اس موقع پر پونے دو لاکھ روپے بطور عطیہ جمع ہوئے اور تقریباً پین لاکھ روپے کے عطیات کا وعدہ کیا گیا کہ وہاں انجینئرنگ اور میکانک جی کا قاعدہ کالج قائم کیا جائے۔

## مسلم لیگ کا اجلاس علیگڑھ

کیونکہ ہندوستان بھر کے مسلمان اس تقریب میں موجود تھے، لہذا مسلمانوں کے مسائل پر غور و خوض کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی وقت نہ تھا۔ اسی جہت سے مسلم لیگ نے اپنا ۱۰واں اجلاس علی گڑھ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کی صدارت کلکتہ کے سر عبد الرحیم کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا:

”ہندو اور مسلمان، عیسائیوں کے دو فرقوں پر وٹسٹنٹ اور کیتھولک کی طرح نہیں بلکہ دو مختلف قوموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کی قدیم روایات، ان کی سماجی زندگی، ان کا تہذیب و تمدن، ان کی تاریخ اور مذہب اور اخلاقی اقدار سبھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ وہ ایک ہزار سال سے ایک جگہ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ماحول کو نہیں اپنا سکے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اس مقصد کے لئے ان پر سیاسی اقتدار قائم کرنے کی کوشش کی۔ بہت کم مروجے ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کو واضح اکثریت حاصل ہے۔ لہذا ان کے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ ہر جگہ سے مخلوط انتخاب میں حصہ لیں۔ موجودہ حالات میں ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ مسلمانوں کے لئے مخلوط انتخابات قابل قبول ہو سکتے ہیں اور اگر مخلوط انتخابات میں مسلمانوں کے لئے کچھ نشستیں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمانوں کے لئے یہ اقدام مزید قابل اعتراض ہوگا۔ اگر مسلمانوں کو نظام مجالس قانون ساز اور دیگر خود مختار اداروں کے لئے منتخب نہ کیا گیا تو وہ ایسے ہر اقدام کے خلاف، جو ان کے مفادات میں نہ ہو، کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اگر کچھ مسلمان مخلوط حلقہ ہائے انتخابات سے منتخب ہو بھی جائیں گے تو وہ قطعی طور پر اپنے انتخابات میں ہندوؤں کے دھوکہ پر ہوں گے۔ وہ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی مسلمانوں کی خواہشات کا احترام کر سکیں گے۔“

اس کے بعد سر عبد الرحیم نے مسلمانوں سے متحد ہونے کی اپیل کی۔ انہوں نے کہا کہ اگر مسلمانوں نے صوبائی اسمبلیوں میں کسی متحدہ جماعت کی تشکیل نہ کی تو جدا جدا انتخابات کا مقصد فوت ہو کر رہ

جائے گا۔ جداگذا انتخابات کی ضرورت محض اس لئے نہیں کہ مسلمان مل میٹر کو فرقہ دارانہ معاملہ پر تبادلا خیال کریں بلکہ اصل مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ، ان کی قوت اور ان کی سیاسی سوچ کا ارتقاء ہے۔

مسلم لیگ نے اپنے اجلاس ملی گروہ میں یہ قرار دایں منظور کیں،

۱۔ ملک کی تمام صوبائی اسمبلیوں اور دیگر منتخب اداروں میں مؤثر اور مناسب نمائندگی کا حتمی اصول تسلیم کیا جائے اور کسی صوبے میں اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کیا جائے اور نہ ہی اقلیت کو اکثریت کے مقابلے میں توازن دیا جائے۔

۲۔ مجموعہ طریق کار کے ذریعہ فرقہ دارانہ گروہوں کی نمائندگی جداگذا انتخابات کے ذریعے جاری رہے اور کسی بھی فرقے کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ جداگذا انتخاب سے کسی وقت بھی دست بردار ہو کر مخلوط انتخاب کے حق میں ہو جائے۔

۳۔ اگر کسی وقت کہیں بھی ملاقاتی رد و بدل ضروری خیال کیا جائے تو پنجاب، بنگال اور صوبہ سرحد کی مسلمان اکثریت پر کسی صورت کوئی اثر نہ پڑے۔

۴۔ تمام فرقوں کے لوگوں کو مکمل مذہبی، تعلیمی اور انکسار خیال کی آزادی مہیا کی جائے۔ کسی صوبائی اسمبلی یا دوسرے منتخب ادارے میں کوئی بل یا قرارداد اس وقت تک منظور نہ کی جائے جب تک اس بل یا قرارداد کی مخالفت کسی فرقے کے تین چوتھائی اراکین کر رہے ہوں کیونکہ اس صورت میں ایسی کسی قرارداد یا بل ان دونوں کے کسی حصے کی منظوری اُس مخصوص فرقے کے لئے معضرت ثابت ہوگی۔ ایسے معاملات سے نمٹنے کے لئے کوئی دوسرا ممکن اہل طریقہ دریافت کیا جائے۔

ان قراردادوں کو محمد علی جناح کی تائید حاصل تھی، تاہم مولانا محمد علی، مولانا شوکت، محمد ساقی اور مولانا عبدالباری نے ان کی مخالفت کی۔ مولانا محمد علی نے یہ مطالبہ کیا کہ ایک گول میسز کانفرنس طلب کی جائے جس میں تمام فرقوں اور سیاسی جماعتوں کے نمائندے شریک ہوں تاکہ اس کانفرنس میں 'سوراج' کے لئے آئین وضع کیا جاسکے۔

یہ پہلا موقع تھا جب مسلم لیگ کے پیٹ خدام سے سندھ کی بھٹی سے علیحدہ گھکا مطالبہ کیا گیا۔ اس ضمن میں جو قرارداد منظور کی گئی اس میں کہا گیا کہ بھٹی کے ساتھ سندھ کو منسلک رکھنے کا حیران افشانی یا کوئی اور جواز نہیں۔ ماضی کے تجربات شاہد تھے کہ سندھ کے لوگوں کو اس بنادر پر شدید



مان پنپا اور اس کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ لہذا سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔  
ان تمام قراردادوں کے بارے میں مسلم لیگ نے دوسری جماعتوں اور فرقوں کے ساتھ مخالفت  
بات چیت کے دروازے کھلے رکھے۔ ایک کیٹیجی بھی قائم کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ آئینی ارتقاء کیلئے  
سیکیم مرتب کرے جو شاہی کمیشن کے سامنے پیش کی جائے اور جس میں مسلمانوں کے مفادات کا  
محفوظ خیال رکھا جائے۔ یہ سیشن ۱۹- اراکین پر مشتمل تھی۔

## اصلاحات کی تحقیقاتی کمیٹی

فروری ۱۹۶۲ء میں مرکزی اسمبلی کے ایک رکن دیوان بہادر رنگ چاری نے مرکزی اسمبلی  
میں ایک قرارداد پیش کی جس میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا گیا تاکہ ہندوستان  
کے لئے سلطنت برطانیہ کے دائرے میں رہتے ہوئے مکمل خود مختار حیثیت اور صوبائی خود مختاری  
کے بلوازہ حصول کا جائزہ لیا جاسکے۔ سو راج پارٹی کے قائد پنڈت موتی لعل نہرو نے اس  
زارواہ میں ایک ترمیم پیش کی جس کے ذریعے بلوازہ ایک گول میز کانفرنس بلائے کا مطالبہ  
کیا گیا تاکہ ہندوستان کی اہم اقلیتوں کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے لئے  
آئین کی ایک ایسی سیکم مرتب کی جاسکے اور اس کے بعد مرکزی مقننہ کو ختم کر کے مجوزہ ایسی سیکم کو ایک  
مختص ہندوستانی مقننہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اسی سیکم کو برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے  
پیش کیا جائے تاکہ وہ اسے آئینی صورت دے۔ ہوم ممبر مرانکم سیلی نے اس قرارداد اور ترمیم  
سے مارے میں بتایا کہ حکومت اس سلسلے میں تحقیقات کرنے پر آمادہ تھی اور اگر تحقیقات کے بعد  
فی الواقعہ چھوٹا کر ایکٹ میں خامیاں موجود ہیں اور اس ایکٹ کے اندر آگے بڑھنے کے لئے  
چھٹا اور امکانات موجود ہیں تو اس قسم کی سفارشات ضرور پیش کی جائیں گی۔ لیکن اگر تحقیقات سے  
بیرونیج ہوگا کہ آئین میں ترمیم کئے بغیر آگے بڑھا ممکن نہیں تو اس صورت میں اس مسئلہ کو لازماً ایک  
علیحدہ مسئلہ کی حیثیت دینا ضروری ہوگا اور حکومت کسی صورت بھی یا بند نہ ہوگی۔

محمد علی جناح نے تقریر کرتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء میں حکومت کی  
طرف سے ترمیم اور نظر ثانی کی ضرورت کو تسلیم کر لینے پر خوشی کا اظہار کیا تاہم انہوں نے ماکم سیلی  
کی اس بات سے اتفاق نہ کیا کہ حکمرانوں کی بات ہے۔ محمد علی جناح نے گول میز کانفرنس کے انعقاد  
کی تائید بھی کی تاکہ اس کانفرنس میں حکومت کے مشورے سے ایک آئین بھی مرتب کیا جائے۔

پڈٹ موتی لعل نہرو کی ترمیم اسمبلی میں منظور کر لی گئی۔ آئینی ارتقا سے متعلق حکومت ہند نے اصلاحات کی ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کر دی۔ لیکن اس کمیٹی کے جو مقاصد بیان کئے گئے ان میں وہ چمک موجود نہ تھی جس کے بارے میں ماکمل پہلی نے اسمبلی میں یقین دلایا تھا۔ اس کمیٹی میں مندرجہ ذیل افراد شامل تھے:

سرایینڈر (چیرمین)، سر محمد شعیب، مہاراجہ بردوان، سر آر تھروڈوم، سر ہنری مکنٹر، سر تیج بہادر سہو، سر سیواسوامی آئر، محمد علی جناح اور ڈاکٹر برنجا پی۔

کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا اور ہندوستانی وزرا اور ایگزیکٹو کونسلوں کے اراکین کے علاوہ بہت سے دیگر نمایاں لوگوں کے بیانات بھی قلم بند کئے۔ مگر یہ کمیٹی متفقہ رپورٹ مرتب نہ کر سکی۔ کمیٹی کے پانچ اراکین کی ایک رپورٹ تھی اور چار اراکین کی دوسری۔! محمد علی جناح چار آدمیوں کی رپورٹ پر دستخط کرنے والوں میں ایک تھے۔ جہاں تک پانچ اراکین کی رپورٹ کا تعلق تھا تو لب باب یہ تھا کہ ایکٹ میں شامل دو عملی حکومت کی سکیم کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے بعض سفارشات کی گئی تھیں تاہم ان میں دو عملی آئین کی نامیوں کے بارے میں کوئی تدبیر موجود نہ تھا۔ اس رپورٹ پر دستخط کرنے والے پانچوں اراکین اس بات پر متفق تھے کہ ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کے لئے مناسب تربیت ممکن ہو سکتی ہے۔

اس کے مقابلے میں چار اراکین اس بات پر متفق تھے کہ موجودہ آئین میں بہت سے نقائص موجود تھے۔ لوگوں کو محفوظ اور منتقل حکمرانی کے انتظام و انصرام اور پالیسیوں کے رد عمل پر شدید اعتراض تھا۔ اس رپورٹ میں کہا گیا کہ وزرا، مقصد کے سامنے پوری طرح ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ محکمہ خزانہ جو ایک محفوظ محکمہ تھا، تمام اخراجات پر کنٹرول کرتا تھا۔ اور بعض وزرا اور ایگزیکٹو کے اراکین کے درمیان بہت سے اختلافات پیدا ہو جاتے تھے۔ اس کمیٹی نے واضح الفاظ میں یہ کہا کہ دو عملی نظام قطعی طور پر ناکام ثابت ہوا تھا اور مستقبل میں اس نظام کے تحت بہتر نتائج کی توقع رکھنا عبث تھا۔

دو سال بعد یعنی ۱۹۶۷ء میں حکومت برطانیہ نے ایک کمیشن قائم کیا۔ قیام کا مقصد یہ تھا کہ آئینی اصلاحات کے تمام مسائل پر غور کیا جائے۔ اس کمیشن میں کیوبیکر کوئی ہندوستانی شامل نہ کیا گیا لہذا ہندوستان میں اس بات پر شدید مزاحمت کی گئی۔

دوسرا مسئلہ ہندوستانیوں کے لئے فوجی تربیت کا تھا۔ فروری ۱۹۶۵ء میں ایک

ہندو کہیں اسمبلی نے مرکزی اسمبلی میں اس امر کی قرارداد پیش کی کہ کسی مناسب جگہ اور فوری طور پر ایک ملٹری کالج کھولا جائے جہاں ہندوستان کی فوج میں ہندوستانی کیشینڈ افسروں کے عہدوں کی تربیت کے لئے انتظام ہو۔ محمد علی جناح اس سے پہلے بھی یہی مطالبہ کر چکے تھے۔ انہوں نے صاف طور پر یہ کہا تھا،

”ہم ڈیڑھ سو سال سے تمہاری حکومت کے محکوم ہیں۔ تمہاری انگریز حکومت نے ہندوستان کے عوام کو ہتھیاروں سے محروم کر رکھا ہے، سوال یہ ہے کہ تم نے کیا کیا ہے؟ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ بھلا فوجی اور ہندوستانی فوجوں میں سب افسرانگریز ہیں۔ صرف دو تین سال پہلے ہیں دو معمولی سی مراعات دی گئیں کہ ۱۰ طالب علموں کو سینڈ ہرسٹ بھیجا گیا ڈیڑھ سو سال حکومت میں یہ پٹا مٹتا ہے کہ تم نے چند لوگوں کو کنگ کیشن دیا۔ آج پوری فوج علاوہ انگلستان کی ہوا ہندوستان کی، انگریزوں سے بھری فوجی ہے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہندوستان کی فوج میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی ہوں۔“

اس منہوم کی قرارداد منظور کر لی گئی اور اسمبلی نے ہندوستان میں ہندوستانی افسروں کی تربیت کے لئے ایک ملٹری کالج قائم کرنے کی غرض سے اقدامات کرنے اور حالات کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی قائم کرنے کی سفارش کی۔ جولائی ۱۹۲۵ء میں ایک انڈین سینڈ ہرسٹ کمیٹی قائم کی گئی جس میں بیٹنٹن جنرل سر اینڈریو سیکی، کمپشن نمبر جی، مہی سٹینا، سردار جگندر سنگھ، سر عبد القیوم، محمد علی جناح، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، دیوان بہادر رام چندر راؤ، کمپشن بہار سنگھ، کمپشن گل محمد خاں، پنڈت مونی لعل نہرو اور ای برڈن شامل تھے۔ اس سال اگست میں اس کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا۔ بعد ازاں ایک سب کمیٹی تشکیل کر دی گئی جس کے قائد محمد علی جناح تھے۔ اس کمیٹی نے پورے یورپ کا دورہ کیا اور وہاں مختلف فوجی کالوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا۔ کمیٹی نے ۱۹۲۵ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اسمبلی میں سیکرٹری کی سفارشات کو موثر بنانے کے لئے ایک قرارداد پر تقرر کرتے ہوئے محمد علی جناح نے بتایا کہ وہ یورپ میں جہاں بھی گئے، ہندوستان میں فوجی عمل کی تجربہ کار خیر مقدم کیا گیا لیکن صرف سینڈ ہرسٹ کالج نے اس کی مخالفت کی۔ محمد علی جناح نے کہا کہ اگر انگریزوں کے بچے تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں اور اگر وہ اس ملک میں پنی سٹیٹ اور صلاحیت کے مطابق عہدے حاصل کرنا نہیں چاہتے تو اگست ۱۹۲۷ء کا اعلان

ابھی اور یہیں چھاڑ دیا جائے نیز ہندوستان کے عوام کو صاف بتا دیا جائے کہ انگریز اس ملک میں صرف حکومت کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔ محمد علی جناح نے بڑے کچلے الفاظ میں یہ بھی کہا کہ یہ انگریز کا وہی تعصب ہے جو اس نے سول ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی بھرتی اور مونیو کمپنیز اصلاحات کے نفاذ کے وقت برتا تھا۔ سول ملازمتوں میں ہندوستانیوں کو جگہ دینے کی بات آئی تو انگریز افسروں نے یہ کہہ کر اگر ہندوستانیوں کو شامل کیا گیا تو وہ سب استغناء دے دیں گے کیونکہ وہ ہندوستانیوں کے غلام بن کر نہیں رہنا چاہتے اور جب اصلاحات کی باری آئی تو بہت سے انگریزوں نے یہ کہہ دیا کہ وہ ان اصلاحات کو تسلیم کرنے کی بجائے اس ملک کو چھوڑ دینا پسند کریں گے لیکن آج بھی وہی دھکی دینے والے اسمبلی کی بنیوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔

## سائمن کمیشن

آئینی مشینری کی تطہیر کے لئے مختلف سیاسی جماعتوں کے مسلسل مطالبے سے مجبور ہو کر برطانوی حکومت نے ۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو ایک کمیشن قائم کر دیا جس کا کام جو رنٹن آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کی کارکردگی کے بارے میں تحقیقات کرنا اور تبدیلیوں کے لئے سفارش کرنا تھا۔ اس کمیشن کے چیرمین سر جان سائمن تھے۔ یہ قطعی طور پر ایک پارلیمانی کمیشن تھا جس میں برطانوی ایوان عوام کے پانچ اور ایوان بالاکے دو اراکین شامل تھے۔ کمیشن کے قیام کے بعد ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں سے کہا گیا کہ وہ کمیشن کے سامنے پیش کرنے کے لئے تجاویز مرتب کریں اور اس سلسلے میں کمیٹیاں قائم کریں۔ ہندوستان کے تمام سیاسی رہنماؤں اور عوام کو اس بات پر شدید اعتراض تھا کہ کمیشن کے تمام اراکین انگریز تھے اور اس میں کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اسی لئے کوئی بھی شخص کمیشن کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔

## کانگریس کا بائیکاٹ

کانگریس نے کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا اور محمد علی جناح نے مسلم اور غیر مسلم رہنماؤں کے نام ایک مراسلہ روانہ کیا۔ انہوں نے تمام نمایاں رہنماؤں سے درخواست کی کہ وہ اپنا نام اس مسودے پر دستخط کرنے والوں کی فہرست میں شامل کرنے کا اختیار دیں۔ محمد علی جناح کو اس مقصد میں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے علاوہ سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں

نے بھی انہیں اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔

اس وقت مسلمانوں میں اتنا افتراق پیدا ہو چکا تھا کہ پنجاب کے میاں محمد شفیع نے پٹنہ گروہ کے ساتھ سائنس کمیشن سے تعاون کرنے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے لاہور میں ایک اجلاس بھی بلا لیا اور سائنس کمیشن کے ساتھ تعاون کی قرارداد بھی منظور کرائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان میں دو مسلم لیگیں قائم ہو گئیں۔ حالانکہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے دسمبر ۱۹۲۷ء کے آخری ہفتے میں مسلم لیگ کا اجلاس لاہور طلب کرنا چاہا تھا لیکن اس کے بعد کونسل نے یہ اجلاس کلکتہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح ۱۹۲۷ء میں مسلم لیگ کے دو اجلاس منعقد ہوئے یعنی ایک لاہور میں اور دوسرا کلکتہ میں؛ تاہم کلکتہ کے اجلاس میں زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس کی صدارت مراد آباد کے مولوی محمد یعقوب نے کی۔ اجلاس نے ایک قرارداد بھی منظور کی اور اعلان کر دیا کہ ہندوستان بھر کے مسلمان کمیشن سے کوئی تعاون نہیں کریں گے۔ ایک اور قرارداد میں میاں محمد شفیع کی طرف سے لاہور میں مسلم لیگ کا زیر آئینی اجلاس منعقد کرنے کی بھی شدید مذمت کی گئی اور پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کو ختم کر کے پنجاب کے مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے صوبے کے لئے ایک فائندہ صوبائی مسلم لیگ کی تشکیل کریں۔

## مسلم لیگ کی قرارداد

مسلم لیگ نے ہندوؤں کا یہ بہانہ ختم کرنے کے لئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد میں جداگانہ انتخاب رکاوٹ تھے، کچھ اور قراردادیں بھی منظور کیں،

- ۱۔ سندھ کو بلوچی سے الگ کر کے ایک الگ صوبے کی آئینی حیثیت دی جائے۔
- ۲۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں بھی اسی سطح کی اصلاحات کا نفاذ کیا جائے جو دوسرے صوبوں میں موجود ہیں۔

۳۔ اگر ایسا کیا گیا تو مسلمان ان نئے صوبوں میں مخلوط انتخاب کے لئے تیار ہو جائیں گے اور سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں ہندو اقلیتوں کو بھی وہی مراعات دینے پر آمادہ ہوں گے جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے دی جائیں گی۔

۱۹۴۳ء میں لارڈ برکن ہیڈ وزیر امور ہند تھے۔ انہوں نے بار بار یہ کہا تھا کہ ہندوستانی اس قابل نہیں کہ وہاں نوآبادیاتی درجے کی حکومت خود اختیاری دی جائے۔ بترہہ ہوگا کہ انگریز، برطانیہ کی طاقت کی خاطر اور ہندوستان کی بھلائی کے لئے ہندوستان میں رہے۔ جب ہندوستانیوں نے سائنس گمشدہ کا بائیکاٹ کیا تو لارڈ برکن ہیڈ نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہندوستانی ہمیشہ حکومت کے خلاف تحریکی نقطہ نظر سے بات کرتے ہیں وہ اپنی طرف سے ایسی کے لئے کوئی متحدہ حکم پیش کیوں نہیں کرتے؟

## نہ رپورٹ اور تجاوزِ دل

۱۹۲۳ء کے اجلاس لاہور سے مسلم لیگ جو مطالبات کر رہی تھی وہی مطالبات اس نے اپنے اجلاس علی گڑھ منعقدہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں دہرائے۔ مسلم لیگ نے کانگریس کے ساتھ معاہدہ کے سلسلے میں جو کشمکشیں کی تھیں وہ بھی بار آور نہ ہو سکیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۲۶ء میں دہلی میں شیخ عبدالقادر کی زیر صدارت منعقد ہوا اور ایک بار پھر لاہور اور علی گڑھ کے مطالبات کا اعادہ کیا گیا۔ مسلم لیگ کا مقصد یہی تھا کہ کسی طرح حکومت حیدرآباد، ہندوستان کو ایک خود مختار نوآبادیاتی حکومت کا درجہ دینے کی طرف پیش قدمی کرے۔ دہلی کے اجلاس میں محمد علی جناح نے خود ایک قرارداد پیش کی اور کہا:

”مسلمانوں کے بارے میں کانگریس کا رویہ اب تک غیر یقینی ہے کیونکہ اس لمحہ تک کوئی ذمہ دار کانگریسی یا ہندو رہنما ٹھوس تجاویز کے ساتھ سامنے نہیں آیا اور ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہی مناسب نہیں سمجھا۔ ملک کے اندر فرقہ واریت بدستور موجود ہے اور اس کو بات چیت کے ذریعہ ختم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ غلط انتخابات کے ذریعے قومیت کو ایک سطح پر لایا جاسکتا ہے۔ ہمارے سامنے کینیڈا کی مثال

موجود ہے۔ یہاں جدا جدا انتخابات ایک نمائندہ حکومت کی نشوونما میں کبھی مائل نہیں ہوئے۔ ہماری خواہش تو صرف اتنی ہے کہ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ حوثی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت ہو جائے اور اختلافات ختم ہو جائیں، تو ایک ذمہ دار اور خود مختار حکومت کے قیام کے سلسلے میں ہمارا نصف سفر طے ہو جائے۔

محمد علی جناح نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے سلسلے میں اپنی کوشش جاری رکھی۔ اس موقع پر پنڈت مونی لعل نہرو نے محمد علی جناح کو ذاتی حیثیت سے یقین دلایا کہ اگر مسلمانوں نے مخلوط انتخاب کو تسلیم کر لیا تو وہ کانگریس کو مسلمانوں کے باقی تمام مطالبات ماننے پر مجبور کر سکتے تھے۔ چنانچہ محمد علی جناح نے یہ مناسب خیال کیا کہ پنڈت مونی لعل نہرو کی اس پیش کش کی بنیاد کو کبھی آزمایا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ انہوں نے ۲۰ مارچ ۱۹۴۷ء کو دلی ہی میں مختلف طبقہ خیال کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس طلب کی اور انہیں تاروں کے ذریعہ دعوت نامے روانہ کر دیئے۔ یہ کانفرنس محمد علی جناح کے گھر پر ہی منعقد ہوئی، جس میں سر محمد شفیع، سر علی امام، مفتی کفایت اللہ، راجہ ہشمن علی خاں، سر محمد داز، صاحبزادہ عبدالقیوم، میان شہنواز، مہاراجہ محمود آباد، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، مولوی شفیع داؤدی، ڈاکٹر عبداللہ سہروردی، سید مرتضیٰ، عبدالمبین چودھری اور اقرار العظیم نمایاں تھے۔ کانفرنس کے سیکرٹری راجہ ہشمن علی خاں اور صدر محمد علی جناح تھے۔ کئی نشستوں اور دو دن کے غور و خوض کے بعد کانفرنس نے ایک فارمولہ تیار کیا جو یہ تھا:

- ۱۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔
- ۲۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات کا نفاذ کر کے دونوں صوبوں کو، دوسرے صوبوں کا درجہ دیا جائے۔
- ۳۔ مسلمان صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان میں ہندو اقلیتوں کے لئے وہ تمام مراعات دینے پر تیار ہوں جو مسلمانوں کو ہندو اکثریتی صوبوں میں دی جائیں گی۔
- ۴۔ پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کی مطابقت سے ہو۔
- ۵۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہ ہو۔
- ۶۔ اگر یہ تجاویز منظور کر لی جائیں تو مسلمان مخلوط انتخابات پر تیار ہو جائیں گے۔



۱۰۔ مارچ ۱۹۲۷ء کو یہ فارمولہ شائع کر دیا گیا اور مختلف مسلمان - ہندوؤں نے یہ فارمولہ ج کرنے پر محمد علی جناح کی ذہانت کی بہت تعریف کی۔ لیکن سید محمد شفیع، جو اس کا فرانسس ٹریکس تھے، سب لاجور واپس پہنچے تو انہوں نے ایک بیان میں اس فارمولہ سے اختلاف ظاہر کیا۔ یہ فارمولہ اتنا واضح اور منصفانہ تھا کہ ہندوؤں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں اٹھا سکتے تھے۔ صورت یہ تھی کہ مجموعی طور پر ہندوستان میں مسلمان، اقلیت میں تھے۔ لیکن دی کی تقسیم اس طرح تھی کہ وہ پانچ صوبوں میں اکثریت کے حامل تھے جبکہ ہندوؤں کو اسی صوبوں میں اکثریت حاصل تھی۔ یہ قدرتی بات تھی کہ اگر ہندو اپنی اکثریت کے مات صوبوں میں مسلمانوں کو کچھ مراعات دیتے تو مسلمان اپنے اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں - بھی یہی مراعات دیتے۔ مرکز میں مسلمانوں نے اپنے لئے ایک تنہائی نشستوں کی تخصیص مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ وہ اپنی نمائندگی محسوس کرا سکیں۔ اس فارمولہ کے تحت ہندو یا مسلمان کسی ایک سے بھی نا انصافی نہ ہوتی تھی۔ لیکن ان تجاویز سے اتفاق نہ کیا گیا۔ ہندو عبارات نے اس فارمولہ پر شور مچایا۔ سرفضل حسین نے بھی پس پردہ مخالفت شروع کر دی۔ بعد چاہتے تھے کہ مسلمان، مخلوط انتخاب کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیں اور مسلمانوں پر ہندوؤں غلبہ بہستور رہے۔ علامہ اقبال اس وقت صوبائی کونسل کے رکن تھے۔ انہوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ بھی اس فارمولہ کے خلاف اور سرفضل حسین کے م نوا تھے (سرفضل حسین پس پردہ اس فارمولہ کے مخالف تھے) سرفضل حسین اس بات پر جرتے کہ صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کے ذریعے اکثریت قائم ہو جو کہ ان کا خیال یہ تھا کہ انگریز محدود حق رائے دہی کی جگہ بالغ رائے دہی کا اصول کسی قبول کرے گا اور محدود حق رائے دہی کی صورت میں رائے دہندگان کی فہرست میں صرف پچیس فیصد مسلمان آتے تھے انہیں مزید اندیشہ یہ تھا کہ بالغ رائے دہی کی صورت میں جمی انتخابات کے دوران ہندو اپنی دولت سے اثر انداز ہوں گے۔ کانگریس کے صدر سری نواس آئینگر نے اس فارمولے پر غور کرنے کے لئے کانگریس کا اجلاس طلب کر لیا۔

محمد علی جناح نے ان تجاویز کی مزید وضاحت کے لئے مارچ ۱۹۲۷ء میں ایک بیان جاری کیا انہوں نے کہا:

”مئی تجاویز کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ کچھ نوادہ کچھ دو۔“ صرف

ای روسیوں پر براہ کرم غائب ہوا ہے۔ اس بات پر جدا ہوں  
یا غلط، یہ کسی مقصد کے حصول کی بات نہیں۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ قومی حکومت  
کے قیام تک عبوری دور میں مسلمانوں پر کوئی اکثریتی فرقہ زیادتی نہ کر سکے۔ دونوں  
فرقوں میں سیاسی توازن ضروری ہے اور یہ تجاویز اس توازن کو بہر حال قائم  
رکھتی ہیں۔ اگر ہندو اور مسلمان دونوں ان تجاویز کو تسلیم کر لیں تو سمجھوتہ جو سنہ  
۱۹۳۱ء میں کوئی تاخیر نہیں ہوگی۔ جس خود جداگانہ انتخابات کا حامی نہیں۔ مگر مسلمان اس  
طریقہ انتخاب کو اپنی حفاظت کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جداگانہ انتخاب میں  
اچھائیاں اور برائیاں دونوں موجود ہیں۔ لیکن اصل یہ عا یہ ہے کہ اقلیتوں  
کو اپنے تحفظ کا احساس ہوگا۔

سرفضل حسین کو اندیشہ یہ تھا کہ کہیں کانگریس اس فارمولہ کو تسلیم نہ کرے۔ کیونکہ اگر کانگریس  
نے ایسا کیا تو حکومت بھی اسے تسلیم کرے گی۔ اس طرح جو لوگ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں  
کے لئے اکثریت چاہتے تھے انہیں شکست ہو جائے گی۔ مئی ۱۹۲۷ء میں سرمد شفیق نے  
لاہور میں مسلمانوں کے ایک جلسہ عام کی صدارت کی جس میں علامہ اقبال نے تجاویز دتی کے  
خلافت ایک قرارداد پیش کی اور پھر جلسے اور مظاہرے شروع ہو گئے۔ مدراس، پٹنہ، بھارت  
اور ہندوستان کے بہت سے دوسرے بڑے شہروں میں بھی احتجاجی جلسوں کا سلسلہ  
شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر فیاض الدین جو اس فارمولہ کے خلاف تھے، فرانس میں آغا خاں سے ملے۔  
اور انہیں سرفضل حسین کا یہ پیغام دیا کہ اگر ہندوستان میں تجاویز کے خلاف مسلمانوں کا کوئی بڑا  
جلسہ منعقد کیا گیا تو آغا خاں اس کی صدارت کریں گے۔

## کانگریس کا رد عمل

مئی ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس نے تجاویز دتی  
کی توثیق کر دی۔ اسی سال دسمبر میں کانگریس کا سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا جس  
میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سوال پر ایک قرارداد منظور کی جو تقریباً اتنی خطوط پر تھی جن  
پر دتی تجاویز کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہی کانگریس نے ان تجاویز کو مسترد کرنے کی  
کوشش شروع کر دی۔ حالانکہ کچھ عرصہ قبل ہی منتر سرودھن ناٹھ ورنے اپنی تقریر میں اس

اور کا اعتراف کیا تھا کہ اتحاد کا ایک بہت بڑا موقع کر لیا گیا ہے، اور اس کامیابی کا سہرا اتحاد کے پیغامبر محمد علی جناح کے سر ہے۔

سوال یہ ہے کہ کانگریس نے اچانک یہ پلٹا کیوں کہا یا؟ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ گاندھی کے ایما پر ہوا۔ کانگریس نے اپنی ورلنگ کمیٹی کے فیصلے پر لبیک کہنے کی جگہ مجلسِ عامہ کو یہ حکم دیا کہ وہ ایک آل پارٹیز کانفرنس بلائے اور تجاویز دلی اور دیگر پارٹیوں کی تجاویز کو سامنے رکھ کر ملک کے لئے کوئی متفقہ آئینی تیار کرے۔ دیگر پارٹیوں کی تجاویز کا مطلب یہ تھا کہ آل پارٹیز کانفرنس میں تقریباً ۷۰ پارٹیوں کی تجاویز پر غور ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ان سب پر اتفاق ناممکن تھا۔

## کانفرنس اور نہرو رپورٹ

۱۲۔ ۱۹۴۸ء کو دلی میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس کانگریس کے ذرا ہتھام شروع ہوا جو ۱۱۔ مارچ ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔ اس دوران کانفرنس کے ۲۵ اجلاس منعقد ہوئے۔ کانفرنس میں ہندوستان میں رہنے والی اقوام کی تمام انجمنوں کے نمائندے شریک تھے۔ طے یہ ہوا کہ ہندوستان میں مکمل وفاق حکومت کے قیام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آئندہ آئین پر بات چیت کی جائے اور یہ بھی طے کیا جائے کہ تمام فرقوں کا باہمی تعلق اور تناسب کیا ہو، لیکن ۲۵ اجلاس منعقد کرنے کے باوجود کانفرنس ناکام رہی اور کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔

ناکامی کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا تھا کہ آل پارٹیز کانفرنس نے جو تجاویز پیش کیں، وہ مسلم لیگ کی قراردادوں سے کوئی مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ قراردادیں اس امر پر بھی اظہارِ افسوس کیا گیا کہ ہندو مہاسبھانے ان تجاویز کو غلط فہم کر دیا تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ نے ایک کمیٹی تشکیل کی جس کا کام یہ تھا کہ وہ دوسری جماعتوں کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت کرے اور انہیں مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ (دسمبر ۱۹۴۷ء) کی تجاویز قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے۔

دلی میں آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس کی ناکامی کے بعد کانگریس نے بمبئی میں دوبارہ کانفرنس طلب کی جو ۱۹ مئی سے شروع ہوئی۔ مسلمانوں اور دیگر سیاسی انجمنوں میں ہندوؤں کے رویے کے خلاف اتنی بیزاری پیدا ہو چکی تھی کہ بمبئی کانفرنس میں چند لوگوں کے سوا کسی نے شرکت

نے کی۔ مسلم لیگ کا بھی کوئی مسئلہ نمائندہ شریک نہ ہوا۔ سافری کی کمی کی وجہ سے گاندھی نے پھر یہ تجویز پیش کی کہ کانفرنس ملتوی کر دی جائے۔ کچھ اراکین تو اس حد تک ایسوس ہو چکے تھے کہ انہوں نے کانفرنس کا ارادہ ہی ترک کر دینے کی تجویز پیش کی۔ اسی دوران برطانوی وزیر امور ہند لارڈ برکن ہیڈ نے تمام ہندوستانی جماعتوں سے واضح الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ وہ متفقہ طور پر کوئی آئین تیار کیوں نہیں کرتیں؛ تمام ہندوستانیوں کے لئے لارڈ برکن میڈ کی اس بات کو ایک جیسٹس سمجھا گیا اور اس مقصد کے لئے کوشش شروع کر دی گئی۔ مسلم لیگ نے دلی تجاویز کی صورت میں پہل کر دی تھی، لیکن ہندوؤں کی ذہنیت اور مسلمانوں پر غلبہ کا خیال انہیں کسی نتیجے پر پہنچانے کے راستے میں بری طرح حائل تھا۔ چنانچہ اس بار کانگریس نے نیا راستہ اختیار کیا۔ ایک کمیٹی تشکیل کی جس کا مقصد ہندوستان میں نوآبادیاتی درجے کی حکومت کے لئے ایک آئینی سکیم تیار کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے صدر پنڈت موتی لعل نہرو تھے۔ دیگر اراکین میں ایم۔ ایس۔ آئے، سبھاش چندر بوس، سر تیج بہادر سپرو، سردار گل سنگھ، ایم۔ آر۔ جیک، جج آکر پر دھان، محمد شعیب قریشی، سر علی امام اور این ایم جوشی شامل تھے۔ کمیٹی کے اراکین کے ناموں سے ظاہر تھا کہ اس میں مسلمانوں کی نمائندگی نہایت نامناسب تھی۔ دو مسلمان رکن تو ایسے تھے جن کا تعلق کسی بھی مسلمان جماعت سے نہ تھا۔

نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے تمام مطالبات کو کچھ اس انداز میں پس پشت ڈال دیا گیا جسے ہندوستان میں انہیں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ اس رپورٹ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کانفرنس مسلمانوں کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ رپورٹ کے اہم پہلو یہ تھے؛

- جواگانہ انتخابات قومی روح اور اس کی نشرو نما کے منافی ہوں گے۔
- مخلوط انتخابات کے تحت کسی بھی فرقے کے لئے نشستوں کی تخصیص نہ ہوگی۔
- پنجاب اور بنگال میں آبادی کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے نشستوں کی تخصیص کا مطالبہ رد کر دیا گیا (ان دو صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی علی الترتیب ۵۶ اور ۵۵ فیصد تھی۔ مسلمان ان صوبوں میں تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے پسماندہ تھے۔ صوبائی کونسلوں میں ان کی نمائندگی بہت کم تھی اور انہیں اندیشہ تھا کہ آئندہ اس میں مزید کمی واقع ہو جائے گی)۔

• صرف ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمان اقلیتوں کے لئے آبادی کی بنیاد پر اور مخلوط انتخابات

کے تحت نشستوں کی تخصیص کی جائے گی۔

- معاہدہ کمٹو اور نوٹنگ کمپنوں اور اصلاحات کے تحت مسلمانوں کو جو توازن

(WEIGHTAGE) دیا گیا تھا وہ حاصل نہ ہوگا۔

- مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نمائندگی کا مطالبہ مسترد کر دیا گیا اور آبادی کے اعتبار سے ۲۵ فیصد نشستوں کی تخصیص اور مزید نشستوں کے لئے مقابلے کا

حق دینے کی سفارش۔

- مرکز کے لئے وعدائی شکل تجویز کی گئی۔

- صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لئے دوسرے صوبوں کے برابر آئینی درجہ کا مطالبہ مسترد کر دیا گیا۔

- سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے مطالبہ بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔

اس سلسلہ میں یہ بڑا عجیب و غریب موقف اختیار کیا گیا کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے بشرطیکہ تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ:

۱۔ سندھ مالی اعتبار سے خود کفیل ہے۔

ب۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سندھ مالی اعتبار سے خود کفیل نہیں تو سندھ کے عوام کے سامنے تمام مالی اور انتظامی پہلوؤں کو رکھا جائے اور اگر ان کی اکثریت سندھ کی علیحدگی کے حق میں رائے دے اور اس امر پر آمادہ ہو کہ وہ نئے صوبے کی تشکیل کی صورت میں تمام مالی ذمہ داریاں قبول کر لے گی تو سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔

ج۔ اس صورت میں سندھ کا طرز حکومت آئین کے تحت دوسرے صوبوں کی طرح ہو۔

د۔ سندھ کی غیر مسلم اقلیت کو صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں نمائندگی کے لئے وہی مراعات دی جائیں جو ہندو رپورٹ کے تحت مسلمان اقلیتوں کو دی گئیں۔

سندھ کے بارے میں اس کمیٹی نے جن خیالات کا اظہار کیا اس کی منطوق بہت دلچسپ تھی، ”مسلمان، ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلہ میں کم ہونے کی وجہ سے ڈرتے ہیں کہ ہندو اکثریت ان پر غلبہ حاصل کر لے گی یا ان کو سراسیمہ کرے گی۔ لہذا مسلمانوں نے یہ حتی تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کو کم از کم ہندوستان کے کچھ صوبوں میں غلبہ حاصل ہونا چاہئے۔ ہم اس مطالبے پر اس لئے تنقید نہیں کرتے کہ اس

میں کافی حد تک اور موجودہ فرقہ وارانہ ماحول کے تحت سچائی موجود ہے۔ دوسری طرف، گوہندوپور سے ہندوستان میں اکثریت کے حامل ہیں لیکن وہ پنجاب، کھل، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں اپنی اقلیت اور پورے ہندوستان میں اکثریت کے باوجود مذکورہ بالا صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت کے باعث ان کے غلبہ سے خوف زدہ ہیں۔

ہندو کی پسند و ناپسند اور تنگ دلی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ ایک طرف تو وہ پورے ہندوستان میں ہندوؤں کی واضح اکثریت کے باوجود صرف پانچ صوبوں میں مسلمانوں سے ان کی اکثریت کے باعث مخالفت نظر آتا ہے لیکن سات صوبوں میں اپنی اکثریت کے باوجود مسلمانوں کے اندیشوں کو خاطر میں نہیں لانا چاہتا۔ نہرو رپورٹ میں مرکز کو تمام اختیارات تفویض کرنے اور مرکز میں مسلمانوں کو ایک چوتھائی نشستیں دینے کا واضح مطلب یہ تھا کہ مرکز پر بہر حال ہندوؤں کا غلبہ رہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ صوبوں میں قدرتی طور پر ہندوؤں کو غلبہ حاصل رہے گا خواہ وہ مسلم اکثریت کے صوبے کیوں نہ ہوں۔

یہ رپورٹ اسی پنڈت موتی لعل نہرو کی تھی جس نے محمد علی جناح سے وعدہ کیا کہ اگر مسلمان مخلوط طرز انتخاب پر تیار ہو جائیں تو ان کے باقی تمام مطالبات تسلیم کر لئے جائیں گے۔ لیکن جب دلی جمائیز کے تحت مخلوط انتخاب کو تسلیم کر لیا گیا تو موتی لعل نہرو اپنے تمام وعدوں کو فراموش ہو گئے۔

## حکمتہ کنونشن

نہرو رپورٹ جواب تک محض ایک تجویز تھی، اب دسمبر ۱۹۴۶ء میں آل پارٹیز کنونشن کے ساتھ پیش ہونا تھی کنونشن کا انعقاد حکمتہ میں ہونا تھا اور اس کے ساتھ جی کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی۔! اور مسلم لیگ (سر محمد شفیع گروپ) نے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس کی تیاری شروع کر دی اور صدارت سہ لے آغا خان کو منتخب کیا۔ محمد علی جناح اکتوبر ۱۹۴۶ء میں انگلستان سے ہندوستان واپس آنے تو انہوں نے نہرو رپورٹ پر کڑا کیسا تبصرو کرنے کی جگہ ایک اخباری بیان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے

رہنماؤں سے متحد ہونے کی درخواست کی اور اس موقع کا انہماک کیا کہ ہندو مسلمان رہنما  
 نہرو رپورٹ میں ترامیم کو رد کیا جائے اور اس کی بجائے اپنی اپنی طرف سے قوت کو دیں گے۔  
 مکمل کنونشن کا اجلاس ۲۲ دسمبر کو شروع ہو گیا جس میں مسلم لیگ کی طرف سے محمد علی  
 جناح، مہاراجہ محمود آباد، محمد کریم چٹاگڈ، مولوی عبدالحق، مولوی مجیب الرحمن، ڈاکٹر  
 سیف الدین چکلو، ملک برکت علی، ڈاکٹر ستید محمود، مولانا محمد اکرم خاں، سید یعقوب حسن،  
 مولوی حسام الدین، مولانا ظفر علی خاں، غازی عبد الرحمن، سید عبداللہ، پیر حسرت خلیق الزماں  
 مولوی منظر علی، تصدق احمد خاں شیروانی، نواب زادہ لیاقت علی خاں، شاہ محمد زبیر، مولوی  
 ۲۰ بین الحنفی، مولوی فیض نور علی، مولوی محمد اسلم اور مولوی عبدالکریم شامل ہوئے۔ محمد علی جناح  
 اس وفد کے قائد تھے۔

اس موقع پر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی طرف سے تقریر کرتے ہوئے نہرو رپورٹ  
 میں یہ ترامیم تجویز کیں کہ :

- ۱۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو مجموعی نشستوں کی ایک تہائی نشستیں دی جائیں۔
- ۲۔ پنجاب اور بنگال کی نشستیں آبادی کی بنیاد پر مخصوص کی جائیں۔
- ۳۔ آئین، وفاقی حیثیت کا حامل ہوا اور اختیارات حابقی مرکزی بجگہ صوبوں کو حاصل ہوں۔
- ۴۔ نیز مرکز اور صوبوں کے حکموں پر نظر ثانی کی جائے۔
- ۵۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کیا جائے اور ہندو کمیٹی کی آئینی سکیم کے مطابق صوبہ سرحد اور  
 بلوچستان میں اصلاحات حکومت کے قیام پر منحصر ہوں۔
- کنونشن کی سب کمیٹی نے محمد علی جناح کی یہ تمام تجاویز مسترد کر دیں۔ اس کے باوجود  
 محمد علی جناح ۲۸ دسمبر ۱۹۴۶ کو کنونشن کے مکمل اجلاس میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر انہوں  
 نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ :

”مجھے افسوس ہے کہ نہرو کمیٹی نے اپنی سفارشات میں انتہائی تنگ نظری سے  
 کام لیا جس کی بنا پر ہندوستان کے مسلمان اپنے سیاسی مستقبل کے بارے  
 میں پُر اعتماد نہیں ہو سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے  
 درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا، اس وقت تک ترقی کا خیال دل میں لانا بھی  
 فہول ہے۔ اکثریت ظلم اور جبر کا روح رکھتی ہے اور اقلیت اپنے نقصان سے

خوف زدہ رہتی ہے۔ لہذا مسلم اقلیت کے ساتھ انصاف فرورزی ہے اور اس سے بھی زیادہ ضروری ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد!

محمد علی جناح نے جس استدلال کے ساتھ تعاریف کیں اور اعتراضات کے جواب دیئے۔ اُن کی تائید سر تیج بہادر سپرو اور مولانا محمد علی جوہر نے بھی کی۔ سر تیج بہادر نے تو یہاں تک کہا کہ:

”محمد علی جناح نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے لئے جو کچھ کیا، میں اس احسان کے صلہ میں کسی دلیل کے بغیر اُن کی ہر بات ماننے پر تیار ہوں۔“  
 لیکن کنونشن میں جو ۱۷ نمائندے موجود تھے اُن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس صورت میں ایکلے سر تیج بہادر سپرو کیا کرتے؟  
 ہندو مہاسبھا کے ایک نمائندے نے تو یہاں تک کہا کہ:  
 ”جناح ایک ضدی بچہ ہے جس کا دماغ کانگریس کے لاڈ پیار سے بالکل خراب ہو چکا ہے“

ہندو مہاسبھا کے اس نمائندے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ محمد علی جناح کس کی غماندگی کر رہے ہیں؟ کیونکہ مسلمان تو کانگریس کے ساتھ ہیں یا جمعیت العلماء ہند کے ساتھ!  
 اسی موقع پر مولانا محمد علی بھی ہندوؤں کے پست رویہ سے بہت بد دل ہوئے جب کنونشن میں یہ بات زیر بحث آئی کہ ہندوستان کا درجہ کیا ہو؟ مولانا محمد علی نے ہندوستان کو نوآبادیاتی درجہ دینے سے اختلافات کرتے ہوئے مکمل آزادی کی حمایت کی۔ انہوں نے کہا کہ جو لوگ ہندوستان کی مکمل آزادی کے مخالفت ہیں، وہ بزدلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مولانا کی اس بات پر سید ہنگامہ ہوا اور ہندوؤں نے بار بار نعرہ لگایا ”بیٹھ باؤ“ مگر مولانا نے اپنی تقریر اس جھگڑے میں جاری رکھی لیکن اس کے بعد وہ احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے۔ اس کے بعد انہوں نے دوبارہ کنونشن کا رخ کیا نہ ہی کانگریس کا!

محمد علی جناح نے اپنے طور پر حالات کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ مسلم لیگ کے مجوزہ اجلاس کافی الحال کوئی فائدہ نہیں لہذا انہوں نے اجلاس ملتوی کر دیا اور خود بمبئی چلے گئے۔ مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس مارچ ۱۹۴۷ء میں دہلی میں ہونا قرار پایا۔

مکتبہ کنونشن میں مسلمانوں کے مطالبات مسترد کرنے کے بعد کانگریس نے اس شرط پر



نہرو رپورٹ کو قبول کر لیا کہ اگر اسے دسمبر ۱۹۲۹ء تک برطانوی پارلیمان نے نہ واپس لے کر  
 سفارشات کو قبول کر لیا اور انہیں آئندہ بین کی بنیاد کے طور پر بھی تسلیم نہ کیا تو کانگریس مکمل  
 آزادی کے لئے سول نافرمانی اور ٹیکسوں کی عدم ادائیگی کا سلسلہ شروع کر دے گی۔ دراصل  
 کانگریس یہ دھمکی اس لئے دے رہی تھی کہ اگر یہ حکومت دباؤ میں آکر ہندوؤں کے مطالبات کو  
 تسلیم کر لے اور مسلمان بے بس ہو کر رہ جائیں۔ یہ صورت حال خاصی نازک تھی۔ چنانچہ مولانا محمد علی  
 نے دلی میں ایک آل انڈیا کانفرنس منعقد کرنے کا پروگرام بنایا۔ کانفرنس کے لئے ۱۳ دسمبر  
 ۱۹۲۸ء مقرر کی گئی۔

مولانا محمد علی ہندوؤں سے اس حد تک بدول ہو چکے تھے کہ انہوں نے نہرو رپورٹ  
 کے بارے میں یہ کہا کہ ایک دن آئے گا جب حکومت کسی نئے حکم کا اعلان اس طرح کیسے  
 جائے گا،

”خلق خدا کی ——— ملک برطانیہ کا ——— حکم مہاسیجا بہادر کا۔“

باب

## جناح کے ۴ انکاث

### آل پارٹیز مسلم کانفرنس

گلگتہ کنونشن میں ہندوؤں کی بہانہ تراشیوں اور جیلد سانیوں کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان بد دل ہو چکے تھے حتیٰ کہ مسلمان قوم پرستوں کا خیال بھی یہ تھا کہ کانگریس نے متعصب ہندو مہاسبھا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اسی صورت حال سے فکرمند ہو کر مولانا محمد علی نے ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۶ کو دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی تھی۔ دراصل یہ وہی کانفرنس تھی جو مسلم لیگ کے دوسرے وحرے (سرشیف گروپ) نے طلب کی تھی۔ اس کانفرنس کی صدارت آغاخان نے کی جس میں خلافت کمیٹی، جمعیت العلمائے ہند، مسلم لیگ (شیف گروپ) اور دیگر مسلمان جماعتوں نے شرکت کی۔ تاہم آل انڈیا مسلم لیگ (جناح گروپ) اس کانفرنس میں جماعتی حیثیت میں شریک نہ ہوئی۔

اس کانفرنس میں سر محمد شفیع نے ایک قرارداد پیش کی جس کی تائید علامہ اقبال نے کی۔ دیگر تائید کنندگان میں سر محمد یعقوب، مولانا شفیع داؤدی، مولانا محمد علی اور مفتی کفایت اللہ شامل تھے۔ قرارداد یہ تھی،

”ہندوستان کی وسعت، جغرافیائی اور علاقائی تقسیم اور لسانی امور کے پیش نظر ہندوستان کے لئے صرف وفاقی نظام ہی سودمند ہو سکتا ہے۔ جس میں

تمام ریاستوں کو مکمل خود مختاری اور مقامی اختیارات حاصل ہوں۔ مرکزی حکومت کو صرف ایسے مشترک امور پر کنٹرول ہو جو اسے انہیں کے تحت دیئے گئے ہوں کوئی بل، قرارداد، تحریک یا ترمیم جن کا تعلق فقہ دارانہ معاملات سے ہو اس وقت تک مرکزی یا کسی صوبائی اسمبلی میں پیش نہ کیا جائے یا اس پر بحث نہ کی جائے یا اسے منظور نہ کیا جائے، جب تک اس اسمبلی میں ہندوؤں یا مسلمانوں کے اراکین کی تین چوتھائی اکثریت اس کے حق میں نہ ہو۔ مختلف صوبائی اسمبلیوں کے لئے مسلمانوں کے نمائندوں کا انتخاب ہر حال ہدکانہ ہونا ضروری ہے جو مسلمانوں کا حق ہے۔ اب مسلمانوں کو ان کی مرضی کے بغیر اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ ایک حقیقی نمائندہ جمہوری حکومت کے قیام کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جب تک ہندوستان کے موجودہ حالات قائم رہتے ہیں، تمام اسمبلیوں اور خود مختار اداروں میں مسلمانوں کا انتخاب ان کے اپنے جداگاندہ حلقہ ملے نیابت کے ذریعہ کیا جائے۔ جب تک مسلمانوں کو اس بات کا مکمل یقین اور اطمینان نہیں ہو جاتا کہ ان کے حقوق و مفادات کا مکمل تحفظ انہیں کے ذریعہ کر دیا گیا ہے۔ وہ مشروط یا غیر مشروط، کسی صورت میں بھی مشروط انتخابات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ مسلمانوں کو مرکزی اور صوبائی وزارتوں میں ان کا مناسب حصہ ملنا ضروری ہے۔ مختلف صوبائی اسمبلیوں اور خود مختار اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی لازمی طور پر ایک ایسے منصوبے پر ہونی چاہئے جس کے تحت ان صوبوں میں جہاں مسلمان آبادی کے اعتبار سے اکثریت میں ہیں، ان کی اکثریتی حیثیت متاثر نہ ہو اور ایسے صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، کسی صورت میں ان کی نمائندگی میں فرق نہ آئے۔ یعنی ان کی نمائندگی کا تناسب وہی رہے جو موجودہ قوانین کے تحت ہے۔ یہ کافر نس اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں ۳۳ فیصد نمائندگی ملنی چاہئے۔ یہ توثیق ہندوستان کے مسلمانوں کے تحفظ اجتماعی نکلے اور ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے متفقہ مطالبے کے تحت کی جاتی ہے۔ تعدد قومی، لسانی، جغرافیائی اور انتظامی بنیادوں پر سمندر کی

مجٹی کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں ہے۔ لہذا اس کی علیحدہ اسمبلی اور انتظامی مشینری اُن ہی خطوط پر قائم کی جائے جن خطوط پر دوسرے آئینی صوبوں کی اسمبلیاں اور انتظامی مشینریاں قائم ہیں۔ جہاں تک سندھ کی ہندو آبادی کا تعلق ہے تو اسے آبادی کے تناسب سے اتنی ہی نمائندگی دی جائے جتنی ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت کے لئے ہو۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات، دوسرے صوبوں کی سطح پر نافذ کی جائیں۔ کیونکہ اُن کا نفاذ نہ صرف ان صوبوں کے مفاد میں ہے بلکہ ہندوستان کی آئینی پیش قدمی کے لئے بھی بہت ضروری ہے۔ ان صوبوں میں ہندو اقلیت کو بھی اتنی ہی مناسب اور موثر نمائندگی دی جائے جتنی ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت کو دی جاتی ہے۔ مسلمانوں کو سول سروسوں اور انتظامی اداروں میں لازمی طور پر مناسب نمائندگی ملنی چاہئے۔ ہندوستان کے سیاسی حالات کے پیش نظر انتہائی ضروری ہے کہ ہندوستان کے آئین میں مسلمانوں کی تعلیم، زبان، مذہب، اسلامی قانون اور مسلمانوں کے سماجی اداروں کو مکمل تحفظ دیا جائے اور اُن کی امداد کے لئے مناسب حصہ مقرر کیا جائے۔ ہندوستان کے آئین میں مرکوزی مقصد اس وقت تک کوئی تبدیلی نہ کرے جب تک ہندوستانی وفاق میں شامل دیگر تمام ریاستوں کو اتفاق نہ ہو۔ یہ کانفرنس واضح طور پر اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ ایسا کوئی آئین، خواہ وہ کسی کی طرف سے تجویز کیا گیا ہو۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہو گا جب تک کہ اس قرارداد کے اصولوں سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

## گروہ بندی ختم کرنے کی کوشش

محمد علی جناح اس کانفرنس میں شریک نہ تھے تاہم انہوں نے حالات کا جائزہ لیا۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد اخبارات کے ذریعے پڑھی۔ کنونشن کے بعد کانگریس کا جو سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا، اس کی کارروائی پر بھی غور کیا۔

محمد علی جناح نے محسوس کیا کہ کانگریس کی سرپرستی میں مسلمانوں کا ایک گروہ اس غرض سے

منظر ہوا تھا کہ مسلمانوں کو ضرور پورٹ منظور کرنے پر آمادہ کرتا دوسری طرف لاہور میں  
 محمد شفیع گروپ تھاجس نے متوازی مسلم لیگ بنائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں  
 کو بہر حال ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنا ضروری ہو گا۔ اس مقصد کے لئے محمد علی جناح نے مارچ ۱۹۶۹ء  
 میں دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ کیا اور اس دوران اُن تمام لوگوں سے  
 بات چیت جاری رکھی جنہوں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد کی حمایت کی تھی۔ محمد علی جناح  
 نے بات چیت کے دوران ان مسلمان رہنماؤں سے یہ طے کر لیا کہ محمد شفیع کی صدارت میں  
 جو متوازی مسلم لیگ قائم ہو گئی تھی، اسے ختم کر دیا جائے اور جب مسلم لیگ کے دونوں حصے  
 متحد ہو جائیں تو مسلم لیگ اُن تمام مطالبات کو تسلیم کرے جو آل پارٹیز کانفرنس نے اپنی قرارداد  
 میں پیش کئے تھے۔

## مسلم لیگ کے اجلاس میں ہنگامہ

مارچ ۱۹۶۹ء کے آخری ہفتے میں جب مسلم لیگ کا یہ اجلاس منعقد ہونے میں کچھ دیر  
 رہتی تھی اور محمد علی جناح ابھی حکیم اجمل خاں کے مکان پر مختلف مسلمان رہنماؤں کے ساتھ  
 مصالحت کی بات چیت میں مصروف تھے کہ کانگریسی مسلمانوں نے محمد علی جناح کی آمد میں تاخیر  
 سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہنگامہ کر دیا اور اصل ان لوگوں کی کوشش تو یہ تھی کہ کسی طرح مسلم لیگ  
 کے اس جلسے پر ہی قبضہ جمائیں، مگر وہ ایسا ذکر سکے۔ البتہ انہوں نے اسٹیج پر قبضہ کر لیا لیکن  
 انہیں بہت سیے آبرو ہو کر جلسہ گاہ سے نکلنا پڑا۔

ہوایو کی کہ بہت سے مسلم لیگی کارکن، رہنما اور عوام جلسہ گاہ میں جمع ہو چکے تھے۔ کانگریس  
 چٹو مسلمان بھی وہاں موجود تھے۔ محمد علی جناح حکیم اجمل خاں کے مکان پر گفت و شنید میں مصروف  
 تھے۔ کانگریسی مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا اور چند منٹ کے بعد یوسف امام شیخ پر آئے۔  
 انہوں نے صدارت کے لئے ڈاکٹر محمد عالم کا نام تجویز کیا اور تصدیق احمد خاں شیروانی نے اس  
 تجویز کی تائید کی۔ ڈاکٹر محمد عالم جہاگ کر شیخ پر آگئے اور محمد علی جناح کے لئے مخصوص کرسی پر  
 براجمان ہو گئے۔ فوراً بعد اس خود ساختہ صدر نے غازی عبدالرحمن سے قرارداد پیش کرنے کو  
 کہا۔ غازی عبدالرحمان نے جلدی سے شیخ پر آکر ایک قرارداد پیش کی جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ  
 جلسہ ضرور پورٹ کے اصولوں کی تائید کرتا ہے۔ اتنی دیر میں شیخ کے ارد گرد لوگ جمع ہونا شروع

ہو گئے۔ ڈاکٹر محمد عالم نے جلدی سے لوگوں کی رائے معلوم کئے بغیر یہ کہہ دیا کہ قرارداد منظور ہو گئی۔ اتنی دیر میں لوگوں نے شور مچا دیا، کرسیاں توڑنا شروع کر دیں۔ کچھ لوگوں نے شیروائی کو دھکے دے کر نیچے گرادیا اور ڈاکٹر محمد عالم کو اٹھا کر سیٹج سے نیچے پٹخ دیا۔ جب ڈاکٹر عالم کو یہ لوگ اٹھا کر جلسہ گاہ سے باہر باعزت طور پر لے جا رہے تھے تو اتنی دیر میں محمد علی جناح، راجہ غنیمت علی خاں کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ جناح زندہ باد کے نعرے بلند ہونے اور پھر جلسہ گاہ میں موت ایسی خاموشی طاری ہو گئی۔ محمد علی جناح کی عظیم شخصیت اور دب بے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں ان کے لئے بے پناہ عقیدت اور محبت کا اس سے بڑا مظاہرہ کسی دوسرے ہندو یا مسلمان رہنما کے لئے دیکھنے میں نہیں آیا۔

## چودہ نکات

محمد علی جناح سیٹج پر آئے۔ انہوں نے سب سے پہلے اُن لوگوں کی خدمت کی جنہوں نے جلسے میں گڑبڑ کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد اجلاس دوسرے دن پر ملتوی کر دیا۔ دوسرے دن اجلاس شروع ہوا اور وہ تجاویز سامنے رکھی گئیں جو محمد علی جناح نے دوسرے مسلمان رہنماؤں کے ساتھ مل کر مرتب کی تھیں۔ ان تجاویز کا خیر مقدم ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے کیا۔ البتہ آصف علی، ڈاکٹر سید محمد، تصدق احمد خاں شیروائی، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر محمد عالم اور خلیق الزماں جیسے کانگریسی مسلمانوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ قرارداد یہ تھی:

مسلم لیگ نہایت دیانت دارانہ غور و خوض کے بعد اس امر پر اصرار کرتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے آئندہ آئین کی ایسی کوئی سکیم اس وقت تک قابل قبول نہ ہوگی جب تک آئین میں مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں کو مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کی خاطر شامل نہیں کیا جاتا:

- ۱۔ آئندہ آئین وفاق حیات کا حامل ہو اور صوبوں کو باقائمی اختیارات حاصل ہوں۔
- ۲۔ تمام صوبوں کو مساوی سطح پر خود مختاری حاصل ہو۔

۳۔ ملک کی تمام اسمبلیوں اور دوسرے منتخب اداروں کی تشکیل، ہر صوبے میں اقلیتوں کے لئے موثر اور مناسب نمائندگی کے اصولوں پر کی جائے اور کسی اکثریت کو

کسی صوبے میں نہ تو اقلیت میں تبدیل کیا جائے اور نہ ہی اس کا توازن اقلیت کے ساتھ قائم کیا جائے۔

۳۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔

۵۔ فرقہ وارانہ گروہوں کے لئے علیحدہ انتخابات کا مجموعہ طریقہ جاری رہے۔ ہر فرقے کو اس امر کی اجازت ہو کہ وہ جب چاہے، علیحدہ انتخاب کے طریقے سے کنارہ کش ہو کر مخلوط انتخاب کے طریقے کا رکو اپنالے۔

۶۔ اگر کبھی علاقائی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی جائے تو اس صورت میں کسی قیمت پر بھی پنجاب، بہنگال اور صوبہ سرحد کے مسلمان متاثر نہ ہوں۔

۷۔ تمام گروہوں کے لئے عقیدے، عبادات، اجتماع، انجمن سازی، تسلیم اور پراپیگنڈہ کی ضمانت دی جائے۔

۸۔ کوئی ایسا بل یا کسی بل کا کوئی حصہ کسی اسمبلی یا کسی دوسرے منتخب ادارے میں منظور نہ کیا جائے، بشرطیکہ یہ بل جس فرقے سے متعلق ہو، وہ فرقہ اُسے اپنے لئے مفید خیال نہ کرتا ہو اور ایسے بل کا مخالف ہو۔ نیز اس متعلقہ گروہ کے تین چوتھائی نمائندوں نے اس کی مخالفت کی ہو اور نہ ہی کوئی ایسا بالا واسطہ طریق اختیار کیا جائے جس کے ذریعے ایسے کسی بل کی منظوری کے اسباب پیدا ہوتے ہوں۔

۹۔ سندھ کو بھی سے الگ کر دیا جائے۔

۱۰۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کی سطح پر اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۱۱۔ آئین میں یہ گنجائش پیدا کی جائے کہ دوسرے ہندوستانیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی سول ملازمتوں اور مقامی خود مختار اداروں میں ان کا مناسب حصہ ملی سکے۔

۱۲۔ آئین میں مسلمانوں کی ثقافت، تعلیم، زبان، مذہب، قوانین اور مسلمانوں کے خلاصی اداروں کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔

۱۳۔ مرکزی اسمبلی ایسی کوئی کا پینہ و بنائی جائے جس میں مسلمان ایک تہائی سے کم تعداد میں ہوں۔

۱۴۔ ہندوستانی وفاق میں شامل دیہا سستوں کی مرضی کے بغیر مرکزی اسمبلی آئین میں کوئی

تبدیلی نہ کرے۔

اس قرارداد کو بعد ازاں ”محمد علی جناح کے ہم انکات“ کا نام دیا گیا۔ ان ہی نکات کی بنیاد پر آئندہ کئی برسوں تک مسلمانوں اور حکومت اور دیگر غیر مسلم سیاسی جماعتوں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔



باج

## ۱۹۲۹ء - ایک سنگم پر ور سال

۱۹۲۹ء خاصا ہنگامہ پرور اور اہم سال تھا۔ جزوی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس ختم ہوئی اور اس نے اہم فیصلے کئے۔ بعد ازاں مارچ ۱۹۲۹ء ہی میں مسلم لیگ کا جناس دلی منعقد ہوا۔ جس میں آل پارٹیز کانفرنس کے فیصلوں کی معافیت سے ۴۴ نکات منظور کئے گئے جو آئندہ نئی برسوں تک حکومت اور غیر مسلم سیاسی جماعتوں کے ساتھ مسلم لیگ کے مذاکرات کی بنیاد بنے رہے۔ اسی سال محمد علی جناح کی کوششوں سے مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں (جناح گمڈپ اور شفیق گروپ) کو قریب آنے کا موقع ملا۔ مارچ ہی میں کانگریسی مسلمانوں نے سازش کو سنے مسلم لیگ کے اجلاس کو درہم برہم کرنے کی کوشش میں منہ کی کھائی اور انہیں محسوس ہو گیا یہ مسلمان اب ایک متقدم کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کو کسی طرح بھی ہندوؤں کے جال میں پھنسیا نہیں جاسکتا۔ ۱۹۲۹ء کے آغاز سے ذرا پہلے ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جب سائمن کمیشن نے مختلف صوبوں کا دورہ شروع کیا تو لاہور ریلوے اسٹیشن پر مظاہرین کا زبردست اجتماع تھا۔ انہوں نے سیاہ جھنڈیاں اٹھا رکھی تھیں اور "سائمن کمیشن — واپس جاؤ" کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ قیادت کانگریسیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اسٹیشن اور لنٹے بازار کے درمیان اس جلس کا پولیس کے ساتھ تصادم ہو گیا۔ پولیس نے لوگوں پر ڈنڈے برسائے شروع کر دیئے۔ ایک پولیس افسر سکاٹ کا ایک ڈنڈا کانگریسی رہنما لالہ لاجپت رائے کے دل پر پڑا اور وہ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد ۱۱ نومبر کو انتقال کر گئے۔ اُن کی وفات سے کانگریسیوں

میں سخت اشتعال پیدا ہو گیا۔ انہوں نے انگریز افسر سکاٹ سے بدلے کی ٹھانی۔ اتفاقاً ایک دن جب سکاٹ اور سائڈزس اکٹھے کھڑے تھے تو کسی شخص نے سائڈزس کو سکاٹ سمجھ کر گولی مار دی۔ اس واقعے کے بعد سکاٹ کو بڑی خاموشی کے ساتھ انگلستان روانہ کر دیا گیا۔

## اسمبلی پر بم

۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو مرکز کی اسمبلی میں بم پھینکنے کی واردات ہوئی۔ کچھ دنوں پہلے اسمبلی میں حکومت کی طرف سے ایک پبلک سیفٹی بل پیش کیا گیا تھا۔ حکومت کو خطوات کار کیپوسٹ مزدوروں کو مہربان کر رکھنے میں ہنگامہ کرنا چاہتے تھے۔ اسمبلی بل اسمبلی میں زیر بحث تھا کہ ۲۰ مارچ کو پولیس نے ہندوستان کے بہت سے صنعتی شہروں سے مزدور رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ اپریل کو بم اسمبلی میں اسی بل پر شدید ہنگامہ ہونے کی توقع تھی کہ حالات نے اچانک پلٹا کھایا۔ اس دن سائنس کمیشن کے صدر سر جان سائنس بھی اجلاس کی کارروائی سننے کے لئے اسمبلی میں موجود تھے۔ اسمبلی کی تھوڑی سی کارروائی ہوئی تھی کہ سرکاری پنشن کے پاس ایک بم گرتے ہی زبردست دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ فوراً بعد دو گولیاں چلیں جو اسمبلی کے ایک سٹون پر لگیں۔ اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہو گیا اور پولیس نے فوراً طور پر اسمبلی کے دو وزیروں کی ناکر بندی کے کے عمارت کا محاصرہ کر لیا۔ تماشائیوں کی گیلری سے پولیس نے ایک شخص بگلت سنگھ اور اس کے ساتھی دت کو گرفتار کر لیا۔ بم سے ایک پارسی کن اسمبلی دلائی زخمی ہو گئے تھے۔ اسمبلی کے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے اشتہار بھی نظر آئے جن پر ہندوستان کی سوشلسٹ ری پبلک فوج کے کانڈر بر آج کی طرف سے انگریزوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ فوراً ہندوستان سے باہر چلے جائیں۔

دوسرے دن وائسرائے نے پبلک سیفٹی بل کا نفاذ ایک آرڈینیٹس کے ذریعے کر دیا۔ بگلت سنگھ اور دت پر مقدمہ چلا۔ ان دونوں نے خود ہی جرم کا اقرار کر لیا۔ لمبوں نے یہ بھی کہا کہ ان ارادہ قتل کا نہ تھا بلکہ وہ حکومت تک ہندوستانیوں کی آواز پہنچانا چاہتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو سر جان سائنس کو آسانی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ ان دونوں کو عمر قید اور کانڈر پانی کی سزا دی گئی۔ بعد ازاں بگلت سنگھ پر پولیس افسر سائڈزس کے قتل کا ایک اور مقدمہ قیام کر دیا گیا جس میں بگلت سنگھ کو سزائے موت دی گئی۔

## ایک اور ہنگامہ

۹۔ اپریل ۱۹۲۹ء کو ایک مسلمان نے ایک ہندو ناشر کتب راج پال کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بھوایک راج پال نے ایک کتاب شائع کی جس میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ کے بارے میں نہایت نازیبا انداز اختیار کیا گیا تھا۔ کتاب اسی موضوع پر تھی اور اس کا نام "ٹیکلا رسول" رکھا گیا تھا۔ کچھ دن بعد مسلمانوں کو اس کتاب کی اشاعت کے بارے میں علم ہوا اور مسلمانوں نے احتجاجی مظاہرے شروع کر دیئے۔ حکومت نے ناشر کتب راج پال کے خلاف مقدمہ نہ کر دیا۔ مزم کو مقامی عدالت سے فراہمی کی گئی جب سیشن میں اپیل برٹی تو اس کی سزائیں کمی کر دی گئی مزم نے اپنی کورٹ میں اپیل کی اور ایک سکھ جج کنور دیپ سنگھ نے یہ فیصلہ سنایا کہ کتاب دفعہ ۱۵۰ (۱) یا کسی دیگر قانونی دفعہ کے تحت قابل تعزیر نہیں۔ اس فیصلہ نے مسلمانوں کو زور و شوق دیا مسلمانوں کے ایک وفد نے گورنر سے ملاقات کی تو گورنر نے مزید تحقیقات کا فیصلہ دیا اور اگر قانون میں ترمیم کی گئی تو حفظہ ماتقدم کے طور پر اس میں بھی ترمیم کر دی جائے گی۔ ہندو۔ ایک طرف تو گلا بھاڑ بھاڑ کر ہندو مسلم اتحاد اور ایک قومیت "کانٹرو بلنڈ کر رہے تھے۔ مگر اس دوران کسی نے بھی راج پال کی کھردہ حرکت کی مذمت نہ کی۔ مذمت تو درکنار۔ مقامی ہندوؤں نے والٹر ہند کو ایک احتجاجی تار روانہ کیا اور گورنر پنجاب نے مسلمانوں سے جو وعدہ کیا تھا اس پر احتجاج بھی کیا۔

دوسرا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ایک مقامی وکیل نے جب سکھ جج کے فیصلے پر ایک مضمون مقامی مسلمان روزنامہ میں شائع کرایا تو عدالت نے روزنامہ کے مدیر اور طابع دونوں کو سزا سنائی۔ اس حرکت کے باعث ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے احتجاج شروع کر دیا۔ لاہور اور دہلی میں مسلمانوں نے ہڑتائیں کیں۔ بعد ازاں ایک اور مقدمہ کے فیصلے میں ایک جج براڈ وے نے سکھ جج کنور دیپ سنگھ کی رائے سے بھی اختلاف کیا۔ ادھر راجپال۔ کچھ سزا کائنات کے بعد بری ہو کر دوبارہ اپنی دکان کی گدی پر آ بیٹھا۔ ۹۔ اپریل ۱۹۲۹ء کو جب راجپال دکان پر بیٹھا تھا کہ ایک شخص علم الدین نے اس پر خنجر سے پے درپے وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ علم الدین کو سزائے موت ہوئی۔

علم الدین کے جنازے پر پھر جگڑا شروع ہو گیا۔ حکومت چاہتی تھی کہ اسے خاموشی سے

دفن کر دیا جائے۔ مگر مسلمان جلوس کی صورت میں جنازہ لے جانا چاہتے تھے۔ ایک وفد سر محمد شفیع کی قیادت میں گورنر پنجاب سے ملا۔ سر محمد شفیع نے گورنر سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مسلمان تجہیز و تکفین کے بعد چر امن طور پر منتشر ہو جائیں گے اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو اس کے بعد وہ حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے مسلمانوں سے کبھی کچھ نہ کہہ سکیں گے۔ گورنر مان گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے خوف زدہ ہو کر دکائیں بند کر دیں۔ لاکھوں مسلمان جنازے میں شریک ہوئے۔

فروری ۱۹۲۹ء میں مزدوروں کی پورسش کے بعد بمبئی میں ایک نمونہ یہ چھوڑا گیا کہ پٹھان بچوں کو اغوا کر رہے ہیں۔ پٹھان چوکیداروں پر حملے شروع ہوئے تو پٹھانوں نے ہندوؤں پر مسلح حملے شروع کر دیئے۔ کوئی بیس ہندو قتل کر دیئے گئے۔

### انقلابی سرگرمیوں کا آغاز

اپریل ہی میں پولیس نے لاہور میں چھاپے مارے اور تین افراد کو گرفتار کر لیا۔ اور الزام عائد کیا کہ انہوں نے بم بنانے کا کارخانہ قائم کر رکھا تھا۔ بعد ازاں مزید دو درجن افراد گرفتار کر لئے گئے۔ کچھ لوگ روپوش ہو گئے۔ ان سب کے بارے میں شبہ تھا کہ بھگت سنگھ کو بھی انہی نے بم دیتا کیا تھا۔

جن دنوں سائنس کمیشن — مختلف صوبوں کا دورہ کر رہا تھا تو اس کی ٹرین کو بھی بم سے اڑانے کی سازش کی گئی مگر یہی وقت پر پولیس پر اس سازش کا انکشاف ہو گیا۔ اسی ماہ لاہور میں نشینل بینک پر ڈاکہ ڈالنے کی سازش کے الزام میں کچھ طلبہ کو سزائیں ہوئیں۔

۲۳ دسمبر ۱۹۲۹ء کو جب وائسرائے ہند سفر پر تھے تو نظام الدین سٹیشن (دلی) کے کوئی ۹ میل پر ان کی ٹرین کے قریب دھماکا ہوا۔ گاڑی کو بھی نقصان پہنچا۔ تاہم وائسرائے ہند بچ گئے۔ تفصیلات سے علم ہوا کہ کچھ دن پہلے کوئی جوگی اس غیر آباد علاقے میں آ بیٹھا تھا۔ انہی دھن کسی ٹوکری میں ہم چھپا کر اسے جیتا کئے گئے۔ اس کے بعد جوگی نے لائسنس کے نیچے زمینی کھود کر بم دبا دیئے۔ اور اس سے تار لگا کر جمو پٹری میں پہنچا دی۔ تار ایک بیٹری سے لگائی تاکہ ہر وقت کارروائی کی جاسکے۔ بہر حال لاڈلہ اردن کی جان لینے کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔

جون ۱۹۲۹ء میں جب برطانوی کنزرویٹو پارٹی کو شکست ہوئی اور لیبر پارٹی کے ہاتھوں میں اقتدار آ گیا تو کانگریسی غرضی سے مایاں بنانے لگے کیونکہ لیبرز ہمیشہ سے کانگریس کے

ہزار ہے تھے۔ وزیر اعظم میکڈونلڈ تو کانگریس کے ساتھ اپنی ہمدردیوں کے باعث خاصے ”بدنام“ تھے۔

۱۹۔ جن کو محمد علی جناح نے نئے وزیر اعظم کو ایک خط روانہ کیا اور یہ بات صاف طور پر کھودی کہ ہندوستان کے عوام کے دلوں سے برطانیہ کے سوا عید کا اظہار ختم ہو چکا ہے۔ اگر برطانوی حکومت تسلیم نہ کیا ہندوستانی رہنماؤں کی کانفرنس انگلستان میں منعقد کئے اور خود ذریعہ اعظم اس سلسلہ میں دعوت نامہ بھیجیں۔ تو اس کی تعمیل کی جائے گی۔ محمد علی جناح نے ۱۵۔ اکتوبر کو اسی نوع کا ایک خط سر جان سائمن کو لکھا۔ موخر الذکر ان دنوں اپنی رپورٹ مرتب کر رہے تھے۔ وائسرائے ہند لارڈ آرٹن اس ضمن میں مشورے کے لئے ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو انگلستان پہنچے۔ واپسی پر انہوں نے ایک اعلان کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ۱۹۱۹ء کے آئین کے بارے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ برطانیہ میں بھی شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ مگر حکومت برطانیہ کے تفویض کردہ اختیار کے تحت وہ یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء کے آئین کا مقصد واضح طور پر ہندوستان کے لئے ذرا پارلیمانی و ریبر کا حصول ہے۔

کانگریس اور دیگر ہندو تنظیموں کے لئے یہ اعلان بہر حال پسندیدہ اور ان کی توقعات کے عین مطابق تھا۔ اس اعلان پر پٹنہ کی کانگریس کا اظہار کیا گیا اور اس سلسلہ میں دستخطوں کے ساتھ ایک تحریر وائسرائے کو روانہ کی گئی۔

کانگریس نے اجلاس نکتہ میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۹ء تک نہ رپورٹ کو ہندوستان کے آئینہ آئین کے طور پر منظور کیا تو وہ سوال فرمائی کی تحریک چلائے گی۔ یہ وقت بھی قریب تھا۔ مگر جب کانگریس نے یہ دیکھا کہ انگلستان میں گول میز کانفرنس متوقع ہے تو اس نے پیٹنڈا بدلا اور دسمبر ۱۹۲۹ء میں کابل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ کانگریس گول میز کانفرنس میں شرکت نہ کرے گی۔ مہاسا مقننہ کا بائیکاٹ بھی کیا گیا۔ اور کانگریس کی اراکین کو مستعفی ہونے کی ہدایت جاری کر دی گئی۔ کانگریس کمیٹی کو سول نافرمانی اور ٹیکسوں کی عدم ادائیگی۔ جب چاہے ان کے کی اجازت دے دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک حکومت جنیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف تھی۔ اسی لئے مسلمانوں سے محمد علی جناح نے اپیل کی کہ وہ اس ہم میں کانگریس کا ساتھ نہ دیں۔

غرضیکہ اس طرح ۱۹۲۹ء کا سال نہایت ہنگامہ پر در سال ثابت ہوا۔

بالیٹ

## گول مینہ کانفرنس

### گاندھی بطور نمک ساز

برطانیہ میں کنزرویٹو پارٹی کی جگہ لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آچکی تھی۔ نئے وزیرِ اعظم ریکز میکڈونلڈ کو متحدہ رہنماؤں کی طرف سے یہ مشورہ دیا گیا کہ آئین سازی۔ سائنس کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر نہ کی جائے کیونکہ ہندوستان کے عوام نے کمیشن کا خیر مقدم بھی کرنا گوارا نہ کیا تھا۔ ہنزہ ہوگا کہ مسودہ آئین کی تیاری سے قبل مختلف ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ افہام و تفہیم ہو جائے تاکہ بعد ازاں آئین سازی میں آسانیاں پیدا ہو سکیں۔ خود سر جان سائنس نے بھی وزیرِ اعظم میکڈونلڈ کو یہی مشورہ دیا تھا۔ محمد علی جناح نے بھی میکڈونلڈ کو ایک خط کے ذریعہ اس نوعیت کی بات چیت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میکڈونلڈ نے ان مشوروں کو تسلیم کر لیا۔ لہذا حبیب والہ سرائے ہند لارڈز اور دن۔ انگلستان سے کوٹے تو انہوں نے اکتوبر کے آخری ہفتہ میں ایک اعلان شائع کیا جس کی بنیاد یہ تھی،

۱۔ حکومتِ برطانیہ کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان کو جو خود مختاری اور سیاسی آزادی دی جائے۔ وہ نوآبادیاتی درجہ کی ہو۔

۲۔ سائنس کمیشن کی رپورٹ ملتے ہی ہندوستانی رہنماؤں اور وایانویا سب یا ان کے نمائندوں کو انگلستان مدعو کرے تاکہ مسودہ آئین کے ضمن میں اس نوع کی تجاویز پیش

کی جائیں جو قبولِ عام حاصل کر سکیں۔

مسلم لیگ اور کچھ دیگر گروہوں نے وائسرائے کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔ کانگریس نے حسبِ روایت مولیٰ تولی شروع کر دیا۔ انہوں نے باہم مشورے کے بعد پہلے تو وائسرائے کے اعلان کو خوش آمدید کہا لیکن ساتھ ہی کچھ شرائط بھی عائد کر دیں،

- ۱۔ تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔
- ۲۔ انگلستان کی مجوزہ گول میز کانفرنس میں کانگریس کو موثر نمائندگی دی جائے۔
- ۳۔ کانفرنس میں صرف نوآبادیاتی درجہ کے آئین کی ترتیب پر بات ہوگی۔ نہ کہ آئین کے آئندہ اصولوں پر بحث و تجویس۔

۴۔ جلد از جلد اس امر کی کوشش کی جائے کہ ہندوستان میں علاؤ الدین آبادانی درجہ کے اصولوں کی مطابقت سے حکومت کے کام کا آغاز ہو سکے۔

کانگریس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح اختیارات، ایک ایسی کابینہ کے ہاتھوں میں چلے جائیں گے جو صرف عوامی نمائندوں کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ہوگی لہذا قدرتی طور پر اس کابینہ کو آسانی کے ساتھ تشکیل بھی کیا جاسکے گا اور نوٹا بھی جاسکے گا۔ کانگریس نے یہ بات کرتے وقت اس امر کی طرف کوئی اشارہ نہ کیا کہ اختیارات کا مرکز۔ مرکزی اسمبلی ہوگی اور صوبے اس کے زیر اثر ہوں گے یا مرکز اور صوبوں کے اختیارات کی تخصیص ہوگی۔ کانگریس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ آئین بعد میں بھی بن جائے گا۔ مگر حکومت فوری طور پر کانگریس کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۲۹ء کو دہلی میں وائسرائے ہند لارڈ اردن سے ملاقات کی تاکہ گاندھی کی طرف سے عائد کردہ چار شرائط کے پیش نظر کوئی درمیانی صورت نکالی جائے۔ لارڈ اردن نے پیرشرما قبول کر لی کہ تمام سیاسی قیدیوں کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ مگر انہوں نے باقی شرائط کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کانگریس کے پاس سال بھر قبل دیئے گئے اس چیلنج کا جواز تو موجود ہی تھا کہ دسمبر ۱۹۲۹ء تک نہرو رپورٹ منظور کر لی جائے ورنہ سولی نافرمانی کی جائے گی۔ لہذا ۳۰ دسمبر ۱۹۲۹ء کو، یعنی وائسرائے ہند سے بات چیت ٹوٹنے کے صرف ایک ہفتہ بعد۔ لاہور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت موتی لعل نہرو کے صاحبزادے جواہر لعل نہرو نے کی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ نہرو رپورٹ "کی منظور کی گئی ہوگی مگر اس کی منت ختم ہو چکی لہذا حکومت سے پھر سامنے کا وقت آگیا ہے۔ اس اقدام سے کانگریس کا مطلب ایک طرف

حکومت کو مرعوب کرنا تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کی طرف سے گول میز کانفرنس میں غیر مشروط شرکت کے ارادے کو ناکام بنانا تھا۔ ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ

اب کانگریس نوآبادیاتی درجہ کی بجائے مکمل آزادی کو نصب العین بنائے گی۔

اس کے ساتھ ہی کیسی کو یہ اختیار سونپ دیا گیا کہ وہ جب مناسب سمجھے، سول نافرمانی کا حکم دے دے۔ فروری ۱۹۳۰ء میں کانگریس کمیٹی نے سول نافرمانی کا فیصلہ کر لیا اور اس کا پروگرام ”مرد برت اور سول نافرمانی“ عدم تعاون کے ہیرو گاندھی کی مرضی کے تابع کر دیا۔ گاندھی جیسے یہ لائحہ عمل مرتب کیا کہ وہ اپنی قیام گاہ سابرمتی سے ڈانڈی تک پیدل سفر کریں گے اور منزل پر پہنچ کر نمک بنانا شروع کر دیں گے (نمک سازی ممنوع تھی) گاندھی نے کہا کہ یہ جنگ فیصلہ کن ہوگی۔ کیسکی حقیقت یہ ہے کہ بعد ازاں گاندھی کو اس جنگ سے پلوچھڑانا مصیبت ہو گیا۔ دراصل ان کا خیال تو یہ تھا کہ حکومت پہلے ہی دن ان کو گرفتار کر لے گی۔ مگر گاندھی نے پیدل سفر کیا۔ اپنے جلو میں سینکڑوں، ہزاروں لوگوں کو لے کر سفر کیا۔ حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ گاندھی، ڈانڈی پہنچے۔ نمک سازی شروع کر دی۔ ایک ہفتہ نمک صنعت نمک سازی میں مصروف رہے۔ مگر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہر ملک نمک بناتے رہیں گے؟ جالے ماندن۔ نہ پائے رفق۔ آخر کوئی ہفتہ بعد ان کی دیرینہ امید برآئی، گرفتار کر لئے گئے۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک سول نافرمانی اپنے انجام کو پہنچی۔

مئی میں سائٹس میٹنگ کی رپورٹ شائع کر دی گئی۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۰ء کو گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والوں کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا۔ ان میں کانگریس کا نوٹی نمائندہ شامل نہ تھا۔ کانفرنس کے لئے ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء مقرر کی گئی۔ اس میں مولانا محمد علی جوہر کا نام بھی شامل تھا۔ اس وقت مولانا کی حالت یہ تھی کہ نقل و حرکت سے بھی معذور تھے۔ تاہم انہوں نے قوم کی خاطر یہ زحمت اٹھائی کہ جہازوں میں سفر گوارا کر لیا۔

## پہلی گول میز کانفرنس

پہلی گول میز کانفرنس میں مجموعی طور پر برتر ہندوستانی مندوبین نے شرکت کی۔ ان میں ۱۶ مسلمان تھے اور اسی قدر ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے! مسلمان مندوبین میں ہڑائی نس آغا خان، محمد علی جناح، مولانا محمد علی جوہر، قراب چٹھاری، راجہ مشیر محمد خاں ڈومیسٹی، سر شاہ نواز،



اے۔ کے فضل الحق، حافظ ہاشمین، سر غلام حسین، ہدایت اللہ، سراسے۔ کے غزنوی، صاحبزادہ سید عبدالقیوم خاں، میاں محمد شفیع، سید سلطان احمد، ڈاکٹر شفاقت احمد، چودھری غفر اللہ خاں اور بیگم شاہنواز شامل تھے۔

ریاست کے نمائندوں میں مہاراجہ بڑودہ، راجہ بیکانیر، مہاراجہ پٹیل، نواب بھوپال، راجہ ایوا اور جہلم شامل تھے۔ ان کے علاوہ کچھ دیگر دیوان ریاست بھی شریک ہوئے۔ ہندو مندوہین میں سری نواس شاہسری، سرتیج بہادر سپرد، سر رام سوامی آنیر، سر جین لال، ایم۔ آر۔ جیک، دیوان بہادر، رام سوامی، ڈاکٹر امبیڈکر اور مسٹر۔ پارویان اور پارسی مندوہین میں۔ فرورسٹھینا، سر کاؤس جی جہانگیر اور سداچ۔ پی۔ مودی شامل تھے۔ برطانیہ کی نمائندگی وزیر اعظم ریمز، میکڈونلڈ، لارڈ چانسلر، لارڈ سائیکس، وزیر امور ہند ویکٹوری، سر سیٹھل ہور، لارڈ ریڈنگ اور لارڈ چیل کر رہے تھے۔

کانفرنس کا اجلاس ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو کاؤس آف لارڈز میں شروع ہوا۔ اقتصادی اجلاس سے شاہ جارج پنجم نے خطاب کرتے ہوئے کہا،

”میں کانفرنس کی کارروائی کا جائزہ نہایت دلچسپی، جلدی اور قربت کے ساتھ دیکھتا رہا ہوں گا۔ اس دوران اتنا شامل رہنے گا جہاں تک ہندوستان میں میری دیکھا کے مادی معاملات کا تعلق ہے میں ان سے متاثر رہا ہوں اور یہ معاملات ہمیشہ ہی میرے خیالات میں جاگزیں رہیں گے۔ میرے ذہن میں اقلیتوں اور اکثریتوں، مردوں اور عورتوں، شہریوں اور کسانوں، زمینداروں اور کاشتکاروں، مغربیوں اور امیروں، نسلوں اور ذاتوں اور کمزور اور طاقت ور سبھی کے جائز اور مناسب مطالبات موجود رہے ہیں کیونکہ انہی سے اجتماعی سیاست کی تشکیل ہوتی ہے۔ مجھے ان سب اور ان سب کے معاملات کا مکمل احساس ہے۔ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ حکومت خود اختیاری کی صحیح بنیاد ان لوگوں اور ان کے مطالبات کو تسلیم کرنے اور انہیں ٹھوس حیثیت دینے میں مضمر ہے مجھے توقع ہے کہ ان بنیادوں پر قائم ہونیوالی ہندوستان کی آئندہ حکومت ایسی تمام انگوں اور خواہشات کا احترام کرتی رہے گی۔“

شاہ انگلستان کی تقریر کے بعد مختلف مندوبین نے تعاریر کیں۔ ان سے قبل وزیر اعظم نے میکڈونلڈ لے اس توقع کا اظہار کیا کہ :

”وقت آگیا ہے کہ ہم محنت شاقہ سے کام لیں۔ ماضی میں بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے خواہ وہ منصوبہ تھا یا غلطی کی بنا پر یا جذبات میں اگر، بہر حال بہتر یہ ہو گا کہ اس میز پر بیٹھنے کے بعد ہم گزشتہ تمام باتوں کو بھلا دیں۔ مستقبل کے بارے میں کیا کمانی جنم لیتی ہے۔ اسے بہر حال اس میز پر ہی جنم لینا چاہئے اور یہ بھی یقین رکھئے کہ یہ کمانی ضرور لکھی جائے گی۔ آئیے ہم سب مل کر بہترین سیاسی ذہانت کا ثبوت دیں۔ وہ ذہانت جو ہمارے عوام کے شایانِ شان ہو اور دونوں قوموں کی عزت و توقیر کو دنیا کی نظروں میں دوبالا کر سکے۔“

تقریر شاہ انگلستان کی تھی یا وزیر اعظم برطانیہ کی نیت اور ارادے دونوں سے عین ہے۔ جو نبی مندوبین کی تعاریر کا آغاز ہوا، کانفرنس وہی منظر پیش کرنے لگی جو گزشتہ کئی برس سے ہندوستان میں تھا۔ مولانا محمد علی نے انتہائی حالات کے باعث اپنی نشست پر بیٹھ کر زیرِ کی۔ اسی موقع پر انہوں نے وہ تاریخی الفاظِ بات سے ادا کئے کہ :

”میں اپنی انتہائی حالات کے باوجود ہزاروں میل کا سفر طے کر کے اس کانفرنس میں یہ تہیۂ کمر کے آیا ہوں کہ اگر میرے ساتھ آزادی کی دولت چلتی تو میں اپنے وطن واپس جاؤں گا۔ اگر میں یہ دولت ساتھ نہ لے جا سکا تو یقیناً اس غلام ملک میں جانے کی بجائے غیر ملک میں مرنا پسند کروں گا۔ کم از کم یہ ملک آزاد تو ہے۔ اگر تم مجھے میرے ملک کے لئے آزادی نہیں دے سکتے تو قبر کے لئے چند گز جگہ تو دے سکتے ہو۔“

آزادی نہیں مل سکی تھی، محمد علی جوہر نے اپنی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پورے دکھائے۔ وہ وہیں فوت ہوئے اور انہیں یروشلم میں سپرد کیا گیا۔

مولانا محمد علی جوہر نے سائنس کیشی کی رپورٹ کو ایک بایوس کن دستاویز قرار دیا۔ انہوں نے حکومت برطانیہ کو انتباہ کیا کہ وہ ایک آزاد ملک میں واپس جانا چاہتے ہیں نہ کہ س ایسے ملک میں، جس کا وجود بھی تسلیم کرنا مشکل ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ :

”مہربان کھہ مارو کوٹوریہ کے پوتے جارج پنجم کے دور کی تاریخ شاید یوں لکھی جائے

کہ جارج سورم نے امریکہ گنوا دیا، جارج پنجم نے ہندوستان حیت لیا۔  
جب مولانا محمد علی جوہر سے یہ پوچھا گیا کہ وہ سیاست میں ہندو مسلمان کا سوال کیوں پیدا کر دیتے ہیں تو انہوں نے اپنے روایتی انداز مخاطب میں جواب دیا:  
”جب آپ لوگ سیاست کو مذہب سے خارج کر دیتے ہیں تو یقیناً آپ مذہب کے غلط تصور کو جنم دیتے ہیں۔ میری سیاست کا نام تار و پود اسلام میں ہے۔ اگر آپ مجھ سے یہ کہیں کہ میں آپ کی سلطنت میں یا آپ کی قوم میں اس تار و پود اس ثقافت، اس ضابطہ اخلاق اور اس سیاست کو چھوڑ کر داخل ہوجاؤں تو میں ایسا کبھی نہ کروں گا۔“

مولانا محمد علی جوہر نے مزید کہا کہ ہندوستان کے ہندوستانی سپاہی بھی آزادی کے حق میں ہیں اور اگر حکومت چاہے تو استعصوب رائے کو الے، مقبوضہ معلوم ہو جائے گا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ فوج کو بحال ہندوستانیوں کے ماتحت ہونا چاہئے۔  
گوانگرس اس کانفرنس میں شریک نہ تھی، لیکن حکمران لیبر پارٹی کے وزراء جو بات بھی کہتے، محسوس یہ ہوتا کہ کانگریسی رہنما بات کر رہے ہیں۔ جہاں تک وزیراعظم کا تعلق تھا تو ان کی باتوں سے بھی محسوس ہوتا کہ گویا ہندوستان کی آزادی اور قومیت کی علمبردار صرف کانگریس ہے۔ لہذا ہندوستان کے تمام مسائل برطانیہ اور کانگریس میں طے پانے چاہئیں۔ گوانہوں نے کسی بھی اقلیتوں کے عدم تحفظ کی بات نہ کی لیکن ہر بار ”ہندوستانی قومیت“ کا نام لے کر ملک کے مجموعی مفاد کی بات کرتے رہے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ سب لوگ کانگریس کے موقف کو بلا کم و کاست تسلیم کر لیں۔

مولانہ کانفرنس نے مختلف سب کیٹیاں بنا کر ان کے وقت مختلف امور کر دیئے تھے۔ ایک سب کیٹی دفاعی نظام پر غور و غوض سے متعلق تھی جس میں محمد علی جناح اور سر شفیق بھی شامل تھے۔ دوسری سب کیٹی اقلیتی مسائل سے متعلق تھی۔ محمد علی جناح نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا۔ سر محمد شفیق نے یہ اعلان کیا کہ وہ بحث میں تو شریک ہوں گے لیکن سفارشات کو آخری صورت دینے کے لئے اس وقت تک تعاون نہ کریں گے جب تک اقلیتوں کا مسئلہ تسلی بخش طریق پر حل نہیں ہو جاتا۔ سر محمد شفیق کی اس بات سے واضح تھا کہ مسلمان پہلے اپنے مسائل کا حل چاہتے تھے اور اس کے بعد ہی نئے آئین کے بارے میں کوئی بات ممکن تھی۔ یہ

اس کانفرنس کے دوران دو اہم مسائل پیش نظر تھے۔ ایک تو یہ کہ کل ہندوفاق کی تشکیل

لیونگرہ اور ہندوستان کی ریاستیں اس وفاق میں کن بنیادوں پر شامل ہوں؟ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا تو انہیں اکل پارٹیز مسلم کا نفرس کی قرار داد اور محمد علی جناح کے ۴ نکات کی روشنی میں وفاق پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ تاج برطانیہ کے زیر سرپرستی کانگریس کی خواہشات کے مطابق جس وفاق کی بات کی جا رہی تھی وہ مسلمانوں کے لئے قابل اعتراض تھی۔ اس پر ایک اعتراضی تو یہ تھا کہ یہ مختلف وعدوں پر مشتمل ایسا وفاق نہ ہوگا جس کے سیاسی اور یقینی ڈھانچہ یک رنگ ہوں اور دوسرے یہ کہ ریاستوں کی خود مختاری بلاشبہ مرکز کی ذمہ دار حکومت یا مشورہ نامیں حاصل ہوگی۔ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ایک اور اعتراض یہ بھی تھا کہ بیشتر ہندو ایمان بیاست کی شمولیت کے باعث کل بندہ یکم میں مسلمانوں کی حیثیت کمزور پڑ جائے گی۔ محمد علی جناح نے بھی وفاق ڈھانچہ کی سب کیٹیج میں اس خیال کا اظہار کہ یہ بات اب تک طے نہیں ہوئی کہ برطانوی ہندوستان میں کس قسم کا وفاق ہوگا۔ جہاں تک صوبوں کا تعلق تھا ایک خیال یہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ برطانوی ہند میں صوبوں کو خود مختار ریاستوں ایسی حیثیت حاصل رہے گی۔ اگر یہ خیال درست تھا تو اس صورت میں ان صوبوں کی وفاق میں شمولیت ویسی ہی ہو جائیگی جیسے ہندوستانی ریاستوں کی! لہذا صرف ایک وفاق ہوگا یا دو وفاق یا وفاق در وفاق! — محمد علی جناح نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ دیکھنا یہ ہوگا کہ ہندوستانی ریاستیں کن بنیادوں پر وفاق میں شمولیت پسند کریں گی اور کیا ان کی شمولیت کے بعد وفاق اس حد تک کمزور نہیں ہو جائے گا کہ اسے وفاق بھی نہ کہا جاسکے۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ وہ کون سے امور ہوں گے جنہیں ہندوستان کی ریاستیں وفاقی امور تسلیم کریں گی۔ اگر پہلے یہ فیصلہ ہو جائے تو یہ سوال بعد میں پیدا ہوگا کہ یہ ریاستیں صوبوں کی سطح پر کس حد تک آئیں گی؟ محمد علی جناح نے ریاستوں کے نمائندوں سے بھی یہ بات واضح طور پر پوچھی کہ وہ ایک حقیقی وفاق کے قیام اور اس میں شمولیت کی صورت میں ہندوستان کے مجموعی مفادات کے لئے کس حد تک قربانی دے سکیں گے۔

انہوں نے یہ نکتہ بھی اٹھایا کہ موجودہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ایک ودھانی طرز حکومت کی بنیاد نظر آتی ہے جس میں صوبے خود مختار نہیں لہذا ہندوستان کے وفاق کے سوال پر غور کرنے کے لئے کچھ باتوں کو ذہن نشین کرنا ضروری ہوگا۔ بنیادی بات یہ تھی کہ وفاق کے مقصد کے لئے صوبوں کو خود مختار ریاستوں کے طور پر تسلیم کر لیا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ یہ ریاستیں کس حد تک وفاق کا جزو بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ محمد علی جناح نے اس امر کی بھی وضاحت کی کہ جب تک ہندوستانی ریاستیں اپنے کچھ اختیارات رضا کارانہ طور پر وفاق کے سپرد کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اس وقت تک اس بات پر غور کرنا مبطل ہوگا کہ صوبوں کے کون سے امور وفاق میں شامل ہوں گے اور صوبے کس حد تک اپنے اختیارات وفاق کے حوالے کریں گے؟

محمد علی جناح نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی کہ آزاد ہندوستان میں برطانیہ کو تحفظات دیئے جائیں۔ اس سلسلہ میں ان پر مختلف طریقوں سے خاصا دباؤ ڈالا گیا لیکن وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہٹنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

”آزاد ہندوستان میں برطانوی تجارتی تحفظات کے بارے میں آغا خاں کی دسالت سے محمد علی جناح پر شدید دباؤ ڈالا گیا مگر وہ مضبوطی کے ساتھ اپنے قدموں پر رہے۔ انہوں نے یہ سب کچھ ہندوستان کے عظیم مقاصد کے لئے کیا۔ اس دوران وزیر اعظم برطانیہ رینزے میڈائل نے محمد علی جناح کو خوبصورت رشتہ پیش کرنے کی کوشش میں یہ لالچ دیا کہ نئے ہندوستان کے مختلف صوبوں کی گورنریاں ممتاز ہندوستانیوں کو دی جائیں گی۔ غالباً وزیر اعظم برطانیہ کے اس اشارہ کا مقصد یہ تھا کہ اگر محمد علی جناح ایک تابع فرمان بچے کی طرح ان کی بات مان لے تو اسے بھی کسی صوبہ کی گورنری تھما دی جائے گی۔ لیکن جناح کی اس بات کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے اپنے موقف سے ہٹنا پسند نہ کیا۔“

یہ تھے وہ الفاظ جو معروف ہندو رہنما کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب ”انڈیا فائٹس فار فریڈم“ میں لکھے۔

یہ گول میز کانفرنس برطانوی نائندوں کے ہتھکنڈوں کے باعث ناکام ہو گئی — کانفرنس میں مسلمان وفد کے قائد نہرا ٹی نس آغا خاں نے بھی مجبوراً اس خیال کا اظہار کیا کہ کانفرنس کے انگریز مندوبین نے حقائق اور ہندوستان کے حالات کو پس پشت ڈال دیا تھا

## گاندھی کی رہائی

یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے گاندھی کے ایما پر گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیا گیا اور وہ خود سرول نافروانی کے الزام میں جیل چلے گئے۔ لیکن کانفرنس کے آخری دن وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ کے اعلان سے صرف چار دن قبل گاندھی نے وائسرائے ہند لارڈ اردن کی کس ادا کو پسند کرتے ہوئے مصالحہ رویت اختیار کیا، ۵ دسمبر ۱۹۳۱ کو گاندھی اور کانگریس کی کمیٹی کے ارکان جیل سے باہر آ گئے۔ گاندھی — اردن ملاقاتیں ہوئیں۔ اس دوران گاندھی خود کو "عوامی رہنما" ثابت کرنے کے لئے روزانہ وائسرائے کی قیام گاہ تک پیدل پہنچنے رہے۔ نتیجتاً ایک صلح نامہ پر دستخط ہوئے، جسے گاندھی — اردن پیٹ کانام دیا گیا۔ ساحلی علاقوں پر رہنے والوں کو سمندر سے نمک نکالنے کی اجازت مل گئی۔ مگر سیاسی نوعیت کا کوئی قابلِ ذکر ٹھکانہ نہ ہوا۔ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس نے شرکت پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اس دوران ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ حکومت، کانفرنس میں کانگریسی وفد کو ایک تہائی سے زائد نمائندگی دینے پر آمادہ نہ تھی۔ بہر حال گاندھی نے یہ سوچ کر کہ کانگریس، دوسری کانفرنس میں بھی شرکت سے محروم نہ ہو جائے یہ راستہ چنا کہ وہ کانگریس کی طرف سے تنہا شریک ہوں گے۔ اس کے باوجود وہ یہ اصرار بھی کرتے رہے کہ ہندو مسابھا کی نمائندگی پنڈت مدن موہن مالویہ اور عورتوں کی نمائندگی مسز سروجنی نائیڈو کو دی جائے اور مسلمان نمائندوں کی نمائندگی ڈاکٹر انصاری اور سید علی امام کریں۔ جب یہ معاملہ وائسرائے کی انگریز کمیونسل میں پیش ہوا تو کمیونسل کے ایک رکن مر فضل حسین نے ڈاکٹر انصاری کے نام کی شدید مخالفت کی۔ لہذا ان کا نام فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ گاندھی اس وقت تک یہ کوشش کرتے رہے کہ کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر انصاری مندوہین میں شامل ہو جائیں لیکن ان کی امید برباد ہو سکی۔

اب گاندھی کی تمام تر کوشش ہندوستان کی خود مختاری اور ہندو مسلم مسئلہ کو اپنی نشا کے مطابق حل کرانے پر مرکوز تھی۔ جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گاندھی کا نام کانگریس کے اجلاس کراچی میں توثیق کی غرض سے زیر بحث آیا تو کانگریس نے وہاں اس خیال کا اظہار کیا کہ سب سے پہلے ہندو مسلم مصالحت ضروری تھی اور یہ واحد طریق تھا جس سے ہندوستان کا

مسئلہ حل ہو سکتا تھا اور اگر کانفرنس سے پہلے یہ مسئلہ حل نہ ہوا تو ان کانفرنس میں شرکت کرنا بے سود ہوگا۔

کانگریس کے بارے میں دلچسپ ترین بات یہ تھی کہ جیپ اسے کچھ نہ سوجھتی تو کانگریس کو ہر معاملہ میں کئی اختیارات دے کر ڈکٹیٹر بنا دیتی۔ اور جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتے تو کانگریس کی مجلس عاملہ فوراً برعکس قرار داد منظور کر دیتی اور گاندھی صاحب اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے، ساتھ ہی اپنی مجبوری کا اظہار بھی۔! وقت آتا تو وہ کانگریس سے پھر کسی معاملہ پر اختلاف کر کے دھوئی دے دیتے۔ کانگریس ر ہنہ انہیں سمجھانے لگتے۔ گاندھی صاحب جانتے۔ اور پھر وہی ڈکٹیٹر فیسبل۔ کانگریس کمیٹی کے وہی فیصلے۔ گاندھی صاحب کی وہی مجبوریوں۔ وہی دھوئی دے دیتے اور پھر مان جانا۔ غرضیکہ عجیب انداز دلربائی تھا۔

اُدھر گاندھی صاحب نے ہندو مسلم اتحاد کو آزادی کی بنیاد قرار دیا اور اس کا کانگریس نے کراچی میں ایک قرارداد منظور کر دی جو اقلیتوں کے تحفظ اور ان کے بنیادی حقوق سے متعلق تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ گاندھی صاحب کا تناسب ملک بھر میں مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ قائم رکھا جائیگا لیکن یہ تناسب ان اقلیتوں کے لئے ہوگا جو آبادی کے ۲۵ فیصد کم ہیں تاہم وہ رائڈ نشستوں کے لئے انتخاب لڑ سکیں گی۔ ظاہر ہے کہ اس فیصلہ کے بعد گاندھی صاحب نے ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ ختم ہو گیا تاہم وہ اس سمجھوتہ کے لئے بدستور سرگردم رہے۔ انہوں نے دلی میں جمعیت العلماء ہند کے سالانہ اجلاس میں پھر وہی نعرہ لگایا کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں مصالحت نہیں ہو جاتی، ان کا لندن جانا بے سود ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے نہایت فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ پیشکش کی کہ ہندو مسلم مفاہمت کی خاطر وہ مسلمانوں کو "کوراپیک" دینے پر بھی آمادہ ہیں۔ مگر اس "کوراپیک" کے ساتھ ایک شرط بھی تھی، یہ کہ مسلمان جو مطالبہ کریں اس پر کانگریس مسلمان بھی حاد کریں۔ کیونکہ گاندھی صاحب کو معلوم تھا کہ کانگریسی مسلمان وہی کریں گے جو گاندھی صاحب خود چاہیں گے۔ چنانچہ کانگریسی مسلمان اور مسلم کانفرنس کے تین نمائندوں کے درمیان پہلا اجلاس بھوپال اور دوسرا شملہ میں منعقد ہوا۔ لیکن اختلافات اتنے تھے کہ کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل تھا۔ کانگریسی مسلمان مسلم اقلیتی صورتوں میں مسلمانوں کو مخلوط انتخاب کی بنیاد پر آبادی کے تناسب کے اعتبار سے زیادہ ایک نشست بھی دینے پر آمادہ نہ تھے اور ان کا موقف وہی تھا جو کانگریس کا، یعنی رائڈ حلقوں میں انتخاب لڑنے کا حق! مسلم کانفرنس کا

مطلبہ یہ بھی تھا کہ ایسے مردوں میں مسلمانوں کی تعلیموں کو معاہدہ کھٹو کے مطابق اصلاح کا مدخلہ ہائے انتظام کے ذریعہ نمائندگی دی جائے۔ یہ بات چیت کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ چنانچہ اب گاندھی کیلئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ لندن کیسے جائیں؛ کیونکہ وہ تو یہ کہہ چکے تھے کہ جب تک مخالفت نہ ہو ان کا لندن جانا بے مقصد ہوگا۔

اس موقع پر پھر اسی ناز برداری سے کام لیا گیا جو کانگریس ہمیشہ سے گاندھی کے لئے کرتی آئی تھی۔ یعنی کانگریس نے گاندھی کی بات بھی رکھی اور ان کے لندن جانے کے لئے زمین بھی ہموار کر دی۔ جون ۱۹۳۱ء میں کانگریس نے یہ قرارداد منظور کی کہ اگر بدقسمتی سے فرقہ وارانہ مصالحت نہ ہو سکے۔ تب بھی گاندھی کو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے ضرور جانا چاہئے تاکہ کانفرنس کو کانگریس کا نقطہ نظر معلوم ہو جائے۔ اب گاندھی کی باری تھی۔ انہوں نے کہا: ”میں ایک جمہوریت پسند انسان ہوں۔ لہذا کانگریس کمیٹی کے فیصلہ کو تسلیم کئے بغیر اور چارہ بھی کیا ہے؛ بہر حال میں سمجھوتہ کے لئے اپنی ہر کوشش جاری رکھوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ ۱۹ اگست ۱۹۳۱ء کو کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔



## باب ۲

## مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد و صوبہ

۲۹- دسمبر ۱۹۲۰ء کو جب پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام میں ایک دن رہتا تھا تو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس، الہ آباد میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس موقع پر انہوں نے جو خطبہ صدارت پڑھا۔۔۔ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بائیں مختلف تھا۔ اس خطبہ میں انہوں نے مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے نظریہ پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو صرف کچھ عقائد ہی نہیں دیئے بلکہ انہیں ایک خاص سیاسی معاشرہ بھی عطا کیا ہے۔ اگر معاشرتی یکجہتی اور اجتماعی جذبے کے اعتبار سے ہندوستان میں کوئی اگر وہ واحد قوم کی صورت میں موجود ہے تو وہ اس ملک کے مسلمانوں کا گروہ ہے۔ علامہ اقبال کے اس تاریخی خطبہ کا مکمل متن یہ ہے:

”اس حقیقت سے انکار کیسے ہو کہ ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے اعتبار سے اسلام ہی کے باعث ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کی تاریخ ایک مخصوص سانچے میں ڈھلی۔ نظام سیاست سے میری مراد وہ جماعت ہے جس کا نظم و ضبط ایک نظام قانون کے تحت قائم ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک اخلاقی روح کارفرما ہوتی ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس کے باعث ہندوستانی مسلمانوں کے سینوں میں وہ روح پیدا ہوئی جس روح پر جماعتوں کی زندگی منحصر ہوتی ہے۔ اس روح کی بیداری کے باعث بکھرے ہوئے افراد تسبیح کے

دائروں کی طرح ایک لڑی بن جاتے ہیں اور پھر جب یہ منتشر افراد ایک قوم کی صورت اختیار کر جاتے ہیں تو وہ ایک مخصوص اخلاقی نظام، اخلاقی شعور کو ہمراہ لئے کر چلتے ہیں۔ اگر میں مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لے رہا تو یہ کہوں گا کہ شاید اس خطہ ارضی میں صرف ہندوستان ہی وہ ملک ہے جس میں اسلامی وحدت کی بے پناہ طاقت ایک نمود بن کر سامنے آئی ہے۔ جمعیت اسلام کی ترکیب اسی اسلام کی روح کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ہمارے تمدن، اسلامی تمدن میں وہی مخصوص اخلاقی شعور اور روح موجود ہے، جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس وقت افکار مغرب تمام دنیا نے اسلام، بشمول ہندوستان چھائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک انقلابی کیفیت ہے اور ہماری نوجوان نسل ان افکار سیاسی کی طرف پوری دلچسپی کے ساتھ کھینچتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن ان نوجوانوں نے اس کے پس منظر پر غور کرنے کی سعی بھی نہیں کی۔ انہوں نے اس بات کو فراموش کر دیا کہ آخر ان افکار کے مغرب میں پروان چڑھنے کی وجوہات کیا تھیں؟ نوجوان نسل نے اس حقیقت کو بلائے طاق رکھ دیا کہ مغرب میں مسیحیت معنی ایک رہبانیت کے وجود کا نام تھا، پھر کلیسائی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ یہی وہ کلیسائی حکومت تھی جس کے خلاف لوتھر نے احتجاج کیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوتھر کا یہ احتجاج بالکل درست تھا۔ لیکن ہے اس وقت لوتھر کو بھی اس بات کا احساس نہ ہوا کہ اس نے جن حالات میں اپنی تحریک کا آغاز کیا، وہ تحریک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ملامی نظام اخلاق نہیں بلکہ مغرب کے لاتعداد اخلاقی نظاموں پر منتج ہو گا۔ ہر اخلاقی نظام ایک مخصوص قوم سے متعلق ہو گا۔ اس طرح مختلف عہد و دوائر سے پیدا ہو جائیں گے۔ کیا اسی لئے لوتھر اور روسو کی تحریک نے عیسائیت کی دنیا کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے تقسیم و تقسیم پر نہیں پہنچایا۔ اسی لئے نوجوان انسان کے مجبوری مرکز سے مغرب کی نظریں پٹ گئیں اور مختلف اقوام کے تنگ صندوق میں پھنس کر رہ گئیں۔ لوتھر اور روسو نے انہیں جو تخیل حیات دینا چاہتا تھا مغرب اس سے الگ ہو کر ایک مادی احساس و لطیفیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس ولطیفیت کے احساس

کی نشوونما ہوئی تو مختلف سیاسی نظام سامنے آئے یہ سب قومی جذبات کی  
 نمودیں پر دان چڑھے اور یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ اتحاد سیاسی، وطنیت کے  
 عقیدے کی اساس پر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اگر مذہب کا تصور یہ ہے تو  
 وہ اس دنیا کے لئے نہیں بلکہ آخرت کے لئے ہے۔ مسیحی دنیا میں انقلاب ایک  
 قدرتی بات تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو عالمگیر نظام اخلاق تھا،  
 اب اس کا وجود نہیں ہے۔ اب جو بھی نظام ہے وہ یا تو اخلاقی اساس پر ہے یا  
 سیاسی اساس پر! اور ہر نظام ایک ”قومی نظام“ ہے لہذا اگر مغرب کے  
 لوگ مذہب کو فرد کی ذات تک محدود کر دیں اور فرد کی دنیاوی زندگی کو مذہب سے  
 الگ کر دیں تو اور بات ہے لیکن اسلام ایک فرد کو ایک وحدت قرار دیتا ہے  
 اسلام روح اور مادہ کو یکجا کرتا ہے۔ اسلام کی روح کے تحت تو خدا کی  
 ذات اور پوری کائنات، ریاست اور کلیسا اور مادہ اور روح ایک چیز کے  
 اجزائے ترکیبی ہیں۔ اسلام کے تحت انسان کسی الگ تھلک اور غیر پاکیزہ دنیا کا  
 باشندہ نہیں۔ اسلام اس دنیا سے علیحدگی کا سبق بھی نہیں دیتا۔ اسلام تو  
 مادہ کو بھی روح کی ایک شکل قرار دیتا ہے۔ روح جس کا اہتمام مکان و زمان کی  
 قید میں ہوتا ہے مگر مغرب نے ان دونوں میں حدفاصل قائم کر دی ہے۔ مگر  
 آج پھر مغرب کا مکتہ اس دنیاوی غلطی پر قائم کنا ہے۔ لیکن وہ مجبور ہے کہ  
 سیاست دان اس اصول سے چپٹے ہوئے ہیں۔ یہ سب نتائج روحانی اور  
 دنیاوی زندگی کے درمیان حدفاصل قائم کرنے کی وجہ سے برآمد ہو رہے ہیں۔  
 یہی وجہ ہے کہ یورپ کی ریاست تو مسیحی ہے مگر عملی طور پر وہ مذہب کو غیر باد  
 کہہ چکی ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ چند بے ربط ریاستوں کا قیام عمل میں  
 آتا، سو کیا۔ اب ان بے ربط ریاستوں میں کیا ہے۔ وہاں قومی جذبہ موجود  
 اور انسانی جذبہ نثار رہے۔ چنانچہ اگر آج یہی ریاستیں چاہتی ہیں کہ یورپ  
 متحد ہو جائے تو یہ ایک ناممکن سی بات ہوگی۔ جب مذہبی عقائد اور اخلاقی اقدار  
 کی بنیاد ہی نہیں تو اتحاد کس اساس پر قائم ہوگا؟ قومی اساس پر —  
 یعنی اب مغرب کے لوگ اپنے ہی ہاتھوں تباہ کردہ عمارت کی تعمیر نو کا خواب

دیکھ رہے ہیں۔ یہ عمارت انہیں کلیسا نے دی تھی۔ مگر مغرب نے اس کی تعمیر ایک عالمی تصور، یعنی اخوتِ انسانی کی بنیاد پر کرنے کی جگہ وقصر کے فلسفے کی بنیاد پر کی۔ بہرہفت عالم اسلام میں کوئی وقصر پیدا نہیں ہوگا کیونکہ اسلام میں کلیسا کی طرح کوئی نظام نہیں جو ازمنہ و معلیٰ کے مسیحی نظام کی طرح ہو۔ اسلام کا نطفہ ہم سیاست مانگ رہے ہیں۔ اس کی بنیاد دو ہی ہے، ضرورت صرف اتنی ہے کہ ہم اس عمارت کی تعمیر کریں۔ ہمارے فتنہ علی زندگی سے دور ہیں، نئے دور کے تقاضوں سے پیچھا نہ ہیں۔ یہ کام ہمیں خود کرنا ہے تاکہ ہم ایک مضبوط اور خوب صورت عمارت تعمیر کر سکیں۔ لیکن حوالہ تو یہ ہے کہ اس وقت نوجوان نسل مغرب کے نظریہ قومیت کو جس تیزی کے ساتھ ہوں میں جگہ دے رہی ہے اس کا انجام آخر کیا ہوگا؟ ہمارے سامنے دو چیزیں ہیں۔ اول تو یہ کہ فکرِ مغرب یعنی قومیت کا تصور خود اسلام میں جذب ہو کر نئی صورت اختیار کرے گا، جیسے قبل ازیں مختلف النوع تصورات اسلام میں جذب ہو گئے اور ان کی ہیئت بدل گئی۔ — یا اسلام میں کوئی تبدیلی آجائے گی۔ چند روز کی بات ہے ہالینڈ کے پروفیسر ونسٹیک نے ایک خط میں مجھے لکھا کہ اسلام آج اس نازک موڑ پر ہے جہاں مسیحیت تین سو سال پہلے موجود تھی۔ لیکن سو سال سے زائد گزر جانے کے بعد ابھی یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ مسیحیت آخر کیا رخ اختیار کرے گی۔ اسلام تو ابھی اس نازک موڑ پر پہنچا ہے، لہذا اس کے بارے میں کچھ کیسے کہا جاسکتا ہے مسلمان بھی قوم اور نسل، وطن اور خون کے تصورات میں اُبٹھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی سے عمل کا تعلق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ایسا ہوتا رہا تو شاید اسلام کی صورت ہی بدل جائے۔

میں امید کرتا ہوں کہ علی بحث کے لئے مجھے معاف کر دیا جائے گا۔ بہرہفت جس شخص کو آج آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے اعزاز سے نوازا ہے وہ اب بھی اسلام کو ایک زندہ طاقت سمجھتا ہے۔ وہ طاقت جو انسان کے ذہن کو وطن اور نسل کے تصور کی قید سے نجات دلا سکتی ہے۔ اسلام — ریاست اور فرد دونوں کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے —

اسلام کا عقیدہ ہے کہ اس کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اور کوئی دوسرا  
 اس کی تقدیر کاٹنے نہیں پٹ سکتا۔ چنانچہ ہر سوچ اس عقیدے کے تحت  
 ہوتی ہے۔ میں جو ہر اشارہ کر رہا ہوں اس کی حیثیت صرف نظریہ میں ہے  
 یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ دستور حیات ہے، ایک نظام ہے اور اسلام اس سے  
 متاثر ہوتا ہے۔ بس یہی وہ بات ہے کہ ہم اگر اسے پالیں تو مستقبل میں ہندوستان  
 کی ایک نمایاں تہذیب کے علمبردار بن سکتے ہیں۔ آج اسلام ایک ایسی  
 آتش مائش سے دوچار ہے کہ اس سے قبل وہ بھی اتنے بڑے وقت سے دوچار  
 نہیں ہوا۔ یہ حق تو ہر قوم کو حاصل ہے کہ وہ اپنے اصولوں میں تبدیلی کر سکتی ہے  
 کچھ نئے اصولوں کو بھی اپنا سکتی ہے۔ لیکن اس سے قبل یہ بھی ضروری ہے کہ نیا کچھ  
 پر ہر پہلو سے مکمل غور کر لیا جائے۔ اگر کچھ حضرات کو میرے ان نظریات سے  
 اتفاق نہیں ہے تو اس سے بے سود بحث یا کشمکش کو جنم نہیں لینا چاہئے۔  
 ہم مسلمان ہیں اس اجلاس میں سب مسلمان ہیں۔ اذروئے دین ہمارے  
 مقاصد ایک ہیں، ہماری دینی تعلیم ایک ہے۔ میں نے جن خیالات کا اظہار  
 کیا ہے ان کا واحد مقصد یہ ہے کہ دینی عقائد کی روشنی میں ہمارے سیاسی راستے  
 جگمگا اٹھیں۔

سوچنا یہ ہے کہ فی الواقعہ مذہب ہمارا ذاتی معاملہ ہے؟ اور کیا ہم  
 اسے ذاتی معاملہ قرار دے کر اسلام کو بھی سیاسی و اخلاقی نصب العین میں  
 اس منزل پر پہنچانا چاہتے ہیں جو قبل ازیں مغرب میں مسیحیت کے ساتھ ہر چکا؟  
 دوسری صورت یہ ہے کہ اگر ہم ایک طرف اسلام کو دستور اخلاقی و نخبی کے  
 طور پر رہنے دیں مگر اسلامی نظام سیاست کی جگہ ایسے کسی قومی نظام کو  
 اپنالیں جس کے تحت مذہب درمیان میں نہ آتا ہو۔ تو کیا یہ ممکن ہے؟  
 ہندوستان میں ہم مسلمانوں کے لئے یہ سوال زیادہ ہی اہمیت کا حامل ہے  
 وجہ یہ ہے کہ ہم اقلیت میں ہیں۔ ہم مسیحیت کی طرح رہبانیت کے قائل نہیں ہیں  
 کیونکہ قرآن کریم میں اس کا اظہار موجود ہے۔ ہمارا عقیدہ مختلف —  
 بالکل مختلف ہے۔ یہ ایک فرد اور اس کی ذات تک محدود معاملہ نہیں ہے

بلکہ یہاں تو ہر فرد ایک وحدت ہے اور اس سے عظیم نظام ترتیب پاتے ہیں۔ لہذا ہمارے ہاں ایک ایسے سیاسی نظام کی بنیاد پڑی جس میں قانونی معیارات بھی تھے۔ یہ اس لئے اہم ہیں کہ ان کی بنیاد الہام اور وحی پر ہے۔

لہذا اسلام کا معاشرتی نظام اور اس کا نصب العین مختلف نہیں ہیں۔ یہ ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ ان میں کسی ایک کا دامن تمام کو آگے قدم بڑھانا مشکل ہے۔ ہاں دونوں کی قید سے آزاد ہو کر جو چاہے کیجئے۔

مگر ہاں اسلام خالص از بحث ہو جاتا ہے۔ اس انداز میں کم از کم میرے خیال میں کوئی مسلمان سوچنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ یہی مسئلہ آج ہم ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے ہے۔ معروف فرانسیسی مفکر دینال کے قول سے انسان، نسل یا مذہب کی قیود برداشت نہیں کر سکتا۔ دریاؤں کی تندی بھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ سلسلہ کوہ کے رخ بھی اس دائرہ عمل کو محدود نہیں کر سکتے مگر یہ متوازن ذہن کے عوام کا اجتماع ہے، ان کے دل گرم ہیں تو ان میں وہ اخلاقی شعور یقیناً پیدا ہو گا جسے قوم کے لفظ سے پکارا جاتا ہے۔ مجھے اس اجتماع اور اس ہیئت سے انکار نہیں، مگر یہ عمل طویل ہے۔

اس دوران قدم قدم پر برداشت اور صبر کے امتحان بھی ہیں۔ اس عمل میں حیات انسانی ایک نئے عملی سانچے میں ٹھکانا شروع ہوتی ہے۔ اگر شاہنشاہ اکبر کے دین الہی یا کبیر کی تعلیم عوام میں گھر کر جاتی تو عین ممکن تھا ہندوستان میں ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی مگر تجربہ شاہد ہے کہ ہندوستان میں جتنے بھی مذاہب ہیں ان میں ان کے کوئی جراثیم موجود نہیں ہیں کہ وہ انفرادیت کو ختم کر کے اجتماعیت کو اپنائیں مگر اس اجتماعیت کو قائم رکھنے یا وہ اخلاقی شعور جو قوم کی تخلیق کے لئے ضروری ہے، بہت امتحانات اور قربانیاں طلب کرتا ہے اور اس کے لئے پورے ہندوستان میں کوئی بھی قوم تیار نظر نہیں آتی۔

ہندی قومیت کے اتحاد سے ہم ان تمام جماعتوں کی نفی نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس اتحاد کی اساس ان کا باہمی تعاون اور ہم آہنگی نہیں ہو سکتی۔ تدبیر تو اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ حقائق، حقائق ہیں، وہ خوشگوار ہیں یا تلخ، ہم

وسیع القلبی سے اُن کا اعتراف کر لیں۔ اس کی راہیں سخت ہوتی ہیں۔ ہم  
 مفروضوں پر چل کر اپنے مقاصد کے حصول میں کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں۔  
 ہمارے لئے حالات و واقعات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ہندوستان جو  
 یا ایشیا، اُن کی قسمت ہندی قومیت کے اتحاد کے اصول پر مبنی ہے۔ ہم  
 ہندوستان کو ایک چھوٹا ایشیا ہی کہہ سکتے ہیں۔ ہند کے لوگوں کا ایک حصہ  
 ایسا بھی ہے جو اپنی تہذیب و تمدن میں اقوام مشرق سے خاصی مشابہت رکھتا  
 ہے۔ مگر ایک دوسرا حصہ ایسا بھی ہے جو مغربی یا وسطی ایشیا میں آباد اقوام  
 سے مشابہ ہے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ہندوستان ہی میں  
 باہمی اشتراک کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو ہندوستان میں کسی بنیادی  
 قباحت کی وجہ سے نہیں بلکہ جغرافیائی اعتبار سے جو باشندے قوتِ مشرق بنتے  
 چلے آ رہے ہیں اُن میں صلح ہو جائے گی۔ نہ صرف صلح ہو جائے گی بلکہ پورے  
 ایشیا کی گنتی بھی سلجھ جائے گی۔ مگر افسوس ہے کہ اس ضمن میں ہم نے اب تک جو  
 مساعی کی ہیں وہ بار آور نہیں ہو سکیں۔ سوچنا یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا سبب  
 کیا ہے۔ اس کا ہمارے پاس ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ شاید ہم  
 ایک دوسرے پر افتما و نہیں کر پاتے اور دوسرے یکدم ایک دوسرے پر  
 غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ بھی  
 امکان ہے کہ ہم اتحاد کے عظیم مقصد کے لئے اپنے اپنے مفادات کی قربانی  
 دے دیں۔ ہم ایک نقاب اور دوسرے جوئے ہیں۔ گو بظاہر ہمارا نعرہ ایک ہے  
 مگر ہم فرقوں اور ذاتوں کے بھنور میں بدستور پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم اس اصول  
 کو یونکر تسلیم کر لیں کہ اپنے حق کے تحت ہر جماعت اپنی تہذیب اپنے  
 تمدن کو پروان چڑھاتی رہے اور آسانی سے سرگرم عمل رہے۔ ہماری ناکامیوں  
 کی وجوہات جو کچھ بھی ہیں مگر میں بایکس نہیں ہوا۔ حالات کے تحت ہر  
 — ظاہر و باطن ایک ہیں۔ مسلمانوں کے بارے میں تو میں بلاتا مل کہہ  
 سکتا ہوں کہ اگر اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان  
 کے مسلمان اپنی قدیم روایات اور اپنی تہذیب، تمدن کے تحت ہندوستان

میں آزادی کے ساتھ آگے بڑھ سکتے ہیں تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کے لئے تیار ہوں گے۔ کسی کو ان کے عقائد کے اصول پر — خواہ وہ فرد ہو یا جماعت، ترقی کرنے کی بہاڑت دینا تنگ نظری نہیں۔ یہ فرقہ داریت نہیں۔ فرقہ داریت بھی کئی اقسام کی ہوا کرتی ہے۔ ایک وہ ہے جو دوسروں کو نفرت کا سبب دیتی ہے، اُن کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ ایسی فرقہ داریت کی لپٹی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ میں ہر دیگر قوم کے تہذیب و تمدن، اُس کی رسومات، اس کے قانون اور اُس کے طرز معاشرت کی عزت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ بطور مسلمان بھی مجھے پران کی عزت کا فرض عائد ہوتا ہے۔ وقت پڑنے پر میں قرآن کریم کے احکامات کی تعمیل میں ان کے معبودوں کی حفاظت بھی کروں گا۔ مگر مجھے اس جماعت سے بھی عشق ہے جو بلاشبہ میری زندگی کا سرچشمہ ہے جس جمعیت کے دین و حکمت، جس کے ادب و تمدن نے مجھے ہندیاں عطا کیں۔ جو میری زندگی کی تشکیل کی ذمہ دار ہیں۔ اسی لئے میرا ماضی حیات دست و پیرا ہو گیا۔ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم عمل ہے جن لوگوں نے ہندو پر ورث کی تبلیغ کی ہے وہ بھی فرقہ داریت کے اس پہلو کے معترف ہیں۔

(سندھ کے علیحدہ گئے کے مسئلے پر بحث سے اقتباس)

”اگر یہ کہا جائے کہ قومیت کے نقطہ نگاہ کے تحت فرقے پر مبنی کسی صورت کا قیام نامناسب ہے تو یہ اُس دعوے کی طرح ہے کہ بین الاقوامی تقاضوں کے تحت مختلف اقوام کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ گو یہ دو باتیں کافی حد تک اپنے پہلو میں صداقت رکھتی ہیں مگر بین الاقوامی نصب العین کے شدت سے حامی بھی یہ تسلیم کریں گے کہ اگر ہر قوم کو مکمل آزادی دے دی جائے جب ہی بین الاقوامی ریاست کا قیام عمل میں آ سکتا ہے۔ اس چیز کا اطلاق ہر قوم کی مکمل تہذیبی، تمدنی آزادی پر ہوتا ہے۔ اپنی اعلیٰ حقیقت میں فرقہ داریت صرف تمدن کا دوسرا نام ہے۔“

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں ہم آہنگ قوم کی نشوونما کی



مانند مختلف ملتوں کا وجود ضروری ہے۔ مغربی ملکوں اور ہندوستان میں ایک فرق ہے۔ وہاں کی طرح یہاں صرف ایک قوم کے آباد رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ یہاں مختلف زبانیں ہیں، یہاں مختلف نسلیں ہیں، مختلف مذاہب ہیں۔ ان کے فعل کیساں کیسے ہو سکتے ہیں؟ ان میں ایک نسل کی طرح کے جذبات اور سوچ کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ خود ہندو ایک قوم نہیں۔ ان حالات میں ہندوستان کے اندر مغربی اندازِ جمہوریت کیسے ممکن ہو رہا ہے اس لئے آج مسلمان یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے اندر ہی ایک اسلامی ہندوستان کا قیام عمل میں لایا جائے۔ یہ مطالبہ بالکل درست ہے۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادیں بھی اسی نصب العین کی غلامی کرتی ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ تمام اقوام کے وجود کو ختم کئے بغیر ان سے ایک جم آجنگ قوم تیار کی جائے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارا اجتماع اس قرارداد میں موجود تمام مطالبات پر صاد کرے گا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں کچھ اور آگے جانا چاہتا ہوں میں تو چاہتا ہوں کہ پنجاب صوبہ شمال مغربی سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست کی صورت دے دی جائے، چاہئے پھر یہ ریاست برطانوی ہندی کے اندر اپنی خود مختار حکومت کا قیام عمل میں لائے یا اس سے باہر! مگر میرا احساس ہے کہ آخر کار شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ اسلامی ریاست لازماً قائم کرنا پڑے گی۔ یہی تجویز ہنر و کھیتی میں پیش کی گئی تھی مگر کمیٹی کے اراکین نے اسے محض اس وجہ سے رد کر دیا کہ ایسی وسیع ریاست کے قیام کی صورت میں اس کا انتظام مشکل ہو جائے گا۔ جہاں تک رقبہ کے اعتبار سے ریاست کی وسعت کا خیال ہے تو یہ خدشہ درست ہے۔ مگر آبادی کے اعتبار سے اس ریاست کی آبادی برطانوی ہند کے بعض صوبوں کے مقابلے میں بھی کم ہوگی۔ اگر اہل آبادیاں ایسے اضلاع جہاں ہندو اکثریت موجود ہے، الگ کر دیا جائے تو انتظامی دشواریوں اور وسعت میں نہ صرف کمی ہو جائے گی بلکہ غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت بھی بہتر طریق سے کی جاسکے گی۔ یہ تجویز انگریز اور ہندو کسی کے لئے بھی پریشانی کا باعث نہیں بنی چاہئے۔ ہندوستان میں مسلمان دنیا بھر کے مقابلے میں اکثریت میں ہیں۔ لہذا ہماری خواہش ہے کہ اسلام کو ایک تمدنی طاقت بن کر زندہ رہنا چاہئے اور اس مقصد کے لئے اسے مرکزیت قائم کرنا ہوگی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے برطانوی حکومت کی چھوڑ دہائیوں کے باوجود انگریز کو اس ملک پر حکومت کرنے کے قابل بنایا کیونکہ اس میں

فوج اور پولیس نے خدمات سرانجام دیں۔ لہذا اب بھی یہ طبقہ تمام مسائل کو حل کر سکتا ہے اس طرح مسلمانوں پر ایک ذمہ داری آن پڑے گی اور اس کا احساس فزوں تر ہو جائے گا۔ اس میں محبت وطن پیدا ہوگی۔ اگر فی الواقعہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان اس ریاست کے قیام میں کامیاب ہوتے ہیں تو وہ بیرونی جارحیت کے خلاف بھی پوری قوت سے دفاع کر سکیں گے۔ اس وقت پنجاب میں مسلمان آبادی کے اعتبار سے ۵۹ فیصد ہیں مگر پورے ہندوستان کی فوج میں ۵۴ فیصد ہیں۔ علاوہ انہیں اگر برطانوی فوج سے اُن ۱۹ ہزار نیپالی گورکھوں کو خارج کر دیا جائے تو مسلمان ۶۱ فیصد ہو جائے ہیں۔ اس میں وہ ۶ ہزار لوگ شامل نہیں ہیں جنہیں صوبہ سرحد اور بلوچستان سے فوج کے لیے بھرتی کیا جاتا ہے۔ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی صلاحیتوں کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ یہی وہ صلاحیتیں ہیں جو ہندوستان کو غیر ملکی جارحیت سے تحفظ دے سکتی ہیں۔ سری نواس شاستری کے خیال میں شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاستوں کے قیام کا مطالبہ دراصل مسلمانوں کی اس خواہش کا اظہار ہے کہ حکومت ہند پر دباؤ پڑ سکے۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں۔ ہمارا مقصد تو محض اتنا ہے کہ ہم آزادانہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکیں کیونکہ ایسا ہم اس مرکزی حکومت کے تحت ہرگز نہیں کر سکتے۔ جس پر قوم پرست ہندوؤں کا غلبہ ہو اور دوسری اقوام پر بھی وہ حاوی رہے۔

ہندوؤں کو یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہیے کہ آزاد اسلامی ریاستیں قائم ہو گئیں تو مذہبی حکومت کا قیام عمل میں آجائے گا۔ اسلام میں مذہب کا مفہوم وہ نہیں جو ہندو سمجھتے ہیں۔ اسلام ایک ریاست ہے، کلیسائی نظام ہرگز نہیں۔ اسلامی ریاست کا دار و مدار ایک احسن لاقی نصب العین پر ہوتا ہے۔ اس کے عقائد میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ اندران ایک درخت یا ایک پتھر کی طرح ہے جہاں پر سرزمین سے وابستگی رکھتا ہے۔ اس کے عقائد میں تو یہ بات شامل ہے کہ انسان ایک روحانی وجود ہے وہ ترکیب اجتماعی کے ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے جس کے کچھ حقوق ہیں اور جس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا نے اسلامی ریاست کی نوعیت کے بارے میں لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست پر فرض ہوتا تھا کہ وہ سود کے بارے میں قوانین وضع کرے مگر اسلام میں سود لینا حرام ہے اس کے باوجود اسلامی حکومت نے کوئی پابندی عائد نہ کی۔ میں جس اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں وہ نہ صرف

ہندوستان بکرم اسلام کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ہے۔ اگر اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آگیا تو زمرہ ہندوستان میں طاقت کا توازن پیدا ہوگا بلکہ مکمل امن بھی قائم ہوگا۔ نیز اسلام عرب شائیت کے اپنی تکمیل کے اثرات سے آزاد ہوکر اس جمود کو توڑنے میں کامیابی حاصل کرے گا جو اسلامی تمدن، اسلامی تعلیمات اور شریعت اسلامی پر سیکڑوں برسوں سے طاری ہے۔ یہ جمود ٹوٹے گا، تو یہ صورت تجدید ہوگی بلکہ موجودہ دور کی روح بھی قریب ہو جائے گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بات واضح ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں، عقائد اور معاشرت میں اختلافات کی طبعی عامل ہے ان کے پیش نظر مستقل و مستحکم حکومت کے قیام کی ایک ہی صورت ہے کہ ہندوستان میں مختلف آزاد ریاستیں قائم کر دی جائیں جو تاریخ و مذہب، نسل اور اقتصادی مفادات کے اشتراک پر بنی ہوں۔ سائنس رپورٹ میں وفاقی کا تصور ہے، اُس کے تحت یہ ضروری ہے کہ مرکزی ققند کا انتخاب عام نہ کریں بلکہ وہ وفاقی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں۔ میں نے جو اصول بتائے ہیں وہ سائنس رپورٹ سے خاصی متکلف مطابقت رکھتے ہیں۔ ان میں یہ بھی شامل ہے کہ تمام صوبوں کی تقسیم از سر نو کی جائے۔ میں خود ان دونوں تجاویز کی تائید کرتا ہوں۔ میں یہاں تک کہوں گا کہ ان صوبوں کی تقسیم سے پہلے دو شرائط کو بھی پورا کیا جائے۔ ایک تو یہ کہ تقسیم نئے دستور سے پہلے مکمل ہو، دوسرے یہ کہ اس کے وقت تمام فرقہ وارانہ مسائل کو مکمل طور پر حل کیا جائے۔ صوبوں کی تقسیم کے لئے اگر صحیح اصول وضع کر لئے گئے تو مخلوط اور جداگانہ انتخابات کا مسئلہ بھی مستقل حل تلاش کر لے گا۔ کیونکہ میرے خیال میں آئے دن کے تنازعات کی تمام بنیاد موجودہ صوبوں کی غلط تقسیم ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ جداگانہ انتخابات قومیت کی نفی کرتے ہیں۔ شاید وہ قومیت کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام لوگ اس طرح شیروشکر ہو جائیں کہ کسی انفرادی ملت کا شائبہ بھی نہ رہے۔ مگر میں اس سے اختلاف ہے ہندوستان میں متعدد اقوام آباد ہیں اور متعدد مذہبوں سے وابستہ لوگ رہتے ہیں مسلمان محاشی اعتبار سے پسماندہ ہیں۔ پنجاب کے مسلمان بالخصوص قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ بعض صوبوں میں وہ اقلیت میں ہیں۔ محض انہی وجوہات کی بنا پر ہندوستان کے مسلمان جداگانہ انتخاب چاہتے ہیں۔ موجودہ حالات میں یہ توقع کہ علاقائی انتخابات کے ذریعے ہر قوم اور اُس کے مفادات کی مکمل نمائندگی

ہو جائے گی، مہلت ہے۔ بس یہ ہوگا کہ ہر اقلیت پر ہندو کو غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ ہاں اگر صوبوں کی تقسیم کسی ایسے اصول کے تحت کر دی جائے کہ اس صوبے میں قریباً ایک ہی نوعیت کی اقوام رہتی ہوں، وہ مثلاً اورڈیٹیا، تہذیب و تمدن یا سانی اعتبار سے ایک ہوں تو پھر مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر بھی جھلکیا اعتراض ہو سکتا ہے؛

جہاں تک تعلق ہے مرکزی وفاقی ریاست کا اور اس کے اختیارات کا تو ہندو اور انگریز کے تیار کردہ دستور حکومت سے ان دونوں کے مابین مقاصد کے اختلافات کا مسلم ہر جاتا ہے۔ ہندوستان کے پنڈت یہ نہیں چاہتے کہ مرکزی حکومت کے پاس جو موجودہ اختیارات ہیں ان میں زرا برابر کی بیشی ہو۔ وہ یہ فرود سکتے ہیں کہ یہ اختیارات مرکزی مجلس مقننہ پر چھوڑ دیئے جائیں۔ شاید اس لئے کہ وہاں بھی انہی کی اکثریت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اراکین کی نامزدگیاں ختم ہوں گی تو اور بھی اکثریت ہو جائے گی۔ دوسری طرف فرنگیوں نے محسوس کیا کہ اگر مرکزی جمہوری اصول ور آئے تو ان کے مفادات پر ضرب پڑے گی، اختیارات ہندوستانوں کے ہاتھ میں چلے جائیں گے اور وہ اقتدار سے محروم ہو جائے گا۔ اس میں غلبہ نہیں ہے کہ انہوں نے وفاق کے اصولوں پر عمل کرنے کے خیال کا اظہار کیا ہے اور اس ضمن میں کچھ تجاویز بھی پیش کر دی ہیں مگر ان کا ذلویہ نظر خاصاً مختلف ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے ذلویہ نظریں انگریز کے ذلویہ نظر کے مقابلے میں فرقی ہے۔ اگر مسلمانوں نے وفاق کا مطالبہ کیا ہے تو اس لیے کہ فرقہ داراء مسائل کے حل کا ایک ہی ذریعہ ہے جبکہ شاہی کمیشن کے اراکین، فیڈریشن کا مختلف تصور لیتے ہیں۔ ان کا تصور اصولاً خواہ کتنا ہی صحیح اور مستحکم ہو مگر اس کے تحت وفاق ریاستوں میں حکومت خود اختیاری کا قیام مشکل ہے۔ وہ تو نہ ف یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں جمہوریت کے اصولوں کا جو نوع بلند ہوا ہے اور اس نوع سے جو حالات پیدا ہو گئے ہیں اس سے کس طرح بھی نجات حاصل کی جاسکے۔ انہوں نے فرقہ داریت کے مسائل کو کیکر نظر انداز کر دیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ سائمن رپورٹ میں حقیقی وفاق کی نفی کی گئی ہے۔ نہرو رپورٹ نے اس خیال سے کہ مرکزی مجلس مقننہ میں ہر مال ہندوؤں کو اکثریت حاصل ہوگی، ایک وحدانی نظام کی تجویز پیش کر دی کیونکہ اس طرح ہندوستان بھر میں ہندوؤں کا غلبہ ہو جائے گا۔ سائمن رپورٹ نے جس وفاق کی بات کی ہے وہ ایک لفظ تک محدود ہے نہ اس کے

تحت برطانوی اقتدار پہلے کی طرح قائم رہتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ انگریز اس اقتدار سے ایک ہونا پسند نہیں کرتے وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ فرقہ وارانہ معاملات کا طے ہونا مشکل ہے اور اس طرح اسے ہندوستان کی سرزمین پر قدم جمائے رکھنے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہندوستان میں وحدانی حکومت قائم ہو۔ مانتائے اختیارات صرف آزاد ریاستوں کا حق نہیں۔ کم از کم میں ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ رائے نہیں دے سکتا کہ وہ برطانوی یا ہندوستانی نظام حکومت پر صاف کریں۔ ایسا نظام جو صحیح معنوں میں وفاق کے اصول پر قائم نہ ہو یا جس کے تحت مسلمانوں کے الگ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔

مرکزی حکومت میں فرنگیوں کی طرف سے بنیادی تبدیلیاں کرنے کے لئے اقدامات سے پہلے ہی محسوس ہو گیا تھا کہ یہ تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ اسی لیے گول میز کانفرنس میں ریاستوں کے حکمرانوں کی شرکت کو ضروری سمجھا گیا۔ مگر ہندوستان کے لوگوں اور خاص طور پر اقلیتوں کو یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرتے ہی ریاستوں کے والیان کے موقف میں کتنی تیزی کے ساتھ تبدیلی پیدا ہوئی اور وہ ہندوستان کے وفاق میں شرکت کے لئے تیار ہو گئے۔ علاوہ ازیں وہ ہندو مندوب جنہوں نے اب تک وحدانی حکومت کے حق میں بات کی تھی فوراً وفاق کے اصول پر متفق ہو گئے۔ کچھ دن پہلے مسٹر شاستری نے سائن کی وفاقی سکیم کی بھرپور مخالفت کی تھی مگر والیان ریاست کے نام دعوت ناموں کے ساتھ ہی وہ بھی اس کے حق میں ہو گئے۔ انہوں نے بلاناخبر کانفرنس کے اولین اجلاس ہی میں اپنی تائید کا اظہار کر دیا۔ اسی لئے وزیر اعظم برطانیہ نے آخری تقریر میں کچھ اشارات کئے۔ بات یہ ہے کہ جب فرنگیوں نے والیان ریاست کو وفاق میں شرکت کی دعوت دی تو ہندو بلاچون وچرا متفق ہو گئے۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمان والیان ریاست کی تعداد ہندو والیان ریاست سے کم ہے۔ لہذا اس طرح ذمہ داری یہ کہ والیان ریاست ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو قائم رکھے رہنے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے جبکہ ہندوؤں کو بھی وفاق اسمبلی میں ان کی وجہ سے اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ فرنگی، ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے درمیان مرکزی حکومت کی ہیئت پر اختلاف سے والیان ریاست کو درمیان میں لاکر فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ والیان ریاست کو تو یہ فائدہ ہے کہ وفاق میں شمولیت کے باعث

ان کی استبدادی حکومت مزید مضبوط ہو جائے گی۔ میں یہ بات واضح کر دوں کہ اگر مسلمان اس حکم میں آگئے تو فہیل حرمت میں ان کا سیاسی وجود نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا۔ ایسے وفاق میں ہندو یا وایان ریاست کی اکثریت ہوگی اور وہ من مانی کارروائیاں کرتے رہیں گے۔ وہ ہمیشہ برطانوی حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔ ملک کے اندر بہر حال وہ ہندو کے اقتدار کے قیام کے لئے کوشاں رہیں گے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اصل یہ سکیم حکومت برطانیہ اور ہندوستان کے ہندوؤں میں ایک گٹھ جوڑ ہے۔ اگر یہ چاہتا ہے کہ ہندو کے ذریعے ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم رکھے اور ہندو کو اس کا یہ معاوضہ دے کہ مسلمان پر اس کا غلبہ ہو جائے۔ ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد مسلمان ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ لہذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ مسلمانوں کو مرکزی وفاق اسمبلی میں ۳۳ فیصد نشستیں دی جائیں، اسی ایک ایوان یا دیگر ایوانوں میں کسی طرح پائے تکمیل کو پہنچ سکتا ہے، جب کہ یہ ایوان ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی ہند کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے۔ ہم ایسی وفاق حکومت کا مطلب اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس وقت گول میز کانفرنس میں یہ مسئلہ زیر غور ہے۔ کل ہند وفاق میں ابھی مسلمانوں کی نہایت کاسٹل نہیں آیا۔ مگر جیڑساں انجمنی رائٹر کے مطابق موجودہ رپورٹ میں دو دیوانوں کی سفارش کی گئی ہے۔ ان میں برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے شامل ہوں گے تاہم ان نمائندوں کی تعداد کے معاملہ پر اس وقت بات ہوگی جب کمیٹی ان پر غور کرے گی اور جنہیں ابھی سب کمیٹی کے سپرد نہیں کیا گیا۔ ہمارے خیال میں نمائندگی کے تناسب کا سوال کچھ کم اہم نہیں ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اسمبلی کی ہینٹ ترکیبی کے ساتھ ہی اس پر غور ہوتا۔ جہاں تک میری فہم کا تعلق ہے تو سب سے اچھی صورت تو یہ تھی کہ ابتدائی مرحلہ میں وفاق صرف برطانیہ کے علاقوں تک ہوتا۔ کوئی ایسی وفاق سکیم جو جبراً استبداد اور جمہوریت کے گٹھ جوڑ کی بنیاد پر ہو، صرف ہیڈنگ لاسکتی ہے کہ برطانوی ہندوستان، حسب سابق و حیدرآبی حکومت کا تختہ مشق بنا رہے۔ یہ وحدانی حکومت فرنگی کے لئے سود مند ہو سکتی ہے۔ یا ریاستوں کے حکمرانوں اور ہند اکثریت کے لئے فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ مگر اس سے بھلا مسلمان کس فائدے کی توقع رکھ سکتے ہیں؟ یہ تو سچی بات ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے ۵ میں مکمل باقائے اختیارات اور اکثریتی حقوق حاصل ہوں۔ نیز مرکزی وفاق اسمبلی کے اراکین کی مجموعی تعداد ۳۳ فیصد نہیں حاصل ہو۔ برطانوی ہندوستان کے صوبوں

کے لئے ناکام نہ اختیارات کے سلسلہ میں نوآبادیوں کو پالنا چاہیے اور محمد علی جناح قطعی طور پر درست اور مناسب موقف کے حامی ہیں۔ کیونکہ آپ ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنی وفاق میں شریک کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ مرکزی مجلس کے بارے میں میں بھی اپنے مطالبات پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ آپ یہ حرف برطانوی ہند کی اسمبلی میں تمام کی بات نہیں بلکہ آپ کل ہند وفاق میں مسلمانوں کی نمائندگی کی بات ہے۔ چنانچہ ہم معاہدہ کرتے ہیں کہ وفاق میں شامل ہونے والی اسلامی ریاستوں کو چھوڑ کر محض وفاق میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستوں کا نمائندہ ہونا ضروری ہے۔

ہندوستان میں وفاق حکومت کے قیام کے سلسلہ میں دفاع کے مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ شاہی کمیشن نے ان تمام امور کو پیش نظر رکھا ہے اس لئے کہ دفاع ہندوستان کے حکمرانوں کے ہاتھوں میں رہے۔ ان کے مطابق ہندوستانی اور برطانوی تعلقات کی نوعیت کے باعث ہندوستان کے دفاع کے مسئلہ کو آپ یا بعد ازاں خاندان ہندوستان کا مسئلہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ دفاع کا نظم نسق ہمیشہ برطانیہ کے ہاتھوں میں رہنا ضروری ہے۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہندوستان خود برطانوی فوجوں اور افسروں کے بغیر اپنا مزیدوں کی حفاظت کی قوت حاصل کرے یا ہندوستان میں خالصتاً ایک ذمہ دار حکومت کا قیام ناممکن ہے۔ اس وقت جو حالات ہیں ان کے پیش نظر اس سے انکار کچھ ممکن نہیں ہے کہ فی الواقع ہندوستان کی اپنی ترقی میں سہارا ہے۔ لیکن اگر رپورٹ میں شامل اس اصول سے اتفاق کر لیا جائے کہ جب ہندوستان کو مکمل اختیارات حاصل ہوں گے تو اس کی افواج کی شان فتنہ مجلس مقتصد کے ہاتھوں میں ہوگی۔ لہذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرکزی حکومت ۲۰ اگست ۱۹۴۷ء کے اعلان کی روشنی میں ترقی کرتی رہے، وہ ناممکن ہو جائے گی۔ اس بات پر سب سے زور دیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف نسلوں اور مذاہب کی وجہ سے ان سب کی ملاہیتوں اور نوتوں میں اختلاف ہے۔ اس کے ساتھ یہ کہ معاملہ کو مزید الجھا دیا گیا ہے کہ

”بلاشبہ ہمارے عام استعمال میں ہندوستانی ایک قوم نہیں کیونکہ ہندوستان

کی جگہ اقوام اور دیگر اقوام میں نمایاں فرق ہے۔“

شاید ان امور پر اس لئے زور دیا گیا ہے کہ اگر تیرے ہیں یہ جانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی

خلافت نہ صرف بیرونی جارحیت سے کر رہے ہیں بلکہ اندرونی استحکام و امن و امان کے غیر جانبدار محاذ بھی ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس طرح وفاق میں ہندوستان کے صرف بیرونی تحفظ کا مسئلہ باقی رہ جائے گا۔ صوبائی افواج سے قطع نظر۔ کیونکہ یہ ہمارے ملک کے اندر امن و امان کے لئے ضروری ہیں۔ ہندوستان کی وفاقی جماعت، صوبہ سرحد میں ایک طاقت ور فوج بھی متعین کر سکتی ہے۔ اس میں مختلف صوبوں کے لوگ بھی شامل ہوں گے اور ان کی کمان مختلف اقوام کے تجربہ کار افسروں کو دی جائے گی۔ یہ بات درست ہے کہ ہندوستان میں لائق فوجی کمان نہیں ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر کمیشن یہ کہتا ہے کہ افواج کی عنان برطانیہ کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے۔ مگر اس نے اپنی ہی رپورٹ میں یہ بھی کہا ہے کہ :

”اس وقت کوئی ہندوستانی کمیشنز فافہ، اعلیٰ فوجی عہدے پر نہیں — ہندوستانی اہلکاروں کی کل تعداد میں سے ۲۵ رجمنٹوں میں ہیں۔ ان میں کچھ کی عمر اتنی ہے کہ اگر وہ حکمانہ امتحانات میں کامیاب بھی ہو جائیں تو ان کی مزید ترقی ممکن نہیں۔ ان میں سے اکثر سینئر سٹاف میں نہیں گئے۔ انہیں کمیشن ملا۔ مگر جنگ عظیم کے دوران —“

اس خواہش کے تحت کہ حالات میں تبدیلی آنا ضروری ہے۔ مخلصانہ اور سچی ہی کیوں نہ ہو کر سکیں مجھ کے الفاظ بھی ملاحظہ ہوں، جس کے صدر اور فوجی سیکرٹری برطانوی اور تمام رکن ہندوستانی ہیں۔

”ترقی کا دار و مدار ہر مرحلہ پر کامیابی میں نہیں ہے۔ یا جگہ قابلیت کے قیام میں تسلسل نہیں ہے۔ یوں ترقی کی رفتار سست پڑ جائے گی۔ اس وقت ہندوستانی فوجی اعلیٰ عہدوں پر نہیں ہیں۔ ان کا تجربہ بھی محدود ہے۔ لہذا وہ قلیل مدت میں اعلیٰ عہدوں پر نہیں پہنچ سکتے۔ یہ جیسی ممکن ہے کہ ان امیدواروں میں اضافہ ہو اور ہم اس اضافے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ کم از کم چھوٹی چھوٹی رجمنٹوں کے تمام افسر ہندوستانی ہوں۔ اس وقت تک فوج کو ہندوستانیوں کے حوالے کر دینا غلطی ہوگی، سچی کہ اگر تمام فوج ہندوستانی پر مشتمل ہو تب بھی اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک طویل مدت درکار ہوگی۔“



سوال یہ ہے کہ ان حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ شمالی باری ڈاکا قوم میں ہے یا فوجی تہذیب کی سست رفتار کی۔ ہمارے لڑاکا اقوام کی صلاحیتوں سے انکار کون کر سکتا ہے؟ بین فوجی امور کا ماہر تو نہیں ہوں مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس دلیل کا انداز ظاہر کتابت کہ یہ تمام ہمسایہ مروجہ عمل "جباری" رہے گا اور ہندوستان ہمیشہ غلامی کی بنیاد پر قائم رہے گا۔ اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندو ریورٹ کی تباہی کی روشنی میں سرحدی فوجوں کا نظام ایک دفاعی کمیٹی کے ذمہ کر دیا جائے اور اس کمیٹی کے اراکین جو بھی فیصلہ کریں وہ باہمی افتاء و تقابلاً کے ذریعہ ہو۔

یہ بات خاصی دلچسپ ہے کہ سائنس ریورٹ میں ہندوستان کی خشکی کی سرحدوں کو کمال درجہ سمجھا گیا ہے، مگر سرحدی سرحدوں کو بس مال دیا گیا ہے ہیں اوقات ہے کہ ہندوستان پر جب بھی کوئی خطرہ ہو یا خشکی کے راستوں ہی سے ہوا اگر فوجی اس بات کو نظر انداز کیوں کر گئے کہ وہ خود ہندوستان کے ان ساحلوں کی طرف بھی آئے تھے۔ جو غیر محفوظ تھے اور پھر ہندوستان پر قابض ہو گئے تھے۔ چنانچہ ہم خود مختار ہندوستان کے لئے بڑی حفاظت کے ساتھ ساتھ بحری دفاع کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتے ہیں۔

اگر دفاعی ریاست کا قیام عمل میں آگیا تو مجھے یقین ہے کہ مسلم وفاق ریاستیں ہندوستان کی حفاظت میں ایک غیر جانب دار ہندوستانی فوج کے قیام میں جو بڑو بھرا دونوں جگہ موجود ہے، تہم تہاد کریں گی۔ دوہرہ منلیہ میں اس نوع کی غیر جانب دار افواج موجود تھیں۔ شہنشاہ اکبر کے دور میں ان تمام سرحدی فوجوں کے افسر بھی ہندو تھے۔ لہذا میرا یقین ہے کہ اگر وفاق نظام حکومت میں ایک غیر جانب دار فوج قائم کر دی گئی تو مسلمانوں کے جذبات حب وطن کو مزید تقویت ملے گی اور بیرونی جارحیت کی صدارت میں ہندوستان کے مسلمان دیگر مسلمانوں سے مکمل اشتراک و تعاون کریں گے۔

میں اختصار کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ ہندوستان کے وہ آئینی مسائل پر مسلمانوں کا طرز عمل کیا ہو؟ ہمارا اولین مطالبہ تو یہی ہے کہ ہندوستانی صوبوں کی تقسیم از سر نو کی جانے تاکہ فرقہ وارانہ مسائل کا حل نکل آئے۔ لیکن اگر مسلمانوں کے اس مطالبے کو منظر نہیں کیا جاتا تو میں پوری شدت سے ان مطالبات پر قائم ہوں جن کا اعلان کل ہند مسلم کانفرنس اور کل ہند مسلم لیگ کر چکی ہے۔ ہم مسلمان ایسی کوئی آئینی تبدیلی تسلیم نہ کریں جس کے تحت ہم بنگال اور پنجاب میں جدا گانہ انتخابات کے ذریعے اکثریت حاصل نہ کر سکیں یا یہیں مرکزی مجلس میں ایک تہائی نشستیں حاصل نہ کریں۔

کے سیاسی رہنما ایک تو اس دہان میں چھٹے ہوئے ہیں جو کھنڈ کا مسترد بیثبات ہے اور جس کی تربیت ہندی قومیت کے باطل غلط تصور پر کی گئی۔ اس طرح مسلمان اپنی سیاسی طاقت کے قیام کے برعکس سے محروم ہو کر روایات۔ دوسری دلیل پنجاب کی نام نہاد دہی آبادی کے نام پر اتحاد و ملت اسلامیہ کی وہ جھینٹ ہے جس کے تحت پنجاب کا مسلمان حصہ ایک اقلیت بن کر رہ جاتا ہے۔ مسلم لیگ کا فرض اولین ہے کہ وہ بیثباتی کھنڈ اور موخر الذکر تجویز دونوں کی بھرپور مذمت کرے۔

سائنس رپورٹ میں بنگال اور پنجاب میں ہم مسلمانوں کے لئے کسی آئینی اکثریت کی سفارش نہیں کی گئی۔ دوسرے الفاظ میں مسلمان بیثباتی کھنڈ کی پابندی کریں یا محفوظ انتخابات کا راستہ اختیار کر لیں۔ ہندوستان کی حکومت نے سائنس رپورٹ پر مبنی جو یادداشت بھیجی ہے اس میں وہ معترف ہے کہ مسلمان نے دونوں تجاویز کو مسترد کر دیا ہے۔ اس بات کو درست قرار دیا گیا ہے اور کہا ہے کہ بنگال اور پنجاب میں آبادی کے تناسب کے اعتبار سے مسلمانوں کو نمائندگی کا حق ملنا ضروری ہے۔ یہ کہہ کر کہ دوسرے صوبوں میں انہیں توازن حاصل رہے، اس خسار سے کا ازالہ کیونکر کیا جاسکتا ہے؟ مگر افسوس کہ اس کے باوجود یادداشت میں مسلمانوں سے انصاف دوا نہیں رکھا گیا۔ پنجاب کے بارے میں جو حکیم ہے، ہندوستانی حکومت نے اسے نہایت متوازن حکیم قرار دیا ہے۔ یہ حکیم پنجاب کو نسل کے سرکاری اراکین نے مرتب کی تھی اس کے تحت پنجاب میں مسلمانوں کو مجلس میں ۱۴ فیصد نمائندگی ملتی ہے۔ اس طرح وہ ہندو اور سکھ اراکین سے صرف ۱ فیصد آگے رہتے ہیں۔ کیا پنجاب کے مسلمان کسی ایسی سکیم کو قبول کر لیں گے؟ ہرگز نہیں! انہیں پوری مجلس میں تقابلی اکثریت کی ضرورت ہے۔ لارڈ آڈن اور ان کی حکومت اس بات پر متفق ہے کہ ہندوستان کی اقلیتیں اس وقت تک فرقہ وارانہ انتخابات کو قائم رکھنے کی مجاز ہوں گی جب تک رائے دہندگی میں اتنی وسعت نہ پیدا ہو جائے کہ ہر قوم کا تناسب آبادی اس کے نمائندوں کے ذریعے واضح صورت اختیار کرے اور مسلمان اتفاق رائے سے علیحدہ نمائندگی کے غور سے دست بردار نہ ہو جائیں۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ حکومت ہند اگر مسلمانوں کی شکایت کو سمجھا سکتی ہے تو اس میں بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کو آئینی اکثریت کی سفارش کرنے کی جرأت کیوں پیدا نہیں ہوتی۔

ہندوستان کے مسلمان ایسی تبدیلیوں سے بھی متفق نہ ہوں گے جن کے تحت سندھ الگ صوبہ نہ ہوا۔ شمال مغربی صوبہ سرحد کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ

نویا جائے۔ سندھ اور بلوچستان کو مل کر ایک الگ اور نیا صوبہ قائم ہو سکتا ہے۔ بمبئی کے مدائن اور سندھ میں آخر کیا چیز مشترک ہے؟ کمیشن کے اراکین نے تسلیم کیا ہے کہ سندھ کے لوگ عراقی اور عربی تمدن کے حامل ہیں۔ معروف جغرافیہ دان مسعودی نے کافی عرصہ قبل سندھ اور عرب کی اس مشابہت کا تذکرہ کیا تھا۔ مسعودی کے مطابق "سندھ ایسا ملک ہے جو اسلامی حکمت سے بے حد نزدیک ہے"۔ اموی خلیفہ اول نے کہا تھا کہ "مصر کی پشت افریقہ کی طرف اور چو عرب کی طرف ہے"۔ معمولی ترمیم کے بعد ہم سندھ کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سندھ پشت ہندوستان کی طرف ہے اور چو وسط ایشیا کی جانب! سندھ کے ذریعہ سائل سے بمبئی کی حکومت کو باطل و غلطی نہیں ہے مگر سندھ کی تجارتی صلاحیتوں کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ ایک دن کراچی ہندوستان کا دوسرا دارالخلافہ بن سکتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سندھ کی ترقی میں متحدہ مالی مشکلات موجود ہیں۔ اگر اس بیان کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سندھ جہاں ہے اسے وہیں رہنے دیا جائے اور اس کی ترقی کو نظر انداز کر دیا جائے۔ کیا اس کی مدد کرنا ضروری نہیں؟ جہاں تک تعلق ہے صوبہ سرحد کا تو کتنی افسوس ناک بات ہے کہ کمیشن نے اس صوبے کی اصلاحات کا حق دینے سے ساف انکار کر دیا ہے۔ جس کو نسل کی تجویز پیش کی گئی ہے وہ عرب اور صرف یہیں اکثر کو ایک مطلق العنان شخص بنائے رکھنے کے لئے کافی ہے۔ افغانوں کا یہ حق کہ وہ سگریٹ جلا لیں، صرف اس لئے ختم کر دیا گیا ہے کہ وہ بارود خانوں میں رہنے والے لوگ ہیں۔ کیا یہ دلیل مطمئن کر سکتی ہے؟ سیاسی اصلاحات روشنی دیتی ہیں، لوگ کے نفع سے نہیں۔ افغان ایک نہایت شجاع اور ذہین قوم ہے۔ وہ سخت کوشش کرتے ہیں اور اپنے لئے ہر معیبت برداشت کرتی ہے۔ وہ اپنی ترقی کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ریت کی دیوار کی طرح ٹکڑا دے گی۔ ہندوستان ہر ایک ملکستان۔ افغانوں کو مطمئن کرنا نہایت ضروری ہے۔ گزشتہ دنوں اس صوبے میں جو کچھ ہوا، وہ امتیازی رویے اور اسی بدترین سلوک کے باعث ہوا۔ کیا برطانوی مذہب ہمیشہ خود کو اس دعوے میں رکھنا چاہئے ہیں کہ صوبہ سرحد میں جو کچھ ہوتا ہے، خارجی اثرات کے تحت ہوتا ہے؟

حکومت ہند کی یادداشت میں صوبہ سرحد کے لئے ترقیاتی اصلاحات بتائی گئی ہیں وہ بہت ہیں۔ دہسٹن رپورٹ سے قدرے زیادہ ضروریں کیونکہ ان میں ایک غائب کو نسل اور نیم منتخب نیم نامزد کا بینڈ کی تجاویز رکھی گئی ہیں مگر حکومت ہند اس صوبے کو دیگر صوبوں کا درجہ نہیں

دے سکی۔

اب میں گول میز کانفرنس سے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں ذاتی طور پر اس کانفرنس سے توقعات وابستہ نہیں کر سکتا۔ یہ ضرور سوچا جاسکتا تھا کہ فرقہ وارانہ گمراہی سے الگ تھلگ ہو کر عقل و خرد سے کام لیا جاسکے گا مگر حقائق اس کے برعکس ہیں۔ فرقہ وارانہ مسائل پر لندن میں جو بات چیت ہو چکی ہے اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تہذیبی و تمدنی اختلافات نمایاں ہو چکے ہیں۔ انگلستان کے وزیر اعظم یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں کہ ہندوستان میں یہ مسئلہ بین الاقوامی نوعیت کا ہے، قومی نوعیت کا نہیں۔ انہوں نے پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخابات کی تجاویز پیش کرنے کو ایک خشک بات کہا ہے کیونکہ فرنگی وزیر اعظم کے خیال میں منسلک انتخابات فرنگیوں کی جمہوریت پسندی سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن اس بات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا کہ ہندوستان میں ایک نہیں متعدد اقوام آباد ہیں اور ان کو برطانوی قوم کی سطح پر لا کر سوچنا غلط ہوگا۔ یہ مسئلہ حیران افیائی اصولوں پر حل کرنا ضروری ہے۔ اقلیتوں کے لئے جو سب کمیٹی قائم کی گئی ہے میں اس سے بھی کوئی امید وابستہ نہیں کرتا۔ آخر کار یہ مسئلہ برطانیہ کی پارلیمنٹ میں جانے گا۔ شاید انگریز اس معاملے کی جتنی تک پہنچنے کی کوشش میں کوئی منصفانہ حل تلاش کر سکیں اور انہیں یہ احساس ہو جائے کہ اگر ہندوستان میں امن درکار ہے تو فرقہ وارانہ معاملات کا حل تلاش کرنا پڑے گا۔ اگر انہوں نے بھی یہ سوچا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم یعنی ہندوستانی آباد ہیں یا ہندوستان میں بھی برطانوی جمہوریت پسندی کے جذبات کے اصولوں پر کچھ اصول اپنانے چاہئیں تو یہ ان کی غلطی ہوگی۔ اس طرح دوسرے ہندوستان بھر میں خانہ جنگی کے لئے اصول نافذ کریں گے۔ میرے نزدیک واحد حل یہ ہے کہ ہندوستان کی ہر قوم ماننی سے تعلق ختم کئے بغیر نئے اصولوں کے تحت اپنی آزادی اور ترقی کی منازل کی طرف قدم بڑھائے۔ مجھے مسرت ہے کہ مسلمان مندوبین کو اس مسئلے کی اہمیت اور حل کا مشکل احساس ہے جسے ہم بین الاقوامی مسئلہ کہہ رہے ہیں۔ یہ مطالبہ درست ہے کہ مرکزی حکومت میں دھرم داروں کے تعین کے تصفیہ سے قبل فرقہ وارانہ معاملات کا تصفیہ ہونا ضروری ہے۔ ہندو فرقہ واریت کو بائیکاٹ کے طور پر استعمال کر رہا ہے اور مسلمان سیاسی رہنما اس طنز کی پروا نہیں کرتے۔ یہ اس لفظ سے انگلستان کے اُن جذباتی جمہوریت پسندی سے فائدہ اٹھانا پاتا ہے جس کا ذکر برطانوی وزیر اعظم نے کیا ہے اور وہ حقیقت اس کا ہندوستان میں کوئی وجود نہیں ہے۔

رے مفادات اس وقت نہایت پرخطر دور سے گزر رہے ہیں ہندوستانی مسلمانوں کی  
مدد ساخت کہہ دے اور ہم دوسری اقوام کے مقابلے میں زیادہ ایک رنگ قوم ہیں ہندوستان  
ہاں اگر کوئی قوم فی الواقع قوم ہے تو وہ مسلمان ہے۔ ہندوہم سے دیگر معاملے ہیں لاکھ آگے ہو  
۔ اس میں مسلمانوں جیسی ایک رنگی موجود نہیں ہے اور جب تک اس میں یہ ایک رنگی نہیں  
تی، جہد و غور ایک قوم نہیں بن سکتا۔ مسلمان کو تو یہ ایک رنگی اس کے دین اسلام کی طرف سے  
طاہر ہوئی ہے۔ ہندو چاہتے تو ہیں کہ ایک قوم کی صورت اختیار کر لیں مگر اس کا مطلب یہ ہے  
وہ اپنا ماضی جھاڑ کر نئی ترکیب و ترکیب کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ جہدوں کو اس مقصد  
سے لئے اپنا نظام معاشرت بھی بدلتا ہوگا۔ مسلمان رہنماؤں کو اس فرقہ وارانہ دہیل سے کوئی تاثر  
میں لینا چاہئے۔ ترکی، ایران اور دیگر ملک اسلامیہ قوم پسندی کے اصول ہی پر چل رہے  
ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت مختلف ہے، ایران، ترکی یا دیگر اسلامی ملک  
بمکمل آبادی قریباً مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ وہاں اگر اقلیتیں ہیں۔ تو اہل کتاب ہیں۔ اور  
اہل کتاب اور مسلمانوں میں معاشرتی فرق کا وجہ نہیں ہے۔ کوئی اہل کتاب یعنی عیسائی، یہودی  
پارسی مسلمان کے کھانے کو یا عورت عادت تو درہا پاک نہیں جاتا۔ اسلامی شریعت ان میں  
سے دوسرے سے نکاح کو بھی جائز قرار دیتی ہے۔ یہ وہ پٹا خدیم تھا جو اسلام کی طرف سے  
تہادون انسانیت کے لئے اٹھایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں کا سیاسی نسب اہلین کہاں ہے  
وہ اہل بائیں۔ یہ قرآن پاک کے ارشادات ہیں۔ مگر اقوام مغرب کی زیادتیاں اور مسلمانوں  
اہل کتاب کے درمیان جنگ نے اتحاد کے یہ مواقع پیدا نہ ہونے دیے۔ تاہم اسلامی ملکوں میں  
جہد مقصد اسلامی قوت کی صورت میں ابھرا ہے۔

ہم اپنے مندوبین کی کامیابی کے بارے میں کوئی اندازہ محول میز کانفرنس کے دوران  
ن کی طرف سے قرار داد دہی کے مطالبات کو غیر مسلم مندوبین سے منظور کرا لینے کے بیانے سے  
رکتے ہیں۔ اگر قرار داد دہی کے مطالبات نام منظور کر دیے گئے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو  
تہی ہو کر آزاد سیاسی اقدام کرنا ہوگا۔ اگر آپ اپنے مطالبات پر قائم ہیں تو اس اقدام  
کے سنے تیار رہنے۔ یہ ہمارے۔ چاہ لوگوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو پہچان  
بیا جو مل کر مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ فیصلہ ہندوستان میں  
دور ہندوستان سے باہر بھی ہم پر اثر انداز ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ اس غور و فکر نے ہم میں اتنی

قابلیت پیدا کر دی ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو ہم متذکرہ اقدام کے لئے خود کو تیار پائیں۔ میں بغیر لائسنس کے یہ کہوں گا کہ ہم سرما کم مینی اور لارڈ ارون کی تشخیص پر پورے اترے ہیں۔ انہوں نے علیٰ کراہ یونیورسٹی میں یہ کہا تھا کہ ملت اسلامیہ کوئی رہنما پیدا نہیں کر سکی۔ ”رہنماؤں“ سے میری مراد وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ خدا کی مدد ہوتی ہے۔ یادہ اپنے وسیع تجربے کی بناء پر اور اک کے مالک ہوں اور جانتے ہوں کہ تعلیمات اسلامی کی روح کیا، ان کی تقدیر کیا ہے۔ ساتھ ہی ان میں بدستے ہوئے حالات کی رفتار کا صحیح اندازہ ہو۔ ایسے ہی رہنماؤں میں کسی قوم کے عمل کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہم میں اطاعت کا جذبہ نا پیدا ہے، اسی لئے آج افراد منتشر ہیں۔ یا مختلف جماعتوں میں منقسم ہیں۔ اس سے ہمارے عام افکار اور سرگرمیوں پر تو کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے کیونکہ ہم نے جو طرز عمل مذہب میں اختیار کیا ہے وہی سیاست میں ہو گیا ہے۔ مگر مذہبی فرقہ بندی سے اس لئے نقصان نہیں پہنچتا کہ ان سے کم از کم ذہنی تربیت کے اصول پر انحصار سے دلچسپی قائم رہتی ہے۔ نیز اس اصول کے تحت کوئی قوم اسلام کے دائرہ سے خارج نہ نہیں ہو سکتی۔ مگر سیاسی زندگی میں اختلافات کو رد و احمیں رکھا جاسکتا کیونکہ ملی مفاد کے پیش نظر عمل میں اتحاد ضروری ہے۔ اور اگر عمل کا اتحاد نہ ہو تو اثرات دھمک ہوتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کا علاج ہمارے پاس کیا ہے؟ جہاں تک حقیقی معنوں میں ایک ”رہنما“ کا سوال ہے تو وہ ہمارے بس سے باہر ہے۔ دوسری بات تو ہمارے پاس اس کا تذکرہ ہے۔ میں نے اس ضمن میں مخصوص رائے قائم کر چکی ہے مگر اس کا اظہار اسی وقت ممکن ہو گا جب حالات پر خطر ہو جائیں۔ اگر خدا نخواستہ ایسا ہو گیا تو پھر اتحاد علی ناگزیر ہو جانے لگا۔ پھر مجلس تزارو دروں سے بات نہ بنے گی بلکہ عمل کی راہ کا تعین کرنا پڑے گا۔

ہندوستان کے مسلمان اس وقت نہایت نازک موڑ پر کھڑے ہیں۔ اتحاد علی، اتحاد قول اور اتحاد عزم کی شدید ضرورت ہے۔ اگر ہمیں ہندوستان کے مفاد اور اپنے ملی رجحان کی خواہش ہے تو یہ اتحاد ضروری ہو گا۔ ہندوستان سیاسی اعتبار سے غلام ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو پورے ایشیا کے لئے مشکلات و مصائب کا ایک کبھی ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائیگا اس سیاسی غلامی نے ہمیں ایک ارفع تمدن کی مسرتوں سے محروم کر دیا ہے۔ ہندوستان کی طرف سے ہم پر کچھ فرض عائد ہوتا ہے۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ ہماری حیات و موت یہیں ہے۔ دوسرا فرض ہم پر ایشیا اور اسلامی ایشیا کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔ ایشیا کے

کسی اسلامی ملک میں، نبردِ سمان موجود نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے ایک جگہ سات کروڑ مسلمانوں کا وجود مکی دنیا نے اسلام کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس اعتبار سے ہیں آج کے ہندوستان کے مسائل پر اسلامی اور ہندوستانی مسلمانوں، دونوں کے نقطہ نظر سے غور کرنا ہوگا۔ ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے مائدہ بننے والی قوم داریوں سے ہم اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جب تک ہم ایک مقصد، ایک منزل کا تعین نہیں کرتے۔ اگر ہیں دیگر اقوام میں ہندوستان کا وجود قائم رکھنا ہے تو اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم متحد ہو جائیں۔ اسی عدم اتحاد کی بنا پر مسئلے سلجھنے کی جگہ اُلجھنے پلے جارہے ہیں۔ جس پوری شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ آزادانہ وجود کا وقت سر پہ ہے اور اس کے لئے پوری قوم کا اتحاد لازم ہے۔ یہیں انہوں میں یہ جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ وہ اتحاد و عزم پیدا کرنا ہوگا۔ جس کی نشو و نما خود ہوتی ہے۔ ہم فرقہ بندیوں کی قید سے آزاد ہو کر یقیناً ایسا کر سکتے ہیں۔ مادی اغراض کے ساتھ روج سے قریب تر ہونا ہوگا۔ رُوح ایک روشنی ہے، ایک زندگی ہے، ایک وحدت ہے۔ یہ وہ مسیت ہے جو مجھے تاریخ اسلام نے سکھایا ہے اور ہرگز اسے وقت میں اسلام نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ہے۔ مسلمان۔۔ اسلام کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ جب بھی مسلمان اپنے آپ کو اسلام پر مرکوز کر دیتا ہے تو اس کی نام کی شدت، قوت، زبردستی جیتی ہو جاتی ہے۔ پھر یہ وجود پر بادلوں سے محفوظ رہتا ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے ”ہمارے نزدیک موت و حیات ملت کا مسئلہ ایک فرد کے مسئلہ کی طرح ہے۔“ کیا ہمارے لیے یہ دعویٰ ممکن نہیں ہے کہ ہم مسلمان ہی اس اعلیٰ و ارفع تصور انسانیت پر عمل پیرا ہوئے۔ ہمارے لئے ایک اجتماع آنا پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس وقت ہم سب پر جب کچر دشمن اور عیاں ہو جائے گا۔“

عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّكُمْ إِذَا هُمْ تَقْتُلُونَ

## دوسرا عمل

علامہ اقبالؒ نے جو تجاویز مسلمانوں کے سامنے رکھی تھیں ان کا فوری طور پر رد عمل نہ ہو سکا یہ تجاویز مسلمانوں کی فوری توجہ کی مستحق تھیں مگر ایسا نہ کیا گیا۔ جہاں تک تو مسلمانوں کے لئے علیحدہ قومیت کی نظریاتی تشریح کا سوال تھا تو وہ فوری طور پر مسلمانوں کے ذہن نشین ہو گئی کیونکہ یہ نظریہ پہلے سے دیگر مسلمان رہنماؤں کی وساطت سے مسلمانوں تک پہنچ چکا تھا لیکن جس حد تک

صوبوں کی نئی عد بنہ ہی تے بار سے میں ان کی تجاویز کا تعلق تھا تو فوری طور پر وہ توجہ کار کو لے کر لی گئیں۔  
 نہ ہی فوری طور پر انہیں تائید حاصل ہو سکی۔ شاید وہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک مسلمانوں کے  
 ذہن میں ایک وفاقی کا تصور تھا حالانکہ ملا سراقبال کی تجویز میں بھی اس وفاقی کا تصور موجود تھا  
 لیکن مسلمانوں کے لئے پنجاب کی تقسیم ایک عجیب سی بات تھی۔ اسی طرح مسلمان اپنے اکثریتی  
 صوبوں کے ادغام کے خلاف تھے۔

### صوبہ سرحد ۱۹۳۰ء میں

ایک طرف تو مسلمان رہنما صوبہ سرحد میں اصلاحات اور اس صوبے کو دوسرے صوبوں کی  
 سطح پر لانے کی کوششوں میں مصروف تھے تو دوسری طرف ۱۹۳۰ء میں صوبہ سرحد کے اندر  
 حالات نے کچھ ایسا پلٹا دکھایا کہ یہ مسلمان صوبہ کانگریسی سیاست کے بحال میں پھنس گیا۔  
 انگریز حکومت کے زیر اثر آنے کے بعد بھی صوبہ سرحد پنجاب کا ایک حصہ تھا۔ ۱۹۰۰ء  
 میں اس صوبے کو پنجاب سے علیحدہ کر کے صوبہ شمال مغربی سرحد کا نام دے دیا گیا۔ کیونکہ اس صوبے  
 کی انتہائی زیادہ اہمیت تھی۔ قبائلی انگریزوں کے خلاف مسلسل نبرد آزما تھے۔ نیز اس کی  
 سرحد افغانستان سے ملتی تھی۔ لہذا انگریز ان تمام وجوہات کی بنا پر اس صوبے کو زیادہ سے زیادہ  
 فوجی اثر و رسوخ میں رکھنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے صوبوں میں تو اصلاحات کا نفاذ ہوتا  
 رہا لیکن صوبہ سرحد مسلسل مطالبات کے باوجود اصلاحات سے ایک تھک دکھایا۔ جس وقت  
 دوسرے صوبوں میں نظم و نسق کا بیشتر نظام، منتخب وزراء کے ذریعے کونسلوں کے ماتحت کر دیا گیا  
 تو سرحد میں منتخب میونسپل کمیٹی تک موجود نہ تھی۔ جہاں تک قبائلی خدقوں کا تعلق تھا تو وہاں  
 پولیسکل ایجنٹ اس نوعیت سے موجود تھے کہ قبائلی سرداروں کو ہاتھ میں رکھیں تاکہ قبائلی عوام  
 ان کے ہاتھ میں رہیں۔ دوسرا علاقہ وہ تھا جو چیف کمشنر کے ماتحت اخلاص پر مشتمل تھا۔ پولیسکل  
 ایجنٹ بھی اسی چیف کمشنر کے ماتحت ہوتے تھے نوضیکہ ایسے ہی حالات تھے جن کی بنا پر سرحد  
 ہمیشہ پسماندہ رہا اور یہاں کے عوام اپنے جائز حقوق سے زندگی کے ہر شعبہ میں محروم رہے۔

### خدائی خدمت گار اور فسادات

صوبہ سرحد کے ایک شخص سید قاسم نے ستمبر ۱۹۲۹ء میں "افغان جگہ" قائم کیا جس کا



تعداد کسانوں کی بدو، اُن کی اخلاقی اصلاح اور اقتصادی ترقی کی طرف توجہ دینا تھا۔ یہ ایک زیرسیاستی تنظیم تھی جس نے مختلف دیہاتوں میں اپنے رضاکار مقرر کئے اور انہیں خدائی خدمتگار کا ام دیا۔ رضاکاروں کی سرینہ قیصوں کی وجہ سے انہیں سُرخ پوش بھی کہا جانے لگا۔ اس تنظیم کو مختصر ترین عرصہ میں خاصی مقبولیت ہوئی۔ جب دسمبر ۱۹۱۹ء میں لاہور میں ہوا تو اس تنظیم کے کچھ اراکین بھی اجلاس میں شامل ہوئے۔ اُن کی حیثیت صرف ایک عام شخص کی طرح تھی۔ ان میں خان عبدالغفار خاں (بابا خاں)، جنہیں بعد میں سرحدی کانگریس بھی کہا جانے لگا، شامل تھے۔ صوبہ سرحد میں واپس پہنچتے ہی ان لوگوں نے خراب کی دکانوں کو باہر کرنا شروع کر دیا۔ حکومت اس تنظیم کو سیاسی تنظیم سمجھ رہی تھی لہذا اس نے موقع پاتے ہی اس کے گیارہ افراد کو جن میں عبدالغفار خاں بھی شامل تھے، گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں کی گرفتاری پر لوگوں نے شدید احتجاج کیا اور قتلے کے باہر سیکڑوں اشخاص جمع ہو گئے۔ حکومت نے اُن کی طرف سے تشدد کے مظاہرے کے بغیر فوج طلب کر لی۔ فوجی گاڑیوں کو جھوم کے اوپر سے گزرنے کا حکم دے دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بارہ افراد گاڑیوں تلے پکچھے گئے۔ باقی نوک مزید منتشر ہو گئے، انہوں نے فوجی گاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ جواب میں فوج نے فائر کھول دیئے۔ نئی گھنٹے تک یہی حالت رہی۔ آخر جھوم نے فوجی گاڑیوں کو تندر آتش کر دیا۔ خیال ہے کہ اس حادثہ کا وہاں میں کوئی دوسرا پیمانہ ہلاک ہوئے۔ فائرنگ کے بعد بھی جھوم منتشر نہ ہوا۔ انگریزوں نے دوفوجی پلٹینیں طلب کر لیں اور انہیں جھوم پر گولی چلانے کا حکم دے دیا لیکن فوجیوں نے صاف انکار کر دیا۔ انگریز اس بات کی توقع بھی نہ کرتے تھے۔ آخر فوج بارکوں میں واپس بھیج دی گئی اور کئی دن تک پشاور شہر ہنگاموں کا مرکز بنا رہا۔ ۵ اداں بعد شہر میں انگریز فوج داخل ہو گئی، خان عبدالغفار خاں اور کچھ دوسرے لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا اور مختصر سماعت کے بعد انہیں قید کی سزائیں دی گئیں۔ صوبہ سرحد کے واقعات سے بہت سے دوسرے صوبوں میں بھی گڑبڑ ہوئی۔ قبائلیوں نے بار بار سرکاری چوکیوں پر مسلح حملے کئے جن کے جواب میں فوج نے ان پر بمباری کی۔

## مارشل لا کا نفاذ

اگست ۱۹۳۰ء میں پشاور کو مارشل لا کے جوہم میں دھکیل دیا گیا۔ یہ مارشل لا

۱۰۔ جنوری ۱۸۴۱ء کو قائم رہا۔ نتیجتاً سرحد کے لئے اصلاحات کا مطالبہ تو دھراکا دھرا ہو گیا اور وہاں کانگریس کی طرف سے سول ناخرامی کا آغاز کر دیا گیا۔ اسی موقع پر ۱۸۴۱ء میں گاندھی اور عبدالغفار خاں کے درمیان پہلی بار ملاقات ہوئی۔ عبدالغفار خاں نے جی مناسب سمجھا کہ اگر پٹانوں کو انگریز کے ظلم و ستم سے نجات دلانا مقصود ہے تو کانگریس کی جدوجہد آزادی میں شمولیت ضروری ہوگی۔ کانگریس بھی ایسے موقع کی ناک میں تھی۔ اس نے افغان جرگہ کی ہر ممکن مدد کی اور اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ۱۸۴۱ء سے خان عبدالغفار خاں نے سرحدی علاقوں اور مواعظات کا دورہ کر کے تنظیم کو مضبوط کر دیا۔ اس طرح سرحد کے ۵۹ فیصد مسلمان کانگریس کی گود میں چلے گئے۔

## باب

# کمیونل ایوارڈ، دوسری گول میز کانفرنس

## صرف ہندوؤں کے باپو

۱۹ اگست ۱۹۴۱ء کو گاندھی لندن روانہ ہو گئے تاکہ ستمبر ۱۹۴۱ء میں شروع ہونے والی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کر سکیں۔ پہلے وہ شملہ پہنچے پھر ایک خاص گاڑی کے ذریعے ممبئی، تاکہ وہاں سے بحری جہاز سے لندن پہنچ سکیں۔

اپریل ۱۹۳۱ء میں لاہور دارقن کے عہدہ کی میعاد ختم ہو چکی تھی اور ان کی جگہ رڈ وگلڈن آچکے تھے۔ نئے وائسرائے نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس بھی شریک ہو۔ مگر گاندھی کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ہندو مسلم اتحاد کا تھا۔ لندن پہنچنے کے بعد گاندھی، مسز سروجنی نائیڈک کے ساتھ اس ہوٹل میں پہنچے جہاں آغا خاں مقیم تھے۔ ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ نہ صرف خاصی دلچسپ تھی بلکہ اس نے گاندھی کے اس نعرے کی قلبی سہی کھول دی کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھوں کی طرح سمجھتے ہیں اس بات حقیقت کا ذکر خود آغا خاں نے اپنی سرگزشت میں یوں کیا ہے:

آغا خاں: گاندھی جی! اگر آپ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی حقیقی اولاد کی طرح سمجھ لیں اور ان سے باپ کی طرح مشفقانہ سلوک کریں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان بھی آپ کی جدوجہد آزادی میں آپ سے اپنے تمام تر وسائل

اور سلاہت کے ساتھ تعاون کریں گے۔

گاندھی: میں فی الحال دل کی گہرائی کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے میرے پاس باپ ایسی محبت اور شفقت موجود ہے۔ اں اگر آپ سیاسی تقاضوں اور ضرورتوں کی بنیاد پر کچھ کہیں تو میں انتہائی تعاون کے جذبے سے بات چیت کروں گا کیونکہ میں کسی قسم کے جذبے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔

آغا خان نے کہا:

”حقیقت یہ ہے کہ اگر اس وقت گاندھی فراخ دلی سے کام لیتے تو یقینی طور پر مسلمان اپنی تمام تر حمایت ان کے لئے وقف کر دیتے اور گاندھی کی طرف سے پورا نہ شفقت کے مظاہرے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ دلی طور پر مسلمانوں کے تمام جائز اور مناسب حقوق کو تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کہ ایسا نہ ہوا۔ گاندھی نے بات چیت کے آغاز ہی میں جس کورسے پن کا مظاہرہ کیا اس کی نفی تمام بات چیت کے دوران شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی رہی۔ میں نے جتنے کمرے اور پتے ہندوستان کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر گاندھی بھی ایسا ہی کرتے تو ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو سکتا تھا۔“

بات چیت کئی نشستوں میں ہوئی لیکن گاندھی کے رویہ کی بنا پر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ گاندھی نے مختلف فرقوں کے درمیان لسانی، معاشرتی اور ثقافتی فرق کو محسوس کرنے سے واضح طور پر انکار کر دیا اور یہی کہتے رہے کہ ہندوستان میں رہنے والے سب لوگ صرف ایک قوم ہیں لہذا آئندہ تمام بات چیت اور فیصلے اسی تصور کے تحت ہونا ضروری ہیں۔

### مشروط بات چیت پر اصرار

اس دوران مسلمان رہنماؤں کی طرف سے ہندو مسلم اتحاد کے لئے جتنی بھی تجاویز پیش کی گئیں، گاندھی نے ان پر بات چیت کی بجائے پھیلنے والے شرائط مانگ دیں۔ پہلی شرط تو یہ تھی کہ مسلمان کسی معاملہ پر ضمانت حاصل کرنے سے پہلے ”سوراج“ کے اس مفہوم کو بلا کم و کاست قبول کر لیں جو مفہوم کانگریس کے نزدیک ہے گاندھی کی اس شرط کا جواب محمد علی جناح نے بڑے موثر اور مدلل انداز میں یہ دیا:

”اگر یہ شرط گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے والے دوسرے ہندو

مندوبین پر عام نہیں کی جاسکتی تو مسلمانوں ہی پر اس شرط کے تحت بات کرنے پر اصرار کیوں؟

گاندھی اس شرط پر بحث اس لئے کرتے تھے کہ کانگریس کے نزدیک "سوراق" کے تصور کی بنیاد قطعی طور پر ایک قومی نظریہ پر تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان سب سے پہلے تو اپنی جداگانہ قومیت اور پھر سیاسی حیثیت سے دست بردار ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان یہ شرط کسی قیمت پر بھی تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔

گاندھی کی دوسری شرط یہ تھی کہ مسلمان مندوبین پس ماندہ طبقوں اور اچھوتوں کے حقوق اور مطالبات کی نمائندگی نہیں کریں گے اور ان کے لئے علیحدہ نمائندگی کی بات تو بالخصوص نہیں کر سکیں گے۔ اچھوتوں کی کیتوں میں رہنے والے اور قدم قدم پر ان کی نمائندگی اور انسانی حیثیت کا مظاہرہ کرنے والے "مہاتما" کا بند کمرے میں یہ مطالبہ سس کے باطن کا ایک شفاف عکس پیش کر رہا تھا۔ گاندھی کے اس مطالبے کا جواب مسلمان رہنماؤں کی طرف سے یہ دیا گیا کہ پس ماندہ طبقوں اور اچھوتوں کے مطالبات کی مخالفت مسلمان نہیں کر سکتے اور اگر گاندھی براہ راست اچھوتوں کے ساتھ معاملہ طے کریں تو مسلمان ان کی راہ میں کوئی روڑہ بھی نہیں اٹھائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود گاندھی وعدہ لینے پر اصرار کرتے رہے۔

گاندھی نے پھر پُرانا کھیل کھیلاد اور کانگریس کو درمیان میں گھسیٹ لائے۔ انہوں نے کہا کہ جہاں تک مسلمانوں کے مطالبات کا تعلق ہے تو وہ ذاتی طور پر ان کے بارے میں غور کرنے پر تیار ہیں لیکن وہ اس کی کوئی ضمانت اس لئے نہیں دے سکتے مگر کون جانے کانگریس انہیں قبول کرے یا نہ کرے۔ جب علامہ اقبالؒ نے یہ مشورہ دیا کہ وہ تار کے ڈریلے کانگریس کی منظوری حاصل کریں، تو گاندھی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی:

"مجھے معلوم ہے کہ اس معاملے میں کانگریس مجھے پورے اختیارات نہیں دے سکی۔"

گاندھی کو اقلیتی کمیٹی کا چیئر مین بنادیا گیا لیکن اپنی اسی قلیل و قال کی پالیسی کے باعث وہ کمیٹی میں کوئی مسئلہ حل نہ کرا سکے۔ کمیٹی کے آخری اجلاس میں انہوں نے وزیر اعظم برطانیہ کی موجودگی میں یہ کہا:

"مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ اقلیتی کمیٹی کے اجلاس کے انعقاد کا یہ مناسب

موقع نہ تھا۔ کیونکہ فرقہ دارانہ مسائل 'سوراج آئین' میں سر فہرست تو ہو سکتے ہیں لیکن انہیں 'سوراج آئین' کی بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ فرقہ دارانہ اختلافات میں جو اضافہ ہوا وہ بلاشبہ غیر ملکی حکومت کی وجہ سے ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ اختلاف آزدادی کا سرچ ملوچ ہوتے ہی اس کی حدت سے گھل جائے گا۔

اس کے بعد وزیر اعظم برطانیہ کانگریس کے حامی ہونے کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

"مسٹر گاندھی! دیانت داری سے کام لیجئے اور حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت پیدا کیجئے۔ فرقہ دارانہ مسئلہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ بتائیے آیا ہندوستان میں فرقہ داریت ہمہ انہیں؟ اس کا جواب میں نہیں دوں گا بلکہ آپ کی دینداری پر چھوڑتا ہوں۔ اپنے ہی دل سے پوچھئے اور اگر آپ کا دل تسلیم کرتا ہے کہ فرقہ داریت موجود ہے تو یہ یہ فیصلہ کیجئے کہ اسے ہندوستان میں یا یہاں کیونکہ حل کیا جاسکتا ہے؟ جب تک مختلف فرقوں کی نمائندگی، مختلف فرقوں کے حقوق اور مختلف فرقوں کے تحفظ کے مسائل حل نہیں ہو جاتے ہندوستان کا آئین کیسے مرتب ہوگا؟"

گاندھی کے اسی رویہ کے بارے میں معروف ہندو رہنما کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب میں لکھا:

"لندن کی گول میز کانفرنس میں ہندو طلبوں اور فرقہ دارانہ مسائل کا حل آسانی سے تلاش کیا جاسکتا تھا۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ گاندھی جی پر ہوتا، پڈت مائوہا اور جیک جیسے متعصب ہندوؤں کا بہت اثر تھا۔"

آخر سر محمد شفیع نے دیگر اقلیتی نمائندوں کے ساتھ گفت و شنید کر کے ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم برطانیہ ہیزے سیکلڈائل کے سامنے ایک سمجھوتہ پیش کر دیا۔ اس سمجھوتے میں صرف ہندو شامل نہ تھے۔ ہندوؤں کے ساتھ جو اختلاف موجود تھا، گاندھی کی زندگی بنا پر جس کا توں رہا۔ ۳۰ نومبر ۱۹۳۱ء کو گاندھی نے اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاس میں یہ اعلان کیا کہ انہوں نے سمجھوتے کے لئے خلوص کے ساتھ جو کوشش کی وہ ناکام ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ



اجازت طلب کی۔ انہوں نے تار میں لکھا :

”صوبہ سرحد اور یو۔ پی کے نئے آرڈی منس ، صوبہ سرحد میں فائرنگ اور دونوں صوبوں میں میرے دوستوں کی گرفتاریاں سب کچھ اچانک اور غیر متوقع انداز میں ہوا۔ میں ان حالات کے لئے خود کو تیار نہ پاتا تھا۔ فی الحال میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان حالات کو حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے خاتمہ کی علامت قرار دوں یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ سے مل کر یہ رہنمائی حاصل کروں کہ مجھے مل کے لئے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ اور کانگریس کو کیا مشورہ دینا چاہئے۔“

کانگریس پُر امید تھی کہ وانسٹرائے کی طرف سے تسلی بخش جواب آئے گا اور بات چیت کا موقع ملے گا۔ شاید گاندھی نے لاڈ و انگلڈن کو بھی لاڈ اور دیکھا تھا لیکن ان دونوں کی طبیعت میں نمایاں فرق تھا۔ لاڈ اور ون جتنے نرم دل اور صلح جُڑتے ، لاڈ و انگلڈن اتنے ہی سخت گیر اور طاقت پر تعین رکھنے والے شخص تھے۔ گاندھی کو بہت مایوسی ہوئی کیونکہ وانسٹرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے جو جواب آیا ، وہ بہت خشک تھا۔

”حضور وانسٹرائے کا ارشاد ہے کہ وہ تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ اپنی حکومت کے دوستانہ تعلقات کے خواہشمند ہیں لیکن جہاں تک صوبہ سرحد اور یو۔ پی میں کانگریس کی سرگرمیوں کا تعلق ہے تو یہ سرگرمیاں ایسے دوستانہ تعلقات کی سراسر نفی کرتی ہیں نیز ہندوستان کے مفادات کے خلاف بھی ہیں۔“

یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو گاندھی نے وانسٹرائے کے نام ایک اور تار روانہ کیا جس میں دوبارہ ملاقات کی خواہش کا اظہار اور کانگریس کی سرگرمیوں کو درست قرار دینے کی کوشش کی گئی تھی ، نیز حکومت پر بھی کچھ الزامات عائد کئے گئے تھے۔ اس تار کا جواب بھی نہایت مایوس کن تھا۔ وانسٹرائے نے صرف ملاقات سے انکار کر دیا بلکہ یہ بات بھی واضح کر دی کہ اگر کانگریس کی سرگرمیاں ختم نہ کی گئیں تو قحط کی تمام تر ذمہ داری کانگریس اور گاندھی پر عائد ہوگی۔ نیز ایسی سرگرمیوں سے نمٹنے کے لئے حکومت اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لائے گی۔

کانگریس نے مول ناظرانی کی تحریک کو دوبارہ پُوری توجہ دی کے ساتھ شروع کر دیا لیکن حکومت نے ان سرگرمیوں کو زیادہ تشددی کے ساتھ دبا دیا۔ گاندھی سمیت تمام کانگریسی رہنماؤں کو



جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ اس دوران کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ قطعی علیحدگی کا رویہ اختیار کرنے رکھا اور ان کے مطالبات پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔ کانگریس خود کو ہندوستان بھر کے عوام کی واحد نمائندہ اور آزادی کی طلبہ دار سمجھتی رہی مگر اس نے مسلمانوں یا دیگر اقلیتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی اب گاندھی کا وہ فوج بھی ختم ہو گیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر سب سے پہلے "سوراج" کا حصول ضروری ہے۔

### کیونل ایوارڈ

۳۔ اگست ۱۹۳۷ء کو وزیر اعظم برطانیہ ریزے میکڈونلڈ کی طرف سے کیونل ایوارڈ کا اعلان کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو سکون نصیب ہوا، اس اعلان میں فی الحال صوبائی نشستیں شامل تھیں اور دیگر کسی اسمبلی کی نشستوں کے بارے میں فیصلہ باقی تھا۔ ۲۰ اگست کو مسلم کانگریس کا اجلاس دہلی میں ہوا جس میں وزیر اعظم کے فیصلوں پر گو عدم اطمینان کا اظہار کیا گیا تاہم اسے قبول کر لیا گیا اور اس بات پر اصرار کیا گیا کہ فیصلہ طلب امور پر بھی جلد از جلد غور کیا جائے۔ نیز اس توقع کا اظہار کیا گیا کہ باقی ماندہ امور کا فیصلہ مسلمانوں کے جائز مطالبات کے مطابق ہوگا۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۳۷ء کو کیونل ایوارڈ کے باقی حصہ کے بارے میں بھی اعلان کر دیا گیا۔ صوبائی نشستوں کے لئے مسلمانوں، سکھوں اور ہندوستانی عیسائیوں کو جدا جدا گانہ انتخابات کا حق دیا گیا۔ مختلف صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کے لئے نمائندگی کا مناسب یہ تھا،

بمبئی — ۳۰	،	دراس — ۲۹	،	بنگال — ۱۱۹
پٹی — ۶۶	،	پنجاب — ۸۶	،	ہار اور اڑیسہ — ۴۲
سی۔ پی — ۱۴	،	آسام — ۳۴	،	صوبہ سرحد — ۳۶
اور سندھ — ۳۴ -				

یہ امر قابل ذکر ہے کہ بمبئی میں نشستوں کی مجموعی تعداد ۱۷۵، بنگال میں ۲۵۰، پی۔ پی میں ۶۶، پنجاب ۸۶، اور اڑیسہ میں ۴۲، سی۔ پی میں ۱۱۹، آسام میں ۳۴، صوبہ سرحد میں ۳۶ اور سندھ میں ۳۴ تھی۔

اس اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ سراسر نا انصافی کی گئی تھی۔ مسلمانوں کو مسلم اقلیتی صورتوں میں توازن (WEIGHTAGE) کا حق دیا گیا تھا۔ لیکن بنگال اور پنجاب کے دو بڑے

مہجوں میں مسلمانوں کی نمائندگی میں غصہ پیدا کر دی گئی تھی۔ لیکن ان میں مسلمانوں کی آبادی ۵ فیصد تھی اور پنجاب میں ۵۰ فیصد، لیکن ان کے لئے مندرجہ بالا اہلکار کے تحت مسلمانوں میں طوائف اور ۶۰۶ اور ۹۰ فیصد نشستیں رکھی گئی تھیں۔ پنجاب کے زمینداروں کو ۵ نشستیں دی گئی تھیں کیونکہ پنجاب کے زمینداروں کی اکثریت مسلمان تھی۔ لہذا ان کے لئے جنوبی اسیلی میں الکویت حاصل کر لینا معمولی بات تھی۔ دوسرے دو مسلمان اکثریتی مہجوں میں غیر مسلم اٹلیجنٹوں کو زیادہ تر انڈیا دیا گیا۔ مثلاً سندھ کی ۱۰ فیصد غیر مسلم آبادی کو ۲۴ فیصد اور صوبہ سرحد کی غیر مسلم آبادی کو ۲۴ فیصد نمائندگی دی گئی۔

گاندھی جیل میں تھے لیکن مسلمانوں اور اچھوتوں کے حقوق منسب کرنے کا خیال وہاں ہی ان کے ذہن سے خارج نہ ہو سکا۔ انہوں نے اچھوتوں کو طیبہ علاقے کے انقلاب کے ذریعہ نمائندگی دینے پر شدید احتجاج کیا اور ساتھ ہی اپنے روایتی ہتھیار "حرن ہٹ" کا استعمال شروع کر دیا گیا۔ کچھ ہندوؤں نے گاندھی اور اچھوت رہنماؤں کو امید کر لی جس کا ثبوت کی کوشش کی۔ آخر دونوں ایک فارمولہ پر رضامند ہو گئے۔ اچھوتوں کے لئے کچھ مزید نشستیں مخصوص کر دی گئیں، لیکن ان کے انتخابی حلقوں کو ہندوؤں کے انتخابی حلقوں کے ساتھ منسلک کرنے کے غلط صورت سے دی گئی۔ حکومت نے بھی اس فارمولہ کو تسلیم کر لیا اور اسی طرح گاندھی کا مرن برت بھی ختم ہو گیا۔

گاندھی کو اپنی اس تحریک سول نافرمانی میں، جس نے نہایت سے گاندھی سے رہنماؤں اور گاندھی کو جیل بھیجا تھا، مجرئی طرح ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۹۳۱ء میں گاندھی نے پہلی نافرمانی اس وقت اچانک ختم کر دی جب وہ اپنے حریف پر تھی۔ دوسری سول نافرمانی گاندھی اور وائسرائے ہند لارڈ ایلن کے سمجھوتہ کے تحت ختم ہوئی۔ مگر تیسری تحریک نافرمانی پر نہ کوئی سمجھوتہ ہوا اور نہ اسے بند کرنے کا کوئی جواز تھا بلکہ علی طور پر تحریک رفتہ رفتہ اپنے موت آپ مر گئی۔ گاندھی نے اس کی غرض نافرمانی کو ختم کرنے کے سلسلے میں وائسرائے ہند سے بات چیت کا جو اذیتناشی کہنے کی بار بار کوشش کی لیکن ہر بار حکومت کی طرف سے یہی جواب ملا کہ پھر غیر مشروط طور پر تحریک ختم کی جائے ورنہ اس کے بعد حکومت سے بات چیت

ناممکن ہو جائے گی۔ لہذا گاندھی نے وائسرائے سے بات چیت سے انکار کر دیا۔

## مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار

مسلم لیگ کی صفوں میں اب سچ کسی حد تک انتشار برپا ہوتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہو سکا۔ ۱۹۳۳ء میں مسلم لیگ کے اندرونی استحکام کو مزید صدمہ پہنچا۔ ہندوستان کے ۱۲ مارچ ۱۹۳۳ء کو مسلم لیگ کے قائم مقام صدر میاں عبدالعزیز نے کمیٹی میں مداخلت پیش کرنے بغیر اپنے طور پر سیکرٹری کا عہدہ خالی قرار دے دیا۔ مسلم لیگ کے سیکرٹری مولوی محمد یعقوب خاموشی کے ساتھ اپنے عہدہ سے دست بردار ہو گئے۔ لیکن مسلم لیگ کو نسل بے ان کے اس اقدام کی مذمت کرتے ہوئے مولوی محمد یعقوب پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود میاں عبدالعزیز نے مولوی محمد یعقوب کو مسلم لیگ کے نئے صدر کے انتخاب کے لئے اجلاس طلب کرنے سے منع کر دیا جس کی وجہ سے تعطل پیدا ہو گیا۔ چنانچہ کونسل کے ممبروں نے اکثریت رائے سے اجلاس طلب کیا اور میاں عبدالعزیز کے خلاف ہجرا اجلاس میں موجود تھے، عدم اعتماد کی قرارداد منظور کر دی۔ دو دن بعد کونسل کے اجلاس نے فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کا آئندہ سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۳۳ء میں ہوتی ہیں، کانپور کے حافظہ دایت حسین کی زیر صدارت منعقد کیا جائے اس اجلاس میں مسلم لیگ نے کمیونل ایوارڈ قبول کر لیا لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے مطالبات کو منظور کرانے کی کوششیں جاری رکھنے کی قرارداد بھی منظور کی۔ اسی اجلاس میں ایک اہم قرارداد منظور کی گئی کہ محمد علی جناح اور آغا خان کے مشوروں سے مسلم لیگ کی صفوں میں دوبارہ اتحاد پیدا کیا جائے۔

## تیسری گول میز کانفرنس

نومبر ۱۹۳۲ء میں حکومت برطانیہ نے تیسری گول میز کانفرنس طلب کی۔ یہ کانفرنس دوسری کانفرنس کے خارجی فیصلوں اور کمیونل ایوارڈ کی بنیاد پر انگلستان کے لئے ایک نئے آئینی ڈھانچہ کی تیاری کی غرض سے طلب کی گئی۔ اس کانفرنس میں محمد علی جناح شریک تھے۔ کانفرنس نے اڑھائی تین ماہ میں نئے آئین کی تفصیلات طے کر لیں۔ بعد ازاں یہ تفصیلات ایک قرارداد میں پیش کی صورت میں (مارچ ۱۹۳۳ء میں) شائع کر دی گئیں جو آئین تجربہ کیا گیا تھا اس کے تحت صوبوں اور وفاقی مرکز میں اختیارات کی تقسیم، صوبائی حکومتوں میں عوام کی نمائندہ وزارتیں

اور اس وزارتوں کا صوبائی امور پر کنٹرول اور وفاقی حکومت میں گورنر جنرل کا زیادہ سے زیادہ عمل دخل شامل تھا۔ چنانچہ محمد علی جناح کا تعلق تھا کہ اس آئین سے مطمئن نہ تھے کیونکہ ان کے خیال میں ہندوستان کی آزادی کے پہلو سے یہ آئین محض اشک ثوئی کے مترادف تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس آئین کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوشش ہی نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ایوارڈ آچکا تھا اور اس کی بنیاد پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مصالحت کی راہ ہموار ہو چکی تھی لیکن یہ ضروری تھا کہ کانگریس اس سلسلہ میں مسلمانوں سے تعاون کرتی۔ ۱۹۳۳ء میں جب کانگریس کی سول نافرمانی اپنی موت آپ مر گئی تو قدرتی طور پر کانگریس کی تمام تر توجہ دوبارہ آئینی تبدیلی کی طرف ہو گئی۔

دوسری طرف مسلمان رہنماؤں میں اس بات کا احساس شدت سے موجود تھا کہ مسلم لیگ کی صفوں کو حیدر از سب سے منظم کیا جائے اور اس مقصد کے لئے مسلم لیگی رہنماؤں کی نگاہیں صرف محمد علی جناح پر جاتی تھیں جو دوسری گول میز کانفرنس کے بعد سے انگلستان میں مقیم اور وکالت کر رہے تھے۔ بہر حال مسلمان انہیں ہندوستان واپس نہ آنے میں کامیاب ہو گئے۔

## باب ۲۲ مسلم لیگ کی تنظیم نو

۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء تک مسلمانوں میں بہت سی سیاسی تنظیموں کے باوجود مسلمان باہمی افتراق میں مبتلا ہو چکے تھے۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہر مسلمان تنظیم خود کو مسلمانوں کی نمائندہ سمجھتی تھی۔ لیکن ان میں ایک بھی ایسی نہ تھی۔ جو فی الواقعہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ کہلانے کی مستحق ہوتی۔ مسلمان تنظیمیں یہ تھیں۔

۱۔ نیشنلسٹ

۲۔ جمعیت العلماء ہند (دودھڑے)

۳۔ مجلس احرار اسلام

۴۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس یا آل انڈیا مسلم کانفرنس

۵۔ آل انڈیا مسلم لیگ (دودھڑے)

اس کے علاوہ بہت سے مسلمان کانگریس کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ اور کانگریس کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ محمد علی جناح ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۹ء تک مسلم لیگ کے صدر رہے۔ اس دوران مسلم لیگ ایک باوقار جماعت بن گئی۔ لیکن محمد علی جناح کے جلتے ہی اس کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں کو محمد علی جناح کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی تھی۔ گول میز کانفرنس کے وقت ہندوستان کے ممتاز سیاسی رہنماؤں نے اس

اس کی پوری کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح محمد علی جناح کو لندن سے مستقل طور پر ہندوستان لپکا لے آئیں تاکہ مسلم لیگ کے وقار کو بحال کیا جاسکے۔ محمد علی جناح کا یہ فیصلہ کہ وہ لندن میں قیام کریں متعدد وجوہات کی بنا پر تھا۔ ہندو کی مسلمان دشمنی نے بھالان پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ انہوں نے انتہائی برداشت سے کام لیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کے لئے حویلی جدوجہد کی۔ لیکن ہر قدم پر ہندو کی تنگ نظری نے انہیں نیا صدمہ دیا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہندو کسی قیمت پر مسلمان کو بر داشت نہ کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے ہر مسلمان ایک ایسے گیند کی مانند ہو جائیں جو میدان میں لڑ سکتا پھرے اور اُسے کبھی قرار نصیب نہ ہو سکے۔ لندن میں قیام کے دوران انہوں نے بعض ہندو مسلمانوں کے کردار کے بارے میں بھی اس بات کا اظہار کیا کہ وہ مسلمانوں کے لئے خصماً ہندو کی کھائے دوغلی پالیسی کا مظاہرہ کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ بعض مسلمان تو ایسے بھی ہیں کہ ان سے بات کرنے سے قبل ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے مشورہ حاصل کرتے ہیں۔ لہذا ایسے لوگوں کے درمیان ان کی کیا جگہ ہو سکتی تھی۔

گو محمد علی جناح پہلی گول میز کانفرنس کے بعد سے انگلستان ہی میں مقیم رہے لیکن وہ ہندوستان کے سیاسی حالات کی انٹ پیٹ سے بھی غافل نہ رہ سکے۔ ہندوستان کے میدان سیاست میں جو کھیل کھیلے جاتے رہے۔ محمد علی جناح نے ایک زیرک تماشائی کی حیثیت سے ان کا جائزہ لیا۔ اگست ۱۹۳۱ء میں جب وہ ہندوستان آئے تو انہوں نے سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیا کہ ہندوستان کے مسلمان متحد ہو کر آزادی کی جنگ میں بھرپور اور وابہانہ حصہ لیں۔ آباد کی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں بھی انہوں نے مسلمانوں کو ایک متحدہ محاذ کے قیام کی ضرورت کا احساس دلانے کی کوشش کرتے ہوئے دروندانہ اپیل کی کہ وہ فردی طور پر باہمی تنازعات کو ختم کر کے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جائیں۔ انہوں نے اس موقع کا اظہار بھی کیا کہ اُن کی لندن روانگی سے قبل ہی مسلمانوں کے تمام حصے متحد ہو جائیں گے اور وقت کی انتہائی نزاکت کو شدت کے ساتھ محسوس کریں گے۔ محمد علی جناح نے زور دیا کہ وہ سب سے پہلے مسلمانوں میں اتحاد اور ان کے درمیان تمام تنازعات پر مکمل مصالحت اور اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں وہ نازک وقت بحث و تمحیص کا تھا نہ ہی پراپیگنڈہ کا، اس وقت فرقہ وارانہ احساسات و جذبات کو ہوا دے

ان میں مزید تلخی پیدا کرنا بھی نہایت خطرناک تھا۔ اس لئے کہ دشمن عدوان سے یہ دھمک لے لے رہا تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی مفید بحث نہ ہو پائی تو اگر نیز کہ مصالحت کرانی نہ ہو سکے گی۔ اور جب کوئی مصالحت نکلا تا ہے تو وہ یقیناً اپنے لئے احمقیت اور بالادستی کا حق محفوظ رکھتا ہے محمد علی جناح نے اس پاپیل میں کہا۔ گاؤں میں بھی خود بچتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو وہ سب کچھ دینا پسند کریں گے جو مسلمانوں سے مانگیں گے۔ اور محمد علی جناح کا لگا ہوا صوف اتنا ہے۔ کہ ہندوؤں سے مسلمانوں کے لئے صرف ہر انکات طلب کرتا ہے۔ حالانکہ یہ چوڑا نکات اس کو دے چیک کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ جو گاؤں میں نے مسلمانوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مسلمانوں کو کبھی کورے چیک کی ضرورت نہیں اس کی جگہ ان کو چوڑا نکات کیوں نہیں دے دیتے ہاتھ سے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ جو اہر لال بہنو، پٹیل اور گاؤں میں سب سے ایک ہی ٹیٹ لگا رکھی ہے۔ یہی کہ ہمیں کورا چیک دیدو ہم سودیشی قلم سے سودیشی کاغذ پر دستخط کر دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تینوں انتہائی غیر جانبدار اور غیر فرقہ وارانہ اہمیت کے لوگ ہیں۔ لیکن فرقہ وارانہ اہمیت رکھنے والا کوئی شخص ہے تو محمد علی جناح! ہندوؤں سے یہی اپیل کی جاسکتی ہے۔ کہ وہ ہر شخص کے بارے میں غلط فہم فائدہ قائم نہ کریں۔ آخر میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا۔ کہ اگر اب بھی خواہش ہو تو مصالحت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

محمد علی جناح کی اس اپیل کا اثر خواہ مخواہ تبدیل نہ ہو سکا۔ مسلم لیگ نے اور مسلم کانفرنس کے لوگوں نے باہم اختلاف پیدا کر کے مشترکہ تجاویز مرتب کیں۔ لیکن جنرل بنک نیشنلسٹ مسلمانوں کا تعلق تھا وہ پھر بھی کانگریس کے ہمناں رہے۔ گاؤں میں تو ہمیشہ ہی مسلمانوں کے مطالبات کو نظر انداز کرتے رہے۔ مسلمان جماعتوں میں تنظیم کے اسی فقدان کے باعث ان کی آواز دہتی رہی۔ جب مسلم لیگ نے دہلی میں سالانہ اجلاس طلب کیا تو بہت کم لوگوں نے اس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں چوہدری غلام احمد خان کو مسلم لیگ کا صدر منتخب کر کے کی تجویز پر دہلی میں شدید مزاحمت کی گئی۔ جنی گاؤں۔ جو یہ لہو کہ یہ اجلاس بھی دہلی کے ایک مکان میں منعقد کرنا پڑا۔

جب محمد علی جناح اپریل ۱۹۳۴ء میں ممبئی پہنچے تو انہوں نے سب سے پہلے مختلف گروہوں میں بڑی بڑی برائی مسلم لیگ کو متحد کیا۔ جو متحدہ مسلم لیگ کونسل کی صورت میں سامنے آئی۔ اس نے کرایا گیا اور کونسل نے محمد علی جناح کو مستقل صدر چنے لیا۔ حافظہ ہدایت حسین اس متحدہ کونسل کے سیکرٹری منتخب کئے گئے۔ اس کونسل نے سب سے پہلے ایک قرارداد منظور کی جو

یہ تھی۔

جب تک مختلف جماعتوں اور فرقوں میں مفاہمت نہیں ہو جاتی۔ مسلم لیگ کونسل کیونل ایوارڈ کو اس کی موجودہ صورت میں قبول کرتی ہے۔ تاکہ ملک کے لئے قابل قبول آئین کی ترتیب کی طرف پیش قدمی کی جاسکے؟

اس کے بعد محمد علی جناح نے ایک پریس کانفرنس طلب کی اور کہا کہ اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ اس مجوزہ آئین سے، جو ہندوستانیوں پر عورتوں کا بار تھا، کیونکر نجات حاصل کی جائے۔ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مکمل مفاہمت نہیں ہو جاتی اور دونوں کو ایک دوسرے کا تعاون حاصل نہیں ہو جاتا، اس آئین سے چھٹکارا مشکل ہو گا۔ مسلم لیگ کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو۔ مسلم لیگ کونسل نے جو قرارداد پاس کی ہے۔ وہ اس بنیاد کی نشاندہی کرتی ہے۔ جس بنیاد پر اتحاد ممکن ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ملک کی آئندہ سیاسی ترقی کا تعلق ہے تو اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطہ نگاہ میں کوئی فرق نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ مسلمان کیونل ایوارڈ پر مصر ہیں۔ کیونکہ وہ کیونل ایوارڈ میں موجود سختیوں کو آئین آزادی میں شامل کئے جانے کے بارے میں اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

## محمد علی جناح کا بلا مقابلہ انتخاب

۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ محمد علی جناح دو اس وقت انگلستان میں تھے کہ عدم موجودگی میں بھی سب سے ان کے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے گئے۔ اور وہ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ یہ انتخاب ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو محل میں آیا۔ انتخابات کے دوران کیونل ایوارڈ سے متعلق کانگریس کا رویہ خاصا دلچسپ تھا۔ کانگریس کے انتخابی منشور میں کہا گیا تھا کہ کانگریس کیونل ایوارڈ کو منظور بھی نہیں کرتی اور نامنظور بھی نہیں کرتی۔ اس وقت کانگریس میں بھی کیونل ایوارڈ کی وجہ سے دو دھڑے بن چکے تھے۔ ایک تو وہ جو کیونل ایوارڈ کا مخالف اور اس کی دو ٹوک مخالفت پر یقین رکھتا تھا۔ دوسرا وہ جو مخالفت تو ضرور تھا۔ لیکن اس مرحلہ پر بخیر جان بولنا رو بہ اختیار کرنے کے حق میں تھا۔

نیشنلسٹ پارٹی نے ان انتخابات میں سوراخ پارٹی کے مقابلہ پر جھٹکا لیا۔ لیکن سوراخ پارٹی کے مہم اور نیشنلسٹ پارٹی کے صرف اہم امیدوار کامیاب ہو سکے۔



## مسلم یونٹی بورڈ

کانگریس کے مسلمان اراکین میں ایک چوہدری خلیق الزمان نے گاندھی کی اشیر باد حاصل کی اور سوراج پارٹی سے علیحدہ ایک مسلم یونٹی بورڈ قائم کر دیا اور اسی بورڈ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے لئے کمر باندھ لی۔ یونٹی بورڈ میں کچھ کانگریسی مسلمان، کچھ غیر کانگریسی مسلمان اور کچھ جمعیت العلماء ہند کے اراکین تھے۔ اس بورڈ نے کیونل ایوارڈ کی حمایت اور مجوزہ آئین کی جگہ آئین آزادی کا غور لگایا۔ یو۔ پی میں بورڈ کے امیدواروں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی لیکن جب اس بورڈ کے کامیاب امیدوار اسمبلی کے اندر پہنچے تو سوراج پارٹی کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب کیونل ایوارڈ کا مسئلہ آیا تو اس بورڈ نے محمد علی جناح کا ساتھ دیا۔

اسمبلی میں انڈین یونٹ پارٹی کی قیادت محمد علی جناح کر رہے تھے۔ اسمبلی میں اس پارٹی کے ۲۲ نمائندوں میں ۱۸ مسلمان تھے۔ اسمبلی میں کانگریس کے ۴۴ اور نیشنلسٹ پارٹی کے ۱۱ نمائندے موجود تھے۔ علاوہ ازیں کانگریس کے دونوں دھڑوں کی مجموعی قوت ۵۵ تھی۔ جہان نیک محمد علی جناح کی انڈین یونٹ پارٹی کا سوال تھا تو مسلمان اراکین اس میں تیزی سے شامل ہو رہے تھے اس طرح یہ پارٹی حقیقتاً مسلم پارٹی کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی اسمبلی میں سوراج پارٹی نے نیشنلسٹ پارٹی کی حمایت سے ایک کانگریسی مسلمان تصدق احمد خان شیروانی کو سپیکر کے عہدہ کے لئے منتخب کیا۔ ان کے مقابلہ میں محمد علی جناح نے سر عبدالرحیم کو کھڑا کیا۔ سر عبدالرحیم ۶۲ کے مقابلہ میں ۷۰ ووٹوں سے منتخب ہو گئے۔ اسمبلی بیچے بچے محمد علی جناح کی یہ پہلی اور بہت بڑی فتح تھی۔

## نئے آئین پر بحث

۴ فروری ۱۹۳۵ء کو ہندوستان کا نیا آئین اسمبلی میں زیر بحث آیا۔ جو برطانوی پارلیمنٹ کی مجلس منتخبہ کی رپورٹ کی صورت میں تھا۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے تین حصوں پر مشتمل ایک تہ نیم پیشینگی۔

۱۔ یہ ایران کیونل ایوارڈ کو منظور کرتا ہے۔

۲۔ آئین کے صوبائی حصہ کو اس کے قابل اصلاح اور پرستش کرنے کے باعث اس کی اصلاح کا مطالبہ کرتا ہے۔

۳۔ مجوزہ آئین کے وفاقی مرکز کی ساخت سے متعلق حصہ بنیادی طور پر ناقص اور ہندوستان میں رہنے والوں کے لئے ناقابل قبول ہے۔ ایمان حکومت برطانیہ کو مشورہ دیکر کہ کھد کورہ بالا حصہ سے متعلق تجاویز آئین میں شامل نہ کی جائیں۔ اور مرکز کی ساخت پر دوبارہ غور کیا جائے۔ غیر ہندوستانی حوام کے مشورے سے نئی تجاویز مرتب کی جائیں۔ ان ترامیم پر تین دن بحث جاری رہی۔ کیونکہ ایوارڈ کی منظوری سے متعلق ترمیم کے حق میں سکاوی ہاک تھا اور ترمیم کے خلاف غیشٹ پارٹی! ترمیم کے حق میں ۶۸ اور اس کے خلاف ۱۵ ووٹ پڑے۔ کانگریس غیر جانبدار رہی۔

مجوزہ آئین کے صوبائی حصہ کے پرستش اور قابل اصلاح ہونے کی ترمیم سے متعلق پوچھا یہ تھی کہ اگر اسمبلی کثرت رائے سے اسے حذف کر دیتی تو مجموعی اعتبار سے کیونکہ ایوارڈ منظور ہو جاتا۔ بالفاظ دیگر اسمبلی اسے کسی تنقید کے بغیر قبول کر لیتی۔ اور صرف مرکزی حصہ کو مسترد کر دیتی۔ چنانچہ کانگریس اور غیشٹ پارٹی کے نمائندے مجبور ہو گئے کہ اس ترمیم کے دوسرے حصہ کو سرکاری ووٹوں کی اکثریت سے مسترد کرنے سے بچالیں۔ جہاں تک ترمیم کے تیسرے حصہ کا تعلق تھا۔ یعنی آئین کے مرکزی حصہ کا کچھ استرداد اور اس مسئلہ پر سب متفق تھے۔ لہذا محمد علی جناح کی ترمیم کے دوسرے اور تیسرے حصوں پر مشترکہ رائے شمار کی ہوئی سرکاری پٹری میں مخالفت کی کانگریس اور غیشٹوں نے حق میں ووٹ دیئے۔ لہذا دونوں حصے ۸۵ کے مقابلے میں ۷۷ ووٹوں کی اکثریت سے منظور ہو گئے۔

ہندوؤں اور ان کے نمائندہ اخبارات کو محمد علی جناح کی اس غیبا کا میا پی نے بوجھلایا ہندو اخبارات نے یہ الزام عائد کیا کہ محمد علی جناح نے اپنی پارٹی کی ہڈیشن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قومی مفاد کو نظر انداز کر دیا اور فرقہ وارانہ تبلیغ کا عمل کر کے کی کوشش کی۔ ہندو اخبارات نے یہ عجیب بات بھی کہی کہ محمد علی جناح لاکھ بار یہ سمجھیں کہ انہیں فتح حاصل ہوئی ہے۔ مگر ان کی یہ فتح اسمبلی کے اندر اور ان کی فائز تک محدود ہے۔ لہذا اصل یہ حکم کی شکست کے مترادف ہے۔

باب

## مبشہدین کا ہنگامہ

مجلس احرار اسلام ۱۹۳۲ء میں قائم ہوئی تھی اس کا نصب العین مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت تھی۔ اس جماعت نے کثیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ تحریک کی قیادت شیخ عبدالمذکور رہے تھے۔ سیالکوٹ، جہلم اور راولپنڈی کے رستوں سے مسلمانوں کے بہت سے جہتے تکثیر چلوں کا نعرہ لگا کر ریاست کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ کیونکہ کثیر کی سیکھ حکومت نے مسلمانوں کے داخلہ پر پابندی عائد کر دی تھی لہذا ان جہتوں کو عام طور پر ریاست کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے ہی پنجاب کی پولیس گرفتار کر لیتی اور اگر کچھ لوگ بچ جاتے تو کثیر میں داخل ہو بھی جاتے تو وہاں ڈوگرہ پولس انہیں حراست میں نہ لے لیتی۔ چنانچہ پولیس اور عوام میں تصادم کی صورت بھی پیدا ہو جاتی۔ ۱۹۳۲ء میں اس مہم میں جماعت احمدیہ بھی شامل ہو گئی۔ لیکن جلد ہی یہ محسوس کیا گیا کہ جماعت احمدیہ کا مقصد تحریک آزادی میں مسلمانوں کی مدد نہیں بلکہ اپنی تبلیغ تھا۔ چھوڑ دینا کہ غیر احمدیوں اور احمدیہ جماعت کے کثیر گروہ سے ابگاہ ہونے لگا اور وہیں دیکھتے دیکھتے عام جہتاں میں مولانا اقبال نے حالات پر مددگار بننے والی اور غور و فکر کثیر کی تنظیم کے لیے ایک نئی تنظیم کی بنیادی قواعد جاری کی۔ ان کے کثیر کی کام چلنا کہ کثیر کی کثیر کے لیے ایک ایسا ادارہ بنے جس کے قیام سے مسلمانوں کی حالت بہتر ہو سکے۔ اس طرح احمدیوں کی تحریک کثیر کی جماعت احمدیہ میں ختم ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں جماعت احمدیہ نے غور و فکر کیا کہ وہ اس سے

کی کونسل کے عارضی رکن کے طور پر منتخب کیا گیا تو احراریوں کو اچھا موقع ملتا تھا۔ ان کے خیال میں چودھری صاحب کو یہ عہدہ دلانے میں سرفضل حسین نے اہم کردار ادا کیا تھا نتیجہ یہ نکلا کہ چودھری صاحب کی جگہ سرفضل حسین احراریوں کی کڑوی کسلی تنقید کا نشانہ بنے۔

۱۹۳۲ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مجلس احرار نے لالہ ہرکٹ لال کے ایک لڑکے کو اپنا امیدوار منتخب کیا جس نے کچھ عرصہ پیچھے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بعد ازاں وہ پھر ہندو ہو گیا۔ اور تقسیم ملک کے وقت بھارت چلا گیا۔ اس کا اسلامی نام خالد لطیف لگا باقیات گاہا کو یونیسٹ پارٹی کے امیدوار کے مقابلے میں کھڑا کیا گیا۔ جسیت گاہا کی جوتی اور اس طرح سرفضل حسین مجلس احرار اسلام کی مزید تنقید کا نشانہ بنے۔ کیونکہ احرار اسلام کے خیال میں گاہا کے مقابلے پر جو امیدوار کھڑا کیا گیا تھا وہ بھی سرفضل حسین کے اشارے پر میدان میں آیا تھا۔

۱۹۳۵ء کے وسط میں پنجاب کا امن وامان شدید خطرے میں پڑ گیا لاہور کی ایک مسجد پنجاب میں سکھوں کے مختصر دور حکومت میں ان کے قبضے میں چل گئی تھی۔ مسجد پر قبضہ کرنے کے بعد سکھوں نے قریب ہی ایک گوردوارہ تعمیر کر دیا اور اس کے گرنختی نے مسجد کو اپنا مکان بنالیا مسجد کے ساتھ جو دکانیں تھیں وہ ان کا کرایہ بھی وصول کرنا رہا۔ اس گرنختی کی اولاد نے مسجد کو ذاتی ملکیت قرار دے دیا۔ مسجد تقریباً سو سال پرانی تھی۔ سکھوں نے ایک دوبار اسے مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کا کوئی خریدار پیدا نہ ہو سکا۔ ہندو میں انگریز حکومت کے قیام کے قریباً پینسٹھ سال بعد ایک مسلمان نے خود کو مسجد کا متولی ظاہر کیا۔ اور سکھوں کے خلاف دیوانی مقدمہ دائر کر دیا لیکن عدالت نے یہ مقدمہ اس بن پر خارج کر دیا کہ اس پر ایک سو سال سے زائد عرصہ سے سکھوں کا قبضہ تھا۔

جب ۱۹۲۵ء میں سکھ گوردوارہ ایکٹ بنایا گیا تو حکومت نے تمام گوردوارے اور ان کی جائداد سکھوں کی گوردوارہ پر بند حکم کیٹی کے سپرد کرنے کے لئے ضابطے وضع کئے جسے اس سلسلے میں ٹریبونل قائم ہوا تو مسجد شہید گنج پر قابض سیراداروں نے اسے ذاتی ملکیت قرار دیا لیکن اس کے ساتھ ہی انجمن اسلامیہ کے سکریٹری نے بھی یہ دعوئی کیا کہ یہ گوردوارہ دراصل مسجد تھی لہذا اس پر مسلمانوں کا حق ہے لیکن ٹریبونل نے سکھوں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ انجمن اسلامیہ کی طرف سے کوئی اپیل نہ کی گئی آخر مارچ ۱۹۳۵ء میں یہ مسجد پر بند حکم کیٹی کے سپرد کر دی گئی جون ۱۹۳۵ء میں پنجاب کے مختلف علاقوں کے سکھ لاہور پہنچنا شروع ہوئے۔

اور انہوں نے مسجد کو شہید کرنے کا پروگرام بنالیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ مسجد کے گرجے جانے سے پہلے ہی ایک سکھ راج مسجد کی بوسیدہ دیوار کے اچانک گرنے سے ہلاک ہو گیا۔ اس کی ہلاکت کی وجہ سے مختلف قسم کی افواہیں پھیل گئیں اور مسلمان بھی اس مسجد کے باہر کثیر تعداد میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر اور سٹی جمنسٹریٹ موقع پر پہنچ گئے اور ۲۸ جون ۱۹۳۵ء کو یہ حکم دیا گیا کہ سکھ مسجد کی عمارت کو گرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس کے بعد سکھوں اور مسلمانوں کے جلسوں جلسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کبھی کبھار لاٹھی چارج بھی ہو جاتا۔ ۶ جولائی کو پنجاب کے گورنر ایمرسن ٹنڈل سے لاہور پہنچ گئے۔ مسلمانوں کے ایک وفد نے ان سے ملاقات کی اور مطالبہ کیا کہ مسجد کو حکم آتا رہا تب تک کے سپرد کر دیا جائے نیز شہر میں وفد ۳۴ نافذ کی جائے تاکہ مسجد کے اندر عام کو روکا جائے مسلمانوں نے سکھ رہنماؤں سے بھی ملاقات کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ جب تک گورنر دارہ پر بندھک کٹی مسلمانوں کی تادیب پر غور نہیں کر لیتی مسجد کو شہید نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہ بات حجت جاری تھی کہ ۳ جولائی کو سکھوں نے اچانک رات کے وقت مسجد گرجا شروع کر دی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس موقع پر مسیح پولیس موجود تھی تاکہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک سکے۔ صبح تک مسجد ایک میدان میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اگلے دن جب حالات میں انتہائی کشیدگی پیدا ہو گئی تو گورنر نے دو انگریز پولیس چھوٹی سے بلوا کر مسجد کے پاس منتقل کر دیں، آئندہ شب سکھ نے گورنر نافذ کر دیا اور اخبارات پر سنسر لگا دیا۔ تین دن تک کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔ اس دوران میں صبر اعزیز کے مکان پر مسلمانوں کے اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ حکومت نے سوچا کہ شاید معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ ایک فوجی پلیٹن واپس بھیج دی گئی۔ اور گورنر میں بھی نرمی کر دی گئی۔ اس دوران حکومت نے ایک چال یہ چلی کہ مسلمانوں کو شاہ چراغ کی عمارت دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ عمارت بھی کسی وقت مسجد ہو کر تھی۔ ۳۱ جولائی کو ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس سے مولانا غفر علی خاں نے خطاب کیا۔ انہوں نے شاہ چراغ کی عمارت کے بارے میں حکومت کے فیصلے کا غیر مقدم کیا۔ لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ مسلمان مسجد شہید گئے لے بغیر کبھی نہ ملیں گے اور اس مقصد کے لئے رسول نافرمانی کی تحریک چھوٹی جائے گی۔ حکومت نے فوری طور پر مولانا غفر علی خاں، ملک لال خاں، میاں فیروز الدین اور سید جہتیب کو گرفتار کر کے لاہور سے باہر بھیج دیا مسلمانوں نے گورنر کی پروا کئے بغیر جلوس نکالا۔ ۱۱ جولائی کو لاٹھی چارج کیا گیا۔ ۱۲ جولائی کو گورنر نے صوبائی مقننہ کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا گیا۔ ۱۹ جولائی کو بادشاہی مسجد

میں غریب مسجد کے بعد مولانا ظفر علی خان کے صاحبزادے اعظم علی خاں نے ایک تقریر کی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے شاہی مسجد سے نکل کر قادیان سے پہنچ گئے اور صبحی رات وہیں بیٹھ رہے۔ دوسرے دن پولیس نے زبردستی لاکھٹی چارج کیا اور پانی چھڑوایا۔ لیکن مسلمان کرتوالی تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ ان پر بار بار گولی چلائی گئی۔ اہل ہزاروں کو ہوائی گونگنار کر دیا گیا۔

## محمد علی جناح کی آمد

۲۰ فروری ۱۹۳۱ء کو محمد علی جناح لاہور پہنچ گئے۔ انہوں نے مسلمان رہنماؤں اور گورنر سے ملاقات کی۔ گورنر نے وعدہ کر چکا تھا کہ اگر مسلمان مولانا ظفر علی خان کی تحریک ختم کر دیں تو گرفتار شدہ لوگوں کو رہا کر دیا جائے۔ مسلمانوں نے محمد علی جناح کی نصیحت پر عمل کر کے ہوسے تحریک ختم کر دی اور تمام مسلمانوں کو رہا کر دیا گیا۔ انہوں نے سکھ رہنماؤں سے بھی ملاقات کی اور انہیں سمجھایا کہ مسلمان اور سکھوں کے درمیان اس قسم کا اختلاف دونوں میں کسی کے حق میں بھی اچھا نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں ملک کے لئے آزادی کی جدوجہد میں بھی مشکلات پیدا ہوں گی۔ سکھ رہنما محمد علی جناح کے انداز مصالحت سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ انہیں مسجد کا معائنہ کرانے کے لئے لے گئے۔ محمد علی جناح کو فوری طور پر اسی محل کرانے میں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے مسلمانوں اور سکھوں دونوں پر زور دیا کہ وہ پرامن اور آئینی طریقوں سے مصالحت کی کوشش کریں۔ محمد علی جناح کی ان کوششوں سے مسلمان ہندو اور سکھ اس حد تک متاثر ہوئے کہ انہوں نے محمد علی جناح کی اعلیٰ خدمات کو سراہنے کے لئے ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۳۱ء کو محمد علی جناح لاہور سے چلے گئے۔ لیکن بدلتے چلے آئندہ انہوں نے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں پر مشتمل ایک رضا کار کمیٹی قائم کر دی تاکہ وہاں بھی تباہ و برباد کے علاوہ کافر کوئی پرامن حل تلاش کر سکے۔ انہوں نے کمیٹی کو اپنے مختصراً تیار کردہ اصول کاغذی بھی دیا۔ یہ گورنر پنجاب سید محمد علی جناح کو بھیج دیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ مسلمانوں کے ساتھ سکھوں کے ساتھ بھی اسی طرح کے اصول بنائے جائیں۔ مسلمانوں نے اس پر آمین کہا۔ سکھوں نے بھی اس پر آمین کہا۔ سکھوں نے بھی اس پر آمین کہا۔ سکھوں نے بھی اس پر آمین کہا۔ سکھوں نے بھی اس پر آمین کہا۔

## جنّاح پر شاد بات چیت

جب مرکزی اسمبلی نے کیونل ایوارڈ کی منظوری کا فیصلہ کر لیا تو مجھ کو سونے بنی میں چار  
 محمد علی جناح اور کانگریس کے صدر راجندر پرشاد نے بات چیت کے لئے فضا جموں کی تھیں اس  
 بات چیت میں اس بنا پر تعقل پیدا ہوا کہ اگر ان دونوں میں مفاہمت کی کوئی صورت عمل بھی آئے تو  
 یہ راجندر پرشاد اس بات کی ذمہ داری قبول کریں گے کہ ہندو مہاسبھا بھی پابندی کرے گی؛ نیز  
 عقوں کا دباؤ عمل کیا ہوگا؛ لیکن راجندر پرشاد ان دونوں باتوں کی ذمہ داری نہ لے سکے۔  
 اسی دوران کانگریس نے یہ پراجیکٹ پوری شدت کے ساتھ شروع کر دیا کہ محمد علی جناح  
 و راجندر پرشاد کے درمیان مفاہمت ہو چکی تھی اور انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان  
 اتحاد کے لئے ایک فارمولا تیار کر لیا تھا۔ اور اب یہ فارمولا ناحیہ میں کے سامنے توثیق کے لئے پیش  
 ہونا تھا لیکن محمد علی جناح کی وجہ سے یہ بات چیت کامیاب نہ ہو سکی محمد علی جناح نے اس بات کو  
 بے بنیاد اور غیر ذمہ دارانہ قرار دیا۔

## صوبائی انتخابات ، کانگریسی حکومت

۱۹۳۶ء میں برطانوی پارلیمنٹ کی طرف سے منظور کئے جانے والے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت پہلے صوبائی انتخابات ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوئے۔ اس ایکٹ کے تحت کیپٹل ایوارڈ اور صوبائی خود مختاری دی گئی۔ گو یہ صوبائی خود مختاری محدود تھی جس کے تحت ہندوستان کے تمام صوبوں کا وفاق قائم ہونا تھا۔ بعض شرائط کے ساتھ اس وفاق میں ہندوستانی ریاستوں کو بھی شمولیت حاصل دیا گیا تھا۔ صوبوں میں ذمہ دار حکومت قائم ہونا تھی اور صوبائی گورنر، وزیروں کے مشوروں پر عمل کرنے کے پابند تھے۔ مگر چند معاملات میں گورنروں کو قانون کی رو سے وزیروں کے مشوروں کے برعکس عمل کرنے کا حق بھی حاصل تھا۔ صوبوں سے دو عمل ختم کر دی گئی، لیکن وفاقی مرکز میں اسے رائج کر دیا گیا۔

اس ایکٹ کے بارے میں مسلمانوں کی سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے آئین میں اس دفعات شامل نہ کی گئی تھیں اور اقلیتوں کا تحفظ صوبائی گورنر اور گورنر جنرل کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ ایکٹ ۱۹۳۵ء کی تفصیل کے لئے دیکھئے باب ۳۷-۱۹۳۶ء میں جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو غرضی نہی زنجیر قرار دیا۔ گو وہ اسے قطعی طور پر مسترد کر دینے کے حق میں تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے آئندہ صوبائی انتخابات میں، جو اسی آئین کے تحت ہونا تھے، کانگریس کے شمولیت کی مخالفت نہ کی۔ اور یہ نیا نعرہ لگا دیا کہ کانگریس صوبائی وزارتوں میں حصہ نہ لے



نے صوبائی حکومتوں میں کانگریس کی شمولیت کو ایک مہلک غلطی سے تعبیر کیا۔ ان کے خیال  
 بتوں میں کانگریس کی شمولیت کا مطلب برطانوی سامراج سے تعاون کے مترادف تھا۔ مگر  
 سے کانگریسی موقع کی ناک میں بیٹھے تھے اور اقتدار پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔  
 ۱۷ ایلو پر کانگریس نے ایک قرارداد کے ذریعے فیصلہ کیا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں میں اپنے  
 با اُمیدوار قوضور بھیجے گی لیکن ایکٹ سے تعاون کرنے کی غرض سے نہیں، بلکہ اس کے  
 مقصود ہونے اور اُسے ختم کرنے کے لئے اچھا نیک حکومتوں میں شرکت کا سوال تھا تو  
 انتخابات کے بعد تک کے لئے اٹھا رکھا گیا۔ کانگریس نے کمیونل ایوارڈ کی خدمت کی مگر ساتھ  
 خرچہ بھی لگایا کہ فرقہ وارانہ مسائل کے تسلی بخش حل کے لئے ہندوستان کے بڑے فرقوں کے  
 خیر گالی اور تعاون کے ذریعے ہی کام لیا جاسکتا ہے۔ بہر حال یہ کانگریس کا روایتی کھوکھلا  
 ناس لئے اجنبی محسوس نہ ہوا۔

## کانگریس اور انتخابات

انتخابات میں حصہ لینے کے لئے کانگریس پورے ہندوستان کے ساتھ میدان میں کود  
 اُس کے پیچھے مولے وٹے ہندو سیٹھوں کا سرمایہ تھا۔ کانگریس نے برطانیہ کے خلاف  
 داندھی کے لئے دوٹ کے جذباتی نعرے لگائے۔ حالانکہ گاندھی ۱۹۳۳ء میں کانگریس  
 عدم رکنیت سے الگ ہو چکے تھے۔ ہندو انہیں دیوتا اور مہاتما سمجھتا تھا۔ لہذا گاندھی  
 م پر ہندو سے دوٹ حاصل کرنا کانگریس کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی انتخابات میں کانگریس  
 ۴۴ فی صد نشستیں حاصل کیں مجموعی نشستیں ۵۸۵ تھیں، کانگریس کو ۱۱۷ ملیں (دہلی،  
 سی پی اور اڑیسہ کے پانچ صوبوں میں کانگریس کو واضح اکثریت حاصل رہی۔ بمبئی میں اُسے  
 نصف نشستیں اور آسام میں ۱۰۸ میں سے ۳۵ کانگریس کے پاس چلی گئیں۔ جہاں تک مسلم  
 توں کا تعلق تھا تو کل ۴۲۸ نشستوں میں کانگریس نے ۵۸ کے لئے مقابلہ کیا۔ اُسے صرف  
 ۱۱ ملیں۔ اور ان میں بھی زیادہ تر صوبہ سرحد میں تھیں کیونکہ وہاں سرخ پوشوں کے ساتھ کانگریس  
 دہر چکا تھا۔ بنگال، پنجاب اور سندھ کے مسلم اکثریتی صوبوں میں نشستوں کی مجموعی تعداد  
 تھی۔ ان میں سے صرف ۶۶ کانگریس کو ملیں ان میں اکثر ہندو نشستیں تھیں۔  
 مسلمانوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ ان کی متعدد مختلف سیاسی جماعتیں تھیں یعنی مسلم لیگ،

جمعیت العلماء ہند، مجلس احرار اسلام، اتحاد ملت، شیعہ کانفرنس، مومن کانفرنس، سرخ پوش،  
 یونیٹ پارٹی اور کرشک پر جا پارٹی وغیرہ۔ اسلام لیگ کے سوا ان میں ایک جماعت بھی ایسی نہ  
 تھی جس نے مسلمانوں کی قابل قدر خدمات سر انجام دی ہوں۔ خود مسلم لیگ میں بھی کافی افتراق  
 رہ چکا تھا۔ کچھ عرصہ قبل محمد علی جناح نے انگلستان سے واپسی پر اس کی قیادت سنبھالی تھی اور  
 اب تک اسے پوری طرح منظم نہ کر پائے تھے۔ جہاں تک صوبائی انتخابات کا سوال تھا تو اکثر  
 لوگوں کی کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح تمام دوسری مسلمان جماعتیں مسلم لیگ کے ساتھ مل جائیں  
 تاکہ انتخابات میں مسلمان نمایاں کامیابی حاصل کر سکیں۔ خود محمد علی جناح اس ضرورت کو شدت سے  
 محسوس کر رہے تھے۔ اس بار انتخابات جداگانہ طریق پر ہونا تھے لہذا قدرتی طور پر مسلمانوں میں  
 اتحاد کی شدید ضرورت تھی تاکہ وہ کامیابی کے بعد قدم بڑا کر اپنی منزل کی طرف ہمیشہ قدمی کر سکتے۔  
 اسی دوران اپریل ۱۹۳۶ء میں جمعیت العلماء کی طرف سے محمد علی جناح کو ایک جلسے میں تقریر  
 کرنے کی دعوت دی گئی۔ جس میں ہندوستان کے علماء شریک تھے۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے  
 کہا کہ ہندوستان میں پہلی بار ایک نمائندہ حکومت کا قیام عمل میں آنے والا تھا انہیں حقیقتاً یہ اکثریت  
 کی حکومت کا قیام تھا ان حالات میں اقلیتوں کا کیا بنے گا۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ اقتدار اور اختیار کا  
 نشہ اکثریت کو بدست بھی کر سکتا ہے لہذا ضروری تھا کہ جمہوری آئین میں اقلیتوں کے تحفظ کی  
 گنجائش رکھی جاتی۔ محمد علی جناح نے علماء سے اپیل کی کہ وہ عمومی مباحث میں اُلجھے بغیر متحد ہو جائیں  
 اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کمر بستہ ہو جائیں۔ وفاقی سکیم کے بارے میں انہوں نے کہا  
 ”جب تک ہمیں بہتر آئین دہل جاتے ہیں لڑنا ہو گا۔ ہم مسلمانوں کے غادات کو کسی قیمت  
 پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر اس وقت بھی جدوجہد نہ کی گئی تو ہمیں کوئی نہ پوچھے گا۔ ہماری  
 عزت اور ہمارا وقار ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ اپنے لوگوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے  
 کام کرنے میں آخر بڑی بات کیا ہے؟ ہندو اور مسلمان اس مقصد کے لئے الگ الگ  
 بھی منظم ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں وہ ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طریق پر سمجھ سکیں گے  
 اور پھر ان دونوں کے درمیان مفاہمت کے لئے کئی سال تک انتظار نہ کرنا پڑے گا۔  
 میں اپیل کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کے طنز کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ میں نہ کروڑ مسلمانوں  
 کی مدد کر رہا ہوں اور اگر وہ منظم ہو جائیں تو یہ تنظیم قومی جدوجہد کے لئے بیدار و زندہ ثابت  
 ہو سکے گی۔

## محمد علی جناح کی مساعی

محمد علی جناح نے مسلمانوں کے مستقبل کے لئے لاٹھر حمل مرتب کرنے کی غرض سے ۱۹۳۶ء میں کل ہند مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں طلب کیا۔ صدارت سید وزیر حسن نے کی کیونکہ مسلم لیگ گزٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۶ء کے وفاقی حصے کو قبول کرنے پر تیار نہ تھی لہذا اُس نے ہندوستان کے عوام پر ایک ایسا آئین ٹھرنے کی مذمت کی جو عوام کی خواہشات کے برعکس تھا۔ گو مسلم لیگ کو آئین کے صوبائی حصوں پر بھی مکمل اطمینان نہ تھا تاہم اُس نے حالات کے پیش نظر اسے قبول کر لیا۔ مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ انتخابات میں ایک جماعت کی حیثیت سے شرکت کرے گی راجہ غنصفر علی خاں کی پیش کردہ ایک قرارداد بھی اس ضمن میں منظور کی گئی۔ اس قرارداد کے ذریعہ محمد علی جناح کو اپنی صدارت میں کم از کم ۳۵ افراد پر مشتمل ایک مرکزی انتخابی بورڈ قائم کرنے کا اختیار دیا گیا۔

محمد علی جناح نے اس مقصد کے لئے ہندوستان کا طوفانی دورہ کیا اور مختلف صوبوں میں مختلف گروہوں کے رہنماؤں سے بات چیت کی۔ وہ چاہتے تھے کہ یا تو سب گروپ ایک پیٹ فارم پر جمع ہو جائیں یا مسلم لیگ کو اتنے فعال جماعت بنا دیا جائے کہ وہ دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر آزادی کے لئے جدوجہد کر سکے۔ انہوں نے ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ منظور کر دیا جس میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے نمائندے شامل تھے۔ اس بورڈ کا پہلا اجلاس ۸ جون ۱۹۳۶ء کو لاہور میں منعقد ہوا۔ متعدد ستوں میں مسلم لیگ کا انتخابی دستور منظور کر لیا گیا۔ جہاں تک صوبائی پارلیمانی بورڈوں کا تعلق تھا تو محمد علی جناح کی توجہ صوبائی مسئلہ پر مرکوز تھی۔ پنجاب میں سرفضل حسین کے مشورے سے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ جماعت بنی جو فینیسٹ پارٹی کہلائی۔ بنگال میں فضل الحق نے کرشک پر جاپارٹی بنائی ہوئی تھی اور اُن کے مقابلے میں خواجہ ناظم الدین تھے۔ ناظم الدین مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئے۔ سرحد میں خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خاں صاحب کانگریس کے حامی تھے۔

مسلم لیگ نے اپنے انتخابی منشور میں یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ تمام جاہلانہ قوانین منسوخ کرانے کی اور ملک میں جو اقتصادی لوٹ کھسوٹ ہو رہی ہے، اسے روکے گی۔ حکومت کے بے وجہ اخراجات میں تحقیق اور فوج کو قومی رنگ دیا جائے گا۔ صنعت کے لئے ترقی کے راستے کھولے

جائیں گے اور نئے و شرح مہار کا خیال رکھا جائے گا۔ ابتدائی تعلیم مفت ہوگی اور ذریعہ قرضوں کے جوہر کو کم کیا جائے گا۔ مسلمانوں کے مذہب، زبان اور ثقافت کی حفاظت کی جائے گی نیز ریلوے عام کو بیدار کیا جائے گا۔

محمد علی جناح تمام صوبوں میں مسلمانوں کے اتحاد کے لئے جو کوشش کر رہے تھے، انہیں اس میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مشکوٰۃ بنکال میں فضل الحق اس بنا پر ناسازش رہتے کہ مسلم لیگ کے انتخابی مشن میں زمینداری کے غلے اور ٹیکس عائد کئے بغیر مفت ابتدائی لازمی تعلیم کو شامل کیوں نہ کیا گیا۔ مسلم لیگ نے دونوں مطالبے منظور کر لئے تھے مگر وہ ٹیکس کے معاملے پر متفق نہ تھے۔ چنانچہ فضل الحق نے بنکال میں کرشمہ پر جا پا۔ ٹی قائم کر ل۔

پنجاب میں محمد علی جناح نے مسلمانوں کے اتحاد کے لئے بھرپور کوشش کی لیکن یہاں پر زمینداروں کا مل تھا۔ دوسرا طبقہ سرمایہ داروں کا غریبہ دونوں مل کر یونیٹ پارٹی بنا چکے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ پنجاب کے لوگوں میں جب بھی بیداری کی بے پیدا ہوتی تو یہی یونیٹ صوبے کے گورنر کے ساتھ مل کر ایسی ہر کوشش کو ناکام بنادیتے اس لئے کہ ان کے اپنے مفادات اسی صورت میں محفوظ رہ سکتے تھے۔ یہ روابطی طور پر ایک خوشامد پرست پارٹی تھی اسی پارٹی نے شہری اور دیہی علاقوں میں مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کی بھی بار بار کوشش کی۔ انتخابات کے وقت اس کی قیادت سرفضل حسین کے ہاتھ میں تھی۔ سرفضل حسین دائرے کو تسلیم کی رکینیت سے ریٹائر ہوئے تھے جو ان کا نہ انتخابات کے لئے سرٹوف کوشش کرتے رہے لیکن انتخابات کے وقت ان کے موقف میں اچانک تبدیلی ہو گئی اور انہوں نے بدلائے انتخابات کی مخالفت شروع کر دی۔ محمد علی جناح ان سے ملے اور اس بات پر زور دیا کہ اتحاد قائم کر کے مسلمان، پنجاب سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑیں اور پھر ان عناصر کے ساتھ مل کر وزارت بنائیں جو مسلم لیگ کے پروگرام سے ہم آہنگ ہوں۔ مگر سرفضل حسین کا کہنا یہ تھا کہ مسلمانوں کے پاس صوبائی اسمبلی میں صرف ۱۵ فیصد نشستیں تھیں لہذا جب تک انہیں کسی دوسری غیر مسلم جماعت کا تعاون حاصل نہ ہو، وزارت کی تشکیل مشکل ہوگی۔ فضل حسین اس سے پہلے ہی سر جھوٹورام کی مدد سے ایک مخلوط پارٹی بنا چکے تھے۔ گو محمد علی جناح بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے۔ مگر یہ چاہتے تھے کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون بھی کیا جائے لیکن نام مسلم لیگ کا ہو اور انتخاب اسی نام سے لڑے جائیں تاکہ مسلم لیگ اسمبلی میں اپنی بدلائے

یت کو قائم رکھ سکے۔ لیکن بفضل حسین نے محمد علی جناح کی منی بات کو تسلیم نہ کیا۔ یہی وجہ  
کہ انتخابات کے بعد جب صوبہ میں یونینسٹ وزارت بنی تو مسلمانوں کے مفادات کو شدید  
پریشانی۔ یونینسٹ پارٹی میں ہندو اور سکھ بھی موجود تھے اور ظاہر ہے کہ انہیں مسلمانوں کے  
مفادات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟

میر فضل حسین ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو وفات پا گئے۔ ان کی جگہ سر سکندر حیات خاں نے  
پنجاب سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صرف دو امیدوار، حاجہ خضفہ علی خاں اور ملک برکت علی  
پہلے ہوئے مگر اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر۔ کانگریس کے ٹکٹ پر صرف دو مسلمانوں کو  
بیابا حاصل ہوئی۔ تین چار مسلمان بطور آزاد امیدوار کامیاب ہو گئے۔ ان مسلمانوں اور ۲۲ ہندو  
نندار اور اچھوت ممبر یونینسٹ پارٹی کے ساتھ ہو گئے۔ جب سر سکندر حیات خاں نے کابینہ  
میل کی تو انہوں نے ملک خاں کی بات خاں کو اپنے ساتھ بلا لیا۔

سندھ اور سندھ میں بڑے مسلمان امیدوار کامیاب ہونے وہ بھی اپنے ذاتی اثر و  
بنا پر۔ مسلم لیگ کا کوئی امیدوار ان دونوں صوبوں میں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ صوبہ سندھ  
بن سر عبد القیوم نے فرمٹیر یونائیٹڈ پارٹی اور سندھ میں سر عبد اللہ باروی نے سندھ یونائیٹڈ  
رٹی قائم کر لی۔ ان دونوں جماعتوں نے غیر مسلم اقلیتی ممبروں کو ساتھ لے کر اپنی اسمبلیوں  
پس اکثریت حاصل کر کے وزارتیں بنالیں۔

جہاں تک ہندو اکثریت کے صوبوں میں انتخابات کے نتائج کا معاملہ تھا تو ان چار صوبوں  
لی اسمبلیوں میں کانگریس کو ٹھوس اکثریت حاصل ہو گئی۔ ساتویں صوبہ آسام میں بھی کانگریس سب  
سے بڑی پارٹی تھی (آزاد امیدواروں کے الحاق سے) جب کانگریس نے یہ دیکھا کہ اسے  
 واضح اکثریت حاصل ہو چکی ہے تو اس نے نیا راستہ اختیار کیا۔

کانگریس نے انتخابات کے فوراً بعد تمام کامیاب کانگریسی کارکنوں کا ایک کنونشن دلی  
میں طلب کیا اور تمام صوبوں کی اسمبلی پارٹیوں کو حکم دیا کہ وہ مرکز کی اجازت کے بغیر کسی پارٹی  
سے کوئی معاہدہ نہ کریں۔

## کانگریس کا نیا ہتھیار

کانگریس نے ایک طرف اپنی اسمبلی پارٹیوں کو پابند کر دیا اور دوسری طرف یہ کہہ دیا

کہ کانگریس چھ صدوں میں دجہاں اس کی اکثریت تقیٰ (خود وزارت بنائے گی نہ ہی وزارت  
بٹھے دے گی البتہ وزارت سازی نہ ہوتی اس صورت میں ممکن ہوگی کہ گورنر اپنے خاص اختیارات  
استعمال نہ کرنے کا وعدہ کریں۔

کانگریس نے تیسرا اقدام یہ کیا کہ تمام کامیاب مسلمان امیر و اربوں کو مسلم لیگ پارٹی کی  
وساطت سے با بحیثیت مجموعی، صوبائی کابینہ میں نمائندگی دینے سے بھی صاف انکار کر دیا۔  
اُس نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ صرف ایک پارٹی کی وزارت پر یقین رکھتی ہے حالانکہ بعد ازاں  
کانگریس نے صوبہ سرحد میں کانگریس پارٹی کو مخلوط وزارت بنانے کی اجازت دے دی۔  
اس اقدام سے کانگریس کا مقصد محض اتنا تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کو ختم کر دیا جائے۔ کانگریس  
نے ایک مہم چلانے کا فیصلہ کیا جس کا نام ”مسلم ہاس کنٹریکٹ“ رکھا گیا مقصد یہ تھا کہ مسلم تہذیب  
کو کانگریس میں مدغم کر دیا جائے۔ کانگریس کا تیسرا بڑا ہتھیار یہ تھا کہ اُس نے صاف  
الفاظ میں کہہ دیا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی، صرف کانگریس اور برطانوی سامراج کے درمیان  
ہے، ان دونوں کے علاوہ کسی تیسری پارٹی کا وجود نہیں۔ اس موقع پر کانگریس کے ناپاک ارادے  
کھل کر لوگوں کے سامنے آ گئے۔ کانگریس کے ایسے ہی اقدامات اور گھٹیا رویہ سے تنگ آ کر  
محمد علی جناح نے پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا۔

”میں کانگریس اور اپنے ہندو دوستوں کو انتباہ کرنا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو تنہا چھوڑ دیں  
ہم نے یہ بات واضح کر دی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی بھی گروپ یا گروپوں  
کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ ان گروپوں کا مزاج آزادانہ ہو اور وہ  
تنگ دلی سے کام نہ لیں نیز ہمارے اور ان کے پروگراموں میں خاص مشابہت پائی  
جاتی ہو ہم کسی جماعت کے حاشیہ بردار نہیں بننا چاہتے۔ پندت نہرو نے کلکتہ میں یہ  
کہا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو ہی فرقے ہیں۔ ایک کانگریس اور دوسرا برطانیہ، ان کے  
علاوہ کسی تیسرے فرقے کا وجود نہیں۔ میں نہرو کی اس بات کو تسلیم کرنے سے صاف انکار  
کرنا ہوں۔ ملک میں ایک تیسرا فرقہ بھی موجود ہے جس کا نام مسلمان ہے۔ کوئی جماعت  
یا کوئی اکثریت ہمیں حکم دینے یا اپنے حکم پر چلانے کی کوشش نہ کرے۔“

## یونینسٹ وزارت کا قیام

اپریل ۱۹۴۳ء میں یونینسٹ وزارت نے پنجاب میں عہدہ کا حلف اٹھا لیا اور اسی ماہ پنجاب اسمبلی کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ راجہ غصنفیر علی خاں یہ سوچ رہے تھے کہ کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جس کے ذریعہ پنجاب اسمبلی میں یونینسٹ پارٹی کی پارلیمانی قوت قائم رہے۔ اور اس کے تمام مسلم اراکین ایک تنظیم میں بھی شامل رہیں۔ خود فزیر علی سرسکندر جیٹا خان اسی قسم کے انتظام کے حق میں تھے۔ لاہور کے جلاوطنوں کے بعد پنجاب اسمبلی کا دورہ اجلاس شہر میں ہوا۔ اب یونینسٹ پارٹی کے بہت سے اراکین نے شہر سے محسوس کر رہے تھے کہ مسلم لیگ کے ساتھ مخالفت کی صورت پیدا ہو جائے۔ اسی دوران کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلافات واضح صورت اختیار کر گئے۔ لہذا سرسکندر جیٹا نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ ہو۔ جب مسلم لیگ نے اپنا اجلاس کھنجر میں منعقد کیا تو ان تمام یونینسٹ اراکین کو جو انتخاب سے پہلے مسلم لیگ کو تسلیم کرتے اور اپنی طور پر اس وقت تک ان کی حیثیت موجود تھی، کو بھی مسلم لیگ کی طرف سے دعوت نامہ روانہ کئے گئے۔ چنانچہ یہ سب لوگ اور خود سرسکندر جیٹا خان اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ کھنجر میں محمد علی جناح اور سرسکندر جیٹا خان میں بات چیت ہوئی اور مخالفت کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس صبح ۳ اکتوبر کو مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا۔ آئندہ روز مسلم لیگ کو نسل نے اس سمجھوتہ کی توثیق کر دی۔

## جناح سرسکندر پکیٹ

یہ سمجھوتہ جسے جناح سرسکندر پکیٹ کہتے ہیں۔ یہ تھا۔

۱۔ پنجاب واپس جانے کے بعد سرسکندر جیٹا یونینسٹ پارٹی کا خاص اجلاس طلب کریں گے اور ان تمام مسلمان اراکین کو جو مسلم لیگ کے رکن نہیں، مسلم لیگ میں شامل ہونے کا مشورہ دیں گے۔ اس صورت میں وہ کل ہند مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی پارلیمانی بورڈوں کے قواعد و ضوابط کے پابند ہوں گے۔ اس انتظام کے بعد عام یا ضمنی انتخابات میں یونینسٹ کمیشن میں شامل نہ ہوں گے۔ ایسے تمام امیدواروں کی حمایت کریں گے، جو اس گروپ کی طرف سے کھڑے کئے گئے ہوں۔

مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے یا اس ٹکٹ کو قبول کرنے والے مسلمان اراکین اسمبلی، اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کے رکن شمار ہوں گے اس طریق پر مسلم لیگ کی جو پارٹی پیدا ہوگی اسے مسلم لیگ کے جو بنیادی اصولوں اور اس کی پالیسی کی بنیاد پر کسی دوسری پارٹی کے ساتھ سمجھوتہ یا اس کی تائید کا حق حاصل ہوگا۔ ضروری نہیں کہ یہ اقدام انتخاب کے موقع ہی پر ہو بلکہ انتخاب سے پہلے بھی ممکن ہوگا۔ انتخاب کے بعد قائم شدہ اتحاد، اپنا نام، یونیٹ پارٹی ہی رکھے گا نئے انتظام کے تحت صوبائی پارلیمانی بورڈ پھر سے مرتب کیا جائے گا۔

اس سمجھوتہ کا لب لباب یہ تھا کہ یونیٹ پارٹی مسلم لیگ کے اراکین اور غیر مسلم اراکین کا ایک اتحاد تھا۔ کہ یونیٹ پارٹی ایک علیحدہ جماعت تھی تاہم اندرونی اتحاد کی خاطر یونیٹ پارٹی کو اپنا نام قائم رکھنے اور ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت میں آئندہ عام یا معنی انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔ محمد علی جناح نے صوبائی مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لئے ایک تنظیمی کمیٹی قائم کر دی۔ جس میں اکثریت سرسکندر کی پارٹی کی تھی، وہی اس کمیٹی کے صدر بنے۔

اس اتحاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان، مختلف گروہوں سے وابستہ رہے باوجود سنی، ہر گز مسلم قومیت اور مسلم اتحاد کا کیا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ یہ پہلو مرقع خدانہ سبک جب تک مسلمانوں کی واحد مسئلہ اور طریقہ زندگی نہ رہتی۔ جبکہ وہ جس نے صحت مان کا جائزہ لیا تو اسے اپنا تختہ الٹنا نظر آیا۔ فریبی طور پر نہ وہ اور گاندھی نے مجموعی جنات سے غلط و گناہت کا آغاز کر دیا۔ تدریجاً بات چیت نہ ہو سکی۔ تو غلط و گناہت شائع کر دی گئی۔ ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ کانگریس مسلم لیگ کے مسلمانوں کی نمائندہ اور کانگریس کو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ جبکہ محمد علی جناح کی بنیادی شرط یہ تھی کہ اس نمائندگی کو تسلیم لیا جائے۔ کانگریس کو تمام ہندوستانی باشندوں کی نمائندگی کا دعویٰ تھا۔

## محمد علی جناح سے قائد اعظم

اپریل ۱۹۳۳ء میں مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اسی سال دسمبر میں اس کا سالانہ اجلاس ٹپنہ میں۔ ان دونوں کی صدارت محمد علی جناح نے کی۔ گو اس سے پہلے نئے آئین کے وفاقی حصہ کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے گورنر جنرل کے خصوصی اختیار پر کی بنیاد پر مسترد کر دیا تھا لیکن ٹپنہ کے اجلاس میں محمد علی جناح نے اس وفاقی نظام کو ایک نئی



بنیاد پر مستر دیکھا۔ بنیاد یہ تھی۔ کہ اس نئے نظام کے تحت ہندوؤں کے ہاتھ میں جو اقتدار کرنے والا تھا، وہ ہندوستان میں ہندو حکومت کے مترادف تھا۔

اسی سال محمد علی جناح مرکزی اسمبلی میں اپنی ”آزاد پارٹی“ ختم کر کے مسلم لیگ پارٹی بنا چکے تھے۔ مسلم لیگ کی جو نئی پارٹی بنی تھی۔ اس کی قیادت بھی انہی کے ہاتھ میں تھی۔ پارٹی کے نائب قائد سید غلام بھیک نیرنگت تھے۔ جہان نگر مرکزی اسمبلی میں مرگرمیوں کا تعلق تھا تو محمد علی جناح مسلسل اس بات پر اصرار کرتے رہے۔ کہ وفاقی سکیم کی جگہ مرکز کو نئی صورت دی جائے۔ مسلمانوں کے مطالبات کے پیش نظر ایسی کوئی نئی سکیم منظور نہ کی جائے جس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہو اور کانگریس کے وزارت میں صوبوں میں اور کچھ بن۔ وریاستوں میں مسلمانوں پر جو زیادتی ہو رہی ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔

انہی دنوں کیمبرج یونیورسٹی کے ایک پنجابی طالب علم چوہدری رحمت علی کی تجویز ”پاکستان“ ایک بار پھر مسلمان عوام اور اخبارات کی توجہ کا مرکز بنی۔ اس تجویز کے تحت ہندوستان کے لئے کوئی وفاقی نظام یا الحاق نہ تھا۔ بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو مختلف آزاد ریاستوں کا تصور پیش کیا گیا۔

پٹنہ کے سالانہ اجلاس مسلم لیگ میں سے محمد علی جناح۔ قائد اعظم کے نام سے یاد کرتے جاتے تھے۔ اس اجلاس میں ”قائد اعظم“ زندہ باد“ کا نعرہ پہلی بار مسلم لیگ کے ایک گرم جوش کارکن فیروز الدین احمد نے لگایا۔ پھر اس لقب کو ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے اپنا لیا۔

## تصویر کا دوسرا رخ

۱۹۳۶ء کے انتخابات کے بعد گوانگریسی رہنماؤں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ وہ کہیں بھی مخلوط وزارتیں نہیں بنائیں گے۔ انہوں نے گورنروں کو بھی واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر وہ اپنے خاص اختیارات استعمال نہ کرنے کا وعدہ کریں۔ تو کانگریس وزارت سازی پر سحر کر سکے گی۔ لیکن اس کے باوجود کانگریس کی زبردست خواہش تھی کہ وہ وزارتیں بنائے۔ اس خواہش کو وہ زیادہ دیر تک چھپانہ سکی۔ ۲۲ جون ۱۹۳۶ء کو وائسرائے ہند لارڈ لینتھگرو نے ایک بیان جاری کیا جو خاصا مبہم تھا۔ اس بیان میں محض اخلاقی اعتبار سے یہ کہا گیا تھا۔ کہ گورنر بلاوجہ اپنے اختیارات استعمال نہ کریں گے۔ تاہم اس کی کوئی آئینی بنیاد نہ تھی۔ نمایاں کانگریسی رہنما اور یو۔ پی کانگریس

کیٹی کے قائد ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی نے اس بیان کے بارے میں اپنے ردِ عمل کا اظہار یوں کیا۔  
 ”ہمیں نہایت فرائض کے ساتھ اپنی شکست کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ برطانیہ کی سیاسی  
 چال ہم پر مکمل غلبہ حاصل کر چکی ہے۔ کیونکہ وہ جی کانگریس جو عوام میں انقلابی رجحانات  
 پیدا کرنا چاہتی تھی، اب حکومت برطانیہ کی دوست بن چکی ہے۔“

کانگریس نے دائرِ صلح کے بیان کا سہارا لیتے ہوئے اپنا تمام پروگرام اور تمام دھمکیاں  
 بالائے طاقت رکھیں اور یو۔ پی، بھارت، اٹلی، سی۔ پی، بھارت اور مدراس میں وزارتیں قائم کر لیں۔  
 لیکن ابھی کانگریس کے سامنے ایک اور نہایت مشکل مرحلہ تھا۔ وہ یہ کہ کانگریس پورے ہندوستان  
 کے تمام لوگوں کی نمائندگی کی دعوے دار اور مسلم لیگ کے اس موقف کو کسی قیمت پر تسلیم کرنے پر  
 آمادہ نہ تھی۔ لہذا کانگریس کے لئے اپنے دعوے کے ثبوت میں چھ صوبوں میں جہاں اسے وزارت  
 بنانا تھی، وزارتوں میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو شامل کرنا ضروری ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی مسئلہ یہ  
 بھی تھا کہ ان چھ صوبوں میں سے ۴ میں کانگریس کے ٹکٹ پر کوئی مسلمان کامیاب نہ ہو سکا تھا۔  
 اور باقی تین صوبوں میں محدودے چند مسلمان کامیاب ہوئے تھے۔ چنانچہ اب کانگریس کے لئے  
 اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے مسلمانوں کو رشرت  
 دے کر اپنی طرف کھینچے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ اُسے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے  
 اب کانگریس کی پوری طاقت مسلمانوں کو دینے پر مرکوز ہو گئی۔ سی۔ پی، بھارت، بھارت اور مدراس  
 میں کانگریس نے مسلم لیگیوں یا آزاد مسلمان اراکین اسمبلی کو وزارتوں کی رشوت پسندی اور اس  
 کے عوض انہیں ایک معاہدہ پر دستخط کرنے کو کہا۔ بالخصوص یو۔ پی میں مسلم لیگ پارٹی کو کانگریس  
 میں مدغم کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ کانگریس کا خیال یہ تھا کہ اس طرح اگلے یا مسلم لیگ  
 کو کاری ضرب پہنچائی جاسکتی ہے۔ حالانکہ کانگریس یہ سیدھا سادہ طریقہ بھی استعمال کر سکتی تھی،  
 کہ براہِ راست مسلم لیگ کے ساتھ گفت و شنید کرے اور مخلوط وزارت بنالیتی۔ لیکن اُس نے  
 مسلم لیگ کے اراکین اسمبلی کو انفرادی حیثیت میں اپنے ساتھ جانے کی کوشش کی۔ ابوالکلام آزاد  
 نے اپنی کتاب میں بھی یہ تاثر دیا کہ یو۔ پی میں کسی پالیسی کے تحت یا کسی اصول کی بنا پر مسلمانوں کو  
 کانگریس وزارت میں شامل کرنا مقصود نہ تھا۔ بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ ایک یا دو مسلمانوں کو وزارت  
 میں ضرور شامل کر لیا جائے۔

کانگریس کے لئے مشکل یہ تھی کہ یو۔ پی سے کانگریس ٹکٹ پر کوئی مسلمان کامیاب نہ ہو سکا تھا

ایک مسلم لیگی امیدوار تھا مگر صفر علی خان ضلع بھڑاچھ سے کامیاب ہوئے۔ اور وہ بھی وفات پا گیا۔  
 ظاہر ہے کہ مسلم لیگ یہاں سے دوبارہ اپنا امیدوار منتخب کرا سکتی تھی۔ مگر ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ  
 نے اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا لہذا کانگریسی رہنما رفیع احمد قدوائی اس حلقہ سے بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔  
 قدوائی کو اس انتخاب میں چوہدری ضلیق الزماں کی حمایت حاصل ہو گئی۔ مگر کانگریس کی مشکل اپنے  
 موجودہ رکن۔ ابوالکلام آزاد نے یہ۔ پی مسلم لیگ پارٹی کے قائد چوہدری ضلیق الزماں سے سلسلہ جہد  
 کی۔ اس بات حقیقت کا مقصد صرف اتنا تھا۔ کہ مسلم لیگ کے اراکین کو شہرت کے ذریعہ کانگریس  
 واپس میں سمیٹ لیا جائے۔ آزاد کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور ایک مسلم لیگی محافظ محمد ابراہیم  
 مسلم لیگ کے ساتھ غداری کے انعام میں وزارت کی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ کچھ دوسرے مسلم لیگیوں کو  
 ورغلا کر پارلیمانی سیکریٹریوں کے عہدے دے دیئے گئے۔ محمد علی جناح نے اس معاملہ کا سختی  
 ساتھ نوٹس لیا اور کانگریس کے ان اوجھے ہتھکنڈوں کی شدید مذمت کی۔ انہوں نے صاف طور پر  
 کہ کانگریس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار پیدا کرے۔ لیکن مجھے یقین  
 ہے کہ یہ۔ پی کے مسلمان ہندوستان کے مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے۔ چند افراد  
 مسلم لیگ کا ساتھ چھوڑ کر کانگریس کی انگلی پکڑ سکتے ہیں لیکن انہیں یہ بھونچا ہٹے۔ کہ ان کا  
 انفرادی اقدام اس امر کا آئینہ دار نہیں کہ تمام مسلمان بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی نکلیں گے۔  
 جہاں تک یہ۔ پی کے ان مسلم لیگی رہنماؤں کی طرف سے وفاداریاں تبدیل کر کے کانگریس  
 کے ساتھ رشتہ جوڑنے کا تعلق تھا۔ تو محمد علی جناح نے اس سلسلہ میں مسلم لیگ پارٹی کے قائد چوہدری  
 ضلیق الزماں سے اصل حالات معلوم کرنے کے لئے بار بار خط لکھے۔ لیکن چوہدری صاحب  
 وعدہ کے باوجود کوئی جواب نہ دیا۔

## شرط وفاداری

- یہ۔ پی اسمبلی کے مسلمان اراکین کو کانگریس میں شامل کرنے کے لئے جو معاہدہ کیا گیا وہ!!  
 آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو نے ترتیب دیا تھا۔ اس کی شرائط حسب ذیل تھیں۔
- ۱۔ یہ۔ پی اسمبلی میں مسلم لیگی گروپ ایک علیحدہ گروپ کی حیثیت نہ رکھے گا۔
  - ۲۔ یہ۔ پی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے اراکین کانگریس پارٹی کے اراکین سمجھے جائیں گے۔
- کانگریس کے جزو تصور ہوں گے۔ وہ کانگریس کی تنظیم اور اس کے کنٹرول کے پابند رہیں۔

کانگریس اسمبلی میں اپنے اراکین کے کردار کے بارے میں جو بھی فیصلہ کرے گی، یہ ممبر بھی ان کی مکمل اعانت کریں گے۔ تمام امور راستہ وہی کے ذریعے پائیں گے۔ اور ہر رکھ کا ایک ۱۰۰ روپے ہو گا۔

۳۔ کانگریس کی مجلس عاملہ اسمبلی میں اپنے اراکین کے لئے جو پالیسی وضع کرے گی، تمام کانگریسی اور وہ رکھ جو کانگریس میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس پالیسی کی پوری پابندی کریں گے۔ ۴۔ ریڈی میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ ختم کر دیا جائے گا اور کسی معنی انتخاب میں بورڈ کی طرف سے کسی امیدوار کا نام تجویز نہیں کیا جائے گا۔ پارٹی کے تمام اراکین ایسے ہر امیدوار کی بھرپور حمایت کریں گے۔ جسے کانگریس نامزد کرے۔

۵۔ کانگریس کے تمام اراکین کانگریس کے قواعد و ضوابط کی مکمل پابندی اور کانگریس کے مفادات اور وقار میں اضافہ کرنے کے لئے ہر ممکن تعاون کریں گے۔

۶۔ اگر کانگریس، وزارت یا اسمبلی کی کیت سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرے تو سب لوگ اس فیصلہ کے پابند ہوں گے۔

اس کے بعد پنڈت جواہر لعل نہرو نے ایک نئی چال چلی جس کے بارے میں خود ابوالکلام آزاد نے لکھا، کہ جب وہ اتحاد پانچنے کو معلوم ہوا کہ جواہر لعل نہرو نے جو، جی خلیق الزمان اور نواب محمد اسطیع خان کو مطلع کیا کہ ان دونوں میں سے صرف ایک کو وزارت میں شامل کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ کون وزارت میں شامل ہو، مسلم لیگ پارٹی کر سکتی ہے۔

لیکن مقامی حالات ایسے تھے کہ ان دونوں میں سے صرف ایک کسی صورت بھی حکومت میں شامل نہ ہو سکتا تھا۔ لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ ان دونوں نے جواہر لعل نہرو سے معذرت کر دی۔ پنڈت نہرو کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح فیصلہ میں غلط کرنے کے بعد مسلم لیگ پارٹی کی من حیث الجماعت وزارت میں شمولیت کا پراپیگنڈہ کیا جاسکے اور یہ تاثر دیا جاسکے کہ مسلم لیگ کانگریس میں منہم ہر چکی ہے۔ مگر جواہر لعل نہرو کا یہی اقدام ریڈی میں مسلم لیگ کی حیات نو کا پیغام لے کر آیا۔ محمد علی جناح نے حالات پر غور کرنے کے بعد موقع سے فائدہ اٹھایا اور مسلسل ایسے اقدامات کئے جو پاکستان کی تشکیل کی طرف رہنمائی کر رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ پنڈت نہرو کا مقصد مسلمانوں کو اپنے ساتھ شامل کرنا نہ تھا۔ بلکہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو ختم کرنا تھا۔ اگر اس موقع پر قائد اعظم فوری طور پر مداخلت نہ کرتے

تر مسلم لیگ کو کل ہند سطح پر باعزم اور یوں بی میں بالخصوص انتہائی نقصان کا سامنا کرنا پڑتا۔  
 کچھ ایسی ہی حرکت کا نگوس نے بمبئی میں کی۔ اس سبب حرکت کا حال معروف ہندو دنیا  
 کا نجی دواکار اس کی زبانی یہ ہے ”بمبئی کے نامزد وزیر اعلیٰ نے وزارت بنانے سے پہلے قائد اعظم  
 سے درخواست کی کہ وہ دو مسلم لیگی اراکین اسمبلی کو وزارت میں شریعت کی اجازت دیں۔ قائد اعظم  
 نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ یہ یقینی بھی دلایا کہ وہ کانگریس وزارت کے ساتھ مستقل تعاون کریں گے  
 لیکن پھر یہ کہ سرورار پیٹل، نامزد وزیر اعلیٰ کی اس حرکت پر سخت ناراض ہوئے کہ اس نے قائد اعظم  
 سے ملاقات کیوں کی۔ چنانچہ ساتھ ہی یہ مطالبہ کر دیا گیا کہ جو مسلم لیگی وزارت میں لے جائیں گے۔  
 انہیں پہلے مسلم لیگ سے استعفا دینا پڑے گا۔ اس کے بعد انہیں کانگریس کا رکن بننا پڑے گا۔  
 پھر انہیں وزارتوں میں شامل کیا جائے گا۔ محمد علی جناح نے اس شرط کو ٹھکرا دیا۔ اگر کانگریس سیاسی  
 تدبیر سے کام لیتی اور اس قسم کی سبب بنیاد شراکتہ عائد نہ کرتی۔ تو ملک کبھی دو حصوں میں تقسیم نہ ہوتا۔  
 اسی سلسلہ میں ایک اور ہندو شروع ڈاکٹر محمد آرنے لکھا۔

”اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ کانگریس رہنماؤں کا یہ فیصلہ انتہائی بدانتہاد  
 اور بے گینے نتائج کا حامل تھا۔ اسی فیصلہ کی بنا پر مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ ایک ہندو قوم  
 کی حیثیت میں ان کا سیاسی مستقبل بنیاد کے اختوں میں کبھی بدوش نہیں رہے گا۔ کانگریس  
 نے جو اقدام کیا، اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے ایک سنگ: اسٹون کا عین کردیا  
 اور اسی وجہ سے پاکستان کی بنیاد پڑی۔“

## کانگریسی حکومت، مسلمانوں کے مصائب

۱۔ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوتے ہی مسلمانوں کے لئے لا تعداد مصائب پیدا ہو گئے  
 یہ تمام صوبے ہندو راج کی منہ بولتی تصویر بن گئے۔ کانگریسی ہندوؤں نے مسلمانوں کے بارے میں  
 جو پالیسی اختیار کی وہ انتہائی غیر منصفانہ اور متعصبانہ تھی۔ وزارتیں قائم ہونے کے فوراً بعد ہندوؤں  
 نے عین نماز کے وقت مساجد کے آگے سنگھ اور باجہ بجانے شروع کر دیئے۔ محرم کے جلوس میں  
 پٹنے چھوڑ کر تمام انعام اہل سنت کے سر منڈ کر سنی شیعہ فساد پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن  
 مسلمان ہندوؤں کی اس پالیسی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ لہذا وہ آپس میں کبھی بدوا زمانہ نہ ہوتے۔  
 کانگریس نے تمام سرکاری عمارات پر ترنگا جھنڈا لہرا دیا۔ اور قیام سکون میں ہندوے ماترم کا ترنگا

۱۵۷۱ قرار دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی گائے کے ذبیحہ پر پابندی عائد کر دی۔ مسلمان اداروں سکولوں اور کالجوں پر ترنگا بھنڈا لہرانا ضروری قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی ان اداروں میں گائے کی نقادیر آویزاں کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور اس تصویر کو ہندوؤں کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر پر نام کرنے پر بھی مجبور کیا گیا

قدرتی طور پر ان تمام باتوں کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف نفرت پلنے لگی۔ اس بارے میں سر کوپلینڈ نے اپنی کتاب میں لکھا۔

”جس صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں وہاں فرقہ وارانہ فسادات اور لوٹ مار عام ہو چکے تھے۔ جب ۱۹۳۹ء میں کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیے تو اس وقت تک ان صوبوں میں ۵ فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے اور ڈیڑھ سو سے زائد افراد ہلاک ہوئے تھے۔ یہ اعداد و شمار یہ ہیں۔ جبکہ غیر سرکاری تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اگر کانگریسی حکومت کچھ عرصہ بددقت قائم رہتی تو شاید قانون کا احترام ہی ختم ہو جاتا۔“

ان صوبوں میں نہتے مسلمانوں پر ہندو مہاسیما اور کانگریسی خنڈوں نے لا تعداد مظالم ڈھائے تھے۔ کانگریسی حکومتوں نے ایسے عناصر کے خلاف کارروائی کرنے کی جگہ مسلمانوں ہی پر گولیاں برسائی اور انہی کو جیلوں میں کھولس دیا۔ دور دراز دیہی علاقوں میں مسلمانوں کی حالت قابل رحم تھی۔ انہیں پودے ہندو بنا لیا جاتا۔ تمام صوبوں میں عید کے موقع پر بھی گائے کی قربانی کی اجازت نہ تھی۔ حتیٰ کہ نہت سب جگہوں پر اذان بھی ممنوع قرار دے دی گئی۔ بہت سی مساجد کو شبیدہ کر دیا گیا۔ اور مسلمانوں کو مذہبی جلوس نکالنے کی ممانعت بھی کر دی گئی۔ جہاں تک انتظامیہ کا تعلق تھا۔ تو وہ چھوٹے چھوٹے کانگریسی رہنماؤں کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتی تھی۔ اور بڑے بڑے افسر معمولی سے کانگریسی رہنما کے دباؤ میں رہتے تھے۔ اگر وہ کسی مرشد پر کسی کانگریسی رہنما کی بات ماننے سے انکار کر دیتے تو ٹیلیفون پر ان کے تباہ کن حکم مل جاتا۔ بہت سے کانگریسی عدالت کے فیصلوں میں ہم عدالت کرتے۔ اور وزارتیں عدالتوں کے فیصلوں کو نظر انداز کرتی تھیں۔

ہندو وزیروں کے تعصب کا عالم یہ تھا کہ ایک باریسی۔ جی کے ایک مریض چند برسوں میں ایک بدنام شخص جگ دیو نے ایک جلوس نکالا، مسلمانوں کے خلاف نعرے لگائے۔ اور مسمرہ سامنے باجے بھائے۔ اس علاقہ کی تھڑی سی مسلمان آبادی سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ اور فساد ہوگا اسی فساد میں جگ دیو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ چند گھنٹوں بعد سی۔ پی کے وزیر اعلیٰ شکلا موقع پر پہنچے۔

انہوں نے نہ صرف مسلمانوں پر ہندوؤں کے خلاف سازش کا الزام لگایا۔ بلکہ انہی کے حکم کے تحت اس موضع کے ۵۵ مسلمان (موضع کی مجموعی مسلمان آبادی) گرفتار کر لئے گئے ان سب کو ہائی کورٹی میں ایک پھوٹے سے کمرہ میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں سیشن جج کلارک نے یہ کہا: ”برطانوی سلطنت میں نازی جرمنی کا یہ نظارہ دیکھنے میں آیا۔“ بعد ازاں ۱۱ افراد کو رہا کر دیا گیا۔ اور ۳۴ پر مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ کے دوران مصافی کا ایک بھی گواہ موجود نہ تھا۔ ان میں سے ۶ کو برائے موت اور ۳ کو سمر قید دی گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس فیصلہ سے انتہائی اشتعال پیدا ہو گیا۔ چونکہ قائد اعظم نے بھیجی کے ایک ممتاز قانون دان سوم جی کو ہائی کورٹ میں لہیل دائر کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اس مسئلہ میں چیف جسٹس سرگیل برڈسٹون اور مسٹر جسٹس ویان بوس نے استغاثہ کی کہانی کے بارے میں کہا۔

۱۔ کتنی تکلیف دہ بات ہے۔ کہ ۳۴ افراد انتہائی بھیاں بک جوم کے الزام میں ہماری سامنے کھڑے ہیں۔ شہادتوں پر شہادتیں ہو رہی ہیں۔ جو جھوٹ پر مبنی ہیں۔ یا پولیس کے می گھڑت قلعے ہیں۔

۲۔ یہ عدالت سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتی لیکن اس موقع پر سیاست کو درمیان میں لانے بغیر گزارہ بھی نہیں۔

۳۔ اسمبلی میں ایک تحریک التنا پر بحث کے دوران اراکین اسمبلی میں بار بار قتل کا لفظ استعمال کیا۔ حتیٰ کہ خود وزیراعلیٰ شکوے بھی یہی لفظ انتخاب کیا۔ قتل کے لفظ کے استعمال کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ جرم کے ارتکاب کے بارے میں پُر یقین تھے۔ اور یہ ظاہر کر رہے تھے۔ کہ یہ سب کچھ ایک منصوبہ کے تحت کیا گیا۔

۴۔ پولیس نے جو شہادتیں پیش کیں وہ اس حد تک بے بنیاد ہیں۔ اور گواہوں کو اس حد تک پڑھایا گیا ہے۔ کہ اتنے گواہوں کی موجودگی کے باوجود ہر بیان مختلف ہے۔ اور جو بیان یہ ثابت کرنے کے لئے دائر کئے گئے کہ ہر شخص مجرم ہے، اس حد تک مسخ ہو چکے ہیں کہ کوئی شخص بھی مجرم نظر نہیں آتا۔

۵۔ اور یہ کتنے ظلم کی بات ہے۔ کہ ۱۱۴۵ افراد کو گرفتار کیا گیا۔ اور ۲ فٹ ۲۰ فٹ طریقہ و عرض کرے میں انہیں رات بھر جبراً رکھا گیا۔

جن وقت یہ لوگ جیلوں میں تھے۔ تو ان کی سماعتوں اور بیچوں کو شدید افیت پہنچائی گئی۔

ہندوؤں نے ان کا اقتصادی بایکٹ کر دیا۔ اور پڑوس کے مراعات کے مسلمانوں کو ان کی مدد کے لئے آنا پڑا۔

یہ بی بی ایک موقع ناٹا میں مسلمان پارچہ باؤں کی خاصی تعداد موجود تھی اور ان میں اکثر کانگریسی تھے۔ ۲۱ اگست ۱۹۴۷ء کو ان مسلمانوں پر اس لئے فائرنگ کی گئی کہ انہوں نے مسجد کے سامنے ہندوؤں کو باجہا کھانے سے روکا تھا۔

بہار کے موضع تکلوری میں بھی یہی کچھ ہوا۔ کچھ مسلمانوں نے ایک لڑکی کی شادی بچکے موقع پر گائے کا گوشت خریدا۔ ہندوؤں نے یہ الزام لگایا کہ اُس نے ایک ہندو کی گائے ذبح کی ہے ہندوؤں نے ان مسلمانوں اور بارائیوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں گردنوں سے جکڑ دیا گیا۔ اور پھر ان کے منہ میں زبردستی سوز کا گوشت ٹھونس گیا۔ اس کے بعد ہندو گھوڑوں میں داخل ہو گئے۔ اور انہوں نے مسلمان عورتوں کے کپڑے فوج ڈلے اور ان کی آبروریزی کی۔ جب یہ مقدمہ سماعت کے لئے پیش ہوا۔ تو عدالت نے بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کہ مسلمانوں کو سوز کا گوشت کھلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ عدالت نے یہ بھی فیصلہ دیا کہ ہندو مسلمانوں کو ۲۰۰ روپے ہرجانہ دیں۔ اس مقدمہ میں جو ۳۴ ہندو ملزم تھے۔ انہیں ایک کانگریسی پارلیمانی سیکریٹری کے گھر میں رکھا گیا۔ ان میں کچھ کو سزائیں دی گئیں۔ لیکن جب ان ہندوؤں نے سیشن کورٹ میں اپیل کی تو عدالت نے ان کی سزاؤں کو حیران کن حد تک کم قرار دیا۔

## حاشیہ برداروں سے سلوک

سی۔ پی۔ اسمبلی کے ایک رکن یوسف شریف مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے اور پھر کانگرس میں چلے گئے۔ جہاں انہیں وزیر قانون مقرر کر دیا گیا۔ انہیں دنوں عدالت نے دو ہندوؤں اور دو مسلمانوں کو ایک لڑکی پر مجرمانہ حملہ کے الزام میں مختلف سزائیں دیں۔ ملزموں نے حکومت سے رحم کی اپیل کی۔ یوسف شریف نے لڑکی کے مشکوک چال چلن کے پیش نظر سزاؤں میں تخفیف کر دی مگر ہندوؤں نے اس فیصلہ کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ کیونکہ لڑکی ہندو تھی۔ کانگرس ہائی کمان نے ہائی کورٹ کے ایک ریٹرنڈ جج سرمان مستفانہ کرجی کو تحقیقات پر مامور کیا۔ انہوں نے فیصلہ دیا کہ یوسف شریف نے اپنے امتیازات سے تجاوز کیا۔ نہ ہی کسی بددیانتی یا فرقہ واریت سے کام لیا۔ لیکن ان سے فیصلہ کرنے میں جو تھوڑی بہت غلطی ہوئی۔ اس کے تحت اس بات کا کوئی حوالہ



نہیں کہ انہیں وزارت سے ہٹا دیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود کانگریس ہائی کمان کے حکم کے تحت یوسف شریف کو وزارت سے استعفیٰ دینا پڑا۔

یوسف شریف کی جگہ ایک ہندو جنتا کو وزیر قانون بنایا گیا۔ انہی دنوں ایک ہندو کونسیشن کورٹ عدالت اسلام میں منرائے موت کا حکم دیا گیا کہ اس نے ایک مسلمان لڑکی کو زہر کھانے پر مجبور کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ طرم کی اپیل ہائی کورٹ سے بھی مسترد ہو چکی تھی۔ رحیم کی اپیل ہوئی۔ تو جنتا نے دزم کو راکرنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا، بار ایسوسی ایشن، جس میں ہندو ہیک وکیل شامل تھے، نے بھی احتجاج کیا، مگر کانگریس ہائی کمان نے تحقیقات کرانے کا مطالبہ مسترد کر دیا۔

غرض کہ مسلمانوں پر ظلم و ستم اور تشدد کے لائق واقعات کانگریس کے ”ہندو راج“ کے دوران عظیم کارناموں کی صورت میں موجود ہیں۔ اس تمام عرصہ میں کانگریس نے مسلمانوں کو دبانے اور ان سے غیر منصفانہ سلوک کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

## داردھاسیکیم

کانگریس نے اس دور میں تعلیمی میدان میں بھی کچھ ایسی چالوں سے کام لیا کہ جس کے ذریعہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو اپنی ثقافت سے بے بہرہ کیا جاسکتا تھا۔ داردھاسیکیم گاندھی کی رہنمائی میں ہامہ قیہ دتی کے پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین نے تیار کی تھی۔ ہندو یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے مخصوص فکر اور عمل سے دور کر دیا جائے۔ اس سکیم کی بنیاد دو چیزوں پر تھی۔ یعنی ایک تو اہنسا اور دوسری علاقائی وطنیت۔ اور یہ دونوں مسلمانوں کے بنیادی عقائد کے خلاف تھیں۔ اس سکیم میں غذائی تعاون بھی شامل تھیں۔ یعنی مشیر کہ خدا اک، جس کا واضح مطلب سبزی خوردی تھا۔ اور اسے تمام بچوں کے لئے لازمی قرار دے دیا گیا۔ اس سکیم کو عملی جامہ پہنچانے کے لئے درسی کتابیں تیار کرائی گئیں۔ اور ان کتابوں کے ذریعہ یہ بتایا گیا کہ دنیا کے تمام مذاہب سچے ہیں۔ حضور اکرم کے بارے میں یہ لکھا گیا کہ وہ عرب میں اسی قسم کی سچائی کی تبلیغ کرنے والے ایک مبلغ تھے۔ اس سکیم کے بارے میں سر کولینڈر نے لکھا۔

کانگریس نے اپنے دور حکومت میں تعلیم کے لئے جو سکیم تیار کی، وہ خاصی طنز آمیز تھی۔ نصائی کتابوں میں اسلام کی قیمت پر ہندو ازم کا پرچار کیا گیا۔ اور مسلمان بچوں میں ہندوؤں کے عقائد کے جراثیم شامل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ دراصل کانگریس چاہتی یہ تھی۔

کچھ کام ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت میں کئے بندوں نہ کر سکی۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کو ہندو قومیت میں ضم نہ کر سکی، وہ کام اس نے وارد حاکم کے تحت کرنا چاہا۔ اسی لئے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بے زاری پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی۔

## اقتصادی تعصب

علاوہ ازیں کانگریسی صوبائی حکومتوں نے مسلمانوں کے مالی مفادات پر ضرب لگانے سے بھی گریز نہ کیا۔ ایسے کاروباروں پر بھاری ٹیکس عائد کر دیئے گئے۔ جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھے۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے گئے۔ کچھ نو انگریزوں کی پالیسی نے مسلمانوں کو پس ماندہ کر دیا تھا۔ وہی سہی کس کانگریسی نے اپنے مختصر دور حکومت میں پوری کر دی۔ علاوہ ان کے تنگی کی اداروں میں مسلمانوں کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ اور بہت سے مسلمان اداروں وغیرہ کی سرکاری امداد منسوخ کر دی گئی۔ اس سلسلہ میں ایک پڑنے آئی سی ایس انگریز افسر مسٹر پینڈیٹ نے کہا کہ ”ہندو لاکھ کہیں کہ مسلمان اُن کے بھائی ہیں۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ سوتیلے بھائیوں سے بھی بدتر سلوک کرتے ہیں۔ اور اُن سے وہی سلوک کرتے ہیں جو اچھوتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔“ جہاں تک کسانوں کا تعلق تھا تو کانگریس نے حکومتوں کے قیام سے قبل کسانوں کی کسی مہر سی کے روئے روئے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس نے حکومت برنگال کے میونسپلٹی بل (TENANCY BILL) کی مخالفت اس لئے کی کہ وہاں کاشتکار مسلمان اور ہندو زمیندار تھے۔ مگر یو۔ پی میں اس کے برعکس TENANCY LAW پر اس لئے اعتراض کیا کہ وہاں کچھ مسلمان زمیندار بھی تھے۔ پنہاب میں ایسے لوگوں کی مخالفت کی گئی۔ اور بہن اراضی کے بل، سود خوروں کے بل اور سیز ٹیکس بل، کو ”سیاہ بلوں کا نام دیا۔ حالانکہ یہ بل حوام کے مفادات میں تھے۔ کیونکہ لاتعداد مسلمان، ہندو سود خوروں کے قرضوں کے بوجھتے دسے ہوئے تھے۔ بہار میں ہندو زمیندار زیادہ تھے لہذا وہاں کانگریس نے اُن سے کاشتکاروں کے مسئلہ پر فوری سمجھوتہ کر لیا۔ کانگریسی صوبوں میں جہاں جہاں بھی مزدوروں کی بڑا ٹال ہوئی، کانگریسی حکومت نے اسے اسی طریقہ پر کچل دیا۔ جس طریقہ سے انگریز کچل کرتا تھا۔ اور ہندو اس کی تنقید کا بدن بنا کرتے تھے۔ غرضیکہ کانگریس نے ہر اعتبار سے کوشش کی کہ اپنے صوبوں میں مسلمانوں کو ضم کر دے۔ اس مقصد کے لئے اُن کے قبلی عام تبدیلی مذہب، اقتصادی استحصال اور تعلیمی راستے مسدود کرنے کے انتہائی پست ہتھکنڈے استعمال کئے۔

## باب

# دوسری عالمگیر جنگ کانگریسی وزارتوں کا خاتمہ

جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کیا تو ۳۱ ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس طرح دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ہندوستان کے وائسرائے نے لارڈ مونتگومری کو اطلاع دیا کہ ہندوستان بھی اس جنگ میں شریک ہے۔ وائسرائے نے ہندوستان کے لوگوں سے برطانیہ کی مدد کرنے کی اپیل کی۔ انہوں نے تمام ہندوستانی رہنماؤں سے بھی اسی سلسلہ میں تفصیلی بات چیت کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وائسرائے نے گاندھی کے ساتھ قائد اعظم کو بھی بات چیت کے لئے یاد کیا۔ قائد اعظم یہ کچھ بغیر نہ رہ سکے۔

”مجھے جوت ہے کہ جنگ شروع ہوتے ہی میرے بارے میں حکومت کا اندازہ کیوں بدل گئے، مجھے آج گاندھی کی سطح پر لایا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مجھے اتنی ”ترقی“ کیسے مل گئی؟“

حقیقت یہ تھی کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن چکی تھی اور حکومت کو اس بات کا مکمل احساس تھا کہ مسلمانوں کے تعاون کے بغیر کام نہ بنے گا۔ وائسرائے کے ساتھ پہلے گاندھی کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنا رد و اتالی طریقہ عمل قائم رکھنے ہوئے اپنی طرف سے وائسرائے کو مکمل تعاون کا یقین دلایا لیکن کانگریس کی طرف سے کوئی وعدہ نہ کیا۔ انہوں نے کہا:

”میں کانگریسی رہنماؤں سے مشورہ کئے بغیر کوئی وعدہ کیسے کر سکتا ہوں۔ میں

تو اس کا نام غیر بھی نہیں لہذا مجھے اس کا کوئی اختیار نہیں۔  
 مگر ایسے کسی بھی موقع پر گاندھی نے یہ کبھی دیکھا کہ ان کے ساتھ بات چیت ہی نہ کی جائے کیونکہ وہ کانگریس کے قریب تو ہیں نہیں لہذا مناسب یہ ہو گا کہ کانگریس رہنماؤں کو بلایا جائے۔ دلچسپ بات یہی ہے کہ بات چیت کے لئے وہ خود آتے یا یوں کہے کہ خود کانگریس انہیں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتی، لیکن میں موقع پر وہ کانگریس کے ممبر نہ ہونے کا بہاد تر اصرار دیتے۔

گاندھی کے بعد قائد اعظم کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے والٹر رائے سے صاف صاف کہہ دیا کہ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ سے مشورے کے بعد ہی وہ کوئی وعدہ کر سکیں گے۔ یعنی انہوں نے متفقہ رائے کو ذاتی رائے پر ترجیح دی۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو والٹر رائے نے اسمبلی کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہندوستان کا وفاق ترقی کیا جاتا ہے تمام حکومت برطانیہ وفاق کے نائب العین سے متفرق نہیں۔ وفاق ختم کرنے میں عجلت سے اس لئے کام لیا گیا کہ ملک میں تعاون کی فضا قائم کی جاسکے۔

مسلم لیگ نے اس اعلان کی روشنی میں کچھ فیصلے کئے جن کے تحت وفاق کے التزامات کو مفید قرار دیا گیا بلکہ یہ درخواست بھی کی گئی کہ وفاق ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ مسلم لیگ نے اس بات پر اصرار کیا کہ ہندوستان کے آئینہ آئین کے مسئلہ پر نظر ثانی کی جائے۔ اس نے حکومت برطانیہ کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرائی کہ مسلمان — مذہبی، سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور اقتصادی آزادی چاہتے ہیں اور ہندوؤں کے تسلط کو پسند کرتے ہیں۔ جہاں تک وفاق کا تعلق ہے تو مسلمان اس کی منسوخی کے مطالبے سے کبھی اور کسی صورت بھی دست بردار نہیں ہو سکتے۔ اپنے اجلاس میں مسلم لیگ نے فرانس، انگلستان اور پولینڈ سے اظہارِ ہمدردی کیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ کانگریسی وزارتوں کے صوبوں میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم کو بند کرے اور وزارتوں کو ہدایات دے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ انسانانہ جیسا سلوک کریں۔

اہم مطالبہ یہ تھا کہ حکومت، مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر ایسا کوئی اقدام نہ کرے جو ہندوستان کی آئینی ترقی سے متعلق رکھتا ہو نہ ہی مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر کوئی آئینی وضع کیا جائے۔

کانگریس نے حسبِ معمول پھر سودا بازی سے کام نکالنا چاہا۔ اس کی مجلسِ عاملہ نے یہ فیصلہ کیا کہ کانگریس اسی صورت میں حکومت کے ساتھ تعاون کر سکتی ہے جب ہندوستان کے لئے

آزادی کا دعوہ کیا جائے اور جنگ ختم ہوتے ہی عقبہ دستور ساز اسمبلی کو آئین آزادی بنانے کا حق دیا جائے۔ ایک اور قرار داد میں کہا گیا کہ نیا آئین تو جنگ کے اختتام پر ہی بنایا جاسکے گا مگر حکومت، وائسرائے کی کونسل کو فوراً ایک قومی حکومت کی صورت دے، یعنی کونسل میں ان اراکین کو شامل کر لیا جائے جنہیں مرکزی اسمبلی کے عقبہ اراکین کی حمایت حاصل ہو۔

وائسرائے نے ایک بار پھر مسلم لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں سے ملاقات ضروری سمجھی۔ انہوں نے پہلے گاندھی سے ملاقات کی پھر ان کے بتانے ہوئے دور رہنماؤں جو اہر محل ضرور اور راجندر پرشاد سے ملے۔ ان دونوں کی ملاقات ۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ہوئی۔ دونوں نے امریکا کے وائسرائے کی طرف سے جنگ کے بعد مکمل آزادی کا غیر مبہم اعلان کیا جائے اور ہندوستان کو یہ آزادی ہو کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے ذریعے اپنا آئین تیار کرے۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ تمام اختیارات مرکزی حکومت کے پاس ہیں اور ان اختیارات میں ہندوستانیوں کو شریک کیا جائے۔ انہوں نے آل پارٹیز کانفرنس کی تجویز کی بھی مخالفت کی۔

اگلے دن لبرل پارٹی کی طرف سے سرچمن لعل، اچھوتوں کی طرف سے ڈاکٹر امبیڈکر، ہندو مساجد کی طرف سے سادکر اور پارسیوں کی طرف سے کاڈس جی جیٹا گرنے وائسرائے سے مشورہ کہ احتجاج میں کہا کہ گاندھی نے وائسرائے کو گراہ کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ پورے ہندوستان کی فائندگی صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ کچھ اور قومیں بھی اس ملک میں بستی ہیں۔ کانگریس کا یہ دعویٰ کہ ملک کی واحد سیاسی جماعت ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔ وائسرائے نے دوسری سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے بھی ملاقاتیں شروع کر دیں۔

اس دوران مختلف سیاسی رہنماؤں نے مستقبل کے اندھیل کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا۔ جب کانگریس کا یہ ڈھونگ ختم ہو گیا کہ وہ ملک کی واحد فائندہ جماعت تھی تو اس نے نئی کر دہ بدلی اور ایک قرارداد کے ذریعے احتجاج کیا کہ ہندوستانیوں کی مرضی کے بغیر ہندوستان کو جنگ میں کیوں دھکیل دیا؟ یہ بات کانگریس کو اس وقت یاد آئی جب وہ وائسرائے سے آزادی کا وعدہ لے رہی تھی، ایگزیکٹو کونسل میں ہندوستانیوں کی شمولیت کا مطالبہ کر رہی تھی اور نئے آئین پر مقرر تھی۔

وائسرائے نے ۱۱ اور ۱۸ ستمبر کو جو اعلانات کئے، ان کے مطابق کچھ مطالبات کو جزوی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے وفاقی حصے کو معطل کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا

یہاں کہ جنگ کے اختتام پر ہندوستانیوں کو لوہا بادیاتی درجے کی آزادی دینے کے لئے نیا آئین مرتب کرنے کی غرض سے تمام سیاسی جماعتوں سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔

## کانگریس وزارتوں کا خاتمہ

۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے وائسرائے کے اعلان پر احتجاج کرتے ہوئے اپنے ایک ہنگامی اجلاس میں وزارتوں سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا اور چھ صوبوں میں قائم کانگریسی وزارتوں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ ۲۰۔ اکتوبر تک استعفیٰ ہو جائیں۔ اسی اجلاس میں کانگریس کی طرف سے برطانوی حکومت کو جنگی مساعی میں کوئی مدد نہ دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا کیونکہ حکومت نے اپنی پالیسی کی وجہ سے کانگریس کو پکڑنے کی کوشش کی تھی۔

۲۲۔ اکتوبر ہی کو مسلم لیگ کا اجلاس ہوا اور یہ موقف اختیار کیا گیا کہ ۱۸۔ ستمبر کو مسلم لیگ نے وائسرائے کے سامنے جو اہم نکات پیش کئے، ان کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا گیا۔ لہذا وائسرائے کی طرف سے ان کی مراحت ضروری ہے۔ اجلاس نے قائد اعظم کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ ان نکات پر اطمینان کئے بعد حکومتِ برطانیہ کو جنگ میں تعاون کا یقین دہا سکتے ہیں۔ ۲۹۔ اکتوبر کو مسلم لیگ، کانگریس اور ہندوستان کی دیگر سیاسی جماعتوں کے مطالبات برطانوی پارلیمان میں زیر بحث آئے۔ یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ وائسرائے ہند کی کونسل میں توسیع کر کے اس میں ہندوستانیوں کو بھی شامل کیا جائے۔

کانگریس اس بات پر بھی رضامند نہ ہوئی۔ نومبر تک تمام کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ ان تمام صوبوں میں گورنروں نے انتظام سنبھال لیا۔ اسام میں گورنر راج کی جگہ سر محمد سمدانند نے وزارت بنانی جو مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرتی رہی۔ پنجاب، سندھ اور بنگال میں وہاں قائم رہیں۔

## حکومت کی نئی پیشکش

یکم نومبر کو وائسرائے نے قائد اعظم، راجندر پرشاد اور گاندھی سے پھر ملاقات کی اور تجویز پیش کی کہ وہ کوئی مشترکہ حل نکالیں تاکہ وائسرائے کی کونسل میں سیاسی جماعتوں کے نمائندے

کو شامل کیا جاسکے۔ جنگ کے خاتمہ تک یہی صورت رہے۔ بعد ازاں وسیع تر آئینی اصلاحات منظور کیا جائے گا۔

مگر کانگریس کے نزدیک یہ قیام ویزہ "مستقلیت کے دائرے" میں نہ تھیں کیونکہ وہ تو ہر حالت میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر اپنا تسلط چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے قائد اعظم کی طرف سے سمجھوتے کی کوشش کے باوجود دوستِ تعاون دراز نہ کیا۔ گاندھی اور راجندر پتھاد نے بھی اس بات پر اصرار کیا کہ جب تک "جنگ کے مقصد" کا بنیادی مسئلہ طے نہ چوہاٹے، اس وقت تک کانگریس کسی دوسرے مسئلے پر یکے غور کر سکتی ہے؛ دلچسپ بات یہ ہے کہ کانگریس نے خود تو قائد اعظم کی طرف سے سمجھوتے کی کوشش کو قابلِ اعتناء سمجھا لیکن راجندر پتھاد نے دائرے کو جو خطا کھن اس میں کیا تھا کہ "حکومت نے ایک بار پھر فرقہ وارانہ مسئلے کو تھیسینے کی کوشش کی ہے جو کانگریسی رہنماؤں کے لئے بڑے دکھ کی بات ہے۔ کانگریس تو ہر قدم پر یہ چاہتی ہے کہ تمام فرقہ وارانہ مسائل آرام سے اور باہمی رضامندی کے تحت حل کئے جائیں اور کانگریس اس کے لئے تیار بھی ہے، لیکن یہ مسئلہ آزادی ہند کا اعلان کے راستے میں حائل کیوں کیا جاتا ہے؟ کانگریس نے جو چار مطالبات پیش کئے، ان کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنا تسلط جمانے۔ ان مطالبات میں پہلا تو یہ تھا کہ حکومت برطانیہ جنگ کا مقصد بتائے اور یہ واضح کرے کہ ہندوستان پر اس کا اطلاق کیسے ہوتا ہے؛ دوسرے یہ کہ ہندوستانیوں کو آئینی ساز اسمبلی کے ذریعے اپنا آئین خود بنانے کا حق دیا جائے اور تیسرے کہ ہندوستان کی مکمل آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا جائے نیز یہ کہ ہندوستان کی آزادی وحدت پر ہوگی، یعنی اسے تقسیم نہ کیا جائے۔

یہ مطالبات کرنے وقت کانگریس نے صرف اپنے اقتدار کو سامنے رکھا اور دیگر تمام اقوام کے مطالبات اور حقوق و مفادات کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔

والسٹر رائے نے ایک بار پھر مختلف رہنماؤں سے ملاقات کی صورت پیدا کی۔ قائد اعظم نے ملاقات کے بعد ۵ نومبر کو والسٹر رائے کے نام جو خط بھیجا اس میں یہ چار باتیں شامل تھیں، ۱۔ جنگ کے بعد یا حالات سازگار ہوتے ہی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے قطعاً "نظر" ہندوستان کے آئندہ دستور پر از سر نو غور کیا جائے۔

۲۔ حکومت برطانیہ یا برطانوی پارلیمان ہندوؤں اور مسلمانوں کی رضامندی حاصل کئے بغیر

آئین وضع کرے نہ ہی کوئی متعلقہ اعلان کرے۔

۲۔ حکومت برطانیہ فلسطین میں عربوں کے تمام قومی مطالبات پورے کرنے کی کوشش کرے۔  
۳۔ ہندوستانی فوجوں کو کسی ملک کے خلاف ہندوستان سے باہر استعمال نہ کیا جائے۔  
۴۔ انڈیائی ہند نے ان چاروں باتوں کا اتنا مبہم جواب دیا کہ قائد اعظم مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔  
گاندھی نے قائد اعظم پر یہ الزام لگایا کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کانگریس پر تو بھروسہ نہیں کرتے لیکن انگریز پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ (قائد اعظم) ہندوستان کی آزادی کے راستے میں حائل ہیں۔

قائد اعظم نے جواباً کہا کہ گاندھی کی یہ بات تو بین آئیز اور بے بنیاد ہے۔ گاندھی کی سطح کے شخص سے اتنے چھوٹے جرم کے ارتکاب کی توقع نہیں تھی۔ وہ جو چاہیں کہیں، لیکن مسلمان اپنے جائز حقوق کے حصول کا عزم کر چکے ہیں اور ان کی خاطر وہ آخری دم تک لڑیں گے خواہ اس مقصد کے لئے انہیں کانگریس سے لڑنا پڑے یا انگریز سے۔ مسلمان صرف اپنی طاقت پر بھروسہ رکھتا ہے۔

دسمبر میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے مسلسل ایسے بیانات دیئے جو قائد اعظم کے خلاف جھوٹے الزامات پر مبنی تھے۔ قائد اعظم بہت دنوں تک خاموش رہے۔ آخر انہوں نے نہ صرف وہ خط و کتابت شائع کر دی جو ان کے اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے درمیان ہوئی تھی بلکہ ایک مختصر سا بیان بھی دیا۔

”نہرو اس الزام کو بار بار دہرا رہے ہیں کہ میں ہندوستان پر برطانیہ کا تسلط قائم رکھنے پر تلا ہوا ہوں۔ یہ الزام سراسر بے بنیاد بلکہ گھٹیا اور بے ہودہ بھی ہے۔“

## مسلم لیگ کا یوم نجات

جب تمام صوبوں سے کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں تو مسلم لیگ نے ۲۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو یوم نجات منانے کا فیصلہ کیا۔ یوم نجات چھ صوبوں میں ہندو راج اور اس کے ظلم و ستم کے خلاف منایا جانا تھا۔ ہندوستان کے کونے کونے میں مسلمانوں نے شکر ادا کیا اور ایک ہی قرار داد منظور کی جس میں مختلف صوبوں میں ہندو حکومتوں کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کا تذکرہ تھا۔ گورنر جنرل سے مسلمانوں کی شکایات کی تحقیقات کرانے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس



”یوم نجات“ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ دوسری اقوام نے بھی حصہ لیا۔ کانگریس کوئٹہ کی اس جلسے کا نا پڑی کہ بہت سے کانگریسیوں نے بھی مسلمانوں کے اس اقدام کو برحق قرار دیا۔ یوم نجات اتنے باوقار طریق پر منایا گیا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ممتاز انگریز صحافی سر آر تھور مور نے ”یوم نجات“ کے بارے میں اعلیٰ خیال کرتے ہوئے کہا،

”یوم نجات پر کانگریس اس طرح ہو کھلا گئی جیسے کسی جنگلی سور کو زخمی کر دیا گیا ہو۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس موقع پر کوئی فساد، کوئی جنگار نہیں ہوا۔ صوبوں کے گورنروں اور بعض ایسے لوگوں نے، جن میں میں خود بھی شامل ہوں، کانگریسی حکومتوں کی بہت تعریف و توصیف کی تھی لیکن جلد ہی ہم پر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چھ صوبوں کی کانگریسی وزارتیں اپنے دورِ حکومت میں شکایات، فساد و فتنہ اور عدم اطمینان کے پلندے جمع کر رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم شہر و دیہات میں انہیں سمجھنے سے قاصر رہے۔“

## باتِ حیت کا نیا دور

۱۰ جنوری ۱۹۱۱ء کو وائسرائے نے بمبئی کے ایک کلب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حکومتِ برطانیہ، ہندوستان کے ملی اتحاد اور اقلیتوں کے تحفظ کو بہت فردی قرار دیتی ہے۔ انہوں نے ہندوستانی رہنماؤں سے ایک بار پھر اپیل کی کہ وہ اتحاد قائم کریں اور کسی مشترکہ فیصلے پر پہنچ جائیں۔ بمبئی سے واپسی سے قبل وائسرائے نے قائد اعظم سے بھی ملاقات کی تاہم انہوں نے جنگ کے خاتمے تک سمجھوتے کے لئے جو تجاویز پیش کیں ان میں صوبوں کے اندر مخلوط وزارتوں کا قیام کسی ایسے قانون کے لحاظ سے اجتناب جو مسلمانوں کو متاثر کرتا ہو اور مسلمان اراکین اسمبلی کی مجموعی تعداد کا دو تہائی اس کا مخالف ہو، کانگریس کے جھنڈے سرکاری عمارتوں پر لگانے سے احتراز، بندے ماترم کے ترانے پر پابندی اور مسلم لیگ کے خلاف کانگریس کا تحریری کارروائیوں سے گریز۔ شامل تھیں۔

وائسرائے نے بمبئی میں ہولابائی ڈیلیسائی سے بھی ملاقات کی۔ وہ اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے قائد تھے۔ لیکن انہوں نے وائسرائے سے ذاتی حیثیت میں بات چیت کی، جس کا لب لباب یہ تھا کہ صوبوں میں کسی نہ کسی طرح دوبارہ کانگریسی وزارتیں قائم ہو جائیں۔ حقیقت یہ تھی کہ کانگریس

وزارتوں سے مستعفی ہونے کے بعد کثرتِ افسوس مل رہی تھی اور دوسری طرف گاندھی کو یہ محسوس  
 کھائے جارہا تھا کہ وائسرائے نے کانگریس کو اہمیت دینا کیوں بند کر دی؟ آخر انہوں نے خود  
 ہی وائسرائے کو ایک خط میں لکھا کہ "اقلیتوں کے مسئلہ پر آپ جب انداز میں عمل کرتے ہیں، یقیناً  
 اس عمل کے لئے آپ کے پاس کوئی بنیاد بھی ہوگی۔ لیکن اقلیتوں اور اچھوتوں کے بارے میں آپ  
 نے محبت میں جو کچھ کیا وہ میرے لئے ناقابلِ فہم ہے۔" گاندھی نے یہ سپیکش بھی کی کہ اگر وائسرائے  
 ان سے ملنا چاہیں تو خط یا تار کے ذریعے اطلاع دے دیں۔ اس خط کے دو دن بعد ہی گاندھی کی  
 ملاقات وائسرائے کے ساتھ ہو گئی۔ گاندھی نے وائسرائے کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ بالکل ذاتی  
 حیثیت میں ان سے ملنے چلے آئے تھے کیونکہ کانگریس زبان سے سخت ناراض تھی نیز گاندھی نے  
 بڑی مشکل سے وائسرائے کے ساتھ ملاقات کی صورت پیدا کی۔ کانگریس حالات سے بد دل ہے  
 لہذا فوری طور پر کوئی تصفیہ ہو نا ضروری ہے۔ گاندھی نے یہ بھی کہا، حالات ایسے ہیں کہ قتل عام بھی  
 ہو سکتا ہے لیکن دم تشدد پر یقین رکھنے کے باوجود میں اس قتل عام کو بلا بچکچا ہٹ دیکھوں گا۔  
 میرے ساتھی مجھے مجبور کر رہے کہ میں جنگ کا اعلان کروں۔ مگر میں نے ہی ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔  
 گاندھی نے دوسرے الفاظ میں وائسرائے کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ انہوں نے فسادات،  
 قتل و غارت، جنگ اور انگریز حکومت کے خلاف پورے ہندوستان کی نفرت اور بیزاری کو  
 اپنے قوت کے بل پر روکا ہوا تھا۔ ان کا اشارہ پاتے ہی قیامت ٹوٹ پڑے گی اور انگریز کو اس  
 ملک سے مجاہدے ہی ہی پڑے گی۔

مگر وائسرائے نے گاندھی سے کہا کہ جب وہ اختیار ہی نہیں رکھتے کہ کانگریس کی طرف سے  
 بات کر سکیں تو بات چیت کا فائدہ ہی کیا؟ بہتر یہ ہو گا کہ گاندھی پہلے یہ اختیار نامہ حاصل کر لیں یا  
 با اختیار کانگریسی رہنماؤں کو ساتھ لے کر آئیں تاکہ جو بھی فیصلہ ہو اس کی پابندی ضروری  
 ہو جائے۔

مخلو وزارتوں کے بارے میں مسلم لیگ کی پیش کش پر گاندھی نے وائسرائے کو یہ جواب  
 دیا کہ دراصل مسلم لیگ کا مزاج اتنا بڑبڑا تھا کہ اس سے سمجھوتے یا مل جل کر کام کرنے کی توقع  
 ہی نہیں رکھی جاسکتی۔ ہذا یہ گفتگو بھی توجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔

گاندھی کے مہم قائد اعظم نے وائسرائے کی دعوت پر ملاقات کی اور ان سے کھل کر پوچھا  
 کہ مسلم لیگ کے نکات کا واضح جواب کیا ہے؟ دراصل قائد اعظم یہ بات صاف کرنا چاہتے تھے کہ

اگر صوبوں میں کانگریسی وزارتیں پہلی صورت میں واپس آئیں تو ملک بھر میں خانہ جنگی مشعل و جہجہ بجائے گی۔ قائد اعظم نے دیگر مطالبات کو بھی دہرایا۔ ان کی طاقات بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔ بعد ازاں مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کا ایک وفد انگلستان جائے اور وہاں کے عوام اور حکومت کو مسلم لیگ کے مطالبات اور مسلمانوں کے مؤقف سے آگاہ کرے۔

## باب

## قرارداد پاکستان

۵۔ فروری ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کو نسل کے اجلاس دہلی میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ جب ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہو تو اس میں ایک قرارداد پیش کی جائے۔ اس قرارداد کا مسودہ سرسکندر حیات خاں نے تیار کیا جو ملک کی تقسیم کے مطالبہ کی بنیاد پر تھا۔ جب یہ مسودہ نئی دہلی میں قائد اعظم کے پاس منظور کیے لئے بھیجا گیا تو انہوں نے اسے موضوعاتی کمیٹی (SUBJECTS COMMITTEE) کے سامنے رکھ دیا۔ کمیٹی نے اس مسودہ میں خاصی تبدیلیاں کیں جو بعد ازاں قرارداد لاہور کی صورت میں ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے آئیں۔

مسلم لیگ کا یہ تاریخی اجلاس لاہور کی شاہی مسجد کے زیر سایہ منعقد ہوا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائد اعظم کی صدارت میں یہ قرارداد اسے کے فضل الحق نے پیش کی جس کی تائید مولانا ظفر علی خاں، چودھری غلیق الزماں، ذاب محمد اسماعیل خاں، سر عبد اللہ شادون، عبد الباقی خان، قاضی محمد عیسیٰ، آئی آئی چندرگیر، ڈاکٹر محمد عالم، سید ذاکر علی، بیگم مولانا محمد علی جوہر، سردار ادنیگ زیب خاں اور سید عبدالرؤف شاہ نے کی۔

قرارداد یہ تھی:

۱۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس نہایت غور و فکر کے بعد اس ملک میں صرف اُسی آئین کو قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول قرار دیتا ہے جو جبرانیائی اعتبار سے

باہم متعلق رکھنے کی صورت میں حد بندی کا حامل ہوا اور بوقتِ ضرورت ان میں اس طرح رد و بدل ممکن ہو کہ جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوا اعتبار تعداد ہو، انہیں آزاد ریاستوں کی صورت میں یکجا کر دیا جائے اور ان میں شامل ہونے والی وحدتیں خود مختار اور حاکمیتِ کامل کی حامل ہوں۔

۲۔ ان وحدتوں اور بر ملا قافی آئینی میں اقلیتوں کے مذہبی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی مفادات اور حقوق کے تحفظ کی خاطر ایسی اقلیتوں سے مشورے کے بعد موثر تحفظات شامل ہوں اور ہندوستان کے ان تمام حصوں میں جہاں مسلمان آبادی کے اعتبار سے اکثریت میں نہیں تحفظ کا یقین دلایا جائے۔

۳۔ یہ اجلاس مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ ان اموروں پر بنی آئین کا لائحہ عمل مرتب کرے جس میں دونوں خطوں کے تمام اختیارات اور دیگر اہم امور کو سنبھالنے کا انتظام کیا جائے۔

اس قرارداد کے بعد پہلی بار ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ایک آزاد اسلامی مملکت کا واضح اور غیر مبہم تصور آیا۔ یہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔ ایک بار پھر مسلمانوں کو احساس ہوا کہ ان کی جنبشِ گم گشتہ انہیں واپس مل جائے گی اور وہ انگریز اور ہند کی چالوں اور ان کے ظلم و ستم سے نجات حاصل کر لیں گے۔ ایک آزاد مملکت کی تائید کر کے یوپی، سی پی، بہار، مدراس اور بمبئی کے مسلمانوں نے جس عظمت اور اسلامی اخوت کا ثبوت دیا تھا اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس قرارداد کی تائید کرنے والوں میں بہت سے لوگ ایسے تھے جن کا تعلق مذکورہ بالا علاقوں سے تھا۔ یہ لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ ہندوستان کی تقسیم اور ایک آزاد علیحدہ اسلامی مملکت کے قیام کے بعد انہیں ہندو حکومت کے زیر سایہ جانے کتنے مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان پر ہندو کی طرف سے کیا کیا ظلم توڑے جائیں گے، لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی ان مسلمانوں نے بہت بڑی قربانی دی۔

اس قرارداد کو "قراردادِ تقسیمِ ہند" کا نام دیا گیا۔ صرف بیگم محمد علی جوہر نے اسے "قراردادِ پاکستان" کہا کیونکہ پاکستان کا لفظ، اس لفظ کے موجد محمد رفیع رحمت علی کی وجہ سے لوگوں میں مانوس ہو چکا تھا۔

## قائد اعظم کا خطبہ صدارت

اس موقع پر قائد اعظم نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا :

حکومت برطانیہ ، ہندوستان کے مسئلہ کو بین الاقوامی مسئلہ تسلیم نہیں کرتی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے چند فرقوں کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے اور اس کا حل اسی بنیاد پر تلاش کرنا ضروری ہے۔ اگر اس بنیاد کے بغیر کوئی دستور وضع کرنے کی کوشش کی گئی تو تباہی کے سوا کچھ لاتھ نہ آئے گا۔ اگر حکومت برطانیہ ہندوستان کے رہنے والوں کے لئے فی الواقعہ خلوص کے جذبات رکھتی ہے اور ان کو امن و امان سے بھٹکار دیکھتا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ ہندوستان کو تقسیم کر دے اور دو بڑی اقوام یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ وطن قائم کر دے تاکہ وہ مکمل خود مختاری کے ساتھ اپنی اپنی قومی ریاستیں قائم کر لیں۔ ان ریاستوں کے درمیان عداوت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی البتہ وہ ایک دوسرے پر چھا جانے کی کوشش ترک کر دیں گے۔ ان دو ریاستوں کے قیام سے اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ دونوں کے درمیان ایک دوسرے کی مرضی سے تمام امور طے پا جائیں گے نیز مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق و مفادات کی موثر حفاظت ہو جائے گی۔ یہ خواب دیکھنا کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم بن جائیں گے ، بے سود ہے۔ بنیادی طور پر دونوں دو الگ الگ اور مختلف اجتماعی نظام کے حامل ہیں کیونکہ افسوس ہے کہ ہندو آج تک اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں کیونکہ مذاہب ، ثقافت ، رسم و رواج اور مذہبی فلسفہ ، غرضیکہ سب کچھ مختلف ہے۔ اس صورت میں بھلا وہ ایک قوم کے افراد کیونکر کہلا سکتے ہیں ؟ اگر حقائق سے نظریں پراتے ہوئے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر دونوں قوموں کو ایک قوم تصور کرنے کے بعد مشترکہ نظام قائم کر بھی لیا جائے تو ایک دن وہ بہر حال تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ تاریخ ایسی غلط بنیادوں پر قائم کھوکھلے نظام کی تباہیوں

نخط کی بات کیوں کی گئی۔ مسلمانوں کو یہ دُکھ تھا کہ اس سے ہندوستان میں، بننے والی متعدد اقوام کی بجائے ایک قوم اور متحدہ ہندوستان کا اثر ملتا تھا۔

## جنگ کے اثرات

نازی فوجیں اتحادیوں پر کاری ضرب بھاری تھیں۔ جون ۱۹۴۰ء تک نازی فوجوں نے قریباً نصف یورپ پر قبضہ کر لیا تھا۔ فرانس، ہالینڈ، بلجیم اور ڈنمارک نازیوں کے قبضہ میں جا چکے تھے۔ ان حالات میں حکومت برطانیہ نے اپنی وزارت میں تبدیلی کی۔ مئی میں جمپریٹن کی جگہ چرچل برطانیہ کے نئے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ برطانیہ کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنی تمام تر توجہ جنگ پر مرکوز کر دے اور ہندوستان سے مکمل جنگی تعاون کو خاص اہمیت دے۔ وائسرائے ہند نے برصغیر کی تمام سیاسی جماعتوں کو اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کی کہ فی الحال وہ آئینی امور پر بحث بند کر دیں اور وائسرائے کی کونسل میں اپنے نمائندوں کو شامل کر کے علاقہ حکومت میں شامل ہو جائیں۔

اس دوران آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے وائسرائے کو ایک خط کے ذریعہ اپنے فیصلوں سے آگاہ کیا۔ ان میں بنیادی بات یہ تھی کہ مسلمانوں کی رضا مندی کے بغیر آئینی مسائل اور ایسے دیگر اہم معاملات پر کوئی اعلان نہیں کیا جائے گا۔ نیز ملک کو دو پیش نظر کے مقابلہ کے لئے صرف صوبائی اور ضلعی کمیٹیوں میں ہندوستانیوں کی شرکت بے سود ہوگی۔ مجلس عاملہ نے ایک اور قرارداد کے ذریعہ تمام صوبائی اور ضلعی مسلم لیگوں کو آئندہ ہدایات تک جنگی کمیٹیوں میں شرکت سے روک دیا۔

۱۷۔ جون کو کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ کانگریس کی نئی پالیسی یہ تھی کہ گاندھی کے اس نظریہ پر کہ اتحادی عدم تشدد کے ذریعہ نازیوں کا مقابلہ کریں، کانگریس موجودہ حالات میں یقینی نہیں رکھتی اور اس پالیسی میں گاندھی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ گاندھی جس طرح چاہیں، عمل کریں اور ان پر کانگریس کے لائحہ عمل اور سرگرمیوں کی کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ کانگریس نے یہ کہہ کر بھی رویہ اختیار کیا جو دکھاوے کے لئے کوئی باپ اپنی اولاد کو عاق کر کے روا رکھتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ باپ نے اولاد کو عاق کرنے کی جگہ اولاد نے باپ کو عاق کر دیا تھا۔ کانگریس نے اس قرارداد میں یہ بھی کہا کہ وہ تمام ملک میں ایک متوازی

نظام کی حیثیت سے کام کرے گی تاہم وہ حکومت کی قائم کردہ جنگ کمیٹیوں سے تعاون پر آمادہ نہیں ہوگی۔ کوئی کانگریسی جنگ کے لئے چندہ نہ دے گا نہ ہی سول گارڈز میں بھرتی ہوگا۔

جولائی ۱۹۴۰ء میں قائد اعظم اور وائسرائے کو چند تجاویز بھیجیں، جن میں کہا گیا تھا کہ برطانوی حکومت کی طرف سے قرارداد لاہور اور ہندوستان کی تقسیم کے برعکس کوئی اعلان یا بیان جاری نہیں کیا جانا چاہئے کیونکہ ہندوستان کے مسلمان بطور عقیدہ قرارداد پاکستان کو اپنا پنگے ہیں۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین دلانے کو ان کی رضامندی کے بغیر کوئی مستقل یا عارضی آئینی لائحہ عمل اختیار نہیں کیا جائے گا۔ تیسری تجویز یہ تھی کہ مسلمانوں کو ہندوستان کی سلامتی کا مکمل احساس ہے اور وہ اس سلسلہ میں ممکنہ اقدامات پر یقین رکھتے ہیں لیکن جب تک مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں مسلمانوں کو مناسب حیثیت نہیں دی جاتی، مسلمان کسی تعاون سے قاصر ہوں گے۔ دراصل قائد اعظم یہ چاہتے تھے کہ ملک میں جو آئین موجود تھا، اس کے تحت وائسرائے کی کونسل کو دست دی جائے، کانگریس کی شرکت کی صورت میں مسلم لیگی نمائندوں کی تعداد مساوی ہو اور گورنری راج کے صوبوں میں غیر سرکاری مشیر مقرر کئے جائیں جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہو نیز ہار اراکین پر مشتمل ایک جنگ کونسل قائم کی جائے جس کے صدور وائسرائے ہوں۔ یہ کونسل تمام دفاعی امور کے بارے میں مشورے دے۔ اس کونسل میں اگر کانگریس بھی شریک ہو تو مسلمانوں کو ہندوؤں کے مساوی نمائندگی دی جائے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایسی جنگ کونسل یا ایگزیکٹو کونسل میں شریک ہونے والے مسلمان نمائندوں اور غیر سرکاری مشیروں کا انتخاب مسلم لیگ کی صواب وید پر ہو۔

جولائی میں وائسرائے نے کونسل میں توسیع کی تجویز کو منظور کر لی۔ مگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمائندگی کو قبول نہ کیا۔ جہاں تک اراکین کی نامزدگی کا تعلق تھا تو یہ کام صرف گورنر جنرل پر چھوڑ دیا گیا۔

فروری ۱۹۴۱ء کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس دہلی میں ہوا، جس نے فیصلہ کیا کہ ایک عارضی قومی حکومت قائم کی جائے اور اس میں مجلس مقتدہ کے منتخب اراکین کو شامل کیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو کانگریس جنگ کی مساعی میں ہر ممکن تعاون کرے گی۔



سب سے بڑی ہے۔ البتہ ایسے ملک جہاں مختلف اقوام آباد ہوتیں اور انہیں قومی بنیادوں پر ہی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا، برقرار رہیں۔ اس کے برعکس ان کا مشترکہ نظام کبھی پائیدار نہ ہو سکا۔ مسلمانوں پر اگر ایسا دستور عطا کیا جائے گا تو مسلمانوں پر ہندو راج کی صورت میں برآمد ہو تو ہندوستان کے مسلمان اسے کسی قیمت پر بھی تسلیم نہ کریں گے۔ ہم پروٹیکٹوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے اپنی منزل کا تعین کر لیا ہے اور جس راہ پر چل سکے ہیں، کسی صورت بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم سے اس راہ میں قربانیاں طلب کی گئیں تو ان کے لئے بھی تیار ہیں۔ میں پابتاہم کہ آج قطعی فیصلہ ہو جائے اور اس کے بعد ہندوستان بھر کے مسلمان متحد ہو جائیں تاکہ وہ اسلام کے خادم بن کر پیش قدمی شروع کریں اور ایک ناقابل تسخیر قوت بن جائیں۔

### ہندو کی بوجھلاہٹ

اس قرارداد کی منظوری کے بعد پورے ہندوستان کے ہندو بڑی طرح بوجھلا گئے۔ اُن کے اہلکار کے وسیع اور موثر جال نے پاکستان کا مضحکہ اڑایا اور اتنی پست سطح پر ٹکنا شروع کر دیا کہ صاف کے آداب بھی نظر انداز کر دیئے۔ شاید ہی کوئی ہندو رہنما جو جس نے اس قرارداد کے خلاف جذباتی تقریر کی ہو۔ ہندوؤں کی منطق یہ تھی کہ ہندوستان ناقابل تقسیم ہے کیونکہ اس کی جغرافیائی وحدت کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ نیز ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت بنیادی طور پر ہندو ہے۔ انہوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا اور ان کے آباؤ اجداد ہندو تھے۔ لہذا وہ مسلمان قومیت کا چولہہ پن کر اپنی قومیت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ تیسری بات یہ کہ جاتی تھی کہ پاکستان دو ماد کے اندر اندر ختم ہو کر رہ جائے گا کیونکہ وہاں اتنے معاشی وسائل ہی نہیں جو پاکستان کو قائم رکھ سکیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندو رہنماؤں اور اخبارات کی اس یا وہ گوئی کی مطلق پروا نہ کی اور قائد اعظم کی قیادت میں حصول منزل کے عزم کو سینے سے لگا کر آگے بڑھتے رہے۔

## باب ۲

# کانگریس اور مسلم لیگ

## نئی کشمکش کا آغاز

۱۰۔ اپریل ۱۹۴۰ء کو برطانوی حکومت نے دوسری عالمگیر جنگ اور ہندوستان کے حالات کے بارے میں ایک قرطاس ایض (WHITE PAPER) شائع کیا جو کانگریسی وزارتوں کے استغفوں کی وجوہات، مسلم لیگ، کانگریس کے رہنماؤں کے ساتھ واسٹرائے کی ہتھپیت اور ان دونوں سیاسی جماعتوں کی قراردادوں پر مشتمل تھا۔ حکومت برطانیہ نے اپنی پارلیمنٹ کے اس امر کی منظوری ۱۸۔ اپریل ۱۹۴۰ء کو حاصل کر لی کہ کانگریسی صوبوں میں دفعہ ۱۹۳۵ جاری رہے۔ برطانوی وزیر ہند نے دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حکومت ہندوستانیوں کی مرضی کے برعکس کوئی دستور وضع نہ کرے گی۔ حکومت وعدہ کر چکی ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں سے مشورہ کے بعد آئینی معاملات پر غور کیا جائے گا۔ لہذا ہندوستان کے تمام فرقوں میں اس لئے بھی اتحاد ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کی آزادی کا خواب حقیقت میں تبدیل ہونے والا ہے۔ برطانیہ کی کوئی بھی برسرِ اقتدار سیاسی جماعت یا پارلیمنٹ یہ کبھی پسند نہ کرے گی کہ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں پر کوئی ایسا آئینی مسئلہ کر دیا جائے جو ان کا امن و سکون متاثر کر دے۔ کانگریس کو اس بیان پر شدید اعتراض تھا۔ مسلمان بھی اس بیان سے ناخوش تھے۔ کانگریس کو تو یہ نہیں کھانے لگا کہ اس بیان میں ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں

آٹا دواؤ ڈالا جانے کی حکومت کانگریس کے تمام مطالبات کو من و عن قبول کرے اور مسلمان منہ دیکھتے رہ جائیں۔

ان حالات میں جب کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ۶۔ اگست کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کر چکے تھیں، وائسرائے نے اعلان کیا کہ فی الحال وائسرائے کی کونسل اور جنگ کی مشورتی کونسل کے قیام کے لئے کوئی کوشش نہ کی جائے گی۔

## مسلم لیگ کا رد عمل

۲۲۔ فروری ۱۹۴۱ء کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس دہلی میں ہوا، جس میں فیصلہ کیا گیا کہ بر ۲۳ مارچ کو مسلم لیگ "یوم استقلال" منایا کرے گی۔ اس موقع پر ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کی بنیاد اور اسوں کی تشریح کی جایا کر سگی اور سال میں چار مرتبہ تمام صوبوں اور اضلاع کی مسلم لیگیں "مہنت مسلم لیگ" منایا کریں گی۔ اس مہنت میں مسلم لیگ کے لئے رکنیت سازی کی جائے گی اور اس کے مقاصد کی وضاحت پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔

گاندھی کی سول نافرمانی کے بارے میں ایک قرارداد میں کہا گیا کہ یہ سول نافرمانی دراصل مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو تباہ کرنے اور حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے شروع کی گئی ہے، تاکہ حکومت کانگریس کے مطالبات تسلیم کرے۔

کچھ دنوں بعد قائد اعظم نے ایک تقریر کے دوران واضح الفاظ میں کہا کہ کانگریس نے سول نافرمانی کا ڈھونج صرف حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے بچایا ہے، تاکہ حکومت کانگریس کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرے۔ مسلم لیگ زیادہ دیر تک خاموشی نہاشائی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اگر حالات خطرناک حد تک پہنچ گئے تو اس کی ذمہ داری کانگریس پر عائد ہوگی۔ نیز اگر مسلمانوں کے مفادات کو خطرے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی تو وہ مداخلت بھی گریز نہ کریں گے۔ ہندوؤں کو چاہئے کہ وہ ہندو راج کے خواب دیکھنا چھوڑ دیں اور ہندوستان کی تقسیم تسلیم کر لیں، پاکستان مسلمانوں کا نصب العین ہے، کوئی سودا بازی نہیں۔

ادھر تقریباً ایک سال تک سول نافرمانی کی انفرادی مہم جاری رہی مگر پٹیل کی طرح اپنی سمت آپ مر گئی۔ اس کے بعد کانگریس نے ایک بار پھر وہی مطالبہ دہرایا کہ اگر اس کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے جائیں تو حکومت کے ساتھ مکمل تعاون کیا جائے گا۔

۱۔ سرگاندھی نے ایک سال تک بھول نافرمانی کرنے کے بعد پھر ارشاد فرمایا کہ کانگریس ملک کا  
 دفاع تشدد کے ہتھیاروں کے ذریعہ کرنا چاہتی ہے، جو ان کے اصولوں کے برعکس ہے۔  
 لہذا وہ کانگریس کی قیادت سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس طرح دوسری بار گاندھی نے کانگریس کو  
 عاقی کر دیا۔

## ۸۔ اگست کی پیشکش

۸۔ اگست کو وائسرائے ہند لارڈ چٹلنگ نے ایک بیان میں ایسے اشارے کئے کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بلکہ متعدد اقوام آباد ہیں اور ان اقوام کی قوت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ جن اقوام کا ذکر کیا گیا تھا ان میں مسلمان لازماً شامل تھے۔ اس اعلان کے چند دن بعد برطانوی وزیر امور ہند نے جو تقریر کی اس نے مسلم لیگ کو یقین دلادیا کہ برطانوی حکومت مسلمانوں کی علیحدہ حیثیت کو تسلیم کر چکی ہے۔

وائسرائے نے اپنے اعلان میں یہ بھی کہا کہ جنگ کے فوراً بعد آئین کے بنیادی مسائل کو قطعی طور پر طے کر لیا جائے گا۔ دوران جنگ نامہ سازگار حالات کے باعث محبت میں یکساں سرانجام دینا مناسب نہیں تاہم ناماندہ حیثیت رکھنے والے اس وقت تک کے لئے قطعاً تعاون کریں اور اس بات پر بھی غور کرتے رہیں کہ جنگ کے بعد جب بنیادی آئینی مسائل کو طے کرنے کا وقت آئے تو دستور کے بنیادی اصول اور اس کا ڈھانچہ کیا ہو۔

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ان بیانات پر غور کرنے کے لئے اجلاس طلب کیا۔ پھر وائسرائے سے ان باتوں کی وضاحت طلب کی کہ کونسل میں کتنے اضافی اراکین ہوں گے۔ کونسل کی دوبارہ تشکیل کسی طریق سے کی جائے گی، مسلم لیگ کو کون سی دوسری پارٹیوں کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ اضافی اراکین کونسل کو کون سے شعبے دیئے جائیں گے اور جنگ کی مشاورتی کونسل کی حیثیت کیا ہوگی، نیز اس کے فرائض کیا ہوں گے؟

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے مسلمانوں کو جنگ کمیٹیوں میں شرکت کی اجازت بھی دے دی۔

## کانگریس کا ردِ عمل

کانگریس نے مارخی قومی حکومت کا جو مطالبہ کیا تھا، نامنظوری کی بنا پر ۸۔ اگست کی پیشکش کو مسترد کر دیا گیا اور حکومت پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ طاقت کے بل پر ہندوستان میں اپنی حکومت قائم رکھنا چاہتی ہے۔ جہاں تک ہندو ماسبحا کا تعلق تھا تو وہ کونسلوں میں بیحد نمائندگی چاہتی تھی لیکن کانگریس کے انکار پر دونوں میں اُن بن جو گئی۔ ماسبحا نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ وہ ملک کی تقسیم سے متعلق کسی بھی تجویز یا سکیم کو مسترد کر دیں۔ کونسل میں

مسلم لیگ کی ۵۰ فیصد نمائندگی لغو اور غیر جمہوری ہے اور ہندو مہاسبھا کو یقین دلایا جائے کہ مسلمانوں کو اتنی نمائندگی نہیں دی جائے گی۔

۵۔ اصل کانگریس اور ہندو مہاسبھا کو بنیادی عارضہ یہ تھا کہ اگر ہر جگہ مسلمانوں کو ۵۰ فیصد نمائندگی مل گئی تو وہ ہندوؤں کے برابر آجائیں گے اور کانگریس نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ جبرِ ظلم و ستم، بربریت اور نا انصافیاں روا رکھی تھیں، اسلئے ان کی کوئی گنجائش درہنہ کی اور مسلمان زندگی کے ہر شعبہ میں ہندوؤں کی سطح پر آجائیں گے۔ ہندو مہاسبھا کا مطالبہ یہ تھا کہ اسے کونسل میں مسلم لیگ کے مقابلہ میں تین تین نشستیں دی جائیں۔

جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق تھا تو اس نے ناکافی نمائندگی اور گورنری صوبوں کے انتظام میں مسلمانوں کو شامل کرنے سے انکار پر ۸ اگست کی پیشکش کو مسترد کر دیا۔

## کانگریس اور رسولِ نافرمانی

گو کانگریس گاندھی کو عاق کر چکی تھی لیکن جب رسولِ نافرمانی کے فیصلہ کو عملی صورت دینے کا وقت آیا تو یہ عاق نامہ واپس لے لیا گیا۔ رسولِ نافرمانی کی تمام ذمہ داری گاندھی کے سپرد کر دی گئی۔ اس طرح گاندھی دوبارہ تخت نشین ہو گئے۔ گاندھی یہ چاہتے تھے کہ جنگ میں شرکت کے خلاف ہندوؤں کو تبلیغ کا حق دیا جائے لیکن جب والٹر نے انکار کر دیا تو گاندھی نے اسے آزادی تقریر پر پابندی کا نام دیتے ہوئے رسولِ نافرمانی کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو کانگریس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں گاندھی نے اپنی رسولِ نافرمانی کا پروگرام واضح کیا۔ اس رسولِ نافرمانی کا مقصد کیا تھا؟ صرف یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بتایا جائے کہ برطانوی فوج میں نازیوں کے ساتھ نیرو آزما لوگوں میں ۶۰ فیصد مسلمان تھے، لہذا اس کے باوجود مسلم لیگ نے مسلمانوں کو جنگ کیٹیوں میں شرکت کی اجازت دے کر یہ صرف مسلمانوں کو جنگ کے

جہنم میں دھکیلنے کی کوشش کی بلکہ انگریز سامراج کے ہاتھ بھی مضبوط کئے۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کے مسلمانوں میں مسلم لیگ کے خلاف نفرت پیدا کی جاسکے۔ دوسری طرف گاندھی نے آزادی تقریر پر پابندی کا بہانہ تراش کر یہ کوشش کی کہ رسولِ نافرمانی کے ذریعہ حکومت پر

کر سکے۔ اگر وہ محسوس کرے کہ اس کا پہلا فیصلہ خط تھا تو اس فیصلہ کو تبدیل کیا جاسکے گا۔ اور اس حق سے عیندگی اختیار کی جاسکے گی۔

گرتس نے دفاعی امور پر مدنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگر برطانیہ بحری، زمینی اور فضائی اطراف کی ذمہ داری قبول کرے گا تو اس کے لئے ہندوستان کی دفاعی ضروریات کی خاطر یہ بھی ضروری ہوگا کہ تمام دفاعی اعتبارات ”جنگ کا بینہ“ کے زیرِ اہتمام کانڈرا چیف کے پاس دیں۔ کیونکہ حکومت ہندوستان کے لئے دفاعی کونسلوں میں موثر شرکت ضروری ہے۔ لہذا کانڈرا چیف بطور ایگزیکیوٹو کونسل ممبر بنی حیثیت کو برقرار رکھے گا۔ گرتس نے تمام ہندوستانی رہنماؤں سے اس سکیم کو قبول کر لینے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ یہ تجاویز یقینی اور قابلِ تہدیر ہیں۔ اگر اس وقت ہندوستان کی رائے سامنے آنے لگے تو یہ تجاویز کو مسترد کر دیا تو پھر یہ موقع جنگ سے پہلے حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس طرح دنیا بھر میں ہندوستان کے دوستوں اور یہی خواہوں کو شدید صدمہ پہنچے گا۔

## قابلِ غور باتیں

گرتس کی ان تجاویز میں کچھ باتیں قابلِ غور تھیں مثلاً :

- اس میں تین مختلف میکن باہم مربوط معاملات شامل تھے۔ ہندوستان کا آؤڈر مستقبل — نئے آئین کی تشکیل کا طریق کار اور موزہ آئین کی تفکیک تک عبوری آئین کے لئے اختیار کئے جانے والا طریق کار،
- پالیسی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ تھی۔ اس کی شرائط تقریباً وہی تھیں جو ۱۹۴۰ء کی پیش کش میں رکھی گئی تھیں۔ البتہ نئی پالیسی اس کے مقابلے میں زیادہ تعمیری حیثیت کی حامل تھی۔ کیونکہ اس میں دو تینوں کی حیثیت کی وضاحت کر دی گئی تھی۔ اور یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ نئے آئین کی تمام تر ذمہ داری ہندوستانیوں پر عائد ہوگی، جس کے تحت مجلس آئین ساز میں ہندوستانیوں کو یکجا کرنے اور کسی سمجھوتے کے عملی طریق کار تک پہنچنے کے لئے کوشاں موجود تھی رہے وعدہ بھی تھا کہ جو آئین جو یہ کیا جائے گا وہی حکومتِ برطانیہ کے لئے قابلِ قبول ہوگا۔

- یہ تجاویز برطانوی جنگ کونسل کی متفقہ تجاویز تھیں لہذا کا بینہ میں ان پر اختلاف کا سوال نہ تھا۔
- تجاویز کے ذریعہ جنگ کے دوران کسی باہم آئینی تبدیلی کو ناقابلِ عمل قرار دے دیا گیا تھا۔

## ردِ عمل

مسلم لیگ، کانگریس، ہندو مہاسیما اور دیگر اقلیتوں نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔ اعلان کے بعد

یہی کرپس مختلف رہنماؤں سے بات چیت میں مصروف رہے۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق تھا تو وہ اس تجویز سے قطعاً متفق نہ تھی۔ کہ جو صوبے نہ چاہئیں، مجوزہ ہندوستانی یونین میں شریک نہ ہوں۔ مسلم لیگ کے خیال میں یوں نظر پر پاکستان کی نفی ہوتی تھی۔ مسلم لیگ کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے مطالبہ کو مبہم الفاظ میں تسلیم کرنے کی جگہ کھل کر تسلیم کیا جائے۔

جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا تو انہیں اس تجویز کی بناء پر اکٹڑ بھارت کا خواب ضرورۃً تعبیر ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اس طرح ہندوستان تقسیم ہو جائے گا۔ لہذا کانگریس نے اس سے ہندوستان کے اتحاد پر زور دیتے ہوئے قطعی طور پر ناقابل قبول قراردادے دیا۔ کانگریس چاہتی تھی کہ ریاستوں کے نمائندے نامزد کئے جانے کی جگہ انتخاب کے ذریعہ آئیں۔ کیونکہ اس طرح کانگریس اپنے حامیوں کو منتخب کرانے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ مسلم لیگ ریاستوں کے معاملہ میں خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھی۔ ممکن ہے کہ مسلم لیگ کی طرف سے ریاستی نمائندوں کے بارے میں عدم دلچسپی کی یہی وجہ ہو کہ وہ انتخابی طریق کار کے ذریعہ کانگریس کی قوت میں اضافہ نہ کرنا چاہتی تھی۔

جہاں تک دفاعی امور کا تعلق تھا، کانگریس کا مطالبہ یہ تھا کہ مرکز میں فوری طور پر ایک متروہ حکومت قائم کی جائے اور دفاع کو واسطہ کی دیگر کمیونسل کے کسی ہندوستانی رکن کے براہ راست کنٹرول میں دیا جائے۔

اس مرحلے پر مسلم لیگ کے لئے انتہائی کشمکش اور تذبذب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ کیونکہ اگر وہ مرکزی حکومت کے قیام کے بارے میں کانگریس کے مطالبہ کی حمایت نہ کرتی تو اس پر غیر جمہوری ہونے کا الزام عائد کر دیا جاتا اور اگر وہ اس مطالبہ کا ساتھ دیتی تو مرکز میں ایک کانگریس، یا دوسرے اتحادیوں ہندو حکومت قائم ہو جاتی، اور مسلمانوں کے مفادات خطہ میں پڑ جاتے۔ گاندھی نے کرپس کی تجاویز کو ایک ایسے چیک کا نام دیا۔ جس پر آئندہ کی تاریخ درج تھی۔ گاندھی نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک دیوالیہ بینک کا چیک تھا۔

مختلف جماعتوں کے رہنماؤں سے بات چیت میں ناکامی کے بعد ۱۱ اپریل کو کانگریس نے ان تجاویز کے استرداد کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ کانگریس کا مؤقف خاصا دلچسپ تھا۔ یعنی یہ کہ وہ ہندوستان کے کسی علاقے کے لوگوں کی آزادی سلب نہیں کرنا چاہتی اور ان کی خواہشات کے برعکس ان کو انڈین یونین میں شامل کرنا پسند نہیں کرتی۔ لیکن وہ ہندوستان کی علاقائی سالمیت کے لئے بھی کوئی خطرہ برائست نہیں کر سکتی۔ فیصلے میں ہندوستان کے دفاع کو کسی ہندوستانی کے ہاتھ میں دینے اور فوری طور پر متروہ دار فقی



## باب ۲۸

## کرپشن

دسمبر ۱۹۴۱ء میں جاپانی طیاروں نے پٹن ہاربر میں امریکی بحریہ پر خمد یہ بیماری کی اور چند ٹھنٹوں کے بعد شنگھائی کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ جاپانی، برقی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھتے دیکھتے برطانوی، ملایا اور سیام پر بھی قبضہ کر لیا۔ فروری ۱۹۴۲ء میں سنگاپور کا سقوط ہو گیا اور جاپانی افواج رنگون میں داخل ہو گئیں۔ اور جزائر انڈیمان پر بھی قبضہ کر لیا۔ جب جاپانی افواج ہندوستان کے دروازوں پر پہنچ گئیں۔ تو حکومت برطانیہ کو سخت پریشانی ہوئی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں کو ہندوستان کے عوام کا تعاون حاصل نہ تھا۔ اس سلسلہ میں دائرے اور حکومت برطانیہ کو پہلے ہی ناکامی پہنچی تھی۔ ظاہر ایسی کوئی صورت نہ تھی کہ ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں اور حکومت کے درمیان مفاہمت ممکن ہوتی اور حکومت پُر یقین ہوتی کہ ہندوستان کے عوام اس کی پشت پر ہیں۔

برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل نے انڈیا کمیٹی کے نام سے ایک خاص کمیٹی قائم کی جس سے چیمبرلین ایٹلی تھے۔ اس میں تین دیگر اراکین شامل تھے۔ ایٹلی کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ ہندوؤں سے ان کی گاڑھی چھٹی ہے۔ کمیٹی کے ایک اور رکن سر سٹیوڈنٹ ڈاکٹر کپس تھے۔ حکومت نے کپس کو ہندوستان بھیجے کا فیصلہ کیا تاہم مختلف جمادین کے زیدیہ مسلم لیگ اور کانگریسی رہنماؤں سے بات چیت کریں اور ان میں اتحاد کے لئے کوشش کریں۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو کپس ہندوستان پہنچ گئے۔

سر سٹیوڈنٹ ڈاکٹر کپس نے ہندوستان پہنچتے ہی دائرے ہند، دائرے کی کونسل اور مشاورتی کونسلوں کے اراکین سے ملاقات کے بعد قائد اعظم، سر سکر راجیات خان، فضل الحق، ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو

ڈاکٹر امبیڈکر، ایم۔ ایس۔ راجہ، سر تیج بہادر پورو، جیکر، سادو کر اور دیگر اقلیتوں اور ریاستوں کے نمائندوں سے تیار لیٹھیا گیا۔

۲۶ مارچ ۱۹۴۷ء کو کرپس نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا، کرپس نے اپنی تجاویز پیش کیں۔ جن کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوستان کی ایک نئی ڈومینین قائم کی جائے۔ جس کی تنظیمی بٹانی سطبت مشر کر اور دوسری ڈومینینوں کے ساتھ ہوگی یہ سب مشترکہ طور پر تاج برطانیہ کی اطاعت گزار ہوں گی۔ تاہم انہیں ہر اعتبار سے مساوی حیثیت حاصل ہوگی اور مورہ داخلہ خارجہ کے معاملات میں کسی دوسرے کی پابند نہ ہوں گی۔ جو نہی جنگ ختم ہو جائے گی ہندوستان میں ایک آئین کی تشکیل کے لئے آئین ساز مجلس بنائی جائے گی۔ اس مجلس کا انتخاب تمام صوبائی مجالس متفرقہ کے ایمان ہائے زیریں جنگ کے بعد متفرقہ ہونے والے عام انتخابات میں متناسب نمائندگی کے ذریعے کریں گے۔ اس مجلس آئین سازیں ریاستوں کو بھی نمائندگی دی جائے گی۔ یہ مجلس جو بھی آئین بنائے گی وہ حکومت برطانیہ کے لئے قابل قبول ہوگا تاہم اس کے لئے تین شرائط تھیں۔

۱۱۔ ہر اس صوبہ کو مجوزہ یونین سے الگ دھننے کا حق حاصل ہوگا۔ اور وہ اپنی موجودہ آئینی حیثیت برقرار رکھ سکے گا۔ اگر مجوزہ یونین میں شامل نہ ہونے والے ایسے صوبے پسند کریں تو ان کی ایک علیحدہ یونین مجوزہ ہندوستانی یونین کے برابر قائم کر دی جائے گی۔

۱۲۔ حکومت برطانیہ اور مجلس آئین ساز کے درمیان برطانیہ کی طرف سے ہندوستانیوں کو اختیارات منتقل کئے جانے کی صورت میں جو امور پیدا ہوں گے وہ اس معاہدے میں شامل کئے جائیں گے۔ اس معاہدے کے تحت ہندوستان کی مذہبی اور نسلی اقلیتوں کے تحفظ کے معاملات بھی شامل ہوں گے۔

۱۳۔ ریاستیں اس آئین کے ساتھ فابیشی اختیار کریں یا نہ کریں ان کے ساتھ معاہدہ کے معاملات میں نظر ثانی پر بات چیت ضروری ہے۔

کرپس نے یہ وضاحت بھی کی کہ جنگ کے خاتمے اور مجوزہ آئین کی تیاری تک تاج برطانیہ بہر حال ہندوستان کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ اور اس کے دفاع کی ذمہ داری بھی اس پر رہے گی۔ تاہم فرجی، اخلاقی اور مادی وسائل کی تنظیم کی ذمہ داری بہر حال حکومت ہندوستان پر عائد ہوگی۔

کرپس نے یہ بھی بتایا کہ اگر ہندوستان کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے رہنما چاہیں تو جنگ کے خاتمے سے قبل مجوزہ مجلس آئین ساز کی نوعیت اور اس کے عمل میں تبدیلی کی گنجائش ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ جو صوبہ ایک بار الحاق میں شامل ہو جائے گا اس پر ایسی کوئی پابندی نہ ہوگی کہ وہ الحاق سے نجات ہی نہ حاصل

کانگریس کے اس نعرے کی تردید کی کہ عالمی جنگ برطانوی سامراج تک محدود تھی۔ ہندوستان اُس میں ملوث کیوں ہوا؟ ان کے نزدیک کانگریس کی یہ پالیسی بھی قابل اعتراض تھی کہ ہندوستان میں صرف قومی حکومت قائم ہونا ضروری ہے۔ راج گوپال اچاریہ کے مطابق جب مسلم لیگ قومی حکومت کو تسلیم ہی نہیں کرتی اور ہندوستان کے ایک حصہ میں مسلمانوں کی علیحدہ ریاست کے قیام کا عزم رکھتی ہے تو اس مطالبے کو تسلیم کر لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ اسی بنیاد پر سمجھوتہ کرنے میں کیا نقصان ہے؟

راج گوپال اچاریہ نے اس سلسلہ میں انفرادی مساعی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کیا کہ اپنے صوبہ کی معطل اسمبلی کے تمام کانگریسی اراکین اور دیگر کانگریسی رہنماؤں کا اجلاس بلا یا۔ اس اجلاس نے دو قراردادیں منظور کیں:

- ۱) یہ اجلاس کانگریس کی مجلس عاملہ سے سفارش کرتا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ جو مسلم لیگ کی طرف سے کیا گیا ہے تسلیم کرے۔ نیز اس بنیاد پر مسلم لیگ کے ساتھ بات چیت کا آغاز کرے، تاکہ موجودہ جنگی حالات سے نکلنے کے لئے ایک قومی حکومت کے قیام کی سفارش کی جاسکے۔
- ۲) مدراس میں وزارت اور اسمبلی کو بحال کر کے مسلم لیگ کو وزارت میں شمولیت کی دعوت دی جائے۔

جب یہ قراردادیں منظر عام پر آئیں تو کانگریسی حلقوں میں افراتفری پیدا ہو گئی۔ ہندوؤں کے لئے یہ بات قابل فہم تھی کہ آخر پاکستان کو تسلیم کرنے کی سفارش کرنے والے کانگریسی اور وہ بھی ہندو کانگریسی کیسے ہو سکتے ہیں؟ بہر حال ۲۹ اپریل ۱۹۴۲ء کو یہ قراردادیں کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش ہوئیں جنہیں مسترد کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ کانگریس ایسی کسی تجویز کو کسی قیمت پر قبول کرنے پر تیار نہیں جس کے ذریعے ملک ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا ہو،

اس کے بعد راج گوپال اچاریہ نے ایک اور اقدام کیا۔ انہوں نے مدراس اسمبلی کی نشست اور کانگریس کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد معطل اسمبلی کی کانگریس پارٹی کا ایک اور اجلاس ہوا، ان کی ہندوائی میں سناٹ اور اراکین اسمبلی بھی متعجب ہو گئے۔

کانگریسی رہنماؤں کی باتوں کی وجہ سے رسمی طرح بوکھلا گئے تھے۔

- ۱۰) حکومت برطانیہ نے بالواسطہ پاکستان کا مطالبہ کیوں تسلیم کر لیا تھا۔ کانگریس اسے اپنی شکست اور مسلم لیگ کی فتح سمجھ رہی تھی۔

۳۱۔ راج گوپال چاریہ کی قیادت میں کانگریسوں کا ایک گروہ بر ملا کبرہ تھا کہ پاکستان کے مطالبے کو تسلیم کیا جائے۔

۳۲۔ اور کمرپس نے اپنے مشن کی ناکامی کی ذمہ داری کانگریس پر کیوں عائد کی؟  
۲۷ جولائی ۱۹۴۷ء کو سرسٹیفورڈ کمرپس نے امریکہ کے عوام کے نام ایک نشری تقریر میں کانگریس کی سیاست پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دنیا کی کوئی بھی ذمہ دار حکومت کانگریس کے مطالبہ کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کے مسلمان اور چھوٹے قروں اور پست اقدام کے لاکھوں لوگ کانگریس کے خلبے سے خائف ہیں۔ اگر گاندھی کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا جائے تو ہندوستان میں بھران اور بد امنی ناگزیر ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ برطانوی حالات میں خاموش تماشائی نہیں بن سکتا۔ یہ مسئلہ ہندوستانی نازک اور پوری دنیا کے لئے سنگین ہے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو، کمرپس کے اس بیان سے اتنے بوکھلائے کہ انہوں نے کمرپس کو شیطان کا چہرہ قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ حکومت برطانیہ عرصہ سے ہندوستان میں جو تشیطانی کردار ادا کر رہی تھی۔ وہی آج بھی ادا کیا جا رہا ہے۔ نہرو کا سب سے زیادہ دلچسپ جملہ یہ تھا:  
”میں اپنے ملک کے مسلمانوں کو کمرپس سے زیادہ جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کمرپس ان مسلمانوں پر مراسر ہتھان تراشی کر رہے ہیں۔“

## ’وہی اوچھے ہتھیار‘

کمرپس کے بیانات اور پاکستان کے مسئلہ پر کانگریس کے درمیان پیٹوٹ بننے ایک بار پھر کانگریس کو اپنا پرانا ہتھیار آزمانے پر مجبور کر دیا۔ کانگریس کی بوکھلاہٹ میں یوں بھی اضافہ ہوا کہ ہر طرف سے اس کی مذمت کا سلسلہ چل نکلا تھا۔

۸ اگست ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، جس میں کانگریس کی مجلس عاملہ کی ۱۴ جولائی کی قرارداد کی توثیق کر دی گئی۔ اس کے بعد کانگریس نے یہ اعلان کیا کہ انگریز ہندوستان سے فوراً نکل جائیں اور ہندوستان اور ہندوستانیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ کانگریس نے کہا کہ ہندوستان سے برطانوی حکومت کا فوری خاتمہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اب انگریزوں کا کوئی وعدہ یا کوئی یقین دہانی موجودہ حالات کو معمول پر نہیں لاسکتے۔ ہندوستان کو فوری طور پر ایک آزاد ملک قرار دیا جائے۔ جس کے بعد کانگریس ملک کی تمام بڑی سیاسی جماعتوں اور دیگر گروہوں

حکومت تشکیل کرنے پر بھی اصرار کیا گیا تھا۔

مسلم لیگ نے اپنے فیصلے میں اس بات پر زور دیا کہ عہدہ کیلئے اگر کسی تجاویز میں حکومت برطانیہ نے صرف تجاویز کی حتمی بات کی اور فیصلہ کن انداز اختیار کرنے سے گریز کیا۔ نیز یہ بات واضح کر دی کہ ہندوستان کے لوگ جو یہی فیصلہ کریں گے وہی حکومت برطانیہ کے لئے قابل قبول ہوگا۔ علاوہ ان باتوں کا بھی خاص خیال رکھا گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مرضی کے بغیر کوئی آئینی پیش قدمی نہ کی جائے۔ یوں پاکستان کے امکان کو تسلیم کیا گیا تھا۔ لیکن مسلم لیگ نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ان تجاویز میں کسی ترمیم و اضافہ کی اجازت نہ تھی، نہ ہی متبادل تجاویز طلب کی گئیں۔

مسلم لیگ نے ان تجاویز کو اس بناء پر مسترد کیا کہ مسلم لیگ کیونکہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت پر یقین رکھتی تھی۔ لہذا ایک کی جگہ دو مجالس آئین سازی کی تشکیل ضروری تھی۔ جہاں تک آئین ساز مجلس کے انتخاب کا تعلق تھا تو اس کے لئے جو طریقہ کار تجویز کیا گیا وہ چرچہ مسموم اور مسلمانوں کے مفادات کے برخلاف تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کو جدا گانہ انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندوں کے انتخاب کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ علاوہ ان باتوں کے علاوہ انتخابات کے تحت منتخبہ مجلس آئین ساز میں سادہ اکثریت کے ذریعہ فیصلوں کے باعث مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ ممکن نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ سراسر نا انصافی ہوگی۔ کیونکہ وہ مجلس آئین ساز میں ایک چوتھائی اکثریت کے برابر ہوں گے۔ نیز تجاویز میں الحاق یا عدم الحاق کے بارے میں صوبوں کی رائے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ حق صرف ریاستوں کو تھا کہ وہ یونین سے الحاق کریں یا نہ کریں۔ مسلم لیگ کا ایک اہم اعتراض یہ بھی تھا کہ تجاویز میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ اگر تاج برطانیہ اور انڈین یونین یا یونینوں کے درمیان معاہدے کی شرائط کے بارے میں اختلاف ہو گیا تو آئندہ اقدام کیا ہوگا؟ مسلم لیگ کے فیصلے کے آخر میں یہ بھی کیا گیا کہ جب ہر بات مکمل کر سامنے نہ آئے اس وقت تک مسلم لیگ عارضی انتظامات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اور جب تک مسلم لیگ کی قرارداد پاکستان مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء کو تسلیم اور مسلمانوں کو حق خود اختیاری نہیں دیا جاتا۔ مسلم لیگ کے لئے مستقبل کی کوئی سکیم یا تجویز قبول کرنا ممکن نہ ہوگی۔

قائد اعظم نے قومی حکومت کے قیام کے مسئلہ پر بات کرتے ہوئے کہا کہ کہیں کے ساتھ عارضی انتظامات کے بارے میں ان کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی اور اگر کانگریس کی مقبول تجاویز کو قبول کر لیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ایسی حکومت تشکیل ہوگی جسے علیحدہ نہ کیا جاسکے گا اور جو صرف اکثریت کے سامنے جوابدہ ہوگی اور جس کی کاہنہ پر صرف کانگریس کی گرفت ہوگی۔ قائد اعظم نے اسی حکومت کو ایک ناشٹ

کرانڈ کونسل "قرارداد اور کہا کہ مسلمان اور دیگر اقلیتی فرقے کانگریس کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ لہذا جنگ کے بعد مستقبل کی بات کرنا کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس لئے کرائس وقت تک سوائے تفصیلات کے مستقبل کے بارے میں اقدام کے لئے اور کوئی بات ہی نہیں رہے گی۔

## کرپس کا بیان

کرپس ناکام ہو کر لندن واپس چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ۲۸ اپریل ۱۹۴۲ء کو دارالعوام میں ایک بیان دیتے ہوئے اپنے مشن کی ناکامی کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا کہ کانگریس، ملک کو بہر حال متحد رکھنا چاہتی ہے۔ جبکہ حکومت برطانیہ کا فرض ہے کہ وہ دو بڑے فرقوں کے درمیان ایسا سمجھوتہ کرے جو دونوں کے لئے قابل قبول ہو، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ملنا چاہیے۔ نہ کہ سب کچھ ایک ہی کے دامن میں ڈال دیا جائے۔ کانگریس کا سب سے بڑا اعتراض عبوری دفا عی انتظامات کے بارے میں ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ حکومت ہندوستان کو دفا عی امور پر مکمل اختیارات حاصل ہوں۔ لیکن یہ بات نہ صرف حکومت برطانیہ بلکہ ہندوستان کی مؤثر اقلیتوں کے لئے بھی ناقابل قبول ہے۔ بات حقیقت ایک عبوری حکومت کے قیام کے مرحلہ پر آ کر ٹوٹی۔ حالانکہ یہ بات داف عی کردی گئی تھی کہ جنگ کے خاتمہ تک آئین میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے گی۔ کانگریس عبوری حکومت کے قیام پر برابر اصرار کرتی رہی مگر مکمل اختیارات کی بات ماسوا کانگریس کے کسی اور جماعت نے نہ کی۔ چنانچہ کانگریس کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ سمجھوتے کے ہر امکان کو خارج از بحث قرار دینا پڑا۔ اگر ایک بار ایگزیکٹو کونسل کے قیام کا راستہ انتخاب کر لیا جاتا تو یہ کونسل صرف انہوں کے آگے جواب دہ ہوتی اور اقلیتوں کے تحفظ کا سوال ختم ہو جاتا۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کوئی بھی اقلیت، خاص طور پر مسلمان اس مسئلے کو کسی قیمت پر قبول نہ کرتے اور شاید کبھی تیار نہ ہوں۔

## ”میں نہ مانوں“

کانگریس کے اندر بھی سوجھ بوجھ سے کام لینے والا ایک عنصر موجود تھا۔ جو اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ایک نہ ایک دن حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی۔ لہذا بلا حرج تاخیر سے کام لینے کی جگہ کیوں نہ اس حقیقت کو آج ہی تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن کانگریس کے متعصب رہنماؤں کی اکثریت میں اس سمجھوتے سے عنصر کی آواز نہ بکرنے لگی۔ کانگریسی تقاضا نے یہی یہ آواز راج گوپال اچاریہ کی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے تو

سرماء مل برعاری حکومت قائم کئے گی۔ اس وقت کا یہ لافز ہندوستان کا دفاع اور بحار حقیقت کے مطابق وسیع اور غیر مستند انداز میں محفوظ ہوگا۔ یہ عارضی حکومت ایک انجمن ساز اسمبلی کی تشکیل کے لئے ڈھانچہ بھی بنیاد رکھے گی۔ جو بعد ازاں تمام صنعتیں پر مشتمل ایک فائن قائم کئے گی جس میں ہر وحدت کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے گی۔ قراردادوں میں کہا گیا کہ حکومت نے فوراً ہندوستان سے دست بردار می اختیار نہ کی تو ہندوستان کے عوام عدم تشدد کی پوری طاقت کے ساتھ انگریزوں کو باہر نکال دیں گے کانگریس کمیٹی نے یہ فیصلہ تسلیم کیا۔

گاندھی نے خود کو ”کھلا باغی“ قرار دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۴۲ء کو حکومت کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دے کر گاندھی اور اہم کانگریس رہنماؤں کو گرفتار کر لیا حکومت کے اس اقدام کے نتیجہ میں ہندوستان بھر میں ہندوؤں نے ہنگامے شروع کر دیئے۔ ریلوں کی پٹریاں اکھاڑ دیں اور ریلوے سیشنوں، تارکھروں اور ڈاکخانوں کو شدید آتش کرنا شروع کر دیا۔ بہت سے ہوائی اڈوں کو بھی نقصان پہنچا یا گیا۔ جا بجا تشدد کیا گیا۔ اور سینکڑوں افراد قتل کر دیئے گئے۔

کانگریس کی اس تحریک کو مختلف طبقہ خیال کے لوگوں کا کوئی تعاون حاصل نہ ہوا۔ اپنا تمام کے رہنماؤں کو امید کرنے کانگریس کے اس اقدام کی مذمت کی۔ انڈین نیشنلسٹ لیگ نے اسے ”گاندھی کا احمقانہ اقدام“ قرار دیا حتیٰ کہ ہندو مہاسبھا کے رہنماؤں نے بھی اپنے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان سے نکل جاؤ۔ تحریک کے ساتھ نژدوں کانگریس کی دوست مجلس احرار اسلام نے بھی اسے بے وقت اقدام قرار دیا۔

قائد اعظم نے اس تحریک پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایسے موقع پر جب حکومت نہایت نازک حالات سے دوچار ہے اس قسم کا اقدام ناجائز ہے اور بدترین غداری کے مترادف ہے۔ انہوں نے کانگریسی رہنماؤں کی گرفتاریوں کو منظر استحسان دیکھا۔

بعض یونیورسٹی اور امریکی اخبارات نے اسے ۱۹۴۲ء کی بغاوت کا نام دیتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی، کہ موجودہ تحریک ہندوستان کی آزادی کی راہ میں جدوجہد نہیں بلکہ اس تحریک کی صحت میں گاندھی کی بیٹھی بیٹھی باتوں کے سب پروردہ مشتمل قوانین سے بے پروہجوم کی غراہٹ سنائی دیتی ہے۔

کانگریس نے یہ اقدام کیوں کیا؟

کانگریس کے دفاع دار سائنسی اور اسلام آزاد کی ترقیاتی..... اصل بات یہ تھی کہ:

”کانگریس کو یقین ہو چکا تھا کہ جاپانیوں کے ہاتھوں اتحادیوں کو شکست ہوگی۔ ہندوستان کے

اور اسے پر دشمنوں کی دستک نے کانگریسی رہنماؤں کو اس معاملہ میں اور زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ لیکن انہوں نے  
 نئے ذہن میں یہ بات سمجھ لی کہ جو بھی جاپانی بیگمیاں داخل ہوں گے اور برطانوی فوجیں بہار کی طرف بھیجے جائیں  
 گی۔ کانگریسی فورسز اور پر ملک پر قبضہ نہ کر سکیں گی۔ پسند پر ۱۹۴۲ء کے وسط میں کم کر دیا گیا تھا۔ کانگریسی  
 رہنماؤں نے یہ خیال کر لیا کہ جاپان، ہندوستان میں داخل ہوگا تو برطانیہ کے دشمن کی حیثیت سے اور جو بھی ہندوستان  
 سے نہ نکلے گا۔ آخر میں جاپان، ہندوستان پر حملہ کرتے ہوئے ان کے ارادہ ترک کر دیے گا۔ لیکن کانگریسیوں کو یہ علم نہ تھا کہ  
 جاپانیوں کے ہنگاموں میں داخل ہونے سے قبل ہی خود جیل میں داخل ہو جائیں گے۔



## گاندھی جناح باٹ چیمٹ اور راجہ نارملو

کانگریس کو ۱۹۴۲ء میں انگریزوں کو ہندوستان سے نکل جانے کا حکم دینے اور اسے باقاعدہ تحریک کی صورت دینے کے اقدامات کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ گاندھی سمیت قریباً تمام رہنما جیلوں میں پہنچ گئے، جہاں انہیں طویل عرصہ گزارنا پڑا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ کو اپنی تنظیم مضبوط کرنے کا بہترین موقع مل گیا اور جب کانگریسی رہنما جیلوں سے نکل کر دوبارہ میدان سیاست میں آئے تو انہیں دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئی۔

راج گوپال اپاریہ نے ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں قطعاً حصہ لیا کیونکہ وہ اسے کانگریس کے لئے ہلک سمجھتے تھے۔ دوسری ہندو جماعتیں حق کہہ سکتی ہیں کہ ہندو سماج بھی اس تحریک سے الگ تھلک رہی۔ راج گوپال اپاریہ نے مسلم لیگ کی قرارداد لاہور (۱۹۴۰ء) کی بنیاد پر ناگہری اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن کانگریس کو یہ ذمہ نثار وہ نہ تھی اور نہ ہی وہ جماعت ہے اور انگریز کو آخر کار اس کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی پڑی ہے۔ راج گوپال اپاریہ نے بار بار کانگری کے باوجود سمجھوتہ کرنے سے اپنی کوشش باہان بنی۔ انہوں نے ۱۹۴۲ء میں اسی سمجھوتہ کے لئے قائد اعظم سے بھی ہندو اور ملتان کی اور ان کے خیالات کو پوری غور سے سمجھنے کے بعد اسی سمجھوتہ کے لئے ایک بار بار کوشش کی۔ راج گوپال اپاریہ اسی سلسلہ میں گاندھی سے بھی ملنا جاتے تھے، لیکن انہوں نے اس کی اجازت نہ دی۔ جب ۱۰ فروری ۱۹۴۲ء کو گاندھی نے جیل سے چھٹکارا کر لیا، تو ان کے لئے

۲۱ دن کا برت شروع کر دیا تو ان کے کچھ دوستوں وغیرہ ملاقات کی اجازت مل گئی۔ مگر گاندھی، جیل سے نجات حاصل نہ کر سکے۔ اسی دوران راج گوپال اچاریہ نے بھی ملاقات کی اور انہوں نے قائد اعظم سے گفتگو کے بعد جو فارمولہ لایا رکھا تھا، گاندھی کو دکھایا، ان کی رضامندی حاصل کی اور ۱۷ اپریل کو قائد اعظم سے ملاقات کے دوران یہ فارمولہ کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے فارمولہ پہ گاندھی کی رضامندی سے بھی مطلع کر دیا۔ قائد اعظم نے اس کا کوئی حتمی جواب تقریباً ڈیڑھ ماہ تک نہیں دیا۔ البتہ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اشارہ کیا کہ اگر گاندھی، مسلم لیگ کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے کے خواہشمند ہیں تو وہ براہ راست ان سے بات کیوں نہیں کرتے؟ جب گاندھی تک یہ اطلاع پہنچی تو انہوں نے ملاقات کی خواہش کا اظہار بذریعہ خط کیا۔ لیکن سمجھوتہ کے بارے میں اس خط میں کچھ نہ لکھا۔ چنانچہ قائد اعظم نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔

اکتوبر ۱۹۴۳ء میں لارڈ مونتگمری کی جگہ لارڈ ویل ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے اس دوران جنگ کے حالات بھی کافی بدل چکے تھے۔ اتحادیوں کی فتح کی پیشگوئی کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ جہاں تک لارڈ ویل کا تعلق تھا، وہ ملک کی تقسیم کے حق میں نہ تھے، ان کے خیال میں جغرافیہ تبدیل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مئی ۱۹۴۳ء میں گاندھی کی ملاقات کی بنا پر جیل سے رہا کر دیا گیا۔ گاندھی نے رہائی کے تقریباً اڑھائی ماہ بعد قائد اعظم کو ایک خط میں لکھا کہ انہیں مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھا جانے اور ان کی ملاقات کی خواہش کو پورا کر دیا جائے ورنہ انہیں سخت مایوسی ہوگی۔ محمد علی جناح نے ملاقات پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔

۹۔ ستمبر ۱۹۴۳ء کو ان دونوں رہنماؤں کی ملاقات قائد اعظم کے مکان پر ہوئی۔ راج گوپال اچاریہ کا فارمولہ زیر بحث آیا۔ فارمولہ کا اقتباس یہ تھا:

”درج ذیل شرائط کے تحت مسلم لیگ ہندوستان کے لئے آزادی کے مطالبہ کی حمایت کرنے ہوئے لاگوس کے تعاون سے ہندوستان میں ایک عبوری عارضی حکومت کی تشکیل پر تیار ہے۔“

● ہندوستان کے شمال مغرب اور مشرق میں ان اضلاع میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، جنگ ختم ہوتے ہی ایک کمیشن مقرر کر دیا جائے گا، جو ان اضلاع کی حد بندی کرے گا۔ ان تمام اضلاع میں اقتصاب رائے نامہ کے ذریعہ علیحدگی کے مسئلہ پر فیصلہ کیا جائیگا۔

اگر اس اضلاع کی اکثریت ایک آزاد ریاست کے حق میں رائے سے  
تو اس فیصلہ پر فوراً عمل کیا جائے۔ سرحدی اضلاع کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ  
ہندوستان یا نئی ریاست میں سے جس میں چاہیں، شامل ہو جائیں۔

- تمام سیاسی جماعتوں کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ استنصاب رائے  
سامرہ سے پہلے اپنے موقف اور نقطہ نظر کی عام وضاحت کر سکیں۔
- علیحدگی کی صورت میں دفاع، تجارت، مواصلات اور دیگر ذہنی امور  
سے متعلق معاہدے کئے جائیں۔

- ایک ریاست سے دوسری ریاست میں آبادی کا تبادلہ ممکن نہ ہوگا۔

- ان شرائط کی پابندی اسی صورت میں کی جائے گی کہ حکومت برطانیہ  
ہندوستان کی حکومت کی تمام نوٹہ داریاں اور عمل اختیارات منتقل کر دے

قائد اعظم کو تو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے گاندھی سے بات چیت کرنے کا  
مکمل اختیار دے دیا تھا لیکن کیا گاندھی ذاتی حیثیت میں اس معاہدے کو تسلیم کر رہے  
تھے یا انہیں بھی کانگریس کی طرف سے یہ اختیار حاصل تھا؟ ماضی میں بار بار ایسا ہوا کہ گاندھی  
ایک فیصلہ کرنے کے بعد کانگریس کے انکار پر خود بھی انکار کر دیا۔ یا یہ کہہ کر بات کو الجھانا  
چاہا کہ وہ تو کانگریس کے حامی ہیں لیکن البتہ وہ کانگریس کی رہنماؤں کو رضامند کرنے کی کوشش  
کریں گے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ گاندھی کو کانگریس کی طرف سے اس معاہدے پر دستخط  
کرنے کا کوئی اختیار نہ دیا گیا تھا۔ لہذا اس بات چیت کو طول دینے کا مطلب محض وقت کا  
ضیاع تھا۔ اس لئے کہ بات چیت ایک جماعت اور ایک فرد کے درمیان ہو رہی تھی اور اس  
امر کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ کامیابی کی صورت میں یہ فرد اپنی جماعت کو بھی رضامند کر سکے گا۔  
قائد اعظم کو بھی یہی اعتراض تھا۔ تاہم انہوں نے اتمام حجت کے لئے مذاکرات میں مکمل دلچسپی کا  
ظاہر کیا۔

قائد اعظم کو دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مسلم لیگ کی طرف سے مطالبہ آزادی کی حمایت کا  
مطلب یہ تو نہیں کہ مسلم لیگ دراصل کانگریس کی قرارداد اگست ۱۹۴۶ء کی حمایت کر رہی ہے  
یا یہ کہ مسلم لیگ بجائے خود حصول آزادی کی خواہشمند نہیں۔ تیسرا اعتراض یہ تھا کہ پہلے متحدہ

ہندوستان کی حکومت ذمہ داریاں اور اختیارات حاصل کرے اور پھر اسے تصواب رائے عامہ کے پروگرام پر عمل ہو یا یہ دونوں کام ایک وقت میں یعنی حکومت برطانویہ وقت کے ریاستوں کو ایک وقت میں ذمہ داریاں اور اختیارات منتقل کرے، کیونکہ مسلم لیگ سب سے پہلے ہندوستان کی تقسیم کے اصول کو بنیاد بناتی تھی اور ہندوئی کا سوال اس کے بعد پیدا ہوتا تھا۔

قائد اعظم یہ چاہتے تھے کہ سب سے پہلے ان اعتراضات اور معاہدہ کے ان استقام کو دور کیا جائے تاکہ اس کے بعد ٹھوس بنیادوں پر کوئی بات چیت ہو سکے۔ ۹ ستمبر سے ۲۶ ستمبر ۱۹۴۴ تک دونوں رہنماؤں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور خط و کتابت بھی جاری رہی۔ آخر کار وہیں ٹوٹی اور گاندھی نے ایک خط میں قائد اعظم کو مطلع کیا کہ :

● ”میں تو کانگریس کو صرف مشورہ دے سکتا ہوں یہ کام کانگریس کا ہے کہ وہ میرے مشورہ کو قبول کرے یا نہ کرے

● ۶-۷ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور میں تو اس بات کا کہیں ذکر نہیں کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں اور ان کی دو الگ ریاستیں قائم ہونا ضروری ہیں۔

● میں جہاں تک مسلم لیگ کی مذکورہ بالا قرارداد کا مطلب سمجھ سکتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ایک خاندان کے ارکان ایک ہی مکان کے اندر الگ الگ کھڑے ہوں۔

● ان حدود کے تقرر کے بعد بھی خاندان کے دونوں حصوں سے بعض معاملات کی ذمہ داریاں مشترک ہوں گی۔

● سب سے پہلا کام حصول آزادی ہے۔ اس کے بعد ہی اس مکان کے کمرؤں کی تقسیم ممکن ہوگی تاہم مکان مشترک رہیگا۔

قائد اعظم نے گاندھی سے مناظر کے الٹ پھیرتے چکر دینے کی کوشش کر رہے تھے اور مکان کے کمرؤں اور اینٹخانہ کی بات کر کے تقسیم کے اصول کو تسلیم کرنے سے واضح انکار کر رہے تھے۔ قائد اعظم نے اسی دن گاندھی کو لکھا کہ میرا تکل کر کریں اور واضح موقف اختیار کریں۔ اگر معاملات کو ابھانے کی کوشش کی گئی تو نتیجہ کچھ بھی نہ نکل سکے گا۔ اگر گاندھی مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم تسلیم کرنے کے حق میں نہیں تو کسی تجویز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انہی بات پر جب امام کو کسی بات چینیہ اور شرط تھا بہت کے وہ ان کا مذہبی مختلف  
 بابوں پر اس کے مذہبی سرکش کرتے رہے لیکن ملک کی تیسرے اور مسلمانوں کے لئے  
 بہت سے ان کے معاملہ یہ اپنی 'میں زمانوں کی پالیسی یہ تھا کہ'۔

## باب ۳

# بیرونی اصول و مشملہ کانفرنس

گاندھی، جناح بات چیت کی ناکامی کے بعد مرتیج بہادر سپروجنوں نے ۱۹۴۱ء میں ایک غیر جماعتی کانفرنس میں بلائی تھی، نے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان مصالحت کے نئے از سر نو کوشش شروع کر دی۔ ان کی ایک تجویز یہ تھی کہ غیر جماعتی کانفرنس کی مجلس قائمہ ہندوستان کے مستقبل کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کرے۔ اس کمیٹی پر کوئی فیصلہ دینے کی ذمہ داری ماندہ تھی۔ مقصد یہ تھا کہ یہ کمیٹی جس قیصر پر بھی پہنچے اسے احاطہ تحریر میں لائے، دستخط کرے اور اسے سربمہر کر کے پارٹیوں کے حوالے کر دے۔ بعد ازاں سیاسی جماعتوں کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ کمیٹی کی تجاویز قبول کریں یا نہ کریں گاندھی نے اس تجویز سے اس شرط پر اتفاق کیا کہ اس کمیٹی میں مسلم لیگ اور کانگریس سمیت کوئی مسئلہ سیاسی جماعت شریک نہ ہو، نہ ہی اس کمیٹی میں ایسے لوگ شامل کئے جائیں، جنہوں نے گاندھی۔ جناح بات چیت کی ناکامی کے بعد کسی واضح رائے کا اظہار کیا ہو۔

غیر جماعتی کانفرنس کی مجلس قائمہ کا اجلاس ۱۹۔ نومبر ۱۹۴۲ء کو اس غرض سے دہلی میں منعقد ہوا۔ اسی دن تیج بہادر سپرو نے یہ بھی بتایا کہ کمیٹی میں کسی مسئلہ سیاسی جماعت کا کوئی شخص شریک نہیں ہو گا۔ بہتر یہ ہو گا کہ اس میں ہائی کورٹ کے دو سابق جج اور ایک یادو انگریزوں کو شامل کر دیا جائے۔ ۳۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کو کمیٹی کا دوسرا اجلاس الہ آباد میں ہوا۔ نئی کمیٹی کے اراکین کے ناموں کا اعلان کیا گیا، جس میں مرتیج بہادر سپرو بطور چیرمین، جیکر، ہلشپ، فاس، ویسٹ کو

راہکار کشن، سر جی جی، سر ہزاراج سنگھ، محمد یونس، این آر سرکار، فریک اینتھوئی اور سنت سنگھ شامل تھے۔ ۱۰۔ دسمبر کو سپروٹنے کمیٹی کے چند اراکین کے ساتھ قائد اعظم سے ملاقات کی اجازت چاہی لیکن قائد اعظم نے کمیٹی کے مقاصد سے عدم اتفاق کی بنا پر ملاقات سے معذرت کر دی۔

کمیٹی کے متعدد اجلاس ہوئے۔ ۸۔ اپریل ۱۹۴۵ء کو اس نے جو قراردادیں منظور کیں اور تجاویز پیش کیں، ان کے مطابق ہندوستان کی تقسیم کی مخالفت کی گئی تھی۔ ملک کا آئندہ آئین مرتب کرنے کے لئے ۱۹ اراکین پر مشتمل آئین ساز جماعت کی تشکیل اور ہندوستان کے مجوزہ وفاق میں ہندوستان کی ریاستوں کی بطور وحدت، شمولیت کی سفارش کی گئی۔ ہندوستان کے آئندہ آئین میں بنیادی حق کی وضاحت اور ایک آزاد قلمی کمیٹی کے قیام کی تجویز بھی پیش کی گئی نیز جداگاندہ انتخابات ختم کرنے اور مجلس آئین ساز، مرکزی اسمبلی اور مرکزی انتظامیہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمائندگی کے لئے کہا گیا۔

کمیٹی نے رپورٹ میں یہ سفارش بھی کی کہ اگر یہ تجاویز مختلف سیاسی جماعتوں اور فرقوں کے قابل قبول نہ ہوں تو حکومت برطانیہ ہندوستان میں ایک عبوری حکومت قائم کر دے اور آئندہ نئے آئین کی تشکیل کے لئے ان تجاویز کے تحت ایک جماعت بھی قائم کر دے۔ آئین پارلیمان میں پیش کرنے کے بعد جلد از جلد نافذ ہو۔ ہندو ماسبما، سکھوں اور دیگر چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے اس تجویز کو اس بنا پر مسترد کر دیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی کا حق دیا گیا تھا۔ دیگر سکھوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے کوئی تجویز تھی۔ قائد اعظم نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ کمیٹی گاندھی کی دمن پر قیاس کر رہی ہے۔

## لیاقت ڈیسا نی معاہدہ

اپریل ۱۹۴۵ء میں یہ افراد عام ہو گئی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی معاہدہ طے پایا گیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ لیاقت علی شاہ اپنے طور پر مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے قائد بھولا بھائی ڈیسا نی کے ساتھ مل کر عبوری حکومت سے متعلق کسی سمجھوتہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ طے پایا تھا کہ عبوری حکومت میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مساوی نمائندگی ہو۔ ڈیسا نی کا کہنا تھا کہ اس تجویز کو گاندھی کی حمایت حاصل تھی اور قائد اعظم کو بھی اس کا

مکڑن اور مہربانی آجیوں نے محتب اراکین سے لیا جائے۔

۲۔ تمام کونسل بدوستانی اراکین پر مشتمل ہو۔ البتہ وائسرائے اور کمانڈر انچیف حکومت برطانیہ کے، یعنی انگریزوں کے۔

۳۔ وزارت بینک کمانڈر انچیف کے پاس ہو اور باقی محکمے کونسل کے اراکین کے پاس۔

۴۔ نئی کونسل اسی دستور کے تحت کام کرے جو اس وقت ملک میں موجود تھا۔

۵۔ گورنر جنرل کو اپنی کونسل کا کوئی فیصلہ مسترد کرنے اور اس فیصلہ کے برعکس اپنے فیصلہ کے مطابق عمل کرنے کا اختیار ہو۔ تاہم وہ اس اختیار کا استعمال بلاوجہ نہ کرے۔

۶۔ تاج برطانیہ اور ہندوستان کی ریاستوں کے تعلقات بدستور وائسرائے کی وسالت سے قائم رہیں۔

۷۔ برطانیہ کے تجارتی و دیگر مفادات کی نگرانی کے لئے ہندوستان میں نوآبادیاتی سطح کا ایک انگریزی بائی کسٹرز موجود رہے۔

ایگزیکٹو کونسل کے اہم فرائض یہ تھے:

۱۔ جاپان کے خلاف جنگ کو کششیں۔

ب۔ نئے اور مستقل آئین پر تمام پارٹیوں کے اتفاق رائے تک امور حکومت ہند چلانا۔

ج۔ آئین پر اتفاق رائے کے لئے غور و غوض۔

لارڈ ویول نے اپنی نشری تقریر میں یہ بات بھی بتائی کہ اگر یہ تجاویز منظور کر لی گئیں اور ان پر عمل شروع ہو گیا تو ایسے تمام شعبوں میں از سر نو وزارتوں کا قیام عمل میں آئے گا، جہاں وزارتوں کے مستعفی ہونے کے باعث گورنر راج قائم تھا۔

ان دنوں درہنوں کی پوزیشن یہ تھی کہ کانگریس تو چھ شعبوں میں اپنی وزارتیں ختم کر چکی تھی اور اپنی اس اجتماعہ سیاسی حرکت پر اب تک ہاتھ لک رہی تھی۔ اُدھر صوبہ سرحد اور بنگال میں علی الترتیب سرحد اور نائیب اور غرض انظم اندین کی وزارتوں کو شکست ہو چکی تھی۔ صوبہ سرحد میں کانگریس بانی کمان نے لارڈ راج صاحب کو وزارت سازی کی اجازت دے دی تھی۔ بنگال کو وزارت کے تحت رہا۔ چنانچہ ویول نے اس مدن کے وقت نہرٹ سندھ او۔ آسام میں وزارتیں قائم کیں۔



نہ تھا۔ جو نیز یہ بات شامل تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ عبوری حکومت میں جن لوگوں کو شامل کر لیا گیا۔ خروزی نہیں کہ وہ مرکزی اسمبلی کے رکن بھی ہوں۔ بینر سکتوں اور اچھوتوں کا ایک ایک نمائندہ بھی شامل ہو۔ یہ تجاویز و اسرارے کے ساتھ پیش نہ دی گئیں اور اس توقع کا اظہار کیا گیا کہ گاندھی اور جٹان جی ان پر سادہ کریں گے۔ والٹر رائے نے یہ تجاویز وزیر امور ہند کو روانہ کر دیں لیکن اس کا اقتراض یہ تھا کہ ان میں جنگ کے معاملہ پر حکومت کی حمایت کا کوئی ذکر نہیں۔ نیز گورنر جنرل کو کونسل کے اراکین کی نامزدگی کے حق سے محروم کر دیا گیا جسے نہ ہی غیر کانگریسی ہندوؤں، غیر مسلم لیگ صحافیوں اور قلمیوں کے بارے میں کوئی تفصیل موجود ہے۔

ابھی پندرہ باری تھا کہ قائد اعظم نے اس معاہدہ سے لاشمی کا اظہار کر دیا۔ اصل معاملہ کیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات اتنا جملہ ہے کہ طاقت علی خاں نے بلا بالا ایسی کوئی کوشش کی جو اسے یہ بات بھی قابل قبول نہیں کہ پہلے قائد اعظم نے طاقت علی خاں کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی جو اور بعد میں گاندھی کی طرح اپنی بات سے پلٹ گئے ہوں۔ بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور ڈیپٹی میٹھ کے سیاست سے خارج ہو گئے۔

یہ سب کچھ جان لینے کے بعد ممبئی لارڈ ویول مئی ۱۹۲۵ء میں لندن چلے گئے تاکہ اس منصوبہ پر کوئی بات چیت کی جاسکے۔

## ویل منسوبہ

لارڈ ویول لندن پہنچے۔ اسی دوران جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے اور یورپ میں جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اب حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے فوری طور پر اقدامات کئے جائیں۔ لارڈ ویول اپنے ساتھ جو منصوبہ لے کر گئے تھے اس پر انہوں نے انجمنستان میں مختلف اراکین حکومت کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ وہ ۴۔ جون ۱۹۲۵ء کو بعض تجاویز کے ساتھ ہندوستان لوٹ آئے۔ انہی تجاویز کو ویول منسوبہ کا نام دیا گیا۔ ۳۔ جون کو انہوں نے ریڈیو سے تجاویز کا اعلان کیا، تب باب یہ تھا:

۱۔ موجودہ ایگزیکٹو کونسل ختم کر کے اس کی جگہ ایک نئی ایگزیکٹو کونسل قائم کر دی جائے۔ نئی کونسل میں مسلمانوں اور اونچی جاتی کے ہندوؤں کی نمائندگی مساوی ہو اور غائبوں کو

وزارتوں کی بھالی سے متعلق دیوکل کا اعلان کانگریس کے لئے گزشتہ چھ سال میں سب سے بڑی خوشخبری کے مترادف تھا لیکن اپنے دل میں وہ اس خوار کی کھٹک بھی شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ وزارتیں مخلوط ہوں گی۔ کانگریس کو یہ بھی رنج تھا کہ دیول منصوبہ کے تحت اونچی جاتی کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مساوات قائم کر کے انہیں (ہندوؤں کو) مسلمانوں کی سطح پر کیوں لایا گیا اور ان صوبوں میں جہاں ہندو اکثریت میں تھے، مخلوط وزارتیں قائم کرنے کی تجویز کیوں رکھ گئی؟ بہر حال کانگریس نے نہایت چالاکی سے یہ موقف اختیار کیا کہ دائرہ رائے نے اونچی اور نیچے ذات کے ہندوؤں میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر کانگریسی ہندوؤں نے اس بات پر احتجاج کرتے ہوئے ہندوستان اور اپنے مذہب کی تاریخ کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا جبکہ اس احتجاج کے لئے ایک اچھوتوں کے ساتھ حسن سلوک اور ذات پات کے اقدار کو ختم کرنے کے لئے گاندھی کے میکر جاری تھے اور وہ مثال قائم کرنے کے لئے خود اچھوتوں کی بستی میں قیام فرماتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کا احتجاج اس دکھ پر مبنی نہ تھا کہ ذات پات کی تیز کیوں پیدا کی گئی بلکہ مقصد یہ تھا کہ نیچے ذات کے ہندوؤں کو عام ہندوؤں میں شامل کر کے اچھوتانیت کو نظر انداز کیا جانا چاہئے تھا اور اس طرح زائد تعداد کی بناء پر مسلمانوں کے مقابلہ میں مساوی نمائندگی کو ختم کر کے کانگریس کے لئے زائد نمائندگی حاصل کرنا تھا۔ یعنی ایک پختہ دو کا۔ اچھوت اپنے حقوق سے محروم، کانگریس کی نفرت میں اضافہ! ۲۱۔ جون کو کانگریس کی مجلس عامہ نے ایک ہدایت نامہ جاری کیا جو شملہ کانفرنس میں مدعو کانگریسی نمائندوں کے نام تھا جس میں کہا گیا تھا کہ مدعو کانگریسی، کانفرنس میں اس بات کی مخالفت کریں کہ مسلمان نمائندوں کے نام صرف مسلم لیگ ہی پیش کرے بلکہ کانفرنس میں شریک ہونے والے تمام گروہ، کونسل کی رکنیت کے لئے مسلمانوں، پست اقوام اور ہندوؤں کے نام مشترک طور پر پیش کریں۔

## شملہ کانفرنس

لاڈ ویل نے ۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو شملہ کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت نامے جاری کئے۔ مدعوین میں صوبائی حکومتوں کے وزراء نے اعلیٰ، مستعفی کانگریسی وزارتوں کے سابق وزراء نے اعلیٰ، مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر، مرکزی اسمبلی کانگریس پارٹی کا سیکرٹری، نیشنل اریورہین گروپ کے لیڈر، گاندھی اور قائد اعظم محمد علی جناح شامل تھے۔ مؤخر الذکر

دونوں رہنماؤں کو مسلم رہنماؤں کی حیثیت میں دعوت دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں لیست اقوام اور سکھوں کا ایک ایک نمائندہ بھی مدعو کیا گیا۔ جہاں تک گاندھی کا تعلق تھا تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ وہ کانگریس کے ابتدائی رکن بھی نہیں، لہذا کانگریس کی نمائندگی کیسے کر سکتے ہیں، وائسرائے سے معذرت کر لی۔ قائد اعظم نے وائسرائے سے درخواست کی کہ ان کی نشری تقریر میں مثال بعض باتوں کی وضاحت قبل از وقت ضروری تھی تاکہ وہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے مشورہ کر سکیں۔ انہوں نے کانفرنس ۱۵ دن کے لئے ملتوی کرنے کو بھی کہا۔ وائسرائے نے کانفرنس کے انعقاد پر معذرت کرتے ہوئے قائد اعظم کو جواب دیا کہ یہ وضاحت کانفرنس کے اجلاس ہی میں کی جائے گی۔ وائسرائے نے یہ مشورہ بھی دیا کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس اگر شملہ میں طلب کر لیا جائے تو باجماعت حیات میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ ۲۴ جون کو لارڈ ڈویل نے شملہ میں قائد اعظم، گاندھی اور ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی۔ گاندھی نے ابوالکلام آزاد کا نام اپنی جگہ تجویز کیا تھا۔ گاندھی کے اس اقدام کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ کانگریس ہندوؤں ہی کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی نمائندہ بھی ہے۔ پنجاب کے خیریات ٹرانڈ نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ وائسرائے کی کونسل میں یونینسٹ پارٹی کو بھی نمائندگی ملنی چاہئے۔ کانگریس اور گرد وائسرائے کو یہ مطالبہ ”پسند“ تھا کیونکہ اس طرح پاکستان کے مقصد کو نقصان پہنچایا جاسکتا تھا۔ لیکن قائد اعظم نے اس مطالبہ کی شدید مخالفت کی اور صاف طور پر بتا دیا کہ یونینسٹ پارٹی جو یا کانگریس، دونوں میں کسی کو مسلمانوں کی نمائندگی کا کوئی حق حاصل نہیں اور وائسرائے کی کونسل میں مسلمانوں کی طرف سے صرف مسلم لیگ کے نمائندے شامل ہوں گے۔ قائد اعظم نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ چھوٹی اقلیتیں کیونکہ ہندوؤں کی ہموائی کریں گی لہذا قدرتی طور پر مسلمان اقلیت میں رہ جائیں گے۔ چنانچہ جب مسلمان اکثریت کسی مسئلہ پر مخالفت کرے تو یہ مسئلہ دوئوں کے ذریعے حل نہ ہو۔

۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو شملہ کانفرنس کا پہلا اجلاس وائسرائے کی افتتاحی تقریر پر ختم ہو گیا۔ دوسرا اجلاس کھانے کے بعد شروع ہوا۔ سب سے پہلے کانگریس کے صدر ابوالکلام آزاد نے ۱۰ دن تقریر کیا کہ کانگریس کسی ایسی تجویز کو خواہ وہ عبوری تصفیہ کی خاطر سامنے آئی ہو، قبول نہیں کرے گی، جس کے باعث اس کے قومی مزاج کو ضعف پہنچتا ہو اور ایک قومیت کی نشوونما میں مائل ہوتا ہو۔

قائد اعظم کے اعتراض پر وائسرائے نے ابوالکلام آزاد کو بتایا کہ ان کی تجاویز میں ایسی

کوئی بات نہیں جس سے کانگریس کو فخر وارانہ انجمن بنانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اسی کانفرنس میں قائد اعظم اور ڈاکٹر خان صاحب کے درمیان بھی نوک جھونک ہوئی۔ ڈاکٹر خان صاحب بھی اس بات پر متعین تھے کہ کانگریس کو صرف ہندوؤں کی نمائندگی تک کیوں محدود رکھا جائے گا۔ مگر وائسرائے نے واضح طور پر کہہ دیا کہ کانگریس صرف اپنے اراکین کی نمائندہ ہے۔ ہرجون کو کانفرنس کا اجلاس صرف ایک ٹھنڈے جاری رہا تاکہ قائد اعظم اور پنڈت گوندولہ پنت کو مسلم لیگ اور کانگریس میں سمجھوتہ کرانے کا موقع دیا جائے۔ ۱۹ جون کو چوتھا اجلاس ہوا جس میں بتایا گیا کہ قائد اعظم اور پنڈت پنت کی مساعی ناکام ہو چکی ہیں۔ لہذا وائسرائے نے تمام پارٹیوں سے کانگریس کے اراکین کے نام طلب کر لئے۔

کانگریس نے ۵ جولائی کو کنسل کے لئے اراکین کے نام وائسرائے کو بھیج دیئے۔ ۶ جولائی کو مسلم لیگ کی مجلس مانڈے پر فیصلہ کیا کہ وائسرائے اور قائد اعظم کے درمیان خفیہ بات چیت میں مسلم لیگ نمائندوں کے بارے میں فیصلہ کیا جائے نیز کانگریس کے لئے تمام مسلمان اراکین مسلم لیگ ہی سے لئے جائیں۔ مسلم لیگ کی مجلس مالد کا ایک اور فیصلہ یہ تھا کہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کوئی ٹھوس اقدام کیا جائے تاکہ عبوری انتظام و انصرام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

۹ جولائی کو وائسرائے نے قائد اعظم کو اطلاع دی کہ انہیں یہ بات منظور نہیں کہ کانگریس کے لئے مسلمان اراکین کا انتخاب صرف مسلم لیگ کی فہرست سے کیا جائے۔ چنانچہ قائد اعظم نے اسی دن ویول کو اطلاع دی کہ اس طرح مسلم لیگ کے بنیادی اصولوں کی نفی ہوتی ہے لہذا وہ نامہ بھیجنے سے قاصر ہیں۔

اس دوران وائسرائے کو دیگر تمام پارٹیوں کی طرف سے ناموں کی فہرستیں وصول ہو چکی تھیں۔ وائسرائے نے اپنے طور پر مسلم لیگ کی طرف سے فہرست بھی مرتب کر لی جو ان کے خیال میں مسلم لیگ کے لئے قابل قبول ہو سکتی تھی۔ ۱۱ جولائی کو ویول نے قائد اعظم کو بتایا کہ کانگریس میں مسلم لیگ کے نمائندے لئے جایاں گئے۔ پانچواں مسلمان ہری، مین پنڈی اور غیر مسلم سی، ویول نے اتنی لچک رکھی کہ اگر مسلم لیگ کو وائسرائے کے ناموں پر اعتراض ہو تو مسلم لیگ اور نام دے دے، جن پر غور کیا جاسکے گا۔ ویول کی خواہش یہ تھی کہ قائد اعظم بہر حال کانگریس میں شامل ہوں۔

## مسلم لیگ کا موقف

تمامہ اعظم کا اقرار تھا کہ کونسل میں پانچویں مسلمان برقیوت پر مسلم لیگ سے ہی لئے جائیں۔ اگر کونسل میں مسلمانوں کو کسی فیصلہ پر اعتراض ہو تو اس فیصلہ کے لئے کہ ان کو وہاں اکثریت کی رائے دیر پاقت کی جائے۔

لیکن واٹرمار نے یہ دونوں شرائط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ قائد اعظم نے بھی صاف بتا دیا کہ مسلم لیگ اپنے قبضہ داری اصولوں کے برعکس نفاذ نہ کرے گا۔ وہ نہیں۔

۱۴۔ جولائی کو کانفرنس کے آخری اجلاس میں لارڈ رابول نے اپنی مساعی اور کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔ اس اجلاس سے قائد اعظم نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

”میں اس بات کی تزیید کرتا ہوں کہ کانفرنس کی ناکامی کی وجہ سے مسلم لیگ ہے۔ کانفرنس میں شریک دو نمائندوں نے یہ دہرائی مسلم لیگ پر غمانہ کی ہے لیکن انہوں نے حقیقت کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔ شعل۔۔۔ کہ مسلم لیگ اور کانفرنس کے انداز فکر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر تیار ہی متنازعہ ہے کل وہ ایک مسئلہ کی کمرجوزہ کو نسل میں اختلاف کی صورت اختیار کرے گی۔ مثلاً آج متحدہ ہندوستان اور پاکستان کے بنیاد پر اتفاق نہیں تو کل کو نسل کے اجلاس میں بھی یہی بات زیر بحث آسکتی ہے۔ اس وقت کون سا نسل نسل نکل آئے گا؟ مسلم لیگ اس عزم کا اعادہ کرتی ہے کہ وہ پاکستان حاصل کر کے رہے گی۔ جہاں تک عبوری دور کی عارضی حکومت کے قیام کا تعلق ہے تو مسلم لیگ ایسی ہر تجویز پر مشروط غور و خوض کے لئے تیار ہے۔ شرائط یہ ہیں کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے مسلمانوں کو حق خود ارادیت دینے کا اعلان کیا جائے اور عبوری انتظام میں مسلمانوں کو غیر تمام ذوقوں کے مقابلہ میں مساوی نمائندگی دی جائے۔ لیکن ہماری پہلی شرط کے لئے اس عبوری انتظام میں کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ دوسری شرط ناممکن رہی کیونکہ مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دینے کی جگہ صرف ایک تہائی نمائندگی دی گئی۔“

اسی دن قائد اعظم نے پریس کو بتایا کہ ویل منصوبہ صرف ایک جاں تھا، جو گاندھی، کانگریس

لارڈ ویول اور خضریات خاں نے مسلمانوں کو چھٹانے کے لئے بکھایا تھا۔ یہ سب مل کر مسلمانوں کے خلاف صف آراء تھے اور اگر مسلمان ویول کی تجاویز سے اتفاق کر لیتے تو یقیناً اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیتے۔ مسلمان یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ انہیں ایک قوم کی جگہ اقلیت کہا جائے اسی لئے وہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۷ء کی قرارداد پاکستان سے ایک قدم پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں۔

## افسائے راز

۹ اگست ۱۹۴۷ء کو جب قائد اعظم نے شملہ کانفرنس کے اندرونی حالات بیان کئے تو وہ باتیں کھل کر سامنے آ گئیں جو کانگریس اور انگریز کے درمیان خفیہ ملاقاتوں میں طے پائی تھیں۔ سرکاری ریکارڈ کے سوا کہ سے قائد اعظم نے بتایا کہ لارڈ ویول نے کانگریس سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ اگر مسلم لیگ اپنے موقف سے نہ ہٹی تو اسے نظر انداز کرتے ہوئے وہ اپنی پسند کے پانچ مسلمانوں کو اپنی کونسل میں شامل کر لیں گے۔ کانگریس اور دیگر جماعتوں کے نمائندے بھی لارڈ ویول کو اس بات پر افسوس ہے تھے کہ ایک مذہبی شخص (قائد اعظم) کو ہندوستان کی ترقی کے راستہ کی چٹان نہ بننے دیا جائے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب لارڈ ویول نے حکومت برطانیہ سے اس امر کی اجازت طلب کر مسلم لیگ کو نظر انداز کرتے ہوئے ویول منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا جائے تو برطانوی کابینہ نے منظوری دینے سے انکار کر دیا اور یہ بھی واضح کر دیا کہ عبوری حکومت کا قیام مسلم لیگ اور کانگریس کے تعاون ہی سے عمل میں آئے گا۔

## برطانوی کابینہ میں تبدیلی

برطانوی وزیر اعظم چرچل نے ویول کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ویول کی تجاویز ۱۹ جولائی کو وصول ہوئی تھیں، لیکن ۲۰ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی حکومت تبدیل ہو گئی اور لیبر پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد کانگریس کے ناپاک سردار اٹھ دھڑے دھڑے رہ گئے تھے۔ لیکن برطانیہ میں لیبر پارٹی کے برسر اقتدار آتے ہی کانگریس نے محسوس کیا کہ شملہ کانفرنس کا زخم جلد مندمل ہو جائے گا۔ کیونکہ کانگریس، لیبر پارٹی کی حمایتی محبوبہ تھی۔ کانگریس نے فوراً نئے وزیر اعظم ایٹلی کو مبارکباد کا تار دے کر اپنی پرانی وفاداریوں کا یقین دلانے میں پہل کر دی۔

## باب

## انتخابات ۱۹۴۵ء کا بینہ مشن سبوتاژ

شملہ کانفرنس ناکام ہوئی، کانگریس نے ایٹلی کو وزارتِ غلطی کا ہندہ سنبھالنے پر مبارک باد دی اور مسلم لیگ نے دسمبر ۱۹۴۳ء کی قرارداد کو راجی کا احادہ کرتے ہوئے اس مطالبے کو دہرایا کہ ملک میں جلد از جلد عام انتخابات کرائے جائیں۔ مسلم لیگ کا مقصد یہ تھا کہ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد انگریز اور ہندو پریر ثبات کرنا ضروری ہے کہ مسلم لیگ بلاشبہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور اُسے ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل تائید حاصل ہے تاکہ اس طرح کانگریس کے اس دعوے کو غلط ثابت کیا جائے کہ وہ تمام ہندوستانیوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اتفاق یہ ہوا کہ اگست ۱۹۴۵ء میں ہیر ویشیا پرائیمریم پجینا گیا، ساتھ ہی جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ لہذا جرمنی اور جاپان کی شکست کے بعد عام انتخابات کو اتوار میں رکھنے کا کوئی حوالہ نہ رہا۔ علاوہ ازیں اس مطالبے پر برطانیہ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ خود اس نے جنگ ختم ہونے سے پہلے انتخابات کرائے تھے۔

دائرسر نے ہندو لٹریول نے ۱۴ اگست ۱۹۴۵ء کو یہ اعلان کیا کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے آئندہ انتخابات موسمِ سرما میں کرائے جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ جلد ہی حکومتِ برطانیہ سے صلاح مشورہ کے عرض سے لندن جائیں گے۔ مسلم لیگی حلقوں نے دائرسر کے ان اعلانات کا غیر مقدم کیا۔ لارڈ ویول ۲۴ اگست کو عازمِ لندن ہوئے اور ۱۶ ستمبر کو ہندوستان لوٹ گئے۔ واپسی کے چوتھے دن انہوں نے ایک اعلان کیا:

”ملک معظمِ برطانیہ کی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہندوستان کے مختلف انیال رہنماؤں کی

مشترک رائے سے ہندوستان کو جلد حکومت خود اختیاری دینے کی کوشش کریں گے۔ اس سلسلہ میں ملک معظم کے ساتھ میری تفصیلی بات چیت ہوئی اور مجوزہ اقدامات بھی زیر بحث آئے۔ انتخابات آئندہ موسم سرما میں ہوں گے۔ اور حکومت برطانیہ یہ توقع رکھتی ہے کہ تمام صوبوں میں سیاسی رہنما فزادتی ذمہ داری قبول کرنے میں مسرت محسوس کریں گے۔ اس اقدام کے فوراً بعد حکومت برطانیہ جلد از جلد مجلس آئین ساز کے انعقاد کا ارادہ رکھتی ہے۔ بعد ازاں ۱۹۴۱ء کے اعلان کے بارے میں اسمبلی کے اراکین سے بات چیت کی جائے گی۔ حکومت برطانیہ نے مجھے یہ اعتقاد دیا ہے کہ یہ صوبائی انتخابات ختم ہوتے ہی ایک ایسی کونسل قائم کریں، جسے تمام اہم سیاسی جماعتوں کی تائید حاصل ہو۔

مسلم لیگ نے وائسرائے کے پہلے بیان کا غیر متعہم کیا تھا۔ لیکن لندن سے واپسی پر انہوں نے جو بیان دیا اس پر مسلم لیگ اور کانگریس، دونوں کو اعتراض تھا۔ مسلم لیگ کا اعتراض تو یہ تھا کہ بیان میں پاکستان کی بنیاد کو تسلیم کرنے کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ مسلم لیگ پاکستان کے اصول سے ایک قدم اوجھڑ رہی تھی۔ کانگریس کا خیال یہ تھا کہ اس اعلان میں آزادی کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ بہر حال دونوں جماعتوں نے انتخابات کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کیونکہ انہی پر ہندوستان کے مستقبل کا دار و مدار تھا۔ مسلم لیگ کے لئے خود کو مسلمانوں کی نمائندہ ثابت کرنے کا اس سے بہتر موقع نہ تھا۔

### انتخابی سرگرمیاں

عام انتخابات کے لئے مسلم لیگ نے اپنا پارلیمانی بورڈ مقرر کیا جس کے صدر لیاقت علی خاں تھے۔ ایک ایشن کمیٹی تشکیل کی، جسے مجلس عاملہ کے بعض اختیارات منتقل کئے گئے۔ ایشن کمیٹی کے صدر نواب محمد اسماعیل خاں تھے۔ قائد اعظم نے ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اس نازک موقع پر مسلم لیگ کے پرچم تلے اکٹھے ہو جائیں۔

کانگریس نے حسبِ عادت تفریق پیدا کرنے کے لئے مختلف نعرے لگائے اور کہا کہ دھرتی ماتا کو بھڑے ٹکڑے کر کے کسی قیمت پر بھی پاکستان دینے دیا جائے۔ کانگریس نے مسلم لیگ پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ وہ خان بہادریوں، سرمایہ داروں، جاگیر داروں اور زمینداروں کا ٹکڑہ ہے یا حکومت سے پنشن حاصل کرنے والے سپیٹوں کی جماعت۔ کانگریس نے ایسے مسلمانوں کو ساتھ ملنے کی سرزور کوشش کی جو پیسے کے بل پر بآسانی خریدے جاسکتے تھے اور قبل ازیں کسی دہائی طرح کانگریس کا ساتھ دے چکے تھے۔ مسلمانوں کے ان گروہوں میں مومن کانفرنس، خلیفہ کانفرنس، جمعیت العلماء ہند اور مجلس احرار



اسلام شامل تھے۔ پنجاب میں کانگریس کو لینسٹ پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ جہاں تک جمیٹ لعلہ ہند کا تعلق تھا تو اس میں بیشتر ممتاز علماء شامل نہ تھے۔ علماء میں مسلم لیگ کا ساتھ دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ؛ بڑے علماء میں مولانا حسین احمد غامیہ و احمد عالم تھے۔ جو کانگریس کا ساتھ دے رہے تھے۔ انتخابات کے دوران کانگریس کے ہاتھ آزاد آدمی قریح کا سنٹ بھی آیا۔ بسماش چند روبروس ہندوستان سے بھاگ کر جاپان جا چکے تھے۔ وہاں انہوں نے ہندوستانی جنگی قیدیوں کو ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لئے آئی۔ این۔ اے (ایکٹیویشن آف) کے نام سے فوجی تنظیم قائم کر لی تھی۔ مگر جاپان کی شکست کے بعد اس فرقے کے بلیٹن ہزار سپاہی انگریزوں کی قید میں آ گئے۔ ان پر مقدمہ چلانے کے لئے ایک فوجی عدالت قائم کی گئی۔ کیونکہ ان سپاہیوں میں ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ لہذا ہندوستان میں ان سے سبھی کو ہمدردی تھی۔ کانگریس کے لئے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ لہذا اس نے ان قیدیوں کے مسئلہ کو سیاسی ضرورت کے لئے پوری طرح اٹھایا۔

انتخابات دوماحل میں مکمل ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات کی تکمیل ہوئی۔ بھٹی میں کانگریس نے قائمہ عظم کے مقابل میں ایک مسلمان تاجر سیٹھ حسین بھائی لال جی کو کھڑا کیا۔ لیکن ان کی ضمانت نہ صرف اس حلقے میں ضبط ہوئی۔ بلکہ وہ جس دوسرے حلقے سے امیدوار تھے، وہاں بھی ضمانت ضبط کر لیا۔ اکثریشنٹ مسلمانوں کا بھی یہی انجام ہوا۔ مسلم لیگ نے انتخابات میں اتنی شاندار کامیابی حاصل کی کہ کوئی بھی مسلمان نشست اس کے ہاتھ سے نہ گئی۔ مسلم لیگ نے ۸۶۷۶ فیصد (مسلمان ووٹوں کا) اور کانگریس نے ۹۱۳ فیصد (مجموعی عام ووٹوں کا) ووٹ حاصل کئے۔

مرکزی اسمبلی کی نشستوں کے اعداد و شمار یہ تھے۔

کانگریس	۵۷ نشستیں
مسلم لیگ	۳۰
آزاد امیدوار	۵
سکر	۲
یورپین	۸

دلچسپ بات یہ ہے کہ اعداد و شمار کی موجودگی کے باوجود کانگریس نے ایک خاص بلیٹن شائع کیا

جس میں کل ۲۰ نشستوں میں سے ۵ کے حصول کو کانگریس کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیتے ہوئے یہ کہا گیا کہ کانگریس نے اس ملک کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت ہونے کا ثبوت دے دیا۔

### صوبائی انتخابات

دکڑی اسمبلی کے بعد صوبائی اسمبلی کے انتخابات کا آغاز ہوا۔ اوائل ۱۹۴۶ء کے ان عام صوبائی انتخابات میں کانگریس نے ۲۰ نشستیں جیت کر وہوں میں مطلق اکثریت حاصل کر لی، مسلم لیگ نے ۲۸ نشستیں حاصل کیں۔  
انتخابات کے نتائج یہ تھے۔

پنجاب	مسلمان حلقے	۸۶	کامیاب	۷۵
بنکال	" "	۱۱۹	"	۱۱۲
اسام	" "	۲۳	"	۲۲
سندھ	" "	۲۳	"	۲۷
پوچی	" "	۶۶	"	۵۴
بہٹی	" "	۳۰	"	۲۰
مدراں	" "	۲۹	"	۲۹
سی پی	" "	۱۳	"	۱۲
اوڈیسہ	" "	۴	"	۳
صوبہ سرحد	" "	۲۸	"	۱۷
بہار	" "	۳۰	"	۳۴

بعد ازاں پنجاب میں موزیک کامیاب امیدوار مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ سندھ کا مسئلہ یہ تھا کہ انتخابات کے بعد مسلم لیگ کو اسمبلی میں نصف ووٹ حاصل ہوئے۔ لہذا دسمبر ۱۹۴۶ء میں دوبارہ انتخابات کرائے گئے۔ اور مسلم لیگ نے تمام دوسری سیاسی جماعتوں پر برتری حاصل کر لی۔

### وزارت سازی کا مرحلہ

سندھ میں آزاد مسلمان اراکین اسمبلی کا ایک گروہ جس کی قیادت جی، ایم سید کے ہاتھ میں تھی

کانگریس کے ساتھ گھبرڑ میں معروف تھا۔ اور دعویٰ کرتے تھے کہ اس گھبرڑ کے ذریعہ اپنی تعداد مسلم لیگ کی تعداد سے زیادہ کر لی تھی۔ لہذا اُسے وزارت سازی کا موقع ملنا چاہیے۔ لیکن سندھ اور بنگال کے گورنر نے فیصلہ کر کے کہ وہ خطوط وزارت قائم کرنے کا موقع سب سے پہلے اس جماعت کو دیں گے جسے ایمان میں سب سے بڑی پارٹی کا درجہ حاصل ہو۔ چنانچہ مسلم لیگ پارٹی کے قائد غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔

اسام میں کانگریس نے واضح اکثریت کی بنیاد پر وزارت بنائی۔ اور ایک نیشنلسٹ مسلمان کو بھی کابینہ میں شامل کر لیا۔ وزارت میں دو مسلم لیگ شامل کرنے کی پیش کش بھی کی گئی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ یہ مسلم لیگ کانگریس کے پارلیمانی پروگرام کی پیروی کریں گے۔ لیکن مسلم لیگ نے وزارت میں نیشنلسٹ مسلمان کی موجودگی کے باعث اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ بیٹی، بہار، مداس، یوپی، اسی پی اور اڑیسہ میں کانگریس وزارتیں قائم ہو گئیں۔ گو کانگریس نے ہر وزارت میں مسلم لیگ کو شامل کرنے کی شرط پیش کش کی۔ لیکن مسلم لیگ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

صوبہ سرحد میں کانگریس کو واضح اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ لہذا وہاں ڈاکٹر خان صاحب نے وزارت بنائی۔

بنگلہ میں سید حسین شہید وسروردی کو وزارت سازی کی دعوت دی گئی، انہوں نے کانگریس کو شرکت کی دعوت دی۔ مگر کانگریس کے انکار پر انہوں نے آزاد امپیراڈوں کو ساتھ ملانے کے بعد مسلم لیگ وزارت قائم کر لی۔

پنجاب میں یونینسٹ پارٹی برسر اقتدار آئی۔ اُسے کانگریس اور سکھوں کی بھرپور امداد کے باوجود ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جب چار یونینسٹ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو مسلم لیگ کے اراکین کی مجموعی تعداد ۹۷ ہو گئی۔ کچھ اور یونینسٹ اراکین بھی تقسیم ہو گئے۔ اس طرح یونینسٹ پارٹی کے پاس صرف ۱۸ نشستیں رہ گئیں۔ جب پنجاب میں وزارت سازی کا مرحلہ آیا تو کانگریس اور سکھوں نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تین شرائط پیش کر دیں۔ شرائط یہ تھیں۔

۱۔ کانگریس کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھنے والے کو وزارت میں شامل کرے۔  
۲۔ کانگریس اور اکالی سکھوں کو وزارت میں نصف حصہ ملے گا۔

۳۔ صوبائی اسمبلی میں پاکستان یا اس قسم کا کوئی سوال جس کا تعلق صوبہ سے نہ ہو، نہیں اٹھایا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کے ستمبر خزانہ قابل قبول نہ ہو سکتی تھیں۔ لہذا مسلم لیگ نے سکھوں کے ساتھ مل کر وزارت سازی کی کوشش کی۔ لیکن انہوں نے یہ شرط پیش کر دی کہ پاکستان کے قیام کی صورت میں پنجاب میں سکھ ریاست قائم کی جائے گی۔ مسلم لیگ فوری طور پر ایسا کوئی وعدہ نہ کر سکتی تھی جو بعد ازاں پورا کرنے میں دشواری پیش آتی۔ لہذا یہ کوشش بھی ترک کر دی گئی۔ جس کے بعد کانگریس نے سکھوں اور یونینسٹوں سے مخلوط وزارت قائم کرنے کے سلسلہ میں اتحاد قائم کیا۔ پنجاب کا گورنر گلانی یہ نہیں چاہتا تھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ وزارت قائم ہو، اس نے سندھ اور بنگال کے گورنروں کے اقدام کے برعکس مسلم لیگ پارٹی کے قائد کو وزارت سازی کی دعوت دی اور یہ عذر رنگ پیش کیا کہ شاہد علی اعظمی مسلم بائیس کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ چند دن بعد گورنر نے مخلوط وزارت قائم کر دی۔ جس میں کانگریس، سکھ اور یونینسٹ شامل تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ سر خضر حیات خاں فوانہ تھے۔ جن کی جماعت میں صرف دس اراکین شامل تھے اور جو صوبے کی سب سے چھوٹی جماعت تھی۔ اس اتحاد میں ۱۵ یونینسٹ، ۲۴ سکھ اور ۵ کانگریسی شامل تھے۔ اس طرح پنجاب کی اکثریتی جماعت یعنی مسلمان حزب اختلاف بن گئی۔ مگر مخلوط وزارت درجہ پائیدار نہ ہوئی۔ وزیر اعلیٰ خضر حیات خاں فوانہ خود ہی مستعفی ہو گئے۔ اس وقت سے اب تک یونینسٹ پارٹی کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

### حصول پاکستان کا عزم

انتخابات کے بعد قائد اعظم نے اپریل ۱۹۴۶ء میں انتخابات میں کامیاب ہونے والے تمام مسلم لیگی امیدواروں کا ایک کنونشن طلب کیا۔ اس موقع پر قائد اعظم نے اپنی اختتامی تقریر میں حصول پاکستان کی جدوجہد کو تیز کر کے پر زور دیا اور انگریزوں کے چلے جانے کے بعد مسلمانوں پر ہندوؤں کے غلبہ کے سنگین نتائج سے آگاہ کیا۔ قائد اعظم نے واضح الفاظ میں بتایا کہ انگریز ہو یا ہندو۔ — دووں مسلمانوں کے راستے میں دیواریں کھڑی کر سکتے ہیں۔ مگر وہ کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کی منزل ان سے نہیں چھین سکتے۔ تاخیر تو ہو سکتی ہے لیکن حوصلہ اور یقین حکم کسی اور کسی صورت میں ختم نہیں ہو سکتے۔ فتح آخر کار ہندوستان کے مسلمانوں کی ہوگی۔

اسی کنونشن میں حسین شہید سہروردی نے پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان، بنگال اور آسام میں مسلمانوں کے لئے خود مختار ریاست کے قیام کی قرارداد پیش کی۔ اس قرارداد میں

صاف صاف کہا گیا تھا کہ مسلمان، متحدہ ہندوستان کے لئے کوئی آئین قبول نہ کریں گے، نہ ہی ایسی کسی کوشش میں حصہ لیں گے جس کا مقصد متحدہ ہند کے لئے متحدہ آئین کے تحت متحدہ مغیبرز قائم کرنا ہو۔ قراردادیں مزید کہا گیا کہ برطانوی حکومت کے لئے مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنے کی اولین شرط مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی فوری منظوری ہے۔ مسلم لیگ اسی صورت میں مرکز میں عبوری حکومت کے ساتھ تعاون کر سکے گی۔

نیشنل کے اختتام سے قبل ہر رکن نے حلف اٹھایا۔ جس میں مسلم لیگ کے ساتھ وفاداری، مسلم لیگ کے مقاصد اور اس کی طرف سے حصول پاکستان کے مطالبہ کی راہ میں پہلائی جانے والی ہر قربانی اور ہم کے ساتھ وفاداری کا وعدہ کیا گیا تھا۔ حلف میں ہر قسم کی قربانی دینے اور خطرات کا مقابلہ کرنے کا وعدہ بھی کیا گیا۔

### کابینہ مشن

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد حکومت برطانیہ، ہندوستان کے سیاسی حالات کا بنظرِ غائر جائزہ لے رہی تھی۔ حکومت برطانیہ کو انتخابات کے دوران ہی یہ احساس ہو چکا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو نظر انداز کر دینا ممکن نہیں رہا۔ اور اگر حالات یہ قابو پانے کی کوشش نہ کی گئی تو سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کے مستقبل کا مسئلہ طے کرنے کے لئے ایک وزارتی وفد ہندوستان بھیجا جائے۔ وفد کے لئے وزیر امور ہند سر پیٹیک لارنس، سر سٹیوڈورڈ کپرس اور اے۔ وی الیگزینڈر کو منتخب کیا گیا۔ ۹ فروری کو وزیر پیٹیک لارنس اور وزیر اعظم برطانیہ اٹلی نے علی الترتیب دارالامراء اور دارالعوام میں ہیک وقت اس وزارتی وفد کا اعلان کیا۔ ۱۵ مارچ کو وزیر اعظم اٹلی نے دارالعوام میں بحث کے دوران بتایا کہ برطانیہ کو اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا مکمل احساس ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اقلیتوں کو اکثریت کی طرف سے کوئی اندریشہ نہ رہے۔ لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی اقلیت کو اکثریت کے نشوونما اور ترقی کے خلاف دیوار بننے کی اجازت دے دی جائے۔

کانگریس کو اس اعلان کا آخری جملہ بہت پسند آیا۔ لیکن تیسرے ہی دن قائد اعظم نے اس کا مسکت جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر ایک کمیٹی، ایک کمیٹی کو اپنے دھمیلے میں آنے کی دعوت دے اور ایک کمیٹی انکار کر دے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کمیٹی ضد کر رہی ہے اور کمیٹی کی ترقی کے راستے میں

حائل ہو رہی ہے ؟

قائد اعظم نے وزیر اعظم برطانیہ کو یہ بھی بتایا کہ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہے اور حتیٰ خود ارادیت اس کا پیدائشی حق ہے۔ مسلمان ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کی تشکیل کا فیصلہ کر چکے ہیں یہ ان کا آخری فیصلہ ہے کیونکہ ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا حل صرف اور صرف پاکستان میں ہے۔

۱۲ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزارتِ وفد ہندوستان پرست گیا۔ لارڈ پٹیک لارنس نے آتے ہی پریس سے بات چیت کرتے ہوئے کہا، بلاشبہ کانگریس زیادہ لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ لیکن مسلم لیگ کو صرف ایک اقلیت کی سیاسی نمائندہ جماعت سمجھ لینا غلط ہوگا۔ مسلم لیگ ایک عظیم مسلمان جمعیت کی نمائندگی کرتی ہے اور صاحبِ اثریت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وفد کی آمد کا مقصد ایسے نظام کا قیام ہے جس کے ذریعہ ہندوستانی خود ایسی صورت کا قیام کریں کہ ہندوستان کو آزادی کا مکمل درجہ حاصل ہو جائے۔ اس پریس کانفرنس میں سر سٹیوڈن کرپس نے یہ وضاحت بھی کی کہ مشن کسی فیصلے کا قیام کر کے نہیں آیا نہ ہی کوئی سکیم ہمارے کر لیا تھا۔

مشن کے اراکین نے وائسرائے کے بعد تمام صوبائی گورنروں اور وائسرائے کی کونسل کے اراکین سے بات چیت شروع کی۔ یہ سلسلہ قریباً آٹھ دن جاری رہا۔ بعد ازاں مشن نے مختلف سیاسی رہنماؤں صوبائی وزراء، صوبائی اسمبلیوں کے اراکین اور والیان ریاست سے نہاد خیال کیا۔

کانگریس رہنماؤں سے مشن کی پہلی ملاقات ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔ کانگریس کے صدر ابراہیم الام آزاد نے مشن کو بتایا کہ ہندوستان کے لئے مکمل آزادی کا آئین، آئین ساز اسمبلی وضع کیے دریں اثنا دمر میں عبوری حکومت قائم کر دی جائے۔ اور آئندہ تمام مراحل کی ذمہ داری مجلس آئین ساز پر ہو، عبوری حکومت ۱۵ افراد پر مشتمل ہو، جس میں صوبوں کے ۱۱ نمائندے لئے جائیں اور چار نشستیں اقلیتوں کو دی جائیں۔ ابوالکلام آزاد نے مشن کو بتایا کہ کانگریس ہر قیمت پر متحدہ ہندوستان چاہتی ہے۔ تاہم مسلم لیگ کو اختیاری شعبوں میں خود اختیاری کا حق دیا جاسکتا ہے۔ نمائندگی کے بارے میں ابوالکلام آزاد نے بتایا کہ کانگریس کی نشستوں کے مقابلے میں بلاشبہ مسلم لیگ کے پاس صرف دو یا تین نشستیں ہوں گی۔ لیکن ایگزیکٹو کونسل میں کانگریس اور مسلم لیگ کے لئے تقریباً مساوی نشستوں کا انتظام کیا جاسکے گا۔ مگر وہ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ کانگریس اس پر رضامند ہوگی یا نہیں۔ ابوالکلام آزاد نے یہ بات بالکل گاندھی کے انداز میں کہی کہ انتظام ممکن تو ہے لیکن ان کی ذاتی رائے میں فیصلہ کانگریس پر ہے۔

اسی شام گاندھی نے وفد سے ملاقات کی اور اپنی روایات اور الفاظ کے اُلٹ پھیر کو قائم

رکھتے ہوئے کہا کہ وہ تو بالکل ذاتی حیثیت میں مل رہے تھے۔ کیونکہ وہ کانگریس کے ابتدائی رکن بھی نہیں۔ کانگریس کا موقف تو کانگریسی رہنا ہی بنا سکیں گے۔ گاندھی و لچسپ باتیں کرنے کے حامی ہو چکے تھے۔ انہوں نے اصل مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے اور موقع محل سے قطع نظر مشن سے کہا کہ ملک کا محصول غنم کر کے غریبوں کے لئے نمک مفت فراہم کیا جائے۔ انہوں نے مشن کو یہ تاثر بھی دیا کہ وہ مسلمانوں کے نہایت مخلص دوست تھے۔ (مگر لندن کانفرنس کے موقع پر انہوں نے مسلمانوں کے لئے پدارتھ شفقت کا مظاہرہ کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا تھا۔) لیکن قائد اعظم جس قسم کا پاکستان چاہتے تھے۔ وہ ان کی فہم سے بالاتر تھا۔ کیونکہ پاکستان کا مطالبہ جب تک ٹھوس دلائل کے تحت نہ سمجھا جائے۔ اسے کیسے قبول کیا جاسکتا ہے؟ گاندھی نے دو نظریہ کے بارے میں کہا، کہ وہ نہایت خطرناک قسم کا نظریہ تھا۔ دراصل مسلمان تو ہندوؤں ہی کی نسل سے تھے۔ اس لئے دونوںوں کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے۔ گاندھی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ عبوری دور کے لئے قائد اعظم سے حکومت بنانے کو کہا جائے۔ جس میں اسپیشیوں کے اراکین شامل ہوں۔ اگر قائد اعظم انکار کر دیں تو کانگریس کو یہی پیش کش کی جائے۔

۴ اپریل کو مشن کی ملاقات قائد اعظم سے ہوئی۔ جب مطالبہ پاکستان کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ تاریخ شاہد ہے کہ چندر گپت کے زمانہ میں ہندوستان میں کسی ایک حکومت قائم نہیں رہی۔ حتیٰ کہ انگریزوں کی آمد اور ہندوستان کے بڑے حصہ پر حکومت کے باوجود ریاستیں قائم رہیں۔ لہذا پاکستان کا مطالبہ کسی صورت بھی نامناسب نہ تھا۔ اگر اتنی دلیق ہوتا تو ۱۹۰۶ء میں معمولی سے اختیارات منتقل ہوتے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کا آغاز کیوں ہوا؟ مونٹنگو چیمفورڈ اصلاحات کے بعد سمجھوتہ نہ ہونے کی صورت میں حکومت برطانیہ نے حتیٰ قبضہ کیوں دیا؟ مسلمانوں کے مطالبہ پر سندھ کو بمبئی سے الگ کیوں کیا۔ اور صوبہ سرحد کو گورنری صوبہ کیوں بنایا گیا؟ اگر خود بھارتی حکومت نے یہ اقدامات کئے تو آج پاکستان کے مطالبہ پر اعتراض کیوں؟ مسلمانوں کی حفاظت، زبان، معاشرت، رسم و رواج، فلسفہ، اور مذہب سبھی ہندوؤں سے مختلف ہیں سوال یہ ہے کہ اتنے اختلاف کے باوجود حکومت برطانیہ ان دونوںوں کو کس قدر مشترک کے ذریعہ ملا کر ایک کر سکے گی۔ ان تمام باتوں کا حل صرف قیام پاکستان ہی میں نظر آتا ہے۔

۱۶ اپریل کو مشن نے قائد اعظم سے دوبارہ ملاقات کی تو مشن کے بارے میں بنایا گیا کہ ”برطانوی مشن کی آمد کا مقصد ہندوستان سے برطانوی اقتدار کے خاتمہ پر غور و خوض ہے۔“

اب اس کے سامنے یہ فیصلہ ہے کہ اختیار اور اقتدار کس کے حوالہ کیا جائے مشن یہ سمجھا ہے کہ اس معاملہ پر ہندوستان میں اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔ کانگریس متحدہ ہندوستان چاہتی ہے اور بریتانویوں کے حکمران ہندوستان کے دفاع میں شمولیت پر آمادہ ہیں۔ مگر آپ پاکستان چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر حکومت برطانیہ کو ہندوستان سے اپنا اقتدار اور فوج و فوج ختم کرنا پس تو دو جماعتوں کے درمیان تصادم کے امکان پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ اگر اس بات کا کوئی جواب نہیں تو پھر یہ سوچنا ہوگا کہ حکومت برطانیہ اور یہ مشن کیا کرے؟ مشن کو یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ کیا ہندوستانی اپنی حفاظت کو قائم رکھ سکیں گے؟ اسی لئے حکومت برطانیہ یہ چاہتی ہے کہ ہندوستان کے دفاع کے لئے برطانیہ سے مدد طلب کی جائے۔ اس صورت میں برطانیہ کو اس مدد کی شرائط پر غور کرنا ہوگا۔ یعنی یہ کہ اس کے عوض ہندوستان ہمسایہ ممالک کے دفاع میں برطانیہ کی مدد کرے۔ لیکن ہندوستان پر بیرونی حملہ کی صورت میں خود ہندوستان کا دفاع مؤثر طریق پر ہونا ضروری ہے، لہذا ہندوستان کے معاملات کا حل تلاش کرنا ناگزیر ہے۔ اور برطانوی حکومت یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہے کہ کیا ہندوستان کا نظام ایسا ہوگا جو علماء برطانیہ کے ساتھ تعاون کر سکے؟

۱۷ اپریل کو مشن نے قائد اعظم سے ملاقات کے بارے میں ابوالکلام آزاد کو مطلع کیا۔ دوسرے دن مشن اکرام کی غرض سے کشمیر چلا گیا۔ کشمیر سے واپسی پر کمرپس نے ۲۶ اپریل کو ابوالکلام آزاد سے دوبارہ ملاقات کی اور ایک بار پھر سر بنیادی آئین پر تبادلہ خیال کیا۔ قبل ازیں اس آئین کی تجویز کو گاندھی اور پٹیل نے مسترد کر چکے تھے۔ ابوالکلام آزاد نے آمادگی ظاہر کی کہ وہ کانگریس کو ان بنیادوں پر مسلم لیگ کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ کمرپس نے قائد اعظم سے پھر ملاقات کی اور حالات سے آگاہ کیا۔ قائد اعظم مسلم لیگ اور کانگریس کے مشترکہ اجلاس پر رضامند ہو گئے۔ ۲۷ اپریل کو وزیر امور ہند پٹیلک لارنس نے قائد اعظم اور ابوالکلام آزاد کو ایک خط کے ذریعہ مطلع کیا کہ مسلم لیگ اور کانگریس رہنماؤں سے ملاقات کے بعد ان کی خواہش ہے کہ دونوں جماعتیں ایک بار پھر مخالفت کی کوشش کریں۔ پٹیلک لارنس نے بات چیت کے بنیادی اصولوں کے طور پر ان دونوں کو ایک حکم بھی روانہ کیا اور کہا کہ وہ چار برطانوی فائندوں سے اس مسئلہ پر بات چیت کے لئے اپنے چار پارٹنرز سے بھی برطانوی نمائندوں میں وائسرائے ہند لارڈ ویل اور کابینہ مشن کے ۳ اراکین شامل ہو گئے۔ خط میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی کہ آئین کا ڈھانچہ یہ ہو کہ امور خارجہ معاملات اور دفاع کا انتظام ایک یونین گورنمنٹ کرے۔ صوبوں کی صورت یہ ہو کہ ہندو اکثریت کے صوبوں کا ایک اور مسلم اکثریت کے صوبوں



کا وہ سراگروپ ہو۔ یہ گروپ دوسرے تمام شعبوں کے انتظامات سنبھالیں۔ لیکن یہ شبہ وہ ہوں گے جو دونوں گروپوں کے خیال میں مشترکہ انتظام کے منتفی ہوں۔ اس کے بعد جو شبہ ہمیں وہ صوبائی حکومتیں اپنے زیر انتظام رکھیں۔ ہندوستان کی ریاستیں پہلے سے طے شدہ شرائط کے تحت اس منصوبہ میں گنجائش حاصل کر سکیں گی۔ بنیادی اصولوں کی وضاحت کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ بات ہمیشہ کے دوران کی جاسکتی ہے۔

قائد اعظم نے اس اعتراض کے ساتھ کہ متعدد معاملات کی وضاحت پہلے سے ضروری ہے کانفرنس میں شرکت کے لئے م نام بھیج دیئے۔ ان میں نواب محمد اسماعیل خان، سردار عبدالرتب نشتر، لیاقت علی خان اور وہ خود شامل تھے۔

کانگریس کا اعتراض یہ تھا کہ پیٹک لانس نے خط میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی بنیادی بات موجود نہ تھی۔ نہ ہی یہ بتایا گیا، کہ ہندوستان سے بھٹانوی فوجیں کب تنگ واپس بلائی جائیں گی۔ تاہم کانگریس نے کانفرنس میں شرکت کے لئے حوامر محل نہرو، ویدھ جائی پٹیل، خان مہدائتغافرسان (سرحدی گاندھی)، اور ابوالکلام آزاد کے نام بھیج دیئے۔

### دوسری شملہ کانفرنس

شملہ کانفرنس کا آغاز ۵ مئی ۱۹۴۷ء کو ہوا۔ اس کے اجلاس ایک ہفتہ تک جاری رہے۔ ۸ مئی کو مشن نے مفاہمت کے لئے مجوزہ نکات، کانگریس اور مسلم لیگ کے سامنے رکھ دیئے، جو نکات مختصر ایسے تھے:

○ ایک کل ہند یونین گورنمنٹ اور مقننہ ہوگی۔ جس کے تحت امور خارجہ، دفاع، مواصلات، اور بنیادی حقوق شامل ہوں گے۔ یونین کو ان ملکوں کے اخراجات کے لئے رقم کی فراہمی کا اختیار ہوگا۔

○ باقی تمام اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں گے۔

○ مسلم اور ہندو اکثریت کے صوبوں کے الگ الگ گروپ ہوں گے جو اپنے مشترکہ امور کا تعین کریں گے۔

○ یہ صوبائی گروپ اپنی اپنی انتظامیہ اور اسمبلیاں قائم کر سکیں گے۔ یونین کی اسمبلی مسلمان اور ہندو اکثریت کے صوبوں کی مساوی رائے رکھنے والی کی حامل ہوگی۔ خواہ انہوں نے یا ان میں سے کسی ایک نے

خود کو گروپوں میں تقسیم کیا ہو یا نہ کیا ہو، اسمبلی میں ریاستوں کے نمائندے بھی شامل ہوں گے۔  
یونین کی حکومت اسمبلی کے تناسب سے تشکیل کی جائے گی۔

اگر گروپ ہوں تو ان گروپوں اور یونین کے دستاویز میں یہ بات شامل ہوگی۔ کہ کوئی صوبہ اپنی اسمبلی کی اکثریت رائے سے آئین کے نکات پر دوبارہ غور و خوض کا مطالبہ کر سکے گا۔ تاہم یہ مطالبہ دس سال کے بعد کیا جاسکے گا۔ اور اس کے بعد ایسا ہی ہر مطالبہ ہر دس سال کے بعد ممکن ہوگا۔

آئین ساز ادارہ درج بالا بنیادوں پر آئین کی تشکیل کے لئے جن صورت کا حامل ہو گا وہ یوں ہوگی۔ کہ ہر صوبائی اسمبلی سے نمائندگان چنے جائیں گے۔ نمائندگان کا تناسب اسمبلی میں مختلف جماعتوں کی قوت کے تناسب اور مذکورہ اسمبلی کے اراکین کی مجموعی تعداد کے دستوں حصہ کی بنیاد پر ہوگا۔ ریاستوں کے نمائندے ان کی آبادی کی بنیاد پر اور برطانوی ہند کی نمائندگی کے اعتبار سے شامل کئے جائیں گے۔ اس طرح جو آئین ساز اسمبلی معرض وجود میں آئے گی۔ اس کا اجلاس کم از کم دو تہائی نمائندگی میں منعقد ہوگا۔ ابتدائی اجلاس کے بعد جس میں بنیادی امور پر بات چیت شامل ہوگی اُسے تین شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ پہلا شعبہ مسلمان اکثریت کے صوبوں، دوسرا ہندو اکثریت کے صوبوں اور تیسرا ریاستوں کی نمائندگی کرے گا۔ ہندو اور مسلم اکثریت والے صوبوں پر مشتمل دو تہائی شعبہ علیحدہ اجلاس منعقد کریں گے۔ تاکہ وہ اپنے گروپ کے لئے صوبائی دستاویز کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔ اگر تناسب سمجھیں تو ایک دستور کے بارے میں متفق ہو جائیں۔ جب یہ معاملہ طے پا جائے تو ہر صوبہ کے لئے یہ اختیار محفوظ ہو گا کہ وہ اپنے بنیادی گروپ سے الگ ہو کر دوسرے گروپ میں شامل ہو جائے۔ یا دونوں گروپوں سے باہر رہے۔ اس کے بعد پھر تینوں شعبے مشترکہ اجلاس منعقد کریں۔ تاکہ وہ یونین کے لئے آئین وضع کر سکیں۔ یونین کے آئین میں ایسا کوئی بنیادی نکتہ شامل نہ کیا جائے۔ جس کا تعلق فرقہ وارانہ مسائل سے ہو۔ تاہم اسمبلی میں شامل ہندو اور مسلمانوں کی اکثریت اس کے حق میں اپنی رائے کا اظہار نہ کر دے۔ ان نکات پر بحث کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ سے ان کے نقطہ ہائے نظر طلب کر لئے گئے۔

### کانگریس کی شرائط کا اہمیت

۱۔ ہر صوبہ کی اسمبلی متناسب نمائندگی اور آرائے منقسمہ (سنگل ٹرانسفیربل ووٹ) کے ذریعہ نمائندے منتخب کرے اور اس طرح جو تعداد منتخب ہو وہ اراکین اسمبلی کی مجموعی تعداد کا پانچواں حصہ ہو ان اراکین پر اسمبلی کے رکن ہونے کی کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ ریاستوں کے نمائندے اپنی آبادی کے

اختیار سے اس تناسب سے لئے جائیں۔ جس تناسب سے برہما لوسی ہندوستان کے نمائندے موجود ہوں۔ ان نمائندوں کے طریق انتخاب پر بعد ازاں غور ہو۔

۲۔ آئین ساز اسمبلی یونین کے لئے آئین وضع کرے۔ جو کل ہند یونین گورنمنٹ اور مجلس منتظمہ پر مشتمل ہو۔ اور دفاع امور خارجہ، مواصلات، بنیادی حقوق، کرنسی، منصوبہ بندی اور کسٹم وغیرہ کا بندوبست کرے۔ ایسے ہی دیگر اہم شعبوں کا انتظام بھی اس کے سپرد کر دیا جائے۔ یونین کو اختیار ہو، کہ ہنگامی حالات یا آئینی انتشار کی صورت میں مطلوبہ اقدامات کر سکے۔

۳۔ باقی ماندہ اختیارات صوبوں یا وحدتوں (ریونٹ) کو حاصل ہوں۔

۴۔ صوبوں کے گروپ قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ گروپ ایسے شعبوں کا حقیقہ گیر ہیں، جنہیں وہ مشترکہ انتظام میں لینا چاہتے ہوں۔

۵۔ جب آئین ساز اسمبلی کل ہند یونین کے لئے آئین کا فیصلہ کر چکے تو صوبوں کے نمائندے اپنے اپنے گروپ کے لئے صوبائی رساتیر کا فیصلہ کر لیں۔ بشرطیکہ وہ گروپ کے لئے آئین پر متفق ہوں،

۶۔ کل ہند وفاقی یونین کے آئین میں ایسا کوئی معاملہ جس کا تعلق فرقہ وارانہ مسئلہ سے ہو، آئین ساز اسمبلی میں طے کیا جائے گا۔ بشرطیکہ متعلقہ فرقے یا کوئی ایک فرقہ اسمبلی میں موجود ہو اور اس مسئلہ پر جداگانہ حیثیت میں اس کے حق میں رائے موجود ہو۔ اگر ایسے کسی مسئلہ پر اتفاق رائے نہ ہو سکے تو اُسے ثالثی کے لئے بھیج دیا جائے۔ اس بات کا فیصلہ کر کیا بات فرقہ واریت پر مبنی ہے؟ اسمبلی کا سپیکر کرے۔ وہ اگر چاہے تو یہ مسئلہ وفاقی عدالت کو بھیج دے۔

۷۔ اگر آئین سازی کے دوران کسی معاملہ پر نزاع پیدا ہو جائے تو ایسے مسئلہ کو فیصلہ کے لئے عدالت کے سپرد کیا جائے۔

۸۔ آئین پر کسی وقت بھی نظر ثانی کا انتظام موجود ہو۔ نظر ثانی کے مطالبہ پر آئین میں یہ واضح کر دیا جائے۔ کہ دس سال کے بعد اس پر نظر ثانی کی گنجائش موجود ہو۔

## مسلم لیگ کی شرائط مفاہمت

۱۔ پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ، بنگال اور آسام کے پھر مسلمان صوبوں کا ایک گروپ قائم کیا جائے۔ یہ گروپ امور خارجہ، دفاع اور دفاع کے لئے لازمی مواصلات کے سوا باقی تمام اختیارات کا حامل ہو گا۔

۷۔ ان چھ مسلمان صوبوں کے لئے ایک علیحدہ آئین ساز ادارہ ہو۔ جو اس پر رے گروپ اور گروپ میں شامل صوبوں کے لئے آئین وضع کرے۔

۸۔ آئین ساز اسمبلی کے لئے نمائندوں کے انتخاب کا طریقہ کار یہ ہو۔ کہ اس میں مختلف فرقوں کی نمائندگی اس کی آبادی کے اعتبار سے موجود ہو۔

۹۔ مسلمان صوبوں کا یہ گروپ "پاکستان گروپ کہلائے گا۔ اور اس کے ہر صوبہ کو پاکستان کی وفاقی حکومت اور اس کے صوبوں کے دساتیر مرتب کرنے کے بعد اس بات کا حق حاصل ہو کہ وہ گروپ میں رہنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ استواب رائے عامہ کے ذریعہ ہو۔

۱۰۔ مشترکہ آئین ساز ادارہ میں اس معاملہ پر بحث کے لئے ہر وقت اجازت ہو۔ کہ یونین کی مجلس قانون ساز ہو یا نہ ہو۔ نیز دونوں گروپوں کی مجالس آئین ساز کو اس فیصلہ کا حق حاصل ہو، کہ مشترکہ یونین کے لئے اخراجات کیونکر فراہم کئے جائیں۔ تاہم یہ اخراجات کسی صورت میں بھی ٹیکس کے ذریعہ پورے کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

۱۱۔ یونین کی انتظامیہ میں اگر اس کی مجلس متفقہ ہو تو، دونوں گروپوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہو۔

۱۲۔ یونین کے آئین میں اگر فرقہ وارانہ مسئلہ آجائے۔ تو اس کا فیصلہ مشترکہ آئین ساز ادارہ کرے۔ بشرطیکہ ہندو اور پاکستانی صوبوں کے گروپ کی مجالس آئین ساز کے موجود اور ووٹ دینے والے اراکین کی اکثریت علیحدہ علیحدہ اس کی تائید کرتی ہو۔

۱۳۔ قانون سازی یا انتظامی معاملات میں کوئی نزاعی مسئلہ پیدا ہو۔ تو یونین تین چوتھائی آراء کی اکثریت کی صورت ہی میں کوئی فیصلہ کرے۔

۱۴۔ گروپوں اور صوبوں کے دساتیر میں بنیادی حقوق، مذہب، ثقافت اور ایسے دیگر معاملات کے تحفظ کے لئے جو کسی بھی فرقہ پر اثر انداز ہوتے ہوں، کوئی انتظام کیا جائے۔

۱۵۔ یونین کے آئین میں یہ بات شامل ہو کہ کوئی صوبہ اپنی مجلس قانون ساز کی اکثریت کے فیصلہ کے تحت آئین کی شرائط پر نظر ثانی کا مطالبہ کر سکے۔ یا دس سال کی ابتدائی مدت کی تکمیل کے بعد جب بھی چاہے یونین سے علیحدگی اختیار کرے۔

مسلم لیگ نے معاہدہ کی ان شرائط کے آخر میں یہ بات بھی مافع کر دی کہ تمام شرائط کا انحصار ایک دوسرے پر ہے۔ اور ان شرائط معاہدہ پر فرداً فرداً نہیں بلکہ ان کی مجموعی حیثیت میں

## کابینہ مشن رپورٹ

۱۷ مئی ۱۹۴۶ء کو کابینہ مشن نے اپنی رپورٹ کا آغاز یوں کیا۔

”۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزیر اعظم برطانیہ مسٹر اچیل نے کابینہ مشن کو ہندوستان روانہ کرنے سے پہلے یہ الفاظ کہے تھے کہ میرے ساتھی ہندوستان کو کم از کم عرصہ میں آزادی کے حصول میں مدد دینے کے لئے ہندوستان جا رہے ہیں۔ موجودہ حکومت کے بعد ہندوستان میں کون سا طرز حکومت قائم ہوگا اس کا فیصلہ خود ہندوستان کو کرنا ہوگا۔ لیکن ہماری خواہش یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے لئے ہندوستان کو ایک لائحہ عمل فراہم کر دیا جائے۔ مجھے توقع ہے کہ ہندوستان کے لوگ برطانوی دولت مشترکہ کے ساتھ رہنا پسند کریں گے۔ اور یہ یقین بھی کہ ہندوستان کو اس صورت میں بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔ تاہم یہ ہندوستان کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ برطانوی دولت مشترکہ اور سلطنت کسی صورت بھی یرونی دباؤ کے پابند نہیں یہ آزاد لوگوں کی رضا کارانہ وابستگی کا معاملہ ہے۔ اگر ہندوستان مکمل آزادی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے، پھر یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم استقلالِ اختیارات کے کام کو کس طرح آسان نہ بنائیں اور اس کے لئے راستہ کیوں کم سہوار کریں۔“

اس تمہید کے ساتھ کابینہ مشن نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ :

”ان تاریخی الفاظ کے احترام میں کابینہ کے وزراء اور دانشورائے ہند نے مل کر اس امر کی حتیٰ الوسع کوشش کی کہ وہ ہندوستان کی دونوں اہم سیاسی جماعتوں کے درمیان ہندوستان کے اتحاد یا اس کی تقسیم کے بنیادی مسئلہ پر کوئی سمجھوتہ کرانے میں اس کی پوری مدد کریں۔ دلی میں طویل بات چیت کے بعد ہم کانگریس اور مسلم لیگ کو شکمہ کانفرنس میں یکجا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ غلط فہمی بالوضاحت تبادلہ خیال ہو اور دونوں سیاسی جماعتیں کسی سمجھوتہ پر پہنچنے کے لئے کچھ نہ کچھ نجاش پیدا کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ لیکن ان کے درمیان کچھ اختلافات بدستور ہیں۔ نتیجہ بات چیت کی ناکامی کی صورت میں برآمد ہوا۔ کیونکہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ لہذا ہمارا یہ فرض ہے کہ وہ تجاویز پیش کریں جو ہمارے نزدیک بہترین ہوں اور جن کے تحت نئے آئین کی تیاری میں آسانیاں پیدا ہو جائیں۔ یہ بیان تاج برطانیہ کے منشاء اور اس کی منظوری کے بعد دیا جا رہا ہے۔

ہم نے ایسے اہتمام کا فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کے لوگ، ہندوستان کے لئے آئندہ آئین

کے بارے میں کسی فیصلہ پر پہنچ سکیں۔ اور فوری طور پر ایک عبوری حکومت قائم کر دی جائے جو نئے آئین کی تیاری تک برطانوی ہندوستان کا انتظام و انصرام سنبھال سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ عوام کے تمام چھوٹے اور بڑے طبقوں کے ساتھ انصاف روا رکھا جائے اور ایک ایسا حل پیش کیا جائے جس کے تحت مستقبل کے ہندوستان پر حکومت ممکن ہو۔ نیز اس انتظام کے تحت دفاع، سماجی، سیاسی اور اقتصادی میدان میں ترقی کے لئے ٹھوس بنیادوں پر مواقع فراہم کئے جائیں۔

اس بیان میں مشن کے سامنے رکھی جانے والی مختلف تجاویز پر ضرور ضروری نہیں سمجھا گیا تاہم اتنا کہا جاسکتا ہے کہ مسلم لیگ کے سوا باقی سب نئے ہندوستان کے اتحاد کے حق میں ہوتے کی ہے۔ اس کے باوجود ہم ہندوستان کی تقسیم کے غیر جانبدارانہ اور بنظرِ خائنِ مطالبہ کے امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہمیں مسلمانوں کی چالز خواہشات کا مکمل احساس ہے۔ مسلمانوں کا یہ اندیشہ بجا ہے کہ وہ ہندو راج کے ماتحت نہ آجائیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ احساس اتنا شدید اور عام ہے کہ اسے صرف کاغذی تفصیلات و مودعیت تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہندوستان میں داخلہ امن امان کا قیام ضروری ہے۔ تو اس کے لئے ایسے اقدامات بھی نہایت ضروری ہوں گے جو کہ ذریعہ مسلمانوں کو اپنے مذہبی، ثقافتی اور اقتصادی مفادات کی ضمانت دے سکے۔

لہذا ہم نے پہلے تو مسلم لیگ کے دعوے کی روشنی میں ایک علیحدہ اور مکمل آزاد خود مختار ریاست ”پاکستان“ کے سوال کا جائزہ لیا۔ اس قسم کے پاکستان میں دو علاقے ہوں گے۔ ایک شمال مغرب میں، جس میں پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحد اور برطانوی بلوچستان شامل ہوں گے۔ اور دوسرا شمال مشرق میں جو بنگال اور آسام کے صوبوں پر مشتمل ہوگا۔ مسلم لیگ کے تئیں کے بارے میں اس بات پر آمادہ تھی کہ یہ کام بعد ازاں کر لیا جائے گا۔ لیکن اسے اصرار اس بات پر تھا کہ سب سے پہلے پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے۔ جہاں تک پاکستان کی علیحدہ ریاست کے قیام کے سلسلہ میں مسلم لیگ کے دلائل کا تعلق ہے، وہ ایک تو مسلمان اکثریت کی اس خواہش پر مبنی ہیں کہ مسلمان اپنے طرز حکومت کا فیصلہ خود کریں۔ اور دوسرے بعض ایسے علاقوں کو پاکستان میں شامل کیا جائے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں تاکہ پاکستان کو اقتصادی اور انتظامی اعتبار سے فعال بنایا جاسکے۔

پاکستان میں دھرم و مذهب جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، غیر مسلم اقلیتوں کا حسبِ مذہب حسبِ ذیل ہے۔

## شمال مغربی علاقہ

مسلمان	غیر مسلم	
۱۶,۲۱۰,۳۳۲	۱۲,۲۰۱,۵۴۴	پنجاب
۲,۶۸۸,۴۹۴	۲۴۹,۲۴۰	صوبہ سرحد
۳,۲۰۸,۲۷۵	۱,۳۲۹,۷۸۳	سندھ
۳۲۸,۹۳۰	۶۲,۴۰۱	برطانوی بلوچستان
۲۲,۶۵۲,۲۹۳	۱۳,۸۳۰,۲۲۱	
۳۴,۶۹۳ فیصد	۴۷,۶۰۰ فیصد	

## شمال مشرقی علاقہ

۳۳,۰۰۵,۴۳۳	۲۴,۳۰۱,۰۹۱	بنگلہ
۳,۴۲۲,۴۴۹	۶,۴۶۲,۲۵۳	آسام
۳۶,۴۲۷,۹۱۳	۳۰,۷۶۳,۳۴۵	
۵۱,۶۴۹ فیصد	۳۸,۶۳۱ فیصد	

باقی برطانوی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کی تعداد دو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔

ان اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے خطوط پر جس الگ اور خود مختار ریاست پاکستان کا مطالبہ کیا گیا۔ وہ فرقہ وارانہ اقلیت کا مسئلہ حل نہیں کر سکتا۔ نہ ہی یہیں خود مختار پاکستان میں پنجاب، بنگال اور آسام کے علاقوں کو شامل کرنے میں کوئی معقولیت محسوس ہوتی ہے اور اگر پاکستان کے حق میں تریاہ سے زیادہ گنجائش پیدا کر کے کوئی دیں فراہم کی جاسکتی ہے۔ تو ہمارے

خیال میں صرف یہی کہ پاکستان سے میز مسلم علاقوں کو خارج کر دیا جائے۔ اس مرحلہ پر سکھوں کی حیثیت یقیناً متاثر ہوگی۔

لہذا ہم نے اس بات پر غور کیا آیا ایک چھوٹا خود مختار پاکستان، جو صرف مسلمان اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ہو، سمجھوتے کی بنیاد بن سکتا ہے؟ لیکن اس قسم کا پاکستانی مسلم لیگ کے نزدیک نامناسب ہوگا۔ کیوں اس میں سے

دو، پنجاب میں انبار اور جالندھر کے ڈو پٹرن خارج ہو جائیں گے،

دہلی، ماسوا سہیت، پورا اسام نکل جائے گا اور

آج، کلکتہ سمیت جس کی مسلمان آبادی ۲۳ لاکھ ۶۷ فی صد ہے، مغربی بنگال کا تمام حصہ بھی نکل جائے گا۔ ہم بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بعد جو مل سمنے آئے گا وہ ان صوبوں کے رہنے والوں کی اکثریت تناسب کی خواہشات اور مفادات کے برعکس ہوگا۔ بنگال اور پنجاب میں ہر ایک کی اپنی زبان اور طویل تاریخ و روایات ہیں۔ مزید یہ کہ پنجاب کی تقسیم سکھوں کو بھی لازماً تقسیم کر دے گی۔ اور وہ سرحد کے دونوں طرف منقسم ہو جائیں گے۔ لہذا ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مجبور ہو گئے ہیں کہ پاکستان بڑا ہو خواہ چھوٹا۔ قرقر وارانہ سائل کے لئے کوئی قابل قبول حل پیش نہ کر سکے گا۔

مندرجہ بالا ذیلی دلائل کے بعد انتظامی، اقتصادی اور فوجی اہمیت کے امور کو بھی زیر غور لانا ہوگا جہاں تک ہندوستان کے ڈاکٹار اور مواصلاتی نظام کا تعلق ہے۔ قراس کی بنیاد متحدہ ہندوستان کے پیش نظر رکھی گئی تھی۔ جب اس مواصلاتی نظام کو درہم برہم کیا جائے گا تو ہندوستان کے دونوں حصے بڑی طرح متاثر ہوں گے۔ مشترکہ دفاع کا معاملہ مقابلتا زیادہ قابل غور ہے۔ جہاں تک ہندوستان کی مسلح افواج کا تعلق ہے قراس کی مجموعی تشکیل ہندوستان کے فوجی دفاع کے لئے کی گئی تھی۔ تقسیم کی صورت میں جب اس کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے جائیں گے، تو ہندوستانی فوج کی قدیم روایات اور انتہائی عمدہ کارکردگی بری طرح متاثر ہوگی۔ بلکہ بہت سے قدریہ خطرات بھی پیدا ہو جائیں گے۔ ہندوستان کی مجرہ اور فضائیہ بھی آج کی طرح مؤثر نہ رہیں گی۔ رہا سوال پاکستان کے دھڑوں کے باہمی تعلق کا قراس کے ساتھ دو انتہائی نازک اور اہم سرحدیں ملتی ہیں۔ لہذا پاکستان کا کامیاب دفاع تسلی بخش طریق پر نہ کیا جاسکے گا۔

مزید اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان کی ریاستیں معمولی کے ساتھ وابستگی میں خاصی مشکلات



محسوس کریں گی۔

اس کے بعد جغرافیائی حقائق ہیں۔ یعنی پاکستان کے دو حصے ایک دوسرے سے کوئی سات سو میل کے فاصلے پر واقع ہوں گے۔ دونوں کے درمیان اس پاجنگ کے زمانے میں مواصلاتی نظام کے لئے پاکستان کو منہ دوستان کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا۔

لہذا ہم حکومت برطانیہ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ اس وقت جو اختیار حکومت برطانیہ کے ہاتھوں میں ہے۔ دو الگ خود مختار ریاستوں کو منتقل کیا جائے۔

اس فیصلے کے باوجود ہم مسلمانوں کے اس اندیشہ کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے کہ مسلمانوں کی ثقافتی، سیاسی اور سماجی زندگی مکمل طور پر متحدہ ہندوستان میں جذب ہو کر رہ جائے۔ ہندو ان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں اور ان پر چھا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کانگریس نے ایک سکیم پیش کی جس کے تحت مرکز کو کم از کم اختیارات کے استثناء کے ساتھ صوبوں کو مکمل خود مختاری حاصل ہوگی۔ مرکز کے پاس امور خارجہ، دفاع اور مواصلات وغیرہ کے شعبے ہوں گے۔

اس سکیم کے تحت اگر صوبے اقتصادی اور انتظامی منصوبہ بندی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی خواہش رکھتے ہوں، تو وہ مرکز کے لازمی اختیارات کے علاوہ اختیاری امور بھی مرکز کے سپرد کر سکتے ہیں۔

لیکن ہمارے خیال میں اس قسم کی ہم فی الوقت زیر غور آئینی معاملات میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر سکتی ہے۔ اس صورت میں ایک ایسی مرکزی انتظامیہ اور مرکزی اسمبلی کا فعال ہونا مشکل ہوگا۔ جس میں کچھ وزیر لازمی مرکزی امور سرانجام دے رہے ہوں اور پورے ہندوستان کے سامنے جواب دہ اور ذمہ دار ہوں، جبکہ کچھ وزیر جو اختیاری امور سرانجام دے رہے ہوں صرف انی صوبوں کے سامنے جواب دہ اور ذمہ دار ہوں، جنہوں نے ان وزراء کو یہ اختیاری امور سونپے تھے یہ مشکل مرکزی اسمبلی میں بھی پیش آئے گی۔ یہاں کچھ اراکین کو بات کر کے اور ووٹ دینے سے اس وقت محروم کر کے تباہ کر دیا جائے گا۔ جب ان کے صوبوں کے امور پر بحث نہ ہو رہی ہو۔ علاوہ انیس ایسے صوبوں کے ساتھ بھی انصاف روا نہ رکھا جاسکے گا جنہوں نے اختیاری امور مرکز کو نہ سونپنے کی خواہش کا اظہار کیا ہو اور انہیں اس مقصد کے لئے اپنا ایک علیحدہ گروپ بنانے کی اجازت دی گئی ہو۔ درحقیقت اس طرح انہیں ایک خاص طریق پر اپنے خود مختار اختیارات کے استعمال سے زیادہ کچھ نہ ملے گا۔

اپنی سفارشات پیش کرنے سے پہلے ہم برطانوی ہند کے ساتھ ہندوستانی ریاستوں کے تعلقات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد تاج برطانیہ اور ہندوستانی ریاستوں کے درمیان جو تعلق موجود ہے، برطانوی دولت مشترکہ کے اندر یا باہر اسے قائم رکھنا ناممکن ہوگا۔ اس صورت میں در تاج برطانیہ اپنی بالادستی قائم رکھنے کا نہ ہی یہ بالادستی نئی حکومت کو منتقل کی جاسکے گی۔ اس حقیقت کو ان ریاستی نمائندوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ جن کے ساتھ ہماری بات چیت ہوئی ہے اس کے باوجود انہوں نے ہمیں یہ یقین بھی دلایا ہے کہ ریاستیں، ہندوستان میں آئندہ تبدیلیوں اور نئی میں پوری طرح اور رضا کارانہ طریق پر تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کے تعاون کی صورت کیا ہوگی۔ اس کا فیصلہ نئے آئینی ڈھانچے کی تیاری کے دوران باہمی گفت و شنید سے ہوگا۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ریاستوں کے لئے جو طریق کار وضع کیا جائے گا۔ وہ تمام ریاستوں کے لئے یکساں مفید ہوگا۔ اس لئے ہم نے آئندہ پر سے ہیں ریاستوں کے معاملے پر اس ابتداء میں بات نہیں کی جو ہم نے برطانوی ہند کے صوبوں کے لئے اختیار کیا ہے۔

### کابلیہ مشن منصوبہ

”اب ہم اس حل کی نوعیت کے بارے میں بات کرتے ہیں جو ہمارے خیال میں تمام حالتوں کے لازمی مطالبات کے لئے مصفاہ ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی پورے ہندوستان کے لئے ایک مستحکم اور ممکن العمل آئین بھی فراہم کرے گا۔

ہم سفارش کرتے ہیں کہ آئین کی حسب ذیل بنیادی صورت ہونی چاہیے۔

۱۔ ہندوستان کی ایک یونین ہو، جس میں برطانوی ہند اور ریاستیں شامل ہوں اور جو امور دفاع اور خارجہ اور معاملات کے شعبے اپنے پاس رکھے۔ اسے مندرجہ بالا امور پر اخراجات کے لئے ضروری رقم فراہم کرنے کا اختیار حاصل ہو۔

۲۔ یونین کی ایک انتظامیہ اور ایک اسمبلی کو جو برطانوی ہندوستان اور ریاست کے نمائندوں پر مشتمل ہو، اگر اسمبلی میں کوئی بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ پیش آجائے تو حاضر نمائندوں کی اکثریت اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی رائے اور حاضر اور ووٹ دینے والے تمام اراکین کی اکثریت کے ذریعہ اس کا فیصلہ کیا جائے۔

۳۔ مرکز کے امور کے علاوہ باقی تمام امور اور اختیارات باقی صوبوں کے پاس رہیں۔

۴۔ صرف ان امور اور اختیارات کے سوا جو ریاستوں نے یونین کے سپرد کر دیئے ہوں باقی تمام امور و اختیارات ریاستوں کے پاس رہیں گے۔

۵۔ صوبوں کو اختیاب اور اسمبلیوں کے ساتھ گروپ بنانے کی آزادی ہوگی اور ہر گروپ مشترکہ صوبائی امور کا تعین کر سکے گا۔

۶۔ یونین اور گروپوں کے درمیان میں ایک دفعہ شامل ہوگی جس کے تحت کوئی صوبہ اپنی اسمبلی کی اکثریت کے ووٹ کے ذریعہ آئین پر نظر ثانی کا مطالبہ کر سکے گا۔ یہ مطالبہ دس سال کی ابتدائی مدت کے بعد اور پھر ہر دس سال کے وقفہ کے بعد کیا جاسکے گا۔

ہمارا یہ مقصد نہیں کہ مندرجہ بالا پروگرام کے مطابق آئین کی تفصیلات طے کریں بلکہ مقصد ایک ایسی متحرک مشینری قائم کرنا ہے۔ جو ہندوستانیوں کے لئے ہندوستانیوں کی طرف سے آئین تشکیل کر سکے۔

ہمارے لئے آئندہ آئین کے بارے میں یہ سفارش اس لئے ضروری ہوگئی تھی کہ ہم پر مذاکرات کے دوران یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ جب تک ایسا کوئی اقدام نہ کیا جائے گا اس وقت تک ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس آئین سے مشترکہ اور ملے میں شامل کرنا مشکل ہو جائے گا۔

ہم امید رکھتے ہیں کہ نیا آزاد ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ میں شرکت قبول کرے گا۔ ہم یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستانی ہر حال میں ہمارے عوام کے ساتھ دوستانہ اور قربانی وابستگی قائم رکھیں گے۔ ہر حال یہ ہندوستانیوں کی اپنی مرضی پر منحصر ہوگا۔ وہ جو راستہ بھی اختیار کریں، ہم دعا گو ہیں کہ انہیں دنیا کی تمام بڑی اقوام میں زیادہ سے زیادہ خوشحال نصیب ہو اور ان کا مستقبل ماضی سے زیادہ تابناک ہو۔

کابینہ مشن نے آئین ساز اسمبلی کی تشکیل کے لئے جس منصوبے کی سفارش کی وہ یہ تھا۔  
۱۔ ہر صوبہ کو اس کی آبادی کے تناسب سے مجموعی نشستیں الاٹ کی جائیں۔ ہر دس لاکھ افراد کے لئے اندازاً ایک نشست ہو۔

دب، ہر صوبہ میں ان نشستوں کو اس کے اہم فرقوں میں آبادی کے تناسب سے تقسیم کیا جائے (ج۔)۔ اور ہر فرقے کے لئے جتنی نمائندگی کا تناسب قائم کیا جائے، وہ اسی فرقے کے اراکین اپنی اسمبلی کے لئے منتخب کریں۔

مشن نے ہندوستانی صوبوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ آئین ساز اسمبلی کے ان صوبوں پر

مشتعل تین گروپوں کو صوبائی دستگیر کا فیصلہ کرنا تھا یا یہ کہ ان صوبوں کے لئے کوئی مشترکہ کمیشن تیار ہو گا یا نہیں، اگر مشترکہ کمیشن کے حق میں فیصلہ ہو تو دیگر وہ کون کون سے صوبائی افسر پر حاوی ہو گا۔ صوبوں کی تین خصوتوں میں تخصیص حسب ذیل طریق سے کی گئی اور ہر صوبے کے لئے کمیشن ساز اسمبلی میں نمائندگی کا تعین کیا گیا۔

### (حصہ ۱)

عام نشستیں	مسلمان نشستیں	مجموعی نشستیں	
۴۵	۴	۴۹	مدراں
۱۹	۲	۲۱	بہٹی
۴۷	۸	۵۵	پٹی
۳۱	۵	۳۶	ہزار
۱۶	۱	۱۷	سیال
۹	—	۹	ایڈلیر
۱۶۷	۲۰	۱۸۷	

### (حصہ ۲)

عام نشستیں	مسلمان نشستیں	مجموعی نشستیں	
—	۳	۳	صوبہ سرحد
۸	۱۶	۲۸	پنجاب
۱	۳	۴	سندھ
۹	۲۲	۳۱	

## (حصہ ج ۱)

عام نشستیں	مسلم نشستیں	مجموعی نشستیں	بنگلہ
۶۷	۳۳	۱۰۰	۶۷
۷	۳	۱۰	۷
۳۳	۳۶	۷۰	

حصہ ۱ میں دتی، دمیر، مارواڑ اور کڑگ کا ایک ایک نمائندہ شامل کیا جانا تھا۔ ریاستوں کی نشستوں کو ۹۳ سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے تھا۔

رد عمل

کابینہ مشن کی سفارشات اور منصوبے پر سب سے پہلے گاندھی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ جہاں تک وزارت مشن کے بیان کا تعلق ہے، وہ کوئی فیصلہ نہیں۔ دراصل مشن نے مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان اتحاد کے لئے جو کوششیں کیں وہ کام ہو گئیں۔ پھر اس نے ایسی سفارش کی جو اس کے خیال میں ہندوستان میں کے لئے قابل قبول ہو سکتی تھی۔ آئین ساز اسمبلی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ان تجاویز میں ترمیم کرے، انہیں بہتر بنالے، یا انہیں مسترد کرے۔ اگر اسمبلی کو یہ اختیار حاصل نہ ہو تو اسے با اختیار ادارہ نہیں کہا جاسکتا۔ مشن نے بعض شعبوں کو مرکوز کے لئے بھی تجویز کیا۔ یہ فیصلہ آئین ساز اسمبلی پر ہے۔ کہ وہ ان میں اضافہ کر دے یا کی! اسمبلی کو مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز بھی ختم کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ جہاں تک وحدوں کا تعلق ہے تو اسی صوبے کو اس کی مرضی کے برعکس کسی گروپ میں شرکت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال مشن نے ایک قابل فخر کارنامہ انجام دیا ہے۔ گاندھی اس بات پر خوش تھے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے تمام مطالبات ٹھکرانے اور ان پر پزیرا اکثریت کا تسلط قائم کرنے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کے انگریزی روزنامہ نے لکھا: "کابینہ مشن نے جو دستاویز پیش کی ہے اس نے جناح کے تصور پاکستان کو دفن کر کے رکھ دیا۔ اور اگر اب بھی یہ شہر ہو کر اس تصور پاکستان میں

زندگی کی رتق باقی ہے۔ تو اسے ختم ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ کابینہ مشن نے جناح کے پاکستان کو جو سزائے موت دی ہے اس کی تشریح حکومت برطانیہ پہلے ہی کر چکی ہے۔

۲۷ مئی کو قائد اعظم نے مشن کے ممبران پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مشن نے دو اہمین ساز مجالس کی جگہ ایک مجلس تجویز کی اور دقت، ابہور، خارجہ اور مواصلات کے لئے اخراجات فراہم کرنے کے بارے میں مشن نے یہ نہیں بتایا کہ یہ اخراجات کہاں سے پورے کئے جائیں گے؟ مسلم لیگ اس سلسلے میں کہہ چکی ہے کہ کوئی ٹیکس عائد نہ کیا جائے۔ نیز مواصلات کے بارے میں مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ اسے یونین کے انتظام میں صرف اس حد تک دیا جائے جس حد تک ذرائع کے لئے ضروری سمجھا جائے۔ لیکن مشن نے مواصلات کا پورا انتظام یونین کے ماتحت کر دیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے الی مین مشراٹھ کو بھی نظر انداز کر دیا گیا کہ یونین کے لئے کوئی مجلس مخزن نہ ہو، یونین کی ایگزیکٹو میں ہندوستان اور پاکستان کے صوبوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہو۔ اور یونین میں جن معاملات پر نزاع پیدا ہو، ان کا فیصلہ تین چوتھائی اکثریت سے کیا جائے۔ فرقہ وارانہ مسائل طے کرنے کے لئے معین جو تجویز رکھی ہے اس کے تحت ہر فیصلہ کرنا مشکل ہوگا۔ کہ ہر ایک کو سادہ اور چھوٹا مسئلہ کون سا ہے اور کون سا مسئلہ بیز فرقہ وارانہ؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر کار فیصلہ اسمبلی کا چیرمین کرے گا جو ہندو اکثریت کے ہاتھوں منتخب ہوا ہوگا۔ علاوہ ازیں اسمبلی میں کل ۳۹۷ نمائندے ہوں گے لیکن مسلمانوں کی تعداد صرف ۹۹؛ اور جب ریاستوں کے ۹۳ نمائندے شریک ہوں گے تو ان کی اکثریت ہونے کے باعث مسلمان مزید اقلیت میں چلے جائیں گے۔

### کانگریس کی قرارداد

کانگریس کی مجلس عاملہ نے ۲۷ مئی کو ایک قرارداد منظور کی جس کے ذریعہ ابتدائی گروپ بندی کو صوبوں کی موجودہ آزادی کے لئے غیر تسلی بخش قرار دیا گیا کہ اس طرح صوبائی خود مختاری کے بنیادی اصول پر ضرب لگتی تھی۔ لہذا کانگریس نے قرارداد میں کہا کہ جب تک اس امر سے متعلقہ حکمت کی وضاحت نہ ہو جائے کسی فیصلہ پر پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔ ۲۵ مئی کو کابینہ مشن نے مطلوبہ وضاحت کر دی۔

### مسلم لیگ کا فیصلہ

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۶ جون ۱۹۴۶ء کو کابینہ مشن کے منصوبہ پر غور کرنے کے لئے منعقد

ہوا۔ کونسل نے جو قرارداد منظور کی اس میں کابینہ مشن کے پاکستان سے متعلق خیالات پر اجماع کیا گیا تھا۔ قراردادیں کہا گیا کہ مشن کی طرف سے اس نوعیت کے خیالات کا اظہار ایک ایسی اہم دستاویز میں نہیں کیا جانا چاہیے تھا جو حکومت بھارت کی طرف سے اور اس کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت جاری کی گئی تھی۔ قراردادیں مزید کہا گیا کہ اس شبہ کو بہر حال رفع کرنا ضروری ہے کہ مسلم لیگ اپنے مطالبہ سے ذرا برابر بھی پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ ایک خود مختار پاکستان کا مطالبہ ہندوستان کے مسلمانوں کا وہ مقصد ہے۔ جس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں جس کے حصول کی خاطر ہندوستانی مسلمان اپنے دائرہ اختیار میں تمام وسائل کربروئے کھلائیں گے اور بڑی بڑی قربانی کے لئے بھی تیار رہیں گے۔ تاہم مسلم لیگ نے اس منصوبہ کو دو بنیادوں پر قبول کیا۔

۱۔ کیونکہ ہندوستان کو گھمبیر مسائل کا سامنا تھا۔ لہذا مسلم لیگ کی یہ مخلصانہ اور دیانتدار خواہش تھی کہ وہ ان مسائل کا کوئی گراں عمل تلاش کرے۔

۲۔ پاکستان کی بنیاد کابینہ مشن کے منصوبہ میں موجود تھی۔ کیونکہ اس میں ۶ مسلمان صوبوں کی گروپ بندی کو تسلیم کیا گیا تھا۔

کونسل نے اس موقع کا اظہار کیا کہ قدرتی طور پر ان چھ مسلمان صوبوں کی لازمی گروہ بندی ایک مکمل خود مختار پاکستان کے وجود پر منتج ہوئی۔ جہاں تک عبوری حکومت کی تفصیل کے تعلق ایجاب و منصوبہ کا تعلق تھا، تو مسلم لیگ کونسل نے قائد اعظم کو اس مسئلہ پر دائرے کے ساتھ بات چیت کا اختیار دے دیا اور ساتھ ہی مناسب اقدامات اور فیصلوں کا بھی!

مسلم لیگ کی طرف سے اس منصوبہ کو قبول کرنے کے بعد مسلم لیگ کے فیصلہ کا وسیع پیمانے پر غیر متعمد کیا گیا۔ لیکن جہاں تک ہندو اخبارات کا تعلق تھا۔ انہوں نے اسے مسلم لیگ کی زبردست شکست قرار دینے ہوئے کانگریس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی فتح کی خوشی میں مشن پر دباؤ ڈالے کہ مشن باقی نکات بھی منظور کرے۔ مسلمانوں کا عام رد عمل یہ تھا کہ قائد اعظم نے منصوبہ کو قبول کس کے کچھ اچھا نہیں کیا۔

۸۔ راجن کو قائد اعظم نے دائرے کو خط لکھا کہ مسلم لیگ کی طرف سے منصوبہ کی منظوری میں دائرے کے اس وعدہ کو بہت زیادہ وزن دیا گیا ہے۔ کہ مجوزہ عبوری حکومت میں کل بارہ ٹکے ہوں گے جن میں سے ۵ مسلم لیگ، ۵ کانگریس، ایک سکھوں اور ایک ہندوستانی جیسائیوں کو دیا جائے گا۔ نیز اہم ٹکے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوں گے۔ قائد اعظم نے دائرے کو مطلع کیا کہ اگر اس یقین دہانی سے انحراف کیا گیا۔ تو اس صورت میں مسلم لیگ کی طرف سے کسی تعاون کی امید

نہ رکھی جائے۔ جابا وائسرائے نے قائد اعظم کو مطلع کیا کہ اس نے اس قسم کی کوئی یقین دہانی نہیں  
کرائی تھی۔ البتہ اس نے مسلم لیگ اور کانگریس، دونوں سے آنا ضرور کہا تھا کہ اہم محکموں کی مساوی  
تقسیم اس کے ذہن میں ہے۔

۱۶ جون کو ہندو، دیول ملاقات ہوئی۔ ہندو نے تجویز پیش کی کہ مجموعی طور پر ۱۵ اراکین ہوں،  
ان میں ۵ کانگریسی ہندو، اور ۵ مسلم لیگی، ایک غیر مسلم لیگی مسلمان، ایک غیر کانگریسی ہندو، ایک  
اچھوت، ایک ہندوستانی عیسائی، ایک سکھ اور ایک کانگریسی خاتون ہو، لیکن وائسرائے نے اسے  
قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ابوالکلام آزاد نے وائسرائے کو سکھ کانگریس اس پیش کش کی  
شدید مخالفت ہے۔ کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں مساوات قائم کی جائے۔ چنانچہ لارڈ دیول نے متبادل  
تجویز پیش کی۔ جو چھ کانگریسیوں، پانچ مسلم لیگیوں اور دو اقلیتی نمائندوں یعنی کل ۱۳ نمائندوں کی  
کونسل سے متعلق تھی۔ کانگریس نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

### نئی تجاویز

عبوری حکومت میں نمائندگی کے تناسب کے مسئلہ پر تعطل کو ختم کرنے کے لئے کانپٹھ مشن اور  
وائسرائے نے ۱۶ جون کو اپنی طرف سے نئی تجاویز پیش کیں۔ ان کے تحت ایکذیکٹوکونسل ۱۴ افراد پر  
مشتمل تھی۔ ان میں سر راجندر پراساد، سرائتی، پی اچ جین، جگ جیو رام، جواہر تل، نہرو، مٹل جیاج  
لیاقت علی خان، پاپے کے منہا، ڈاکٹر جہان متائی، نواب محمد اسماعیل خان، خواجہ ناظم الدین، سردار  
عبدالغنی نشتہ، سی راج گوپال اچاری، ڈاکٹر اجندر پرث داد، سردار ولیم جھائی ٹیل، شامل تھے۔  
ان چودہ نمائندوں میں ۶ کانگریسی، ۵ مسلم لیگی، ایک سکھ، ایک ہندوستانی عیسائی اور ایک پارسی  
شامل تھے۔ تجویز کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ اگر مسلم لیگ اور کانگریس نے اس تجویز سے اتفاق نہ  
کرتے ہوئے، غلو و حکومت میں مذکورہ غلطی پر شرکت سے انکار کر دیا۔ تو وائسرائے ایک عبوری حکومت  
کی تشکیل کرے گا جو زیادہ سے زیادہ نمائندگی کی حامل ہوگی۔

کانگریس نے عبوری حکومت کی تجاویز کو ٹھکرا دیا۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ نمبرہ آئین ساز اسمبلی میں  
کانگریس شرکت کرے گی۔ لیکن اس نقطہ نظر سے کہ اسمبلی ایک متحدہ، جمہوری اور آزاد ہندوستان  
کے لئے آئین وضع کرے گی۔

اسی دن مسلم لیگ نے ۱۶ جون کی مشن وائسرائے تجاویز کی بنیاد پر عبوری حکومت میں شمولیت



کا فیصلہ کر لیا۔ قائد اعظم نے کابینہ مشن اور لارڈ ڈیل کے ۱۶ راجوں کے بیان کی توضیح یوں کی کہ اب مشن کے اراکین اور وائسرائے دونوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ خودی طبع پر ان لوگوں کے ساتھ مل کر جو ۱۶ راجوں کے بیان سے اتفاق رکھتے ہوں، عبوری حکومت قائم کریں۔ اس توضیح کا مطلب یہ تھا کہ اگر اب بھی کانگریس عبوری حکومت میں شمولیت سے انکار کر دے تو وائسرائے پر مسلم لیگ کے نامزدگان اور دوسری پارٹیوں کے نمائندوں کے ساتھ عبوری حکومت کے قیام کا فرض مساند ہو جاتا ہے۔

قائد اعظم کی طرف سے اس توضیح کی وصولی کے بعد لارڈ ڈیل نے قائد اعظم کو لکھا کہ وہ اس توضیح سے متفق نہ تھے۔ اور کانگریس کی شرکت کے بغیر عبوری حکومت کی تشکیل کے سلسلہ میں دائرہ پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ قائد اعظم نے واضح الفاظ میں وائسرائے پر اپنے وعدہ سے منحرف ہو جانے کا الزام عائد کیا۔ وائسرائے نے کانگریس کے بغیر حکومت بنانے پر حکومت نہ بنانے کو ترجیح دی وائسرائے کے اس اقدام پر کانگریسی تنقید کی گئی۔ برطانوی اور ہندوستانی اخبارات نے تقریباً ایک ہی بات کہی۔ یکے بعد دیگرے آئے جیسے تو مسلمان دوست رہتے ہیں۔ مگر جب مسلمان تعاون کی کوشش کریں تو کانگریس اپنی پر غلبہ پانے کے لئے بیقرار ہو جاتی ہے۔ ایک اخبار نے تو یہاں تک لکھا، کہ سیاست دان تو حرکت کر چلتے ہی سہتے ہیں۔ لیکن وائسرائے کے درجہ کے مدبر سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

## باب ۳۲

## نیوین حکومت

۲۹ جون کو کابینہ مشن برطانیہ واپس چلا گیا۔ اس وقت ہندوستان میں خارجہ جنگی کے مکمل امکانات موجود تھے۔ لیکن کابینہ مشن حالات کی پروا کئے بغیر تمام ذمہ داریاں دائرہ اسٹے پر عائد کرنے کے بعد ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔ ۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو بمبئی میں کانگریس کمیٹی نے اپنی ۲۵ جون کی قرارداد جس کے ذریعہ کابینہ مشن کے منصوبہ کی منظوری دی گئی تھی، کی توثیق کے لئے اجلاس طلب کیا۔ کانگریس کے نئے صدر پنڈت جواہر لعل نہرو نے کابینہ مشن کا منصوبہ ۱۹ مئی توثیق کے لئے پیش کیا۔ اس بل کانگریس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کا بچہ پھر اس کے اشارے پر چل رہا تھا۔ اور ہندوستان میں عملاً کانگریس کی حکومت تھی۔ نیز اس نے کابینہ مشن کے منصوبہ کے منظوری سے کہ ہندوستان اور حکومت برطانیہ کو تباہی سے بچایا تھا۔ اس موقع پر نہرو نے تقریر کرتے ہوئے کہا

”سوال یہ نہیں کہ کانگریس کسی طویل المیعاد یا لیبیل المیعاد منصوبہ کو قبول کرتی۔ سوال صرف اتنا تھا کہ آئین ساز اسمبلی میں شمولیت پر رضامند ہو جانا چاہیے۔ جہاں تک اسمبلی میں کانگریس کی موجودگی کا تعلق ہے تو وہ اسمبلی میں اس وقت تک رہے گی جب تک اسمبلی میں اپنی شرکت کو ہندوستان کی فلاح کے لئے ضروری خیال کرے گی۔ فی الوقت ہم پر صرف اتنی پابندی عائد ہوتی ہے کہ ہم نے آئین ساز اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے چوتھے دن پنڈت نہرو نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ گواہی دینی کی۔

”ہم صرف انہیں سازا سبلی میں جانے پر رضامند ہوئے ہیں۔ اب جس بات کی مکمل آزادی ہے کہ اپنا لائحہ عمل طے کریں۔ کیونکہ ہم نے کسی معاملہ میں کسی کے ساتھ کوئی وعدہ نہیں کیا جب ہم نے یہ کہا تھا کہ انہیں سازا سبلی مکمل اور مطلق خود مختار ہوگی۔ تو کاہنہ مشن نے تقریباً ”ماں“ کہہ دی تھی۔ میں اتنی شرط تھی کہ اقلیتوں کا مناسب تحفظ ہو اور ہندوستان اور حکومت بھارت کے درمیان معاہدہ ہو، لیکن ہم اب بھی یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم یہ کوئی معاہدہ مٹوانے کی کوشش کی گئی تو ہم کوئی معاہدہ نہ کریں گے۔ جہاں تک اقلیتوں کا سوال ہے تو وہ ہمارا مسئلہ ہے اور ہم اسے حل کر رہے ہیں گے۔ ہم اس مسئلہ میں کسی کی مداخلت یا مخصوص بھارتیہ کی طرف سے ہرگز قبول نہ کریں گے۔ ہم نے ایسی کئی بات قبول نہیں کی تھی انہیں سازا سبلی کے اختیارات پر تعزیر کی صورت پیدا کرتی ہو۔ جہاں تک صوبوں کی گروہ بندی کا سوال ہے تو ہر پہلو سے غور کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے کہ شائد ہی کوئی گروہ بندی ہو سکے۔ صوبہ سرحد گروہ بندی کے حق میں فیصلہ نہ دے گا۔ اور آسام بھی بنگال کے ساتھ شرکت پسند نہ کرے گا۔ رہا مرکز کے لئے امور خارجہ، دفاع، مواصلات اور ان پر اخراجات کے لئے ذمہ کی فراہمی کے اختیار کا تعلق، تو یہ سب کچھ یونین گورنمنٹ کے ماتحت ہو گا۔ جب امور خارجہ مرکز کے پاس ہوں گے تو قدرتی طور پر غیر ملکی تجارتی پالیسی بھی مرکز کے پاس ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہو تو غیر ملکی پالیسی کا تعین کیوں کر ہو سکتا ہے؟ ان تمام امور کے لئے ہر حال ٹیکس لگانا پڑیں گے۔ صوبوں کی طرف سے ان اخراجات کے لئے عطیات کی بات بالکل بیہودہ ہے۔ چندوں کے ذریعہ حکومتیں نہیں چلا کر تیں لہذا ٹیکس ناگزیر ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ ٹیکس کتنی قسم کے ہوں گے؟ فی الحال صرف کسٹم اور ڈیوٹی کا ناہلیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ڈیوٹی درآمدات و برآمدات سے تعلق رکھتا ہے۔ لہذا ٹیکسوں کی حد وہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ علاوہ ازیں انکم ٹیکس بھی ہو سکتا ہے۔ ہر کیف اس کا تعین بعد ہی میں ہو گا۔ یونین گورنمنٹ کو قرضوں، غیر ملکی منڈیوں، کرنسی اور کریڈٹ پر بھی کنٹرول کرنا لازم ہو گا۔ تمام صوبے اپنے طور پر تو یہ سب کام کرنے سے رہے۔ اگر ملک میں قحط پڑ جائے۔ تو قدرتی طور پر اقتصادی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں یا صوبوں اور ریاستوں کے درمیان تازہ پیدا ہو جاتا ہے تو یقیناً مرکز کو درمیان میں آنا پڑتا ہے لہذا اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مرکز کے اختیارات وسیع تر ہوں یہ فیصلہ انہیں سازا سبلی ہی کرے گی۔“

پندرہ جولائی ۱۹۴۷ء کو چکھما اس کے ایک ایک لفظ سے ہندو دھرم اور ہندوستان کے مسلمانوں پر ہندو تسلط کے ناپاک عزائم چھوٹے تھے۔ نہرو کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ایک بار کانگریس

آئین ساڈا سبلی میں قدم رکھے اور اس کے بعد ہندو ریاستوں اور مکن پوز سکھوں اور اچھوتوں کی حمایت حاصل کر کے دونوں کی اکثریت کے ذریعہ مسلمانوں کو بے بس کر دے۔ گروہ بندی کے منصوبہ کو ختم کرے اور تمام اہم شعبے مرکز کے زیر اختیار کر کے صوبوں کو بے بس کر دیا جائے۔ جہاں تک ہندو کے اس دعوے کا تعلق تھا کہ کانگریس آئین ساڈا سبلی میں غیر ضروری طور پر داخل ہو سکتی تھی۔ تو اس کی تردید خود ابوالکلام آزاد نے کر دی۔ کیونکہ آزاد ہی نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کانپور مشن کے اراکین سے ملاقاتیں اور گفت و شنید کی تھی۔ ابوالکلام آزاد نے واضح طور پر یہ کہہ دیا کہ کانگریس کو کانپور مشن کے منصوبہ میں زہیم و تفسیح کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ کانگریس صرف اس بات پر رضامند ہوئی تھی کہ مرکزی حکومت وفاق طرز کی حامل ہوگی۔ صرف تین شعبے یعنی دفاع، امور خارجہ اور مواصلات مرکز کے پاس رہیں گے۔ اور باقی تمام شعبے صوبوں کے دائرہ اختیار میں شامل ہوں گے۔ نیز اس بات پر بھی اتفاق ہوا تھا کہ فریق دہا نہیں بلکہ تین ہوں گے اور کوئی فریق ایک طرف طور پر ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔

۱۸ جولائی ۱۹۴۶ء کو وزیر امور ہند اور کاہینہ مشن کے ایک رکن لارڈ پیٹیک لارنس نے پٹنہ  
جواہر لعل نہرو کے ان خیالات کی تردید کی۔ انہوں نے بتایا کہ جن شرائط پر سمجھوتہ ہوا تھا۔ کوئی جماعت ان  
سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس طرح دوسری جماعتوں کی حق تلفی ہوگی۔ انہیں سازا سبیل مجبور منصوبہ دار  
شرائط کے تحت جو فیصلہ کرے گی بلاشبہ تابع برطانیہ اپنے وعدہ کے مطابق اس فیصلہ کا احترام کرے گا  
سر سیٹھ نور محمد ریس نے برطانوی دارالعوام میں کہا کہ نہرو نے صوبوں کی گرد و بندی کے بارے میں  
جو کچھ کہا — خود انہیں بات سمجھ نہیں آتی کہ یہ کیسے ممکن ہوگا لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ سکیم کے  
برعکس کوئی اقدام نہ کیا جائے۔

تاہم لارڈ پینٹیک لارنس یا سر سیفورد جیکبسن یہ نہ کہہ سکے کہ کانگریس کو اس قسم کا کوئی اقدام کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔

راست اقدام کا فیصلہ

ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگریس کی ان دھمکیوں اور برطانیہ کی طرف سے مسلمانوں کے تحفظ کی ضمانت کے مسئلہ پر خاموشی سے غافل نہ رہ سکتے تھے۔ ۲۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا۔

خود کانگریس کا کھلونا بنانا اور اس نے پناہ گزینوں کی جلدی رکھا۔ اگر کانگریس یہ سمجھتی ہے کہ وہ مسلم لیگ کو  
 فائدہ دے کر خود جمہوری حکومت میں چلی جائے گی۔ تو یہ اس کی سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ جس میں اس کا  
 علاج معلوم ہے اور ہم کسی سے خوف زدہ بھی نہیں۔ ہم نے بات سمیت کے دوران پیشہ اعلیٰ اقدار اور  
 ارفع اصولوں پر پیش نظر رکھا، جو بات کی ایک صاحبِ وقار انجمن کی طرح کی، اپنے مطالبات میں لچک پیدا  
 کی۔ لیکن اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم کسی سے مرعوب ہیں یا کمزور ہیں، تو یہ اس کی بھول ہوگی۔ ہمارا مقصد  
 صرف اتنا تھا کہ مسلمانوں، ہندوؤں اور دیگر تمام فرقوں کو آزادی کی نعمت مل جائے لیکن کانگریس نے ایک  
 انڈین ٹو ایسا مظاہرہ کیا۔ غالباً حصولِ آزادی سے زیادہ کانگریس کا نصب العین یہ ہے کہ وہ ہندوستان  
 کے مسلمانوں کو کس طرح دھاتے۔ کانگریس نے تو برصغیر کی مگرہ بینہ مشن نے بھی جمہوری حکومت کے  
 مسئلہ پر اسی برصغیر کا مظاہرہ کیا۔ کانگریس کے انداز اتنے کھٹیا ہیں کہ معمول سے معمولی شخص بھی قہراً جاتا  
 ہے کہ کانگریس میں جرائم، معقولیت اور عزت نفس کا اتنا احساس بھی نہیں کہ وہ صاف الفاظ میں  
 یہ کہہ کر کہ تمہارا وجود اس کے اصولوں سے منہدام ہیں۔ مسترد کر دے میں دائرے سے بڑھ چھو سکتا ہوں کہ  
 ۲۴ جون کو کانگریس نے طویل المیعاد منصوبے متروک نہیں کئے تھے؟ کیا ۲۵ جون کو ملی ایجنٹ، بجلی کا دہلی میں  
 گاندھی کے پاس دائرے نے قدم ریختے نہیں فرمایا تھا؟ کیا دائرے نے پنٹیک۔ ۵۔ ۱۰ کو ٹیل کی منڈی  
 پر سامور نہیں کیا تھا؟ کیا انہوں نے ٹیل کو اچانک اپنے گھر لے جانے کے بعد اس بات پر رضامند نہیں کیا  
 تھا کہ کانگریس اپنی توہین کے تحت طویل المیعاد تجویز قبول کرے تو کامینہ مشن جمہوری حکومت کی ۱۶ جون کی  
 سکیم متحرک کر دے گا؟

مسلم لیگ کونسل نے ۳ دن تک غور و فکر کے بعد ۲۷ جولائی ۱۹۴۶ء کو دو قراردادیں منظور کیں۔  
 پہلی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ دائرے ہند اور کامینہ مشن نے ہمارے بارے میں کیا تھا کہ انہیں سازا سبلی میں بڑی  
 پارٹیوں کی شرکت کے لئے بنیادی اصولوں کا تعین کر دیا گیا ہے اور یا ہی تعاون کے بعد کامیابی ممکن نہیں  
 لیکن اب کانگریس کے طرز عمل نے یہ بات واضح کر دی کہ حالات میں خاصی تبدیلی آچکی ہے اور محسوس  
 ہوتا ہے کہ تاج برطانیہ نے بھی مسلمانوں، چھوٹی اقلیتوں اور اچھوتوں کے مفادات کو کانگریس پر قربان کر  
 دینے کا فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ دائرے اور خود کامینہ مشن کے اراکین اپنے تمام وعدوں سے معذور ہو  
 چکے ہیں۔ لہذا ایسے حالات میں مسلمان، انہیں سازا سبلی میں شمولیت کو اپنے لئے خطرناک تصور کرتے  
 ہیں۔ مسلم لیگ جمہوریت کے اس قرارداد کے ذریعہ کامینہ مشن کے منصوبے کی منظوری واپس لے لے۔  
 دوسری قرارداد میں کہا گیا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک خود مختار راہِ قطعی یا اختیارِ مملکت پاکستان

قائم کئے بغیر چین سے دہیشیں گے۔ اور اگر مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر آئین بنانے کے لئے کوئی نامناسب اقدام کیا گیا تو مسلمان اس کی بھرپور مخالفت کریں گے۔ قراردادیں مزید یکجا کیا کہ مسلمان اپنے منصفانہ حقوق، حصول پاکستان و قیام عروج و ترقی کی خاطر اور انگریز اور ہندو کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے راست اقدام پر مجبور ہیں۔ اسی قرارداد میں مسلمانوں سے ہند اور انگریز کے استبداد اور تاپاک ارادوں کے خلاف صف اُراد ہونے کی اپیل کی گئی۔ نیز اولین احتجاج کے طور پر برطانوی ہوا زات و خطابات رکھنے والے مسلمانوں سے سن کی واپسی کی اپیل کی گئی۔ متعدد مسلمانوں نے جو اس کونسل کے اجلاس میں شریک تھے۔ اسی وقت اپنے خطابات واپس کرنے کا اعلان کر دیا۔ کونسل نے ۱۶ اگست سے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔

## آئین ساز اسمبلی کے نتائج

جولائی کے اواخر تک ہندوستان میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات ختم ہو چکے تھے۔ کل ۲۹۷ اراکین اسمبلی کے انتخاب میں کانگریس نے نو کے سوا باقی تمام قشتیں حاصل کر لیں۔ مسلم لیگ نے ۵۰ نشستیں میں سے ۲۰ حاصل کیں۔ آسام اور بنگال کے لیے روپین اراکین نے انتخابات میں حصہ ہی نہ لیا۔ سکھوں کی قشتیں بھی خالی رہیں اور ریاستوں کے نامزدوں کا اسمبلی میں شرکت کا مسئلہ بھی زیرِ غور رہا۔

۲۲ جولائی کو لاہور میں نے پنڈت ہرود اور قائد اعظم کو معصومی واحد کے خطوط روانہ کئے۔

واٹر سرائے نے دونوں سے اپیل کی تھی کہ جب تک کانگریس، مسلم لیگ اور واٹر سرائے کے درمیان کسی مسئلہ پر اتفاق رائے نہ ہو جائے۔ خط و کتابت کو صیغہ دمازیں رکھا جائے، خط میں مزید یکجا کیا کہ عبوری حکومت ۱۴ اراکین پر مشتمل ہوگی۔ کانگریس کی طرف سے پسند آؤام کے ایک نمائندے سمیت ۹ نمائندے نامزد کئے جائیں گے۔ ۵ نمائندے مسلم لیگ نامزد کرے گی اور اقلیتوں کے ۲ نمائندے، جن میں ایک سکھ ہوگا واٹر سرائے کی طرف سے نامزد کئے جائیں گے۔ کوئی جماعت دوسری جماعت کے نامزدگان پر اعتراض نہ کرے گی۔ (واٹر سرائے کی طرف سے منظوری کی صورت میں) — نامزدگیوں اور حکومت میں شمولیت پر رضامندی کے بعد شعبوں کی تقسیم کا فیصلہ کیا جائے گا۔ عبوری حکومت کی حیثیت سے متعلق واٹر سرائے کی طرف سے ابوالکلام آزاد کو ۳۰ مئی جولیتین دہائی کرائی گئی تھی۔ وہ بدستور موجود تھی۔ ان شرائط کے بعد واٹر سرائے نے نیکار کو خالصتاً ایسی منظوری حکومت کے حق میں نہیں۔ جس میں زیادہ سے زیادہ اہمی

رضامندی موجود ہو۔ لہذا کانگریس کی طرف سے کوئی ایسا لائحہ عمل پیش کیا جائے جس کے تحت مسلم لیگ

اور کانگریس کی رضا مندی سے فرقہ وارانہ مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہو، مؤخر الذکر بات شرائط میں شامل نہیں تھی۔

۲۲ جولائی کو پنڈت نہرو نے لاہور ویلز کو اس خط کے جواب میں لکھا کہ کانگریس ایک آزاد اور خود مختار حکومت کو انتہائی اہمیت دیتی ہے حکومت کسی صورت بھی گورنر جنرل کی بنیاد پر نہیں کام کرے اور وہ صرف آئینی سربراہ حکومت ہو، علاوہ انہیں اس کی طرف اقلیتی قائدین کی آمد کی بھی نامناسب ہوگی۔

پنڈت نہرو نے وائسرائے کے خط میں موجود شرائط کے ساتھ حکومت بننے سے انکار کر دیا اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ پہلے سیاسی خود مختاری کا مسئلہ حل کیا جائے۔

۳۱ جولائی کو قائد اعظم نے وائسرائے کے نام ایک خط میں تجاویز کو رد کرنے سے اظہارِ معذرت کر دیا۔ چنانچہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے وائسرائے کی شرائط کے استرداد کے لئے عبوری حکومت کی تشکیل التوا میں پڑ گئی۔ لیکن مختصر سے وقفے کے بعد حکومت برطانیہ کی پالیسی میں ایک عجیب انقلاب آیا کہ اس نے پنڈت نہرو کو حکومت بنانے کی دعوت دے دی۔ اس سلسلہ میں وزیر امور ہند نے وائسرائے کو لکھا کہ وہ نہرو کو برپیش کش کرنے ہوتے بنادیں کہ حکومت کی تشکیل میں تعاون حاصل کرنے کے لئے قائد اعظم سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ نے راست اقدام کا فیصلہ کیا تھا۔ اور حکومت برطانیہ کو یہ بات بہت جلد محسوس ہوئی تھی۔

## باقاعدہ پیش کش

۶ اگست کو وائسرائے نے باضابطہ طور پر پنڈت نہرو کے نام عبوری حکومت کی تشکیل کی پیش کش پیش کر دی۔ اس سے پہلے اور کیا بات ہو سکتی تھی، کہ اسے پہلے غلطے والا کوئی نہ ہو اور وہ مسلمانوں کو ہندو تسلط قائم کرنے کے لئے من مانی کاروائی کرے۔ ۸ اگست کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے لاہور ویلز کی یہ پیش کش قبول کرتے ہوئے پنڈت نہرو کو اختیار دیا۔ کہ وہ اس مسئلہ پر وائسرائے کے ساتھ مذاکرات کریں۔ ۱۴ اگست کو نہرو ویلز ملاقات ہوئی۔ نہرو نے وائسرائے کو بتایا کہ وہ ایک مضبوط حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ دیکھیں غیر مسلم لیگ مسلمانوں کو بھی حکومت میں شامل کریں گے۔ پنڈت نہرو اپنی طرف سے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کر

رہے تھے۔ حالانکہ یہ بات ظاہر تھی کہ وہ جن مسلمانوں کو حکومت میں شامل کرنے وہ یقینی طور پر کانگریس کے پیٹھ ہوتے یا اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کانگریس مسلمانوں کی نمائندہ بھی ہے۔ لیکن ویرن کو اس بات سے اتفاق نہ تھا، ان کی تجویز یہ تھی کہ مسلمانوں کی پانچوں نشستیں کچھ مدت کے لئے خالی چھوڑ دی جائیں۔ نہرو کے لئے یہ بڑی دل آزاری کی بات تھی۔

کانگریس کی عبوری حکومت کے قیام سے چند دن پہلے تک لارڈ ویول اس بات پر مصر ہے کہ مسلم لیگ کے لئے نشستیں خالی رکھے بغیر حکومت تشکیل نہ ہوگی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں وزیراعظم برطانیہ سے بھی اہمیت چاہی، لیکن لارڈ ایملی نے ان کی بات نہ مانی، جو اذیت تھا کہ اس طرح کانگریسی رہنما بد دل ہو جائیں گے اور حکومت برطانیہ اور کانگریسی رہنماؤں کے درمیان جو رہا سہا رابطہ قائم تھا، وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔

۲۴ اگست ۱۹۴۶ء کو دل سے ایک اعلان جاری کیا گیا، جس میں نئی ایگزیکٹو کونسل کے قیام کا ذکر تھا۔ اعلان میں بتایا گیا کہ ۲۲ ستمبر سے نئی کونسل کام شروع کرے گی۔

## ۱۶ اگست

مسلم لیگ نے راست اقدام کا فیصلہ تو اپنے اجلاس میں کر ہی لیا تھا۔ چنانچہ وہ دن بھی آ گیا۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو حکومت برطانیہ کی جانب دارانہ اور غیر منصفانہ پالیسی کے خلاف راست اقدام کا آغاز ہو گیا۔ اس موقع پر مسلمانوں نے ملک گیر ہڑتال کی، جسے منعقد کئے اور جلوس نکالے، ملکاتہ میں مسلمانوں کے جلسوں اور جلوسوں پر ہندوؤں نے اقتدار کا مظاہرہ کرنے سے پہلے ہی نشتر میں چور ہو کر حملے شروع کر دیئے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ان ہنگاموں میں پندرہ ہزار افراد زخمی اور پونسے پانچ ہزار ہلاک ہوئے۔ لارڈ ویول نازک حالات کا جائزہ لینے کے لئے بنگال کے دورے پر گئے تو انہیں اس بات کا شدید احساس ہوا کہ اگر گورنری طور پر مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اتحاد قائم نہ ہوا۔ تو پورا ملک تباہ جنگل کے شعلوں کی لپیٹ میں آجائے گا۔ ویول نے واپس آتے ہی کانگریسی رہنماؤں پر دباؤ ڈالا اور یہ تجویز پیش کی کہ بنگال اور مرکز میں محکوم حکومتیں قائم کی جائیں۔ مگر ۲۸ اگست کو نہرو نے لارڈ ویول کو - طبع کیا کہ کانگریس کی مجلس عاملہ کوئی نیا مارولہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں۔ گاندھی نے وزیراعظم برطانیہ کو ایک خط میں لکھا کہ وہ وائسرائے ہند لارڈ ویول کی ذہنی حالت پر سخت پریشان ہیں۔ لہذا وزیراعظم اس سلسلہ میں کوئی فوری اقدام کریں۔ گاندھی نے لکھا: "موسم ہڑتال ہے کہ بنگال میں قتل و غارت کے باعث



لارڈ ڈیول کے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔ لہذا ان کی جگہ فوری طور پر ہندوستان میں کوئی تبادلاً قابل اور قانونی مزاج رکھنے والا اشرارے بیجا جاتے۔ گاندھی نے ایک اور خط و اشرارے کو بھی بیجا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اگر وہ اس بات سے خائف ہیں کہ قتل و غارت کا سلسلہ پورے ہندوستان میں پھیل جائے گا، تو انگریزوں کو چاہیے کہ وہ فوری طور پر ہندوستان سے ہٹے جائیں۔ اور امن و امان قائم کرنے کا معاملہ کانگریس پر چھوڑ دیں۔

پندرہ تمبر ہونے بھی انگلستان میں بہت سے لوگوں کو یہ لکھا کہ ویلر بہت کمزور آدمی و نفع ہوئے ہیں۔ اور وہ کدلی جناح کو خوش کرنے کے لئے پورے ہندوستان کو مصائب و مشکلات کے جہنم میں دھکیں رہے ہیں۔ انہوں نے یہ الوام بھی لگایا کہ ویلر یہ سب کہہ "انگریزوں کو بولیں، یعنی سر فرانسس موڈی اور جارج ایل کے ایما پر کر رہے ہیں۔ لہذا ویلر کو ہر حالت میں ہندوستانی سے ہٹے جا چاہیے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عبوری حکومت کا قیام عمل میں آگیا۔ کانگریسی رہنما ہندو خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ اور اسے اپنی زبردست کامیابی قرار دے رہے تھے۔ بعض ہندو رہنماؤں نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

"بس اور چند دن کی بات ہے۔ ملک میں ایک قومی حکومت قائم ہو جائے گی۔ مسلم لیگ کے شمل ہونے یا نہ ہونے سے فرق کیا پڑے گا۔ آؤ اسی کا قافلہ تو مسلم لیگ کے بغیر بھی رواں دواں رہے گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم (ہندو) اپنے آپ کو اس ملک کا حاکم کہہ سکتے ہیں۔

## کانگریس کی عبوری حکومت

ہندوستان میں عارضی خطوط حکومت کی جگہ صرف ہندو عبوری حکومت کے قیام کی بات ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اور برطانویہ کے غیر جانبدار سیاسی حلقوں میں زبردست اضطراب پیدا ہو گیا۔ ۲۲ ستمبر کو جب کانگریسی حکومت نے نئی حکومت قائم کر لی تو ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے اپنی عمارتوں پر سیاہ جھنڈے لہرائے۔ برطانیہ میں مسٹر چرچل نے ایک پارٹی کی حکومت کے قیام کو انتہائی ناانصافی اور جانبدارانہ اقدام قرار دیا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ اگر ہندوستان میں کانگریس حکومت کی سرپرستی کی گئی تو اتنا زبردست قتل عام ہو گا کہ شاید ۱۸۵ لاکھ ہنگامہ بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انہوں نے برطانوی حکومت کو انتباہ کیا کہ اگر انگریزوں نے ہندو راج کو ہندوستان پر قابو پانے کی کوشش کی تو سوائے خانہ جنگی اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سرٹیفیڈ ڈگریس

نے ہندوؤں کی جانبداری میں نامناسب اور ناجائز حد تک تجاوز کیا ہے۔ چوتھوں نے اپنی ذات کے ہندو۔ نہرو کو حکومت سونپنے کے اقدام کو حکومت برطانیہ کی ذمہ داری قرار دیا۔ چوتھوں کی طرف اور بہت سے نمایاں انگریز سیاست دانوں نے بھی ایک پارٹی کو حکومت دینے کے اقدام کی ذمہ داری دے دی۔ ان سیاست دانوں نے صاف طور پر کہا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ صریحاً وعدہ خلافی کی ہے اور اس اقدام سے حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کے اعتماد کو ذمہ داری سے محروم کر دیا ہے۔

کانگریس حکومت کے قیام کے چند دنوں کے اندر مسلم لیگ نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے مفادات کو بڑی طرح کھلا جارہا ہے۔ یہ سب محض اس لئے ہوا کہ مسلم لیگ، حکومت میں شامل رہتی لیکن جہاں تک ان اصولوں کا تعلق تھا اور جی کو سر بلند رکھنے کے لئے مسلم لیگ نے حکومت میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی، وہ اصول اب تک اپنی جگہ قائم تھے۔ لیکن بنیادی مسئلہ یہ بھی تھا کہ ذمہ داری سیاسی حالات کا تقاضا تھا بلکہ وزارت داخلہ نے مسلمانوں کے خلاف جو رویہ اختیار کر رکھا تھا، اس کے تحت بھی مسلم لیگ کو اپنی پالیسی میں خاصی تہدیل کی گناہی۔ بنیادی بات یہی تھی کہ حکومت میں مسلم لیگ کی عدم موجودگی کے باعث کانگریس کو من مانی کرنے اور مسلمانوں کے مفادات کو ختم کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا۔ کانگریس کی پالیسی کی وجہ سے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ ان حالات میں مسلم لیگ کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ حکومت میں شرکت اور مسلمانوں کے حقوق کے لئے کام کرے۔ قائد اعظم کا خیال یہ تھا کہ علیحدہ پارٹی بلکہ حکومت میں شامل ہو کر ہی پاکستان کی جنگ لڑی جاسکتی تھی۔ اور دلائل اس لئے ہندوؤں کی ذمہ داری خواہش تھی کہ مسلم لیگ حکومت میں شامل ہو جائے۔ انہوں نے گلشن گلشن گاندھی سے دیکھا تھا کہ دیگر صوبوں میں بھی اس قسم کے ہنگاموں کو شدید خطرہ تھا۔ اس دوران قائد اعظم اور جواہر لعل نہرو کے درمیان طویل طویل مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا۔

### حکومت میں مسلم لیگ کی شرکت

۱۹۴۵ء کو برطانوی حکومت کی تشکیل نئی گئی اور ج ذیل کے لوگوں کو بیٹے کا فیصلہ کیا گیا۔

### مسلم لیگ

لیاقت علی خان (نیکو خاں)، آئی آئی چندر شیکر (چند شیکر)، مراد علی شاہ (مراد علی شاہ)

## کانگریس

جواہر لعل نہرو (امور خارجہ اور دولت مشترکہ) سردار ولسہ بھائی پٹیل (امور داخلہ، اطلاعات اور شہریت) ڈاکٹر راجندر پرشاد (خود راک اور زراعت) سی راج گوبال اپارسی (تعلیم اور فنون) آصف علی (ذرائع رسل و رسائل اور ریلوے) جگ جیون رام (منعت)

## افلیتیں

جان میتھائی (صنعت اور سپلائی) سی ایچ بھابھا (تعمیرات) کان کنی اور برقیات ریلوے سنگھ (خارج) -

ہندوؤں کو حکومت میں مسلمانوں کی شمولیت بہت ناگوار گزری، کیونکہ ان کی چارہ داری ختم ہو گئی تھی اور ہندو راج کے تمام خواب بکھر کر رہ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہندو کو یہ صدمہ بھی تھا کہ نئی کونسل اب ان کے زیر اختیار اور باڈی میں نہیں رہے گی۔ اگرچہ مسلم لیگ نے ایک اچھوت نمائندہ جے این منڈل کو بھی مسلم لیگ کے نمائندوں کی فہرست میں شامل کر لیا تو کانگریس کو ایک اور شدید دھچکا لگا کیونکہ اب تک کانگریس یہی سمجھتی آئی تھی کہ افلیتوں اور خاص طور پر اچھوتوں کی محافظ وہی ہے اور مسلم لیگ صرف ایک فرقہ وارانہ جماعت کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ان تمام حالات میں کانگریس کو لیگ کی شمولیت سخت ناگوار گزری۔ اس کی پالیسی میں لچک آنے کی جگہ زیادہ سختی پیدا ہو گئی۔ پنڈت نہرو کو تو اتنی زیادہ بے قراری محسوس ہوئی کہ انہوں نے واشرائے کو ایک خط لکھا کہ انہیں مسلم لیگ کے ناموں پر شدید اعتراض ہے اور مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ تعاون کرنے کی جگہ تصادم پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

حکومت میں شمولیت کی وجہ سے مسلم لیگ کو نہ صرف مسلمانوں کے تحفظ کا موقع ملا بلکہ اس نے ایک اچھوت نمائندے کو اپنی فہرست میں شامل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اگر کانگریس کو تو مسلم پرست مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ تھا تو مسلم لیگ کو بھی اچھوتوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے۔ مسلم لیگ کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسے کانگریس کی طرف سے پاکستان کی مخالفت کا تذکرہ کرنے کا موقع ملا۔

کانگریس نے قہراً ہر اسم مسلم لیگ کی حکومت میں شمولیت کو برداشت نہ کیا۔ لیکن وائسرائے کے اصرار کے باوجود مسلم لیگ کو اہم شعبوں میں سے کوئی ایک دینے پر رفا مند نہ ہوئے۔ وائسرائے کا اصرار یہ تھا کہ مسلم لیگ کے امور بخارجہ، امور داخلہ اور امور دفاع میں سے کوئی ایک لازماً دیا جائے، مگر نہ تو اس کی مخالفت کرتے رہتے۔ البتہ کانگریس نے حکمرانہ خوشی کے ساتھ مسلم لیگ کے سپرد کردہ ہائیڈرو گائرس کا خیال یہ تھا کہ مسلمان حساب کتاب پر دسترس نہ رکھنے کی وجہ سے بری طرح ناکام ہو جائے گا اور کانگریس کو نہ صرف اس کا تسخیر کرنے کا موقع ملے گا، بلکہ وہ یہ بھی دعوے سے کہے گی کہ مسلمان حکومت کرنے کے قابل نہیں۔ لیکن بعد میں کانگریس کو اپنی اس نامعقولیت پر بری طرح پچھتا نا پڑا۔ کیونکہ مسلم لیگ نے اسی ایک محکمے کے ذریعہ کانگریس کو ایسا سبق دیا جسے وہ آج تک نہ بھلا سکی۔

### لندن میں بات جمیت

منتخب آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو منعقد ہونا تھا۔ لیکن مسلم لیگ کے کامیاب امیدواروں نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ اسمبلی کو ایک نمائندہ جماعت تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ جب تک کانگریس صوبوں کی گروہ بندی کی دفعہ کی مکمل وضاحت کر کے اسے تسلیم نہیں کر لیتی، مسلم لیگ اسمبلی کی کاروائی میں حصہ نہیں لے گی۔ حالات اتنے نازک ہو چکے تھے کہ وائسرائے ہند لارڈ ویول نے ایک بار پھر برطانوی وزیر امور ہند کو مطلع کیا کہ اگر اسمبلی کا اجلاس بلا یا گیا تو ہندوستان میں خانہ جنگی پھیل سکتی ہے۔ مگر ۲ نومبر کو لارڈ ویول نے کانپور مشن منصوبہ کے تحت دعوت نامے جاری کر دیئے۔ اور آئین ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا۔ وائسرائے کے اس اقدام کو قائد اعظم نے ایک اور بہت بڑی غلطی قرار دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ایک بار پھر حقائق اور حالات کی سنگینی کو قطعی طور پر نظر انداز کرنے ہوئے کانگریس کو خوش کرنے کی کوشش کی یعنی آخر حکومت برطانیہ نے کسی فیصلے پر پہنچنے کی غرض سے کانگریس اور مسلم لیگ کے دو دو نمائندوں کو لندن بلا یا تاکہ کوئی فیصلہ کن بات ہو سکے۔

اس دوران کانگریس کا سالانہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا، جس میں کانگریس نے برطانیہ کی حکومت سے استغفیٰ ادا کی۔ کانگریس نے یہ بات کچھ اس انداز میں کی، جیسے مسلم لیگ کو اس نے حکومت میں جگہ دی ہو، ایک بار پھر ہندو مذہبیت کھل کر سامنے آئی اور کانگریس کے سردار آئین و سردار پٹیل نے اجلاس میں یہاں تک کہ دیا

کر ”ہم تلوار کا مقابلہ تلوار سے کریں گے۔ اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ تمام ہندوستان میں اکثریت ، اقلیت کو موت کے گھاٹ اتار دے۔“

۲ دسمبر ۱۹۱۹ء کو برطانوی حکومت نے بات چیت کے لئے قائد اعظم ، یانٹ حل خاں پنڈت جبر و اور سردار بلدی سنگھ لندن پہنچ گئے۔ لیکن بات چیت ناکام ہو گئی۔ اس کا باضابطہ اعلان حکومت برطانیہ کی طرف سے ۶ دسمبر کو کر دیا گیا۔ اختلاف صوبوں کی گروہ بندی والی شرط کی تشریح پر تھا۔ حکومت برطانیہ نے خود اس کی تشریح یوں کی تھی۔

”شروع سے اب تک کا بینہ مشن کی یہی رائے ہے کہ کسی مسئلہ پر اتفاق نہ ہو سکے تو فریقوں کے اندر ان قائدوں کی عام کثرت رائے سے فیصلہ کیا جائے گا جو ان فریقوں میں ہوں۔“ مسلم لیگ نے اس تشریح کو قبول کر لیا۔ لیکن اس نے اس کی تشریح کی کہ صوبوں کو گروہ بندی اور اپنے آئین سے متعلق خود فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

۱۰ دسمبر کو آئین ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا۔ پنڈت نہرو نے نئی دولت کی قرارداد پر قرارداد پیش کی۔ لیکن اس کے التواء کے لئے ایک ترمیم پیش کی گئی جو منظور ہو گئی اور آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ۲۰ جنوری تک ملتوی کر دیا گیا۔ ۵ جنوری ۱۹۲۰ء کو آئین ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس نے یہ قرارداد منظور کی۔

”کانگریس کمیٹی کی دل خواہش ہے کہ آئین ساز اسمبلی آزاد ہندوستان کے لئے آئین مبنی کا کام کرے اور بعض نکات کی تشریح کے باعث جو دشواریاں پیدا ہو گئی ہوں، انہیں دور کرنے کی غرض سے برطانوی تشریح کے مطابق فریقین میں ضابطہ کار۔ فی اختیار کیا جائے مگر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایسا کرتے وقت کسی صوبے پر جبر نہ ہو اور نہ ہی سکسوں کے حقوق پامال ہوں، اگر ایسا ہوا تو پورے صوبے یا اس کے ایک حصہ کو یہ حق ہو گا کہ متعلقہ فرقہ کے لوگوں کی مرضی سے مناسب کاروائی کرے چت چر کانگریس کمیٹی اپنی مجلس عاملہ کو یہ ہدایت کرتی ہے کہ جب بھی ضرورت محسوس ہو، وہ بائی خود مختاری کے اصولوں کے پیش نظر ایسے معاملات میں مشورہ دے۔“

در اصل کانگریس کی طرف سے یہ ایک نیا فتنہ کھڑا کرنے کی کوشش تھی اور اس قرارداد کے ذریعہ معاملات کو مزید الجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔

## مسلم لیگ کی قرارداد

آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا جس نے کانگریس کی قرارداد کی روشنی میں حالات کا جائزہ لیا۔ مسلم لیگ نے یہ قرارداد منظور کی۔

”کانگریس کی مجلس عاملہ نے کانگریس کمیٹی کو قراردادوں کے ذریعے جو حق استرداد دیا ہے اور پنجاب میں سکسوں کو جو امتناعی اختیار تفویض کیا ہے، وہ بے بنیاد اور بھل ہے۔ مسلم لیگ سمجھتی ہے کہ یہ قرارداد مسلمانوں اور حکومت برطانیہ دونوں کو فریب دینے کے لئے منظور کی گئی ہے۔ کانگریس نے ضابطہ کی کارروائی کے بارے میں حکومت برطانیہ کی ۲۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کی تشریح کو مسترد کر کے اور پھر آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں اپنی مرضی سے قرارداد منظور کر کے اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا کہ کابینہ مشن کے آئینی منصوبہ پر کوئی فیصلہ کیا جاسکے۔ نیز حکومت برطانیہ پر ان حالات میں یہ فیصلہ صادر کرنا مناسب ہوگا کہ ۱۶ مئی کو کابینہ مشن نے جس منصوبہ کا اعلان کیا تھا وہ کانگریس، سکسوں اور پست اقوام کی نامظوری کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ کیونکہ ۱۶ مئی کے بیان کا نفاذ صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ اسے قبول کر لیں، جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے، اس نے ۶ جون ۱۹۴۶ء ہی کو منظوری دے دی تھی۔ لیکن کانگریس کی طرف سے استرداد کی بنا پر ۲۹ جولائی ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ نے مجبوراً اپنی منظوری واپس لے لی۔ ان حالات میں مسلم لیگ کے کھلے احتجاج اور اعتراض کے باوجود آئین ساز اسمبلی کے انتخابات اور اجلاس کا انعقاد بنیادی طور پر غیر قانونی، ناقص اور بے ضابطہ تھا۔ اسی طرح آئین ساز اسمبلی کی تمام دیگر کاروائیاں خلاف قانون ہیں۔ مسلم لیگ مطالبہ کرتی ہے کہ آئین ساز اسمبلی کو فوراً توڑ دیا جائے۔“

۵ فروری ۱۹۴۷ء کو کانگریس اور اقلیتی نمائندوں نے (جو حکومت میں شامل تھے) وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ وہ عبوری حکومت میں شامل مسلم لیگ نمائندوں سے استغنے طلب کر لیں۔ کیونکہ مسلم لیگ نے نہ صرف آئین ساز اسمبلی میں شرکت نہیں کی بلکہ کابینہ مشن کا منصوبہ بھی رد کر دیا۔ علاوہ ازیں اس کے ماست اقدام کا بدگرام بھی جاری ہے۔ ۱۳ فروری کو کانگریس نے یہی مطالبہ دہرایا۔ جب وائسرائے نے کوئی اقدام نہ کیا تو کانگریس نے یہ دھکی دیا کہ وہ عبوری حکومت سے الگ ہو جائے گی۔

مسلم لیگ اور کانگریس دونوں ہی اپنے اپنے موقف پر قائم تھیں اور حکومت برطانیہ کے لئے دونوں، بالخصوص مسلم لیگ کو ناراض کرنا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ نہ صرف ہندوستان میں ہنگامہ ہو سکتا تھا بلکہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی اس کے اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔

## باب ۳

# انتقالِ اقتدار کا اچانک اعلان

کانگریس کی فہم نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ خانہ جنگی کا زبردست خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ۲۷ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کے وزیر اعظم ارٹھل نے اچانک ایک بیان دیا جو ہندوستان میں حکومت برطانیہ نے یہ اعلان انتہائی گھبرائے کے عالم میں اور کسی پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر کیا۔ ارٹھل نے اعلان میں کہا کہ حکومت برطانیہ کی رائے میں وہ وقت آچکا ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی تمام ذمہ داریاں اور اختیارات ہندوستانیوں کے سپرد کر دیئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وزارتِ وفد ہندوستان گیا اور اس نے دو بڑی سیاسی جماعتوں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتہ کرانے اور فارمولہ وضع کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن انگریس کہ کامیابی نہ ہو سکی۔ انہوں نے اس پر مزید اظہارِ انوس کیا کہ ان کے اعلان تک ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے درمیان کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجوزہ منصوبہ کے تحت آئین ساز اسمبلی کو کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا، حالانکہ منصوبہ کی بنیاد یہی تھی کہ اسمبلی براہِ اعتبار سے نمائندہ حیثیت کی حامل ہو۔ چنانچہ حکومت برطانیہ کی خواہش ہے کہ تمام ذمہ داریاں ان نمائندہ جماعتوں یا افراد کے سپرد کی جائیں، جنہیں تمام جماعتیں کا بنیہ مشن کے منصوبے کی مطابقت میں قبول کر لیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت حالات بہت غیر یقینی بلکہ خطرناک بھی ہیں۔ کیونکہ ہندوستان میں ایسا آئین اور ایسے با اختیار لوگ نظر نہیں آتے، جنہیں اختیارات منتقل کئے جائیں تاہم اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے میں تردد تاخیر بھی



روانیں رکھی جاسکتی۔ لہذا حکومتِ برطانیہ اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتی ہے کہ جون ۱۹۴۸ء تک ضروری تدابیر کے تحت ہندوستانیوں کو اختیارات منتقل کر دیئے جائیں۔ حکومتِ برطانیہ نے یہ بات پہلے ہی واضح کر دی تھی کہ ایک مکمل نمائندہ آئین ساز اسمبلی جو آئین مرتب کرے اسے پارلیمان میں پیش کر دیا جائے گا لیکن اگر اس وقت تک آئین ساز اسمبلی نے آئین مرتب نہ کیا تو حکومتِ برطانیہ اس بات پر غور کرے گی کہ ہندوستان کی حکومت کے اختیارات کس کے سپرد کئے جائیں۔ یعنی کسی مرکزی حکومت کے یا کچھ علاقوں میں عوامی حکومتوں کے یا ایسے طریق اختیار کر لے جو ہندوستان کے نائنو دن کے نزدیک قابل قبول ہوں۔

ذیہ الفلم ایٹلی نے یہ اعلان بھی کیا کہ ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ویول نے جنگ کے زمانے میں جو خدمات سر انجام دیں، وہ قابلِ قدر ہیں تاہم اب انتقالِ اقتدار کا مرحلہ ہے جس کے لئے لارڈ مونٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر کر کے بھیجا جا رہا ہے۔ وہ مارچ ۱۹۴۷ء تک اپنے عہدے کا چارج لیں گے۔

اعلان کے دوسرے دن لارڈ ویول نے پٹنہ اور بیانت علی خاں سے ملاقاتیں کیں۔ وائسرائے نے پٹنہ نہرو پر اس ضرورت کی وضاحت کی کہ آئین ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کی شمولیت نہایت ضروری تھی۔ انہوں نے نہرو کی توجہ کانگریس کمیٹی کی قرارداد ۶۔ دسمبر ۱۹۴۶ء کی طرف مبذول کرائی جن کی تشریح اس لئے ضروری تھی کہ مسلم لیگ کو آئین ساز اسمبلی میں شامل کیا جاسکے۔ ویول نے نہرو پر یہ بات بھی واضح کر دی کہ حکومتِ برطانیہ ایسا کوئی آئین متلذ کرنے پر ہرگز تیار نہیں جس سے ملک کا ایک یا کچھ حصے اختلاف رکھتے ہوں۔ لہذا جنگال کے ہندوؤں اور پنجاب کے سکھوں کو یہ آئین قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

لارڈ ویول نے فوایزادہ لیاقت علی خاں سے ملاقات کی تو انہوں نے دریافت کیا کہ کیا آئین ساز اسمبلی بدستور کام کرتی رہے گی؟ لیاقت علی خاں نے وائسرائے کو صاف صاف کہا کہ مشیر خزانہ کی حیثیت سے انہیں یہ پوچھنے کا مکمل اختیار تھا کہ اگر آئین ساز اسمبلی مکمل نمائندگی نہیں کرتی تو اس پر عوامی خزانے سے بلاوجہ رقم کیوں خرچ کی جائے گی؟ ویول نے لیاقت علی خاں کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ علی طور پر حکومتِ برطانیہ، گورنر جنرل یا مشیر خزانہ، کوئی بھی آئین ساز اسمبلی کو کارروائی جاری رکھنے سے روکنے کے مجاز نہیں۔ ویول نے اس بات پر اصرار کیا کہ مسلم لیگ آئین ساز اسمبلی میں ضرور شرکت کرے۔ مگر لیاقت علی خاں نے واضح کر دیا کہ

حالات کے پیش نظر بظاہر اس امر کا کوئی امکان نہ تھا۔

## کانگریس کا اقدام

کانگریس نے حکومت کی طرف سے مایوس ہو کر اپنی روایات کے مطابق وہی اوچھے ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ اس نے مسلم اکثریت کے تمام صوبوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو اکٹایا کہ وہ صوبائی گروپوں کی آئین ساز اسمبلی میں شرکت نہ کریں نیز مسلم اکثریت کے دو صوبوں پنجاب اور بنگال اور آسام کی تقسیم کا مطالبہ کریں۔ آسام کی کانگریس پارٹی نے بھی یہ ہدایات جاری کر دیں کہ کامینہ مشن کی سکیم کے تحت کوئی رکن اسمبلی بنگال کے گروپ میں شرکت نہ کرے۔ صوبہ سرحد کو مسلمان اکثریت کا صوبہ تھا کیسی وزارت کانگریس کی تھی۔ وہاں ہندوؤں اور سکھوں کے تعاون سے کانگریسی مسلمانوں کی تعداد مسلم لیگ اراکین سے زیادہ تھی۔ پنجاب میں مسلمانوں کے پاس ۴۸ نشستیں تھیں اور سب مسلم لیگ کے قبضہ میں تھیں۔ انتخابات کے بعد تین آزاد امیدوار مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو یہ تعداد ۹۰ ہو گئی۔ لہذا اب مسلم لیگ کے لئے مجموعی طور پر بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جن صوبوں میں وہ پاکستان قائم کرنا چاہتی تھی، وہی صوبے مسلم لیگ کے مخالفین کے قبضہ میں تھے۔ خفجیات خاں ٹوانہ کی سازش کے باعث مسلم لیگ وزارت نہ قائم کر سکی تھی خفجیات نے سکھوں اور ہندوؤں سے مل کر وزارت قائم کر لی تھی۔ علاوہ ازیں اس حکومت نے مسلم لیگ کے خلاف معاندانہ پالیسی جاری رکھی۔ فوب ممدٹ، میان قنار دولتانہ، سردار شوکت حیات خاں، ملک فیروز خاں فون، سید امیر حسین شاہ اہل بیگم شاہ نواز کو گرفتار کیا گیا۔ اور جب مسلم لیگ نے سول افروانی خبردار کی تو پنجاب اسمبلی کے ۱۶ مسلم لیگ اراکین کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

لارڈ اٹلی کے اسی بیان کے بعد کہ حکومت برطانیہ تمام اختیارات ہندوستانیوں کے سپرد کرنا چاہتی ہے۔ مسلم لیگ کے لئے سب سے بڑا اور نازک مرحلہ یہ تھا کہ صوبہ سرحد اور پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت قائم کی جاتی، بصورت دیگر یہ دونوں صوبے مسلم لیگ کے ماتھے سے نکل جاتے۔

اسی دوران ہندوؤں کے اکٹانے پر سکھ رہنما سٹرا اسنگھ نے یہ اعلان کر دیا کہ اگر مجلس متقنہ اور سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو ایک تہائی نمائندگی نہ دی گئی تو

کچھ تقسیم پنجاب پر اصرار کریں گے۔ مانشر تارا سنگھ بھی سمجھ گیا کہ کسکو کسی صورت بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا سمجھوتہ نہیں کر سکتے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو۔ اگر ایسی حکومت سکھوں پر ٹھوس گئی تو وہ تلوار کے زور سے مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے باہر نکال دیں گے۔

مسلم لیگ کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح پنجاب میں یونینٹ مخلوط وزارت کو ختم کر دیا جائے لیکن علی کوشش سے قبل ہی ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو خضریات خاں ٹوانہ نے متعنا دے دیا۔ اس طرح یہ مخلوط اور غدار وزارت خود بخود ختم ہو گئی۔ ۳ مارچ کو لواب محدود سکھوں، ہندوؤں اور یونینٹ پارٹی کے مسلمانوں کو یکجا کر کے یہ یقینی دلایا کہ اگر وہ پنجاب میں وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئے تو سکھوں اور ہندوؤں کے مفادات کی مکمل حفاظت کی جائے گی۔ مگر اس کے جواب میں تارا سنگھ نے اسی دن یہ بیان داغ دیا کہ سکھ ہمیشہ سے لئے ختم ہو جائیں یا زندہ رہیں، لیکن وہ مسلمانوں کی حکومت کبھی برداشت نہ کریں گے۔ انہوں نے سکھوں سے ان اخلاقیات میں اپیل کی کہ "خالص تیار ہو جائے اور کمر باندھے۔ آخری فیصلے کا وقت آچکا ہے۔ خدا تیری رہنمائی اور حفاظت کرے گا۔" دوسرے دن اس جذباتی لیکن ذہنی طور پر نابالغ بوڑھے سکھ رہنما نے تلوار گھا کر پاکستان مردہ باد اور ست سری کال کے نعرے لگائے۔ یہ بھی کہا کہ اب فیصلہ تلوار کرے گی اور سکھ مسلمانوں کے بڑھن ٹکانے لائیں گے۔ اسی دن تارا سنگھ نے ایک جلسہ عام میں سکھوں کو ان الفاظ میں اشتعال دلایا:

"ہندو اور سکھ اکڑ کر تمہارے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ دھرتی خون مانگ

رہی ہے۔ اب اس کی پائیں خون ہی سے کھجائی جائے گی۔ بھل میں نے

بجایا ہے مسلم لیگ کو تم ختم کر دو۔"

مانشر تارا سنگھ اور دوسرے سکھ اور ہندو رہنماؤں کی ان اشتعال انگیز تقریروں کا

اثر یہ ہوا کہ ۵ مارچ کو ہندوؤں اور سکھوں کا ایک مشترکہ جلوس انارکلی لاہور سے گزرا۔ اس

جلوس میں شامل لوگوں نے دکانوں سے مسلم لیگ کے جھنڈے اُتار دیئے، پاکستان مردہ باد

کے نعرے لگائے اور مسلمانوں پر پھلے شروع کر دیئے۔ دیکھتے دیکھتے فساد پنجاب نے دیگر

اضلاع میں بھی پھیل گیا۔ دو دن بعد حکومت کو ۲۴ گھنٹے کا کرفیو لگانا پڑا کیونکہ پنجاب میں خانہ جنگی

کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

مسلم لیگ نے فیروز خان فون کی تجویز پر ایک بار پھر سکھوں اور ہندوؤں سے

معاہدات کے لئے دست تعاون و راز کیا مگر کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ آخر کار پنجاب کے انگریز گورنر نے حکومت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

## نئی تباہ ویر

کانگریس نے ۵ مارچ کو مسلم لیگ کو دعوت دی کہ وہ کانگریس سے مذاکرات کے لئے اپنے نمائندے نامزد کرے تاکہ اشغالِ اختیارات کا عمل خوشگوار اور چر امن طور پر ہو سکے۔ کانگریس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ پنجاب کو مسلم اور غیر مسلم اکثریت کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ کانگریس نے یہ تجاویز وائسرائے کو بھی روانہ کیں۔ ان میں برنگال کی تقسیم کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ ان حالات میں، کہ کانگریس نے آئین ساز اسمبلی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ کیا تھا، تعاون کیسے کر سکتی تھی۔ انہی دنوں قیامت علی خاں نے نئے سال کا بجٹ پیش کیا۔ اس بجٹ میں ناجائز طریقوں سے بے پناہ دولت کمانے والوں پر کچھ ٹیکس ماہ کئے گئے تھے۔ کانگریس جو اس وقت تک یہ سمجھ رہی تھی کہ مسلمان حساب کتاب میں کمزور ہوتا ہے۔ لہذا خزانہ اگر ایک مسلمان کے پاس چلا گیا تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا، اب نئے ٹیکس پر بڑی طرح بڑکھلا گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی بڑی بڑی صنعتوں اور تجارتوں پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اور اس ٹیکس سے وہی متاثر ہوتے تھے۔ کانگریس ان کروڑ پتی ہندوؤں سے چندے حاصل کرتی تھی لہذا اسے یہ اقدام سخت ناگوار گزرا۔ پینڈت نہرو جو کسی وقت مسلم لیگ کو مرزا بدلاؤ جائیدادوں اور زمینداروں کی جماعت کہتے تھے اب خود ہی اس ٹیکس کی مخالفت کرنے میں پیش پیش تھے۔ اس کاری ضرب نے کانگریس کی کمزور کردی اور بہت سے ہندو سیٹھ کانگریس کے خلاف ہو گئے۔

## نئے وائسرائے کی آمد

نئے وائسرائے ہند لارڈ ہاؤنٹ بیٹن ۲۲ مارچ، ۱۹۲۴ء کو دہلی پہنچ گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہدے کا حلف اٹھانے سے پہلے ہی قائدِ اعظم اور گاندھی کو خط لکھ دیئے کہ وہ ان سے ملاقات کے لئے دہلی پہنچ جائیں۔ اسی دن خط لکھنے کے بعد انہوں نے اپنے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔

ہارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پنڈت جواہر لعل نہرو کے ساتھ مراسم عام سب کو تھا۔ منہذا ان کی بطور وائسرائے آمد۔ بہر حال کانگریس کے لئے ایک نیک فال تھی۔ مگر حکومت برطانیہ کو بعض انگریز مدیرین اور سیاست دانوں نے قبل از وقت متنبہ کیا تھا کہ انیس وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجے گا و احد مطلب یہ لیا جائے گا کہ کانگریس کے ساتھ رعایت برقی جاری ہے۔ لیکن حکومت برطانیہ نے اس کی مطلق پڑاؤ کی۔ اپنی اقتتاحی تقریر کے دوران انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ ان کا متقابل اقتدار ایک فوری ضرورت ہے۔ لہذا تمام عیسیدہ مسائل کو بھی جلد از جلد طے کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ ماؤنٹ بیٹن، کانگریس کے چیتے تھے بلکہ ایک سہ ماہی بھی تھا کہ وائسرائے کے علمبردار ایک ہندو۔ کرشنا مینن بھی تھے جو خود کانگریسی تھے۔ وہ ہر وقت وائسرائے کو بانیہارانہ رویے پر اگسا سکتے تھے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کا متقابل اختیار کا تمام منصوبہ بھی کرشنا مینن نے تیار کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کا عالم یہ تھا کہ وہ ناگشتہ اکثر نہرو کے ساتھ موخر الذکر کے گھر کرتے۔ اندرا گاندھی سے ان کی گڑھی چھنی تھی۔ ادھر لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے نہرو کے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ ابراہام آزاد نے تو اس مذہب اعتراف کیا کہ نہرو پر لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا اثر سردار پٹیل اور ماؤنٹ بیٹن سے بھی زیادہ تھا۔

ماؤنٹ بیٹن نے مختلف اوقات میں پنڈت نہرو، گاندھی، تاندا اعظم، لیاقت علی خاں اور کچھ وہابیوں سے ملاقاتیں کیں۔ کانگریسی رہنما اپنی خوشامد سے اور کرشنا مینن کی قربت کے بل پر ماؤنٹ بیٹن پر دباؤ ڈالتے رہے۔ اسی دوران گاندھی نے ماؤنٹ بیٹن کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی کہ کانگریس وزارت سے الگ ہو جاتی ہے، مسلم لیگ سے کہا جائے کہ وہ خالصتاً اپنی وزارت قائم کر لے۔ ثلید کانگریس فواز وائسرائے یہ بھی کر گزرتے مگر مشکل یہ تھی کہ کامبینہ مشن منصوبے کے تحت وہ ایسا نہ کر سکتے تھے لہذا تمام سیاسی جماعتوں کی رضامندی کے پابند تھے۔

### منصوبہ تقسیم ہندوستان

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان پہنچتے ہی محسوس کیا کہ کامبینہ مشن منصوبہ کے تحت متحدہ ہند کی بنیاد پر کسی حل پر پہنچنا ناممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک نیا منصوبہ تیار کرنے کی کوشش شروع کر دی جس کی بنیاد وہ بیان تھا جو ۲۰۔ فوری کو وزیر اعظم برطانیہ نے دیا تھا۔

ماؤنٹ بیٹن نے اپنے مشیروں کی مدد سے ایک منصوبہ تیار کیا جو منظوری کے لئے لندن روانہ کر دیا گیا۔ انتقال اختیار کے اس منصوبہ میں صوبوں کو اور صوبوں کے گروہوں کو انتقال اختیار سے پہلے عبوری دور میں اختیارات دینے کی تجویز شامل تھی۔ ۱۱ اپریل کو یہ منصوبہ ترمیم و اضافہ کیلئے کرشنا مینن کو لندن سے ملا۔ گو مینن نے اس حکم کی تعمیل تو کر لی لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ منصوبہ پیش طور پر ناقابل عمل تھا۔ ۱۵ اور ۱۶ اپریل کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے صوبائی گورنروں کا اجلاس منعقد کیا اور یہ تبادلہ منظر پیش کیا۔ منصوبہ جو صوبوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تقسیم پر بھی مشتمل تھا منظور کیا گیا۔ کانگریس یہ چاہتی تھی کہ کانگریس کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا جائے اور ہندوستان میں اس نوعیت کی وفاقی حکومت قائم ہو، جس میں ہندوستان کی یونین اور مسلمان اکثریتی صوبے دو گروہوں کی صورت میں شریک ہوں، اس صورت میں بھی بنگال اور آسام کو تقسیم کر دیا جائے۔ کانگریس کا موقف یہ تھا کہ اگر مسلم لیگ، مسلمان اکثریت کے علاقے الگ کرنا چاہتی ہے تو صوبوں کے اندر جو ہندو اکثریت کے علاقے موجود ہیں انہیں بھی بہر حال تقسیم رہنا چاہئے۔ قائد اعظم نے کانگریس کے اس مطالبہ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان پاکستان کا مطالبہ اس اصول کی بنیاد پر کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو ایک قومی وطن ملے جو پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان، بنگال اور آسام کے صوبوں پر مشتمل ہو۔ اگر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کر تسلیم کر لیا جائے تو دوسرے صوبوں کی تقسیم بھی ضروری ہو جائے گی۔ قائد اعظم نے فوجوں کی تقسیم اور ہندوستان اور پاکستان کی مکمل خود مختاریت کا مطالبہ ہی کیا۔ کانگریس نے صوبوں کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو سکھوں نے بھی خالصتاً ان کا مطالبہ کر دیا اور ہندو اکثریتی صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں نے ان ہندو صوبوں کی تقسیم پر زور دینا شروع کر دیا۔

گورنروں کی کانفرنس میں منظوری کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے توثیق کے لئے ترمیم شدہ منصوبہ دوبارہ لندن بھیجا اور یہ درخواست کی کہ ۱۰ مئی تک اسے لازماً واپس بھیج دیا جائے تاکہ سیاسی جماعتوں کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ پھر ہتھ بھرا کر کم کے لئے دائرہ سرائے شلہ پہنچ گئے۔

## راز و نیاز

”سورہ توثیق کے لئے لندن پہنچا۔ وائسرائے شملہ آگئے اور پھر شملہ کی خوشگوار نفا  
ڈاؤنٹ بنیں، کرشنا مینن اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے درمیان راز و نیاز کا سلسلہ  
نہرو نے جو کیا۔ کرشنا مینن نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اس منصوبہ کے بارے میں بات کی۔  
لندن میں بھی کیا تھا۔ دیس انشاء نہرو بھی ماؤنٹ بیٹن کے ہمان خصوصی کے طور پر شملہ پہنچ گئے۔  
پھر ان سب کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ کرشنا مینن، نہرو سے تبادلہ خیال کے بعد ایک اور  
منصوبہ فوری طور پر لندن رواد کریں۔

۱۔ مئی کو مینن نے نہرو کے ساتھ جس نئے منصوبہ کی بات کی اس کے تحت ”دو ہندوستانوں“  
یا صوبوں کے گروہوں کو انتقال اختیار کا کوئی ذکر نہ تھا۔ ۱۔ مئی کو ان مینن میں پھر مشورے چلے  
اور منصوبہ پھر دیکھا گیا لیکن اسے اجلاس کہہ کر اس کی کارروائی سرکاری ریکارڈ میں شامل کر لی گئی۔  
حالانکہ تمام کارروائی ویسے بھی یکطرفہ ہو رہی تھی۔

اسی دن وائسرائے کو لندن سے یہ منصوبہ موصول ہو گیا، جو وہاں توثیق کے لئے بھیجا  
گیا تھا۔ حکومت برطانیہ نے اس میں بھی بعض ترامیم کی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد  
وائسرائے نے برطانیہ سے توثیق شدہ منصوبہ نہرو کو دکھایا۔ نہرو اسے پڑھتے ہی چلا کر بولے  
”کاگر اس سے کس قیمت پر بھی قبول نہیں کرے گی۔“

نہرو کے بہترین دوست اور ان کی صاحبزادی انڈرا گاندھی کے نازب دار لارڈ ماؤنٹ بیٹن  
نہرو کے اس انداز سے بے حد گہرائے۔ انہوں نے علی الصبح کرشنا مینن کو نہرو کے رد عمل  
سے مطلع کیا۔ کرشنا مینن نے یہ تجویز پیش کی کہ انہوں نے جو نیا منصوبہ تیار کیا تھا اسے اپنایا  
جائے کیونکہ اس کے تحت ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ سکتا تھا۔ فوری طور پر  
وائسرائے کے عہد کا اجلاس طلب کر کے نہرو کو خاص طور پر مدعو کیا گیا۔ چند لمحوں میں لندن سے  
موصولہ منصوبہ پر اعتراضات کو سرکاری ریکارڈ میں شامل کیا گیا اور اس طرح انتقال اختیارات کے  
اتنے بڑے اور اہم منصوبہ پر صرف نہرو کے اعتراضات شامل کر کے آخری صورت دے دی گئی۔  
فوراً بعد کرشنا مینن سے کہا گیا کہ وہ اپنا منصوبہ مرتب کر کے پنڈت نہرو کو رات سے پہلے  
دکھا دیں کیونکہ اسی رات نہرو دلی واپس جا رہے تھے۔ مینن نے فوری طور پر منصوبہ تیار کیا،

شہر نے اس کی منظوری دے دی۔

۱۸۔ مئی کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے منصوبہ کی توثیق کے لئے بنفس نفیس لندن پہنچ گئے۔ لندن میں لارڈ رزے اور لارڈ ایبل نے نئے منصوبہ کی شدید مخالفت کی لیکن ماؤنٹ بیٹن نے دھکی دی کہ اگر منصوبہ منظور کیا گیا تو وہ اپنے حرد سے استفادے سے دیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن حکومت برطانیہ کے چیتے تھے، ان کی یہ دھکی کارگر ہوئی اور برطانوی کابینہ کی ہندو باکیٹی نے اس کی توثیق کر دی۔ وزیر اعظم برطانیہ اور ان کی کابینہ نے بھی اس منصوبہ کی منظوری صرف ۵ منٹ میں دی۔ غالباً اتنے اہم کام اور اہم کردار عوام کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے صرف ۵ منٹ دینا کے تحت پہلی اور آخری یکنی بدترین مثال تھی۔

### ۳۔ جون کا منصوبہ

۱۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو تاج برطانیہ کی طرف سے جو اعلان کیا گیا تھا اس کے مطابق ہندوستان کو جون ۱۹۴۸ء تک اختیارات منتقل کئے جانے تھے۔ تاج برطانیہ کو توقع تھی کہ ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتیں کابینہ مشن منصوبہ ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کے تحت باجم تعاون کریں گی اور ان کے لئے ایک ایسا آئین وضع کرنا ممکن ہو جائے گا جو تمام جماعتوں کے لئے قابل قبول ہو۔ لیکن تاج برطانیہ کی یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔

۲۔ مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، سی پی، برار، آسام، اڑیسہ، صوبہ سرحد، دہلی، اجیر، مادھرا اور کرگ کے نمائندوں کی اکثریت نئے آئین کے سلسلہ میں پہلے ہی کام کر چکی ہے۔ دوسری طرف مسلم لیگ جس میں بنگال، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے نمائندوں کی اکثریت ہے، نے فیصلہ کیا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کی کارروائی میں حصہ نہ لے گی۔

۳۔ شاہ برطانیہ کی حکومت کی یہ خواہش رہی ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو ان کی انگلیں اور خواہشات کے مطابق اقتدار منتقل کیا جائے۔ اگر تمام سیاسی جماعتوں میں مکمل تعاون جو توجہ کام بہت آسان ہو جاتا۔ لیکن اس تعاون اور باجم اہتمام و تنہیم کی عدم موجودگی میں کوئی طریق کار اختیار کرنے کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہو گئی ہے تاکہ ہندوستان کے عوام کو ان کی خواہشات کے مطابق اقتدار منتقل کیا جائے۔ ہندوستان



کے سیاسی رہنماؤں سے مکمل مشورے کے بعد حکومت برطانیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ  
ضد رج ذیل منصوبہ کو اپنایا جائے اور یہ بات بھی واضح کر دی جائے کہ وہ خود کوئی متبادل  
آئین وضع کرنے کے حق میں نہیں بلکہ یہ ہندوستانیوں کا اپنا کام ہے اور نہ ہی اس  
منصوبہ میں کوئی ایسی بات ہے جو مختلف فریقوں میں متحدہ ہندوستانی پر گفت و شنید  
کی راہ میں مانع ہو۔

۴۔ حکومت برطانیہ موجودہ آئین ساز اسمبلی کے کام میں کوئی خلل ڈالنے پر آمادہ نہیں۔ وہ  
توقع رکھتی ہے کہ اب ان صوبوں کے مسلم لیگی نمائندے مطمئن ہو جائیں گے، جن صوبوں کے  
نمائندوں کی اکثریت پہلے ہی آئین ساز اسمبلی میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ موجودہ  
آئین ساز اسمبلی جو آئین مرتب کر چکی ہے، خود ہی نہیں کہ اس کا اطلاق ملے ان صوبوں پر بھی جو صوبے کیلئے یہ  
آئین نافذ کیا گیا ہے۔ لہذا حکومت برطانیہ مطمئن ہے کہ جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، تمام لوگوں کی خواہشات کی  
تعمیل کے لئے ایک بہترین عملی طریقہ کار ہے۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ ایسے علاقوں کے  
لوگوں کا یہ منتظر معلوم کیا جائے کہ وہ موجودہ آئین ساز اسمبلی کے ذریعہ اپنا آئین وضع  
کیوں گے یا کسی نئی آئین ساز اسمبلی کے ذریعہ، جہاں ان کے نمائندے ہوں، اور  
جنہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ آئین ساز اسمبلی میں شرکت نہیں کریں گے! اس کے  
بعد ہی یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ انتقال اختیار کسی ایک یا ایک سے زائد بااختیار  
لوگوں کو منتقل کیا جائے۔

۵۔ اس قسم کے نئے بحال اور پنجاب کی مجلس قانون ساز دو گروہوں میں تقسیم ہوں گی۔  
یورپین اراکین ان میں شامل نہیں ہوں گے۔ ان دو گروہوں میں ایک دوہو گا، جو  
مسلمانوں کی اکثریت کے اضلاع پر اور دوسرا وہ جو دونوں صوبوں کے باقی ماندہ  
علاقوں کے اضلاع پر مشتمل ہو۔ اضلاع کی آبادی کے تعین کی غرض سے ۱۹۱۱ء کی  
مردم شماری مستند سمجھی جائے گی۔ پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں مسلمان اکثریت کے  
اضلاع اس بلان کے ضمیمہ میں درج ہیں۔

۶۔ ہر مجلس قانون ساز کے دونوں گروہوں کے اجلاس الگ الگ منعقد ہوں گے اور  
انہیں اس سلسلہ میں اظہار رائے کا اختیار ہوگا کہ صوبہ کو تقسیم کیا جائے یا نہ کیا  
جائے۔ اگر کوئی بھی گروہ سادہ اکثریت سے تقسیم کے حق میں رائے دے تو

تقسیم کا عمل قبول کر دیا جائے گا اور متعلقہ انتظامات کئے جائیں گے۔

۷۔ تقسیم کے فیصلہ سے قبل بہتر یہ ہو گا کہ ہر گروہ کے نمائندوں کو پہلے سے علم ہو کہ اگر اسمبلی کے دونوں گروہوں نے صوبہ کے اتحاد کے حق میں فیصلہ کیا تو متعلقہ صوبہ مقدمہ صدارت میں آئین ساز اسمبلی میں شریک ہو گا۔

۸۔ اور اگر دونوں گروہوں میں کسی ایک کا کوئی رکن بھی مطالبہ کرے تو مجلس قانون ساز کے تمام اراکین کے اجلاس میں اس مسئلہ کا فیصلہ ہو گا لیکن کوئی یورپی رکن ایسا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

۹۔ اگر تقسیم کا فیصلہ ہو جائے تو مجلس قانون ساز کا ہر گروہ اپنے علاقوں کی طرف سے یہ فیصلہ کرے گا کہ اس کا آئین موجودہ آئین ساز اسمبلی وضع کرے۔ یا نئی اور علیحدہ آئین ساز اسمبلی۔

۱۰۔ بنگال اور پنجاب کے مسلم اور غیر مسلم اضلاع کی تقسیم عارضی ہو گی۔ دونوں صوبوں یا کسی ایک صوبہ کی تقسیم کا فیصلہ ہونے کے بعد گورنر جنرل ایک حد بندی کمیشن مقرر کرے گا۔ حد بندی کمیشن حدود کے تعین کے سلسلہ میں مسلسل اور غیر مسلم اکثریتی علاقوں اور دیگر فردی باتوں کو مد نظر رکھے گا۔ حد بندی کمیشن کا فیصلہ موصول ہونے تک عارضی حدود قائم رہیں گی۔

### سندھ

۱۱۔ سندھ کی مجلس قانون ساز کے تمام ہندوستانی اراکین ایک خاص اجلاس میں اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ سندھ کا آئین موجودہ آئین ساز اسمبلی وضع کرے یا ایک نئی اور علیحدہ آئین ساز اسمبلی!

### صوبہ سرحد

۱۲۔ صوبہ سرحد کی حیثیت استثنائی ہے لہذا اسے یہ موقع فراہم کرنا ضروری ہے کہ جب پنجاب یا پنجاب کا ایک حصہ موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کرے تو صوبہ سرحد اپنی حیثیت پر اصرار فرمادے۔ جس لوگوں نے موجودہ مجلس

قانون ساز کے اراکین کو ووٹ دیئے تھے ، وہی اس معاملہ پر حق استصواب رائے استعمال کریں گے کہ وہ موجودہ آئین ساز اسمبلی یا نئی اور علیحدہ اسمبلی میں سے کس میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔

## برطانوی بلوچستان

۱۲۔ برطانوی بلوچستان نے ایک سن منتخب کیا ہے۔ لیکن اس رکن نے موجودہ آئین ساز اسمبلی میں نشست نہیں سنبھالی۔ بلوچستان کی جغرافیائی حیثیت کی بنا پر اس صوبہ کو بھی اپنی حیثیت کا از سر نو جائزہ لینے کا حق دینا چاہئے گا۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے گورنر جنرل اس امر کا جائزہ لے رہے ہیں کہ یہ کام خوش اسلوبی کے ساتھ کیونکر انجام دیا جاسکتا ہے۔ اس صوبہ کو موجودہ آئین ساز اسمبلی یا نئی اور الگ آئین ساز اسمبلی میں شرکت کا اختیار ہوگا۔

## آسام

۱۳۔ گو آسام میں غیر مسلم اکثریت ہے۔ لیکن سلٹ کا ضلع مسلمانوں کی اکثریت کا حامل ہے۔ یہ مطالبہ عام رہا ہے کہ بنگال کی تقسیم کی صورت میں سلٹ کو بنگال کے مسلمان حصہ میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ اگر بنگال کی تقسیم کا فیہ نہ ہو جاتا ہے تو سلٹ کے ضلع میں آسام کی صوبائی حکومت سے مشورہ کے بعد اور نور زجنرل کی منظوری کے تحت یہ فیصلہ کرنے کے لئے آیا، سلٹ بدستور صوبہ آسام کا ایک حصہ رہے ! اسے مشرقی بنگال کے نئے صوبے کا حصہ بنا دیا جائے ، استصواب رائے حامد کرایا جانے گا۔ اگر استصواب رائے کا نتیجہ مشرقی بنگال کے ساتھ وابستگی کے حق میں ہو تو ایک حد بندی کمیشن ضلع سلٹ کے مسلم اکثریتی علاقوں اور مستقل مسلمان اکثریتی علاقوں کی حد بندی کے لئے قائم کیا جائے گا جو پنجاب اور بنگال کے حد بندی کمیشن کی بنیادوں پر کام کرے گا۔ اس کے بعد سلٹ کا ضلع مشرقی بنگال کو منتقل کر دیا جائے گا۔ جہاں تک صوبہ آسام کے باقی ماندہ حصہ کا تعلق ہے تو وہ بدستور موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شریک رہے گا۔

## آئین ساز اسمبلیوں میں نمائندگی

۴۔ اگر پنجاب اور شمال کی تقسیم کے حق میں فیصلہ ہو جائے تو ان علاقوں کے نمائندگان کے انتخاب کے لئے نئے انتخابات کا انعقاد ضروری ہوگا۔ نمائندگی ہر دس لاکھ افراد پر ایک کے تناسب سے ہوگی، اسی طرح اگر سلٹ مشرقی بنگال کا حصہ بننے پر انہما رضامندی کر دے تو وہاں بھی مندرجہ بالا طریق پر نئے انتخابات ہوں گے۔ ہر علاقہ کی نمائندگی یوں ہوگی :

صوبہ	مقام نشستیں	مسلمان نشستیں	سکھ	مجموعی نشستیں
ضلع سلٹ	۱	۲	۳	۳
مغربی بنگال	۱۵	۲	۳	۱۹
مشرقی بنگال	۱۲	۲۹	۳	۴۱
مغربی پنجاب	۳	۱۲	۲	۱۷
مشرقی پنجاب	۶	۲	۲	۱۰

۵۔ مختلف علاقوں کے نمائندے موجودہ آئین ساز اسمبلی میں یا نئی آئین ساز اسمبلی میں شرکت کریں گے۔

## انتظامی معاملات

۶۔ کسی بھی صوبہ کی تقسیم کے نتیجے میں پیدا شدہ انتظامی تبدیلی کے بارے میں بات چیت درج ذیل بنیادوں پر جلد از جلد کی جائے گی :

(۱) ایسے تمام معاملات جو اس وقت مرکزی حکومت کے تحت ہیں اور جن میں دفاع، خزانہ اور مواصلات شامل ہیں، نئے مختاران مجاز کے نمائندوں کی وساطت سے !

(ب) اقبال اختیار سے پیدا شدہ امور پر نئے مختاران مجاز اور حکومت برطانیہ کے درمیان !

(ج) تقسیم ہونے والے صوبوں کے صوبائی امور سے متعلق شلڈ پولیس اور دیگر

گلازمتیں، اعلیٰ عدالتیں، صوبائی ادارے اور دیگر مڈاریاں وغیرہ !

## ریاستیں

۱۷۔ حکومت برطانیہ یہ بات واضح کر دینا چاہتی ہے کہ جو فیصلے کئے گئے ہیں، برطانوی ہند سے تعلق رکھتے ہیں اور ہندوستانی ریاستوں سے متعلق ان کی پالیسی (کا بیسنہ مشن رپورٹ ۱۲۔ مئی ۱۹۴۶ء کے مطابق) میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

## شمال مغربی سرحدی قبائل

۱۸۔ شمال مغربی سرحدی قبائل کے امور کا فیصلہ ان کے مختارانِ مجاز کے ساتھ بات چیت کے بعد ہوگا۔

## عجلت کی ضرورت

۱۹۔ اختیارات منبھالنے کے لئے مختارانِ مجاز کو کچھ وقت درکار ہے، تاہم یہ بہت ضروری ہے کہ اس طریق کار کو جلد از جلد مکمل کیا جائے۔ تاخیر سے پچھنے کے لئے مختلف صوبے یا ان صوبوں کے حصے، جہاں تک ممکن ہو آزادانہ طور پر اس منصوبہ کی شرائط کے تحت موجودہ آئین ساز اسمبلی یا نئی آئین ساز اسمبلی (اگر تشکیل ہو گئی ہو) اپنے اپنے علاقوں کیلئے آئین مرتب کریں گی اور انہیں اپنے ضابطے وضع کرنے کا مکمل اختیار ہوگا۔

## فوری انتقال اختیارات

۲۰۔ تمام بڑی سیاسی جماعتوں نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ اختیارات جلد از جلد منتقل کر بیٹے جائیں۔ حکومت برطانیہ ان کی اس خواہش کا مکمل احترام کرتی ہے اور اس مقصد کے لئے ایک آزاد حکومت ہندوستان یا کئی حکومتوں کو اختیار منتقل کرنے کی زیادہ سے زیادہ مدت جن ۱۹۴۸ء مقرر کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے حکومت برطانیہ ایک یا دو مختار مجاز و ازمان کو نوآبادی کے درجہ کی بنیاد پر اختیار منتقل کرنے کے لئے قانون وضع کرے گی۔ اس قانون کے تحت ہندوستان کی آئین ساز

اسمیل کے اس فیصلہ پر کوئی اثر نہ پڑے گا کہ ہندوستان کے وہ حصے جن کی وہ فائدہ ہے، برطانیہ کی دوست مشترکہ میں بدستور شریک رہیں یا نہ رہیں۔

## مزید اعلانات

۲۱۔ گورنر جنرل وقتاً فوقتاً نئے اشتہارات کے سلسلہ میں فردی اعلانات کرتے رہیں گے۔

## ضمیمہ

۱۔ اہل مردم شماری کے مطابق بنگال اور پنجاب کے مسلم اکثریتی اضلاع یہ ہیں:

۱۔ بنگال:

چٹاگانگ ڈویژن: چٹاگانگ، فوکلہائی، تپو۔  
ڈھاکہ ڈویژن: باکوئچ، ڈھاکہ، فریدپور، میمن سنگھ۔  
پرنسپل ڈویژن: حبیبور، مرشد آباد، بھادوا۔

راجشاہی ڈویژن: بوگرہ، دیناج پور، مالده، پٹنہ، راجشاہی، رنگ پور۔  
۲۔ پنجاب:

لاہور ڈویژن: گوجرانوالہ، گورداسپور، لاہور، شیخوپورہ، سیالکوٹ۔  
راولپنڈی ڈویژن: ہلک، گجرات، جہلم، میانوالی، راولپنڈی،  
شاہ پور۔

ملتان ڈویژن: ڈیرہ غازی خان، جنگ، لائل پور، منٹگری، ملتان،  
منظفر گڑھ۔

## رہنماؤں کی کانفرنس

۲۔ جن کو دائرہ ہند لا رڈمانٹ بیٹن نے سات سیاسی رہنماؤں پر مشتمل

ایک کانفرنس طلب کی۔ اس میں قائد اعظم محمد علی جناح، فواد احمد، لیاقت علی خان، سردار  
عبدارب نشتر، پٹت جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل، اچاریہ کپرنپانی اور سردار بلدیو سنگھ

شامل تھے۔ ۲۰ جون کا منصوبہ ان رہنماؤں کے سامنے رکھا گیا۔ گاندھی اس کانفرنس میں  
دھت کے باوجود شرکت نہیں ہوئے کیونکہ وہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے۔ اس  
سلسلہ میں لاڈاؤنٹ بیٹن ناز برداری کے طے ان کے پاس خود بھی گئے۔ تاہم انہیں  
کانگریس کے حق میں منصوبہ کی افادیت واضح کر سکیں۔

پٹنٹ جواہر لعل نہرو نے کانفرنس میں یہ الفاظ کہے: ”جو کانگریس کے طے ہوا  
منصوبہ قابل قبول نہیں، تاہم کانگریس اسے قبول کرنے لگی، حالانکہ اس منصوبہ کا انکشاف  
پٹنٹ نہرو پر تیاری کے وقت میں ہو چکا تھا اور ان کی پیشگی منظوری کے بعد ہی یہ منصوبہ لندن  
گیا تھا، تاہم انہوں نے یہ ظاہر کیا گیا کہ منصوبہ منظور کرتے وقت وہ حکومت برطانیہ اور مسلم لیگ  
پر احسانِ عظیم کر رہے تھے۔“

قائد اعظم نے صاف کہہ دیا کہ جب تک وہ مسلم لیگ کو نسل سے منظوری حاصل نہ کر لیں  
منصوبہ کے بارے میں کوئی ایک طرف فیصلہ نہیں کر سکتے۔ وائسرائے نے قائد اعظم کو مجبور کیا کہ  
وہ اس کی تصدیق کر دیں اور بعد ازاں کو نسل سے توثیق کرائیں۔ لیکن قائد اعظم نے انہیں  
دروغ بتایا کہ وہ مسلم لیگ کو نسل اور مسلمان قوم کو اس منصوبہ کی منظوری پر آمادہ کرنے کی  
کوشش تو کر سکتے ہیں لیکن تنہا کوئی وعدہ نہیں کر سکتے۔

۲۰ جون کو لاڈاؤنٹ بیٹن نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے  
نہایت ڈھٹائی کے ساتھ کہا کہ منصوبہ کے بارے میں ہر قدم پر تمام سیاسی رہنماؤں کو باخبر  
رکھا گیا تھا، لہذا کسی رہنما کو اس منصوبہ پر تعجب یا صدمہ نہیں ہوا۔ وائسرائے نے اس  
پریس کانفرنس میں انتقالِ اختیارات کے لئے ۱۵ اگست، ۱۹۴۷ء مقرر کی۔

قائد اعظم نے رہنماؤں کی کانفرنس بھی میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کو  
ایک دوسرے سے ملانے کے لئے ساڑھے سات سو میل لمبی راہداری کا مطالبہ کیا تھا۔  
لیکن ہندوؤں کی مخالفت کے باعث یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا۔

کانگریس اور مسلمہ منصوبہ کی منظوری دے چکے تھے۔ کچھ اعتراضات بھی کئے گئے۔  
۱۰ جون کو مسلم لیگ کو نسل کا اجلاس ہوا جس میں قائد اعظم کو منصوبہ کے بنیادی اصولوں کو  
قبول کرنے یا نہ کرنے کا مکمل اختیار دیا گیا۔ کانگریس کمیٹی نے اپنے اجلاس میں منصوبہ کی  
منظوری دی تو تقاریر کے دوران نئی مملکت پاکستان کے بارے میں ان خیالات کا

انکار کیا۔

فہستہ: ہمارے چوٹیاں، سمندر، دریا — یہ سب جغرافیائی صورتیں ہیں۔ کوئی انسان انہیں تبدیل نہیں کر سکتا، نہ ہی ان کی نشوونما میں حائل ہو سکتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جب موجودہ معاندانہ جذبات سرد پڑ جائیں گے تو دو قومی نظریہ کا جھوٹا عقیدہ مکمل طور پر ترک کر دیا جائے گا۔

ابوالکلام آزاد: میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تقسیم صرف اور صرف چند دن زندہ رہے گی۔

ہندو مہاسابھیا: بھارت ایک ہے اور ناقابلِ تقسیم رہے گا۔ اس وقت تک چینی سے بیٹھنا مشکل ہوگا، جب تک تقسیم شدہ علاقے دوبارہ ہندوستان میں شامل کر کے ہندوستان کا اٹوٹ انگ نہ بنا دیئے جائیں اور بھارت اکھنڈ نہ ہو جائے۔

گاندھی: (۱۵ اگست کو) وہ دن دور نہیں جب یہ تقسیم ختم ہو کر رہے گی۔ کرشنا میں نے، ملک کی تقسیم سے ڈیڑھ سو سال پرانے وہ بندن نہیں ٹوٹ سکتے جنہوں نے ہندوستان کی یک جا رکھا۔

عبدالغفار خاں: (سرحدی گاندھی): اگر ملک کی تقسیم کے موقع پر کانگریس نے خدائی خدمت گاروں کو ”مسلم لیگی بیڑیوں“ کے سامنے ڈال دیا تو وہ اسے کانگریس کی غدار ہی سمجھیں گے۔

۱۲۔ جن کی شام کو اٹھرائے، قائد اعظم، پنڈت نہرو اور بلدیو سنگھ نے منصوبہ سے متعلق آل انڈیا ریڈیو سے تقاریر نشر کیں۔ قائد اعظم نے اس موقع پر اپنی نشری

تقریر میں کہا:

”ہم پر انتہائی مشکل کام سرانجام دینے کا وقت ہے۔ لہذا ہمیں چاہئے کہ چرچا میں انتقالی اختیارات کے لئے اپنی تمام تر مساعی وقف کر دیں۔ میں خلوص کے ساتھ ہر فرقہ کے لوگوں اور خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ امن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ یہ بات واضح ہے کہ بعض پہلوؤں سے یہ منصوبہ ہمارے نقطہ نظر کی مطابقت میں نہیں۔ ہم یہ بھی نہیں



یہ سچ کہ ہم اس منصوبہ سے مطمئن اور متقی ہیں۔ فیصلہ یہ کرنا ہے کہ منصوبہ کو  
 رعایا کی طرف سے ایک سمجھوتے یا فیصلہ کے طور پر قبول کیا جائے۔ مسلم لیگ  
 اس اجلاس ورجن کو طلب کیا گیا ہے۔ اجلاس کے انعقاد سے پہلے  
 اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ آخری فیصلہ کونسل کے ہاتھ میں ہے  
 ۔ اور عام تاثر جو مسلہ افزا ہے۔

— یہی صوبہ سرحد کی مسلم لیگ سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ پراسن سول  
 نافرمانی ختم کر کے صوبہ سرحد کے استعصواب رائے عامہ میں مسلم لیگ کی کامیابی  
 کے لئے منظم ہو جائے تاکہ صوبہ سرحد کے عوام سے پاکستان کی آئین ساز  
 اسمبلی کے حق میں فیصلہ لیا جاسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ، پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے منصوبہ کو قبول کرنے پر مجبور  
 ہوئی تھی کیونکہ ہندو نواز وائسرائے لارڈ ڈاؤنٹ بیٹن نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اگر مسلم لیگ نے  
 ان کا منصوبہ قبول نہ کیا تو ہندوستان کا اقتدار آئین ساز اسمبلی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس  
 صورت میں یا تو ہنگامہ آرائی ہوتی اور وہ بھی بے نتیجہ۔ یا ملک ہندو راج میں چلا جاتا اور  
 مسلمان ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو کر رہ جاتے۔

جلال آباد

# پاکستان کا قیام

## آزادی کے آخری مرحلہ پر دشواریاں

### پستے ذہنیت سے کام ظاہر

لاٹو مانوٹ بیٹن نے اپنی ہندو نواز پالیسی، ہندو سے گہرے تعلقات اور اندرا گاندھی کے ساتھ دوستی کا پورا پورا نیاہ کرنے ہوئے تقسیم کے منصوبہ کے ذریعہ مسلمانوں کی خواہشات کو دل بھر کر پامال کیا تھا لیکن اس کے باوجود مانوٹ بیٹن نے پاکستان کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے مشترکہ دفاع کو ٹوڑ کر فیلڈ مارشل اگنلک کو اس لئے الگ کر دیا کہ وہ اپنے فرائض دیانتداری کے ساتھ سرانجام دینا چاہتے تھے۔ اس نے تقسیم کھٹی کو بھی توڑا حالانکہ اس وقت تک پاکستان کو اپنی چیزوں کا حصہ بھی نہ ملا تھا، بعد ازاں اس نے مہاراجہ کشمیر کی درخواست قبول کرستے ہوئے ہندوستان کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے فوجی دستے ریاست میں داخل کر دے۔ سردار پٹیل کے کہنے پر حیدر آباد کن کے ساتھ معاہدہ کے مسودے کو بھی تبدیل کیا گیا۔ حتیٰ کہ مد بندی کمیشن کی تمام کارروائی بھی لاٹو مانوٹ بیٹن کی خواہشات کے مطابق ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ جب تقسیم سے پہلے مانوٹ بیٹن مسلمانوں کو ہر قسم کا نقصان پہنچا ہی چکا تھا تو تقسیم کے بعد اس کی یہ معاندانہ حرکات کس بنا پر تھیں۔ کہ وہ مسلسل پست ذہنیت کا مظاہر

کرتار ۹

حقیقت یہ تھی کہ ماؤنٹ بیٹن بیک وقت ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ کانگریس نے اسے خود ہی یہ پیش کش کی تھی لیکن اس کی ذاتی خواہش یہ تھی کہ دونوں ممالک کے مشترکہ سربراہ کی حیثیت سے پاکستان کی ترقی کے راستے میں ایسے کانٹے پھیلانے جو اس کی ترقی و خوشحالی کی ہمدردی میں قدم قدم پر مشکلات پیدا کر کے حوصلہ شکنی کا باعث ہوں اور ایک دن یہ مملکت ختم ہو کر رہ جائے۔

ماؤنٹ بیٹن، دونوں ممالک کا سربراہ بننے کے لئے اپنے وقار اور خودداری کو بھی داؤ پر لگانے سے باز نہ رہا۔ قائد اعظم کو ماؤنٹ بیٹن کے اس مطالبہ سے پیچھا پھڑانا مشکل ہو گیا۔ قائد اعظم یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان اور پاکستان کے گورنر جنرل الگ الگ ہوں اور ان دونوں سے اعلیٰ حیثیت کا ایک اور عہدے دار راج برطانیہ کی نمائندگی کرے اور اس حیثیت میں تقسیم کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کے بارے میں دونوں حکومتوں کو مخلصانہ مشورے دے سکے۔ قائد اعظم نے ماؤنٹ بیٹن کو اسی اعلیٰ منصب کے لئے حکومت برطانیہ کو رضامند کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن نے قائد اعظم سے یہ وعدہ لینا چاہا کہ اگر حکومت برطانیہ نے یہ تجویز قبول نہ کی تو کیا اس صورت میں اسے پاکستان کا گورنر جنرل بنا دیا جائے گا؟ قائد اعظم نے ماؤنٹ بیٹن کو مانے کی کوشش کی مگر وہ یہ کہہ کر لندن چلا گیا کہ اس کے سیکریٹری سر ابراہیم میٹول دلی میں رہیں گے لہذا انہیں فیصلے سے مطلع کر دیا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن لندن پہنچنے کے بعد بھی مسلسل بے قرار رہا، ادھر سر ابراہیم کو یہ کہہ کر مانتے رہے کہ فی الحال کوئی قائد اعظم نہیں کیا جاسکا۔ ماؤنٹ بیٹن نے حکومت برطانیہ کو اپنے طور پر یہ تاثر دیا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں لئے مشترکہ گورنر جنرل بنانے پر رضامند ہو جائیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن کی اسی توقع پر برطانوی پارلیمان کی طرف سے انتقال اقتدار کا وہ عملی میچ تاخیر پر منتج ہوا۔ جو مل کی منظوری کی صورت میں ہونا تھا اور جس میں ہندوستان اور پاکستان کی رسمی منظوری کے بعد گورنر جنرلوں کے ناموں کا اندراج ہونا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے کہنے پر ناموں کی جگہ خالی رکھی گئی۔ وہ لندن سے واپس آیا اور ایک بار پھر اس مقصد کے لئے کوشش شروع کر دی۔ اس نے حیدر آباد کوکن کے آئینی مشیر سر آلفرڈ لارڈ ارنسٹ، سر ابراہیم میٹول اور ناب بھریال کو درمیان میں ڈالنا کہ وہ قائد اعظم کو اس بات پر رضامند کر سکیں اور ڈانٹے اور سر ابراہیم نے قائد اعظم سے ملاقات کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

انبستہ لیاقت علی خاں نے ان دونوں سے یہ وعدہ کیا کہ چند دن کے اندر وہ قائد اعظم سے جواب لے کر روانہ کر دیں گے۔ واؤنٹ بیٹن کے اضطراب کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۳ جون کو اس نے اپنی طرف سے قائد اعظم کو ملاقات کی دعوت دی اور اشارہ بتایا کہ اگر دونوں مملکتوں کا مشترکہ گورنر جنرل ہوتا تو تقسیم سے پیدا شدہ مشکلات میں کافی حد تک کمی کی جاسکے گی۔ قائد اعظم نے اس ملاقات کے نو دن بعد دہلی کو لاہور واؤنٹ بیٹن کے نام پر پیغام بھیجا کہ انہوں نے برجہ یہ عہدہ خود سنبھالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ واؤنٹ بیٹن کو شدید مایوسی ہوئی۔ اس کے باوجود اس نے نواب بھوپال سے سفارش کے لئے کہا لیکن قائد اعظم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر دہلی کو لیاقت علی خاں کی طرف سے لاہور واؤنٹ بیٹن کے نام ایک خط پہنچا جس میں تاج برطانیہ سے درخواست کی گئی تھی کہ محمد علی جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل نامزد کیا جائے۔ اس طرح لاہور واؤنٹ بیٹن کو نہ صرف شدید مایوسی ہوئی بلکہ اس کی یہ حسرت بھی پوری نہ ہو سکی کہ ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ سربراہ بن کر اپنی ہندوؤں پالیسی کے تحت پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر سکے۔

## صوبوں کی تقسیم

۲۰ جون کو بنگال کی مجلس قانون ساز کا اجلاس ہوا۔ ۱۲۶ کے مقابلے میں ۹۰ ووٹوں سے فیصلہ کیا گیا کہ بنگال کو نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہیے۔ بعد ازاں غیر مسلم گروپ کا اجلاس ہوا جس نے ۲۱ کے مقابلے میں ۵۸ ووٹوں سے بنگال کی تقسیم اور مغربی بنگال کو ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تیسرا اجلاس مسلمان اکثریت کے علاقوں کے نمائندوں کا ہوا جس میں ۳۵ کے مقابلے میں ۱۶ ووٹوں سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ صورتِ تقسیم نہ کیا جائے اور مشرقی بنگال اور سلطنت کو ایک کر کے ابھریں جو آئین ساز اسمبلی میں شامل کر دیا جائے۔

پنجاب کی مجلس قانون ساز نے ۲۴ کے مقابلے میں ۹۱ ووٹوں سے پنجاب کو نئی آئین ساز اسمبلی میں شریک کئے جانے کا فیصلہ کیا۔ بعد ازاں مسلم اکثریت کے علاقوں کے نمائندوں کے اجلاس میں ۲۷ کے مقابلے میں ۶۶ ووٹوں سے صورتِ تقسیم کے خلاف فیصلہ دیا گیا۔ غیر مسلم اکثریتی علاقوں کے نمائندوں نے ۲۲ کے مقابلے میں ۵۰ ووٹوں سے صورتِ تقسیم کے حق میں اور موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شامل کرنے کا فیصلہ دیا۔

سندھ کی مجلس قانون ساز نے ۲۶ جون کو ۲۰ کے مقابلے میں ۳۰ ووٹوں سے نئی آئینہ ساز  
مجلس میں شرکت کا فیصلہ کیا۔

بلوچستان میں شاہی جگرہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری اراکین نے متفقہ فیصلہ دیا  
کہ بلوچستان نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہو۔

جولائی میں سلیٹ کے معاملہ پر استعصواب رٹے عامہ ہوا اور اکثریت نے سلیٹ کو  
آسام سے آگے کر کے مشرقی بنگال میں شامل کرنے کے حق میں ووٹ دیا۔

صوبہ سرحد میں استعصواب رٹے عامہ ۶ جولائی سے ۱۶ جولائی تک جاری رہا اس  
موقع پر سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان نے یہ مطالبہ کیا کہ سرحد کے حوام کو نہ صرف یہ  
فیصلہ کرنے کا کہ صوبہ سرحد موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شامل ہو یا نئی آئین ساز اسمبلی میں  
بلکہ اس فیصلے کا حق بھی دیا جائے کہ وہ آزاد و خیزستان قائم کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ گاندھی  
اور خیر نے غفار خان کی بھرپور حمایت کی لیکن یہ مطالبہ اس لئے تسلیم نہ کیا جاسکا کہ ۳ جون  
کا منصوبہ دونوں پارٹیوں کا رضامندی کے بغیر تبدیل نہیں کیا جاسکتا تھا اور قائد اعظم بھی اس  
بشم کی کسی تبدیلی کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ سرحدی گاندھی نے اپنے کارکنوں کو ہدایت کی کہ  
وہ استعصواب رٹے میں جتنی زوریں اس کے باوجود استعصواب رٹے عامہ ہوا اور ۲۸  
کے مقابلے میں ۲۸۹۲۴ ووٹوں کی اکثریت سے صوبہ سرحد کو نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل  
کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے افغانان نے یہ نعرہ لگا دیا  
کہ دریائے سندھ کے مغرب میں افغان آباد ہیں لہذا انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کی  
اجازت دی جائے۔ لیکن برطانوی وزیر امور ہند لارڈ لٹول نے واضح الفاظ میں کہا کہ افغانان  
کو صوبہ سرحد کے معاملات کا کوئی حق حاصل نہیں افغان ایک عرصے سے صوبہ سرحد کے اندر  
رہے تھے لہذا اس صوبہ کو توڑنے کا کوئی نعرہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

## ریل کی منظوری

دریں اثناء ہندوستان کی آزادی کا بل تیار ہوا اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو دیکھا  
کے بعد وزیر اعظم ایشلی نے اسے ۳ جولائی کو برطانوی دارالعوام میں پیش کر دیا۔ ۱۵ جولائی  
کو برطانوی دارالعوام نے ۱۹ جولائی کو دارالاقرا نے اس کی منظوری دے دی۔ ریل میں کوئی

ترمیم نہیں کی گئی۔ ۱۸ جولائی کو مل کی شاہی توثیق ہو گئی۔ ۲۰ جولائی کو ہندوستان اور پاکستان کی دو الگ الگ حکومتوں کا قیام مکمل ہو گیا۔ قائد اعظم نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت میں اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے گورنر جنرل کے طور پر اپنے عہدے سے سنبھال لئے۔

## تقسیم کے مسائل

۳ جون کے منصوبہ کے تحت جب مختلف صوبوں اور علاقوں نے اپنی اپنی قسمت کا فیصلہ کر لیا تو دیگر تفصیلات طے کرنا شروع کی گئیں۔ دو الگ الگ ریاستوں کے مفروضہ پر دونوں حکومتوں نے مختلف کمیٹیاں قائم کیں اور دونوں حکومتوں نے اپنے اپنے نمائندے مساوی تعداد میں ان کمیٹیوں کے لئے نامزد کر دیئے۔ کمیٹیوں کے باہم متنازعہ امور کے فیصلے کے لئے ایک ٹریبیونل مقرر کر دیا گیا۔ اس ٹریبیونل کے اوپر ایک تقسیم کونسل PARTITION COUNCIL تھی جس کا کام پالیسیوں کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔ کونسل میں دونوں حکومتوں کے دو دو وزراء شامل تھے۔

فرج اور فوج سازو سامان کی تقسیم کی ذمہ داری ہندوستان کے کانڈرا چیف فیلڈ مارشل سر اکنک کے سپرد تھی۔ ۱۵ اگست کے بعد دونوں حکومتوں کے الگ الگ فرجی سربراہوں کی تقرریوں کی تقسیم کی تکمیل تک اکنک کو سپریم کانڈر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ انہیں ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ دفاع کونسل کے مشورے سے تقسیم کا باقی کام مکمل کرنا تھا۔ اکنک نے ۵ اگست تک فوج کی نفی تقسیم کر دی۔ اس کے بعد سوال اس فوج سازو سامان کی تقسیم کا تھا جو ذخیرہ وہاں موجود تھا۔ دراصل ہندوستان اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن چاہتے ہیں تھے اس کام میں جتنی تاخیر ہو، بہتر ہے۔ سردار پٹیل نے دئی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس کام کے لئے وہ سال دو کارہوں گے لہذا دو سال تک پاکستان کے پاس کوئی فوج نہ ہوگی۔ لیکن جب اکنک نے نہایت غیر جانبداری اور دیانتداری کے ساتھ تیز رفتاری سے یہ کام مکمل کر لیا تو کانگریس راہنماؤں اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے خواب بکھر کر رہ گئے۔ انہوں نے اکنک پر بددیانتی کا ٹھکانا انعام عائد کرتے ہوئے کہا کہ وہ بھارت کے ساتھ عداوت کر رہے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی وفاداری میں اکنک کے علم میں لائے بغیر برطانوی حکومت کی طرف سے ان

وہ ہندوستان سے ایسی ہی کے احتجاجات جاری کرادیئے۔ نوٹری کی طرح ہنگامہ وارنٹ میٹن نے آئینک  
 دیکھ کر خط نہ لکھ دیا کہ دراصل اس نے آئینک کو ایسے الزامات سے بچانے کے لئے  
 یہ وعدہ کر لیا تھا۔ آئینک خود وار اور دیانتدار شخص تھے، انہوں نے احتجاج کے طور پر اپنے مہم  
 سے استعفا دے دیا اس طرح فوجی سامان کی تقسیم التوا میں پڑ گئی۔

## عہد بندی کمیشن

جی صوبوں کو تقسیم کیا گیا تھا ان کی نئی سرحدوں کے تعین کے لئے دو عہد بندی کمیشن قائم  
 کئے گئے۔ پنجاب کمیشن کے لئے جسٹس دین محمد اور جسٹس محمد منیر پاکستان کی طرف سے اور جسٹس  
 مہر چاند مہاجن اور جسٹس تاجا سنگھ بھارت کی طرف سے اس کمیشن کے رکن تھے۔ جنگل عہد بندی  
 کمیشن جسٹس ابوصالح محمد اکرم اور جسٹس ایس۔ اے رحمان پاکستان، جسٹس سی سی بسواس اور جسٹس  
 بی کے مکر جی بھارت پر مشتمل تھا۔ ہندوستان اور پاکستان نے ریڈ کلف کو ان دونوں کمیشنوں  
 کا چیرمین بنانے پر اتفاق کیا۔

ریڈ کلف ۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو دلی پہنچے اور پھر کلکتہ جانے کے بعد ۸ جولائی کو لاہور  
 آئے۔ ریڈ کلف نے لاہور پہنچتے ہی کمیشن کے پاکستانی رکن جسٹس دین محمد سے کہا کہ وہ ایک خاص  
 علاقے پر رادھو پورا اور تحصیل گورداسپور، پروانہ کرنا چاہتے ہیں۔ دین محمد نے دل کے عارضہ  
 کی بنا پر انہیں معذوری کیا۔ ان کی جگہ جسٹس منیر احمد تیار ہو گئے لیکن بعد ازاں ریڈ کلف نے اپنا کہ  
 یہ پروگرام ملتوی کر دیا۔ عہد بندی کمیشن کے پاکستانی اراکین کو ریڈ کلف کی یہ بات بری طرح کھٹکی کہ  
 فریقین کے دعاوی کی وصولی کے بغیر وہ کس بنا پر خاص علاقوں کا دورہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ شبہ  
 درست تھا کہ ریڈ کلف کسی سے متاثر ہوئے تھے اور جانبداری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جسٹس دین محمد  
 نے فوری طور پر قائد اعظم سے ملاقات کی اور انہیں حالات سے آگاہ کر دیا۔ انہوں نے اپنی اور  
 جسٹس منیر کی طرف سے کمیشن سے الگ ہونے کی پیشکش بھی کی مگر قائد اعظم نے کسی واضح ثبوت  
 کے بغیر ریڈ کلف پر جانبداری کا الزام عائد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ پاکستانی اراکان اپنے کام  
 میں مصروف ہو گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ ریڈ کلف، ماؤنٹ بیٹن کی وساطت سے ہندو متبروں کے  
 کے ساتھ یہ وعدہ کر چکے تھے کہ گورداسپور کے مسلم اکثریتی ضلع کو یا کم از کم اس کی تحصیل پٹھانکوٹ  
 کو ہندوستان میں شامل کر دیا جائے گا کیونکہ پٹھانکوٹ ہی اترسر اور ریاست جموں کشمیر کو ملاتا تھا۔

علاوہ انہیں دریا سے راوی سے نکلنے والی نہریں بھی اس علاقے کے ماحول پر بہت دگر کی محتاج تھیں۔  
۳ جون کے منصوبہ میں پنجاب کی عارضی تقسیم کے خاکہ کے مطابق گورداسپور کا ضلع پاکستانی پنجاب  
میں شامل تھا لیکن لاہور ماؤنٹ بیٹن نے ایسے اشارے کئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ گورداسپور  
کو ہندوستان میں شامل کرنے پر تھے ہوئے تھے۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا۔ تحصیل  
پٹھانکوٹ، تحصیل گورداسپور، امرتسر تحصیل اجنہ، زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں ہندوستان کی جملہ  
میں ڈال دی گئیں۔

قائد اعظم نے اس فیصلہ کو ناقابل فہم غیر منصفانہ اور مکروہ قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں  
نے بہت حد تک برداشت کئے اور بہت سے مکروہ فیصلوں کو تسلیم کیا اب ایک اور گناہنا فیصلہ  
بھی تسلیم کیا جا رہا ہے۔ خدا مسلمانوں کو یہ نیا صدمہ بہت اور حوصلہ کے ساتھ برداشت کرنے کی  
توفیق دے۔

ماؤنٹ بیٹن کے پیپٹی سیکریٹری جانشین نے اپنی کتاب میں ریڈ کلف ایوارڈ کے بارے میں  
لکھا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کو ریڈ کلف کا ایوارڈ ۹ اگست ۱۹۴۷ء کو مل گیا تھا لیکن انہوں نے اسے  
۸ دن تک دبائے رکھا اور ۷ اگست کو شائع کیا۔ یہ بات اس وقت تک چھپی جب ایک فائل لاہور  
کے گورنمنٹ ہاؤس میں خفیہ فائلوں کی اطاری میں سے ملی۔ اس فائل سے پتہ چلا کہ ریڈ کلف نے  
پچیسے ایوارڈ میں فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلیں مغربی پاکستان میں شامل کی تھیں لیکن ۷ اگست سے  
پچیسے ۳ ایوارڈ کو بدل دیا گیا اور مذکورہ تحصیلوں کو بھی ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔ یہ خفیہ فائل  
مغربی پنجاب کے گورنر سرفرائس مٹھی کے ہاتھ لگی، انہوں نے اسے قائد اعظم کے پاس بھیج دیا۔  
فائل سے یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ ۸ اگست ۱۹۴۷ء کو مشترکہ پنجاب کے گورنر جیکسنز کی بات چیت۔ مانچسٹر  
بین کے سیکریٹری سر جارج اہیل کے ساتھ فونی پر ہوئی۔ جیکسنز یہ معلوم کرنے کے لئے بیقرار تھا کہ  
ریڈ کلف ایوارڈ کو آخری صورت کیا دی ہے۔ ۸ اگست ہی کو سر اہیل نے گورنر جیکسنز کو فون پر  
بتایا کہ ایوارڈ میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ گورنر فون پر گفتگو کے دوران کاغذ پر ایک خاکہ بھی بنا دیا  
جو اس فائل میں موجود تھا جو سرفرائس مٹھی کے ہاتھ لگی تھی۔ اس طرح ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ  
کی بددیانتی اور ہندو فواری نے پاکستان کو جزائیاتی اہمیت کے کچھ علاقوں سے محروم کر دیا۔



## سکھ اور قتل و غارت

آزادی کی جدوجہد کے دوران ہی ہندوؤں نے سکھوں کو سبز باغ دکھا کر مسلم لیگ کے خلاف کر دیا تھا۔ سکھوں نے قائد اعظم کی اس پیشکش کو بار بار ٹھکرایا کہ اگر سکھ مسلم لیگ کا ساتھ دیں تو ان کے حقوق و مفادات کی مکمل حفاظت کی جائے گی۔ سکھوں کا مطالبہ یہ تھا کہ جن سے پنجاب تک سکھ ریاست قائم ہونا چاہیے۔ جب ان کا یہ خواب پورا نہ ہوا اور ہندوستان کی آزادی قریب ہوئی گئی تو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف متعدد دہشتوں کی تنظیم شروع کر دی۔ ان تنظیموں کو اسلحہ سپلائی کیا گیا۔ سکھ ریاستوں نے ان دہشتوں سے مکمل تعاون کیا۔ ادھر ہندو متعصب دہشتوں نے بھی خود کو مسلح کیا۔ ۲ مارچ کو جب پنجاب کی محوطہ وزارت مستعفی ہو گئی تو سکھوں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ گو پنجاب میں گورنر راج قائم تھا لیکن پنجاب کے متعصب انگریز گورنر جنکینز نے کسی ہندو یا سکھ کو قتل و غارت کے الزام میں اس لئے گرفتار نہ کیا کہ چند ماہ بعد جب ہندوستان آزاد ہو جائے گا تو نئی حکومت لازماً انہیں رہا کر دے گی۔ لہذا گرفتاریوں کا فائدہ ہی کیا؟ دوسرے الفاظ میں انگریز گورنر خود چاہتا تھا کہ ہندو اور سکھوں کے مابین بھڑکائی ہوئی حالتیں پیدا ہوں۔ اسی لئے یہ لوگ بے خوف ہو کر مسلمانوں کو قتل کرتے رہے۔ جولائی تک سکھوں کی یہ ہنگامہ آرائی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ۱۵ مئی ۱۹۴۷ء کو قسطنطنیہ کا اجلاس طلب کیا جس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، سردار پٹیل، ڈاکٹر اجندر پرشاد، قائد اعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خاں اور سردار بلدیو بیکھ شامل تھے۔ اجلاس کے اختتام پر یہ سرکاری بیان شائع کیا گیا۔

”خود مختار ریاستوں کے قیام کے حتمی فیصلے کے بعد تقسیم کو نسل کے اراکین یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ پُر امن حالات پیدا کریں گے تاکہ تقسیم کا کام بطریق احسن مکمل ہو سکے۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے یقین دلایا ہے کہ اختیارات حاصل کرنے کے بعد وہ اقلیتوں کے ساتھ مکمل انصاف کریں گی۔ وہ کسی امتیاز کے بغیر ہر شہری کے مفادات کا تحفظ کریں گی اور ان کی طرف سے تمام شہریوں کو آزادی تقریر، آزادی اجتماع، آزادی عبادات اور آزادی ثقافت حاصل ہوگی۔ دونوں حکومتیں یہ ذمہ داری قبول کرتی ہیں کہ گزشتہ سیاسی عداوت کی بنا پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی اور شدت و ہمداشت نہیں کریں گی۔ وہ یکم اگست سے ایک خاص فوجی کمان کے قیام پر بھی متفق ہو گئی ہیں۔ یہ کمان سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ

لائہل پور، فیروز پور، منٹگمری، لہور، امرتسر، گوداس پور، ہوشیار پور، جالندھر اور لدھیانہ میں قائم ہو گئی۔ دونوں حکومتوں کی منظوری سے میجر جنرل ریس کو فوجی کمانڈ مقرر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی طرف سے بریگیڈر ڈگلبکر سنگھ اور پاکستان کی طرف سے کرنل ایوب خاں کو ان کے مشیروں کی حیثیت سے مقرر کیا گیا ہے۔ ۱۵ اگست کے بعد جنرل ریس دونوں حکومتوں کی فوجوں پر عملی معاملات میں با اختیار ہوں گے۔ اگر حکومتوں نے مناسب سمجھا تو بنگال میں بھی اسی قسم کا انتظام کیا جائے گا۔ ان حکومتوں نے حد بندی کمیشن کے فیصلوں کو ہر حالت میں قبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حد بندی کمیشنوں کے اجلاس ہو رہے ہیں اور یہ ضروری ہے کہ تقریروں یا تحریروں یا دھمکیوں کی بنا پر کمیشن کے کام میں رکاوٹیں پیدا نہ ہوں، لہذا دونوں حکومتیں اس مقصد کے لئے ضروری اقدامات کریں گی اور فیصلوں کا اعلان ہونے ہی بغیر جانبداری کے ساتھ ان کا نفاذ کر دیں گی۔

## رسم انتقالِ اقتدار

۱۹ اگست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم کراچی پہنچ گئے۔ یہاں لاکھوں افراد نے ان کا خیر مقدم نہایت گرمجوشی کے ساتھ کیا۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ قائد اعظم نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

”آپ مجھ سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ حکومت پر امن و انتظام قائم رکھنے کا فرض پہلے عائد ہوتا ہے تاکہ مملکت کے باشندوں کے جان و مال اور مذہبی عقائد کو مکمل تحفظ دیا جاسکے۔ آپ آؤ اور میں اس لئے اپنے مندروں میں جائیں، اپنی مسجدوں میں جائیں یا اس پاکستان میں کسی دوسری عبادت گاہ میں جائیں، آپ کا تعلق کسی ذات، کسی مذہب یا کسی عقیدے سے ہو، اس کا تعلق حکومت کے کام سے نہیں۔

اگر آپ ماضی کی تیخوں کو بھلا کر باہمی تعاون سے کام کریں گے تو کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ کسی کا کسی فرقتے یا مذہب سے تعلق کہیں نہ ہو وہ ہر حال اسی مملکت کا شہری ہے اور رہے گا۔ اگر سب کے لئے مساوی حقوق، مساوی آزادیاں، مساوی سہولتیں اور مساوی پابندیاں ہوں تو آپ کی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے گی۔“

۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور ڈائریکٹریٹن متحدہ ہندوستان کے گورنر جنرل اور وائسرائے کی کی حیثیت میں کراچی پہنچا۔ ۱۴ اگست کو مجلس کارپورنگام عوامی ڈائریکٹریٹن کو یہ اطلاع مل چکی تھی

کہ سکھوں نے قائد اعظم کے جلوس پر ہم جھینکے کا منصوبہ بنایا تھا۔ چنانچہ اس نے قائد اعظم کے ساتھ بیٹھنے پر اجازت لیا۔ زندگی بھر مسلمانوں کی مخالفت کرنے والے مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ صدر پہنچانے اور پاکستان کے مقاصد پر کامیابی ضروری لگانے کے بعد غالباً وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ بہت صاف دل اور دیانت دار شخص ہے اور اس نے قائد اعظم کی زندگی کی غلطیوں کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈالنے سے گریز نہ کیا۔ جلوس بخیر و عافیت اپنی منزل کو پہنچا۔ قائد اعظم نے سواری سے اتر کر ڈائٹ بیٹن سے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے آپ میری ملکیت کے مہمان تھے اور آپ کی جان کی حفاظت میرے ذمہ تھی۔ خدا کا شکر ہے میں نے اس ذمہ داری کو پورا کر دیا" یہ کہہ کر ڈائٹ اسپتال میں داخل ہو گئے۔

اسپتال میں پہنچ کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے شاہ انگلستان کا پیغام پڑھا۔ جو پاکستان کو سلام سے مشروع ہوتا تھا۔ پیغام میں پاکستان کی خوشحالی اور ترقی کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد قائد اعظم نے تقریر کی ادا ہونے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کے اس جملے "میری دعا ہے کہ آئندہ برسوں میں ہم اکبر اعظم کے کھانے ہوئے اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہیں" کا جواب دیتے ہوئے کہا شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس انصاف اور رواداری کا مظاہرہ کیا، وہ کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ ۱۳ سو سال پہلے ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زبان نہیں بلکہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کرنے کے باوجود اس رواداری کا مظاہرہ کیا تھا اور ان کے مذہب اور عقیدے کا مکمل احترام کیا تھا۔ مسلمانوں کو پوری تاریخ اسی رواداری اور انصاف سے بھری پڑی ہے۔

۱۵ اگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن دلی واپس چلا گیا۔ ۱۵ اگست کو قائد اعظم نے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھا۔ اس موقع پر اس توپوں کی سلامی دی گئی۔ پولو گراؤنڈ میں پاکستان کی بھری اور بری فوج نے قائد اعظم کو سلامی دی۔ اس طرح انگریز کی غلامی اور سہواستبداد کی طویل تاریخ راتوں سے گزرنے کے بعد مسلمانوں نے اپنی منزل حاصل کر لی۔

## خون کی ہولی

تقسیم ملک کے باضابطہ اعلان کے ساتھ ہی پنجاب، یوپی، اسی پی اور بہار کے بے سر مسلمان مسلمان قاضیوں کی صورت میں پاکستان میں داخل ہونا شروع ہو گئے یہ لوگ گاؤں اور ٹکڑوں پر

یاد پیل اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ہندوؤں نے پاکستان سے ہندوستان کے علاقوں میں منتقل ہونا شروع کر دیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے اس موقع پر اپنی مسلح فوجی تنظیموں کو حرکت دی اور مسلمانوں کے قافلوں پر بھرپور حملے شروع کر دیئے۔ گاڑیاں روک کر مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دیا جاتا۔ مسلمان بڑکیوں کو اغوا کر دیا جاتا۔ اس دورانی ہندوستان کے لاکھوں مسلمان گھروں کو نذر آتش اور مسلمان عورتوں کو بے آبرو کیا گیا۔ مسلمانوں کے خلاف اس کا دروازی کے بعد مغربی پاکستان میں بھی جوابی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ ہندوستان کے مختلف شہروں سے مسلمانوں کی ہجرت کا یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا اس دوران تقریباً سو پانچ لاکھ مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ اندازاً ۶۵ لاکھ ہاجر پاکستان آئے۔ ان میں ۵۲ لاکھ مشرقی پنجاب اور اس کی ریاستوں سے، ساڑھے تین لاکھ صوبہ دلی سے اور باقی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے۔ پاکستان سے ہندوستان جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کی مجموعی تعداد ۴۵ لاکھ سے زائد تھی۔

## کشمیر کا تنازعہ

مہندہ یکیش کے فیصلے سے پہلے ہی راجہ کشمیر اور بھارت کے رہنماؤں کے درمیان خفیہ معاہدہ طے پا چکا تھا۔ ۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد دوسری ریاستوں کی طرح ریاست جموں کشمیر بھی آزاد ہو چکی تھی۔ اسے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کرنے یا خود مختار رہنے کا اختیار مل تھا۔ اس سلسلہ میں ہر ریاست کو لازمی طور پر یہ دیکھنا تھا کہ جغرافیائی اعتبار سے اس کے ملے کیا اقدام ضروری ہے۔ مثلاً کشمیر کا معاملہ ایسا تھا کہ پاکستان کے ساتھ اس کی کئی سو میل سرحد مشترک ہے۔ جموں اور کشمیر کی ۸۰ فیصد آبادی مسلمان ہے۔ اس اعتبار سے ان کے تہذیب و تمدن میں کوئی فرق نہیں۔ کشمیر کے تمام دریا پاکستان میں بہتے ہیں اور پاکستان سے گیارہ رستے کشمیر کو جاتے ہیں۔ ۱۲ وال راستہ پٹیان کوٹ کا تھا جو اصولاً پاکستان کا حصہ تھا، لیکن ماؤنٹ بٹین سربراہ ہندو سازش نے اس راستے کو ہندوستان کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ ہمارے کشمیر نے اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے ساتھ یہ معاہدہ کی کہ ریاست اور پاکستان کے موجودہ تعلقات کو برقرار رکھنے کا معاہدہ (STANDSTILL AGREEMENT) کر لیا۔ حالانکہ ہمارا راجہ کے ہندو کشمیری وزیراعظم پنڈت لاک نے بھی ہمارا راجہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہر حال میں پاکستان کے ساتھ الحاق کرے۔ اس دوران ریاست کی ڈوگرہ فوج، ہندوؤں اور سکھوں نے ریاست کے مسلمان

پر ظلم و ستم شروع کر دیے۔ لاکھوں کشمیری مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ ان کے گھر لوٹ لٹے گئے اور ہاتھ پیر مانوں کو قتل کر دیا گیا۔ ہمارا جہ کشمیر کو یہ تو ظلم تھا کہ جب یہ مہاجر پاکستان نہیں گئے تو رد عمل بھی ہو گا لہذا اس نے پہلے ہی یہ الزام عائد کر دیا کہ لوگوں نے پاکستانی علاقوں سے کشمیر میں داخل ہو کر حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ہمارا جہ کشمیر کو ایک نادر درود نہ کیا اور ان الزامات کی تردید کی۔ یہ مطالبہ بھی کیا کہ تحقیقاتی کمیٹی کے نئے فوری طور پر کشمیری غائبین کے مزد دے جائیں۔ ۲۱ اکتوبر کو شیخ عبداللہ نے پونچھ کے واقعات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پونچھ کے لوگوں نے ہندو راجہ کے ظلم و ستم سے نجات حاصل کرنے کے لئے تحریک شروع کی تھی۔ جسے فرقہ دارانہ رنگ دینا غلط ہو گا۔ لیکن ہمارا جہ کشمیر نے دہلی فوج بھیج کر خوف پھراس پیدا کر دیا۔ کیونکہ پونچھ کے بیشتر مرد ہندوستانی فوج کے سپاہی ہیں یا رہ چکے ہیں اور ان کے تعلقات جہلم، راولپنڈی کے لوگوں سے بھی ہیں، لہذا انہوں نے اپنے گنہگاروں کو ان علاقوں میں بھیج دیا اور خود ڈوگرہ فوج کے مقابلے پر آئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے پورے کشمیر میں مجاہدین آزادی نے ہندو ظلم و ستم کے خلاف کادر وائل شروع کر دیں۔ یہ آزاد فوج وہی تھی جو سابق فوجیوں پر مشتمل تھی۔ ہمارا جہ کشمیر اور دوسرے ہندو کشمیر سے بھاگ نکلے اور دہلی پہنچ کر انہوں نے نہ صرف فوجی امداد طلب کی بلکہ ہندوستان سے الحاق کی درخواست بھی کی۔ آزاد فوج نے کشمیر کے خاصے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں آزادی حکومت قائم کر دی۔ ۲۷ اکتوبر کو دہلی سے کشمیر کا الحاق منظور کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن پاکستان نے اس الحاق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا غرضیکہ حالات بگڑنے لگے اور چلے گئے کہ پاکستان نے کشمیر کے مسلمانوں پر ظلم و ستم بند کرنے کے لئے اقوام متحدہ سے اپیل کر دی۔ یہ تنازعہ بدستور موجود ہے۔ نہ صرف ہندوستانی فوجیں کشمیر میں موجود ہیں بلکہ کشمیری مسلمان بھی گذشتہ ۷۷ سال سے ہندو کے ظلم و ستم کی چٹائی میں پس رہے ہیں۔

اسی دوران ہندوستان نے جنا گڑھ اور جید آباد کی مسلمان ریاستوں پر فوج کشی کر کے ان پر جارحانہ قبضہ کر لیا۔

## باب ۳۵

# آخر پاکستان ہی کیوں؟

ہندو اور انگریز کی مسلسل مخالفت کے باوجود مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن — پاکستان — قائم ہو کر رہا جس منزل تک پہنچنے کے لئے مسلمان ہند نے طویل سفر کا آغاز کیا تھا، آخر کار وہ سفر کو نئی پہلیوں پر بڑھتے ہوئے طوفانوں اور مخالفت کی تند تیز آندھیوں کے درمیان ختم ہوا۔ منزل نے قدم چڑھے اور مسلمانوں کی دیرینہ آرزوئیں بر آئیں، شہیدوں کا خون رنگ لایا اور ایک نئی اسلامی مملکت دنیا کے نقشہ پر ابھری — دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت !

سوال یہ ہے کہ آخر مسلمانوں نے اتنی طویل جدوجہد اور بے شمار قربانیاں کس مقصد کے لئے دیں؟ کیا مسلمان ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے آزادی کی دولت سے مالا مال ہو سکتے تھے؟ کیا مسلمان یرمین جیک کے سایہ میں پوسکون زندگی پر ضمانت نہ کر سکتے تھے؟ کیا مسلمانوں کو صرف ایسی حکومت کی ضرورت تھی جہاں اقتدار کی کرسی پر ان کا تسلط رہتا —؟ کیا مسلمان ہندو اور انگریز سے اپنے مذہبی عقائد کے برعکس باوجود مخالفت و عداوت رکھتا تھا؟ اگر یہ سب درست ہے تو ہندوستان کے مسلمان نے علیحدہ خطہ ارضی کے حصول کی یہ بے مقصد جدوجہد کیوں کی؟ سوال صرف اتنا ہے کہ اس جدوجہد کا مقصد کیا تھا — اور وہ کیا عوامل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو اس جدوجہد پر مجبور کیا؟ یہی وہ سوال ہے جو پاکستان کی جدوجہد کے لئے حرفِ اول اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آئندہ سطروں میں ہم انہی عوامل اور اس جدوجہد کا جائزہ لے رہے ہیں۔

اس مقصد کے لئے میں اور ارق تاریخ کی ورق گردانی کرنا ہوگی، ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ میل جول اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے سلوک کا جائزہ لینا ہوگا۔ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے یہ دیکھنا ہوگا کہ مسلمان ہندوستان میں رہتے ہوئے کس حد تک اپنی معاشرتی ثقافتی اور مذہبی اقدار کا تحفظ کر سکتا تھا۔

آئیے سب سے پہلے تاریخ کے اور ارق پر نظر ڈالیں جو ہمیں یہ بتائیں گے کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا اور اس مقصد کے لئے اتنی طویل جدوجہد کیوں کی؟

آج کے پاکستانی علاقے میں قریباً بارہ سو سال پہلے ۱۲۷۱ء میں عرب مسلمانوں نے قدم رکھے۔ اس کے بعد انہی مسلمانوں نے صدیوں تک اس برصغیر پر حکومت کی۔ ایک طویل عرصہ کے بعد اور مسلمانوں ہی کے دور حکومت میں انگریزوں نے تاجروں کا چولہا پسین کر برصغیر کے ساحلوں پر قدم رکھا۔ مسلمانوں نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی کیونکہ وہ نہ صرف مقتدر تھا، بلکہ تعلیمات اسلامی کا رنگ بھی اس پر غالب تھا۔ اس کے لوہیں رواداری، دیانت، انصاف اور مہمان نوازی دچی بسی ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ انگریز تاجر کا چولہا تار تار ہو گیا اور وہ خامب اور لٹیرے کے اصل روپ میں مسلمان کے سامنے ڈٹ گیا۔ ہندو ذہن نے انگریز کی آمد کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیا، اس لئے کہ وہ مقتدر تو تھا ہی نہیں۔ اس کے لئے سانولے یا سفید خام آٹا دونوں برابر تھے۔ ممکن ہے ہندو نے یہ محسوس کیا ہو کہ وہ مسلمان کے مقابلہ میں انگریز سے انصاف اور رواداری کی دولت حاصل نہ کر سکے گا لیکن اس کے باوجود اس نے انگریز کی دوستی کو محض اس لئے ترجیح دی کہ وہ انگریز کا وفادار ساتھی بن کر مسلمان کا خاتمہ کر سکے اور کسی نہ کسی دور میں اپنے لئے حکومت اور اقتدار کی گنجائش پیدا کر سکے۔ علاوہ ازیں ہندو کو یہ دکھ بھی تھا کہ جس فصیل کوہ کے سامنے پرہ اپنی اجارہ داری سمجھتا تھا وہ مسلمان نے ختم کر دی تھی۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ جو اس میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والا مسلمان تھا کیونکہ ہندوستان کے حاکم مسلمان کو محکوم بنایا گیا تھا لہذا قدرتی طور پر انگریز اور مسلمان کے درمیان انگریز اور ہندو کے مقابلہ میں نفرت اور پیرامی کی زیادہ وسیع خلیج مائل تھی۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کا تھا یا پاکستان کے لئے جدوجہد کا طویل دور — مسلمان کی بنیادی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنی اسلامی اقتدار کو مؤبد ترین دشمنوں — انگریز اور ہندو کے ہاتھوں پامال ہونے سے بچالے۔

۱۹ویں صدی کا سورج برصغیر پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی قوت کا پیغام لے کر

طلوع ہوا اور نصف صدی گزر جانے کے باوجود سلطنتِ دہلی کو بحال رکھنے کی امید بھی ختم ہو گئی۔ وقت کے دھارے تیزی سے بدلے اور مسلمان حالات کی چکی میں پستار ہا۔ مسلمان تاجر تھایا سپاہی۔ تجارت سے محروم ہوا اور اس کی تلوار ٹوٹ گئی۔ غلامت کی طرف اس کا رجحان نہ تھا، لہذا اس کے مسائل اور عسرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور حالات کے ساتھ انگریزوں سے اس کی نفرت بھی ہم قدم رہی۔ وہ تعلیم میں دیکھے ہوئے گیارہویں صدی مغربی تعلیم کو وہ ناپسند کرتا تھا۔ ان تمام عناصر نے مسلمان کے معاشی انحطاط میں اہم کردار ادا کیا۔ ہندو موقعِ شتمناں بھی تھا اور موقعِ پرست بھی۔ اس نے برصغیر میں انگریزوں کے قدم جساتے ہی مسلمان آقاؤں کے ساتھ وفاداریوں کے تمام سلسلے منقطع کر دیئے، محبت اور پیار کے تمام رشتے ایک ہی جھلکے میں توڑ ڈالے اور نئے سفید نام آقاؤں کے ساتھ ذہنی وابستگی قائم کر لی۔ ہندو نے مسلمانوں کے ساتھ اذیت ختم کرنے میں انگریز کے ساتھ مل کر بدترین اور گھناؤنا کردار ادا کیا۔ اس دوستی اور وفاداری کی بناء پر ہندو کے لئے تجارت اور ملازمت کے لائقہ دہنئے دروازے کھل گئے۔ ہندو کے لئے ایک دروازہ کھلتا اور مسلمان کے لئے ایک دروازہ بند ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ دن بھی آیا جب انگریز نے کھلے ہندو سرکاری احکامات کے ذریعہ مسلمانوں کو مٹا دیا اور اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے محروم کر دیا۔ جب اس نے سرزمینِ ہند پر مغربی طریقہ زمینداروں کی تعیناداری تو ہندو نے مسلمان کی گجری اور اس کے مفادات کو دلِ بھر سے نقصان پہنچایا۔ برصغیر کا کوئی بھی علاقہ ایسا نہ تھا جسے مسلمانوں کی خوشحالی کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا۔ لہذا مسلمان پر رفتہ رفتہ تاجِ برطانیہ کی غلامی اور یونین جیک کے سائے گرے جوتے چلے گئے اور دوسری طرف سرکاری دفاتر سے زمینداری اور تجارت تک ہندو کا تسلط قائم ہوتا چلا گیا۔

انگریز کی اشریاد سے ہندو نے مسلمانوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کا آغاز کر دیا۔ اسے سفید نام آقاؤں کی وفاداری کا دُغم تھا اور انگریز، بیٹے کی پیٹھ اس لئے ٹھونکتا رہا کہ وہ مسلمانوں کی قوت اور ان کے عقیدہ کی پختگی سے ہمیشہ خائف رہا تھا۔ انگریز نے مسلمان کے خلاف جو کچھ علی الاعلان نہ کرنا چاہا، وہ ہندو کے ذریعہ کر دیا۔ اس تمام مدت میں مسلمانوں کی معاشی، مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی حیثیت کو بری طرح کچلنے کی کوشش کی گئی، ہندو مسلمان نے اپنے لئے ایک علیحدہ اور ایسی مملکت کا مطالبہ کر دیا جہاں اسے یہ تمام آزادیاں حاصل ہوں۔ اس اعتبار سے علیحدہ مملکت کا مطالبہ نہ تو خاص جذباتی اور نہ ہی خاص مذہبی مطالبہ تھا۔



بلکہ اس مطالبہ کے شانہ بشانہ ایک تاریخی اور تہذیبی منسلک بھی موجود تھی۔

علیحدہ ملکیت کے مطالبہ کے بارے میں بالعموم یہ کہا جاتا رہا ہے کہ یہ مطالبہ ”مذہبی تعصب یا عدم برداشت“ کی بنا پر کیا گیا۔ یہ اعتراض مغرب کے اس معاشرے میں جہاں مذہب کو خاص حیثیت حاصل نہیں رہی، بلاشبہ درست ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کا تعلق تھا تو ان کی بنیاد مذہبی نہیں بلکہ ان کا دائرہ انسانی وسیع تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قدم قدم پر اپنا تضاد تھا اور ہے کہ دونوں میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں۔ اسلام اور ہندو ازم یا بت پرستی کی بنیادیں بالکل مختلف معاشروں پر انسانی تھی تھیں۔ ایک طرف عالمگیر تصور ہے اور دوسری طرف یہ تصور اپنے ہی معاشرے میں اندر تضاد ہے۔ تصور وحدانیت اور تصور اصنام پرستی دو مختلف، متضاد اور متضاد تصورات ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک ہزار سال تک ہندو میں کئی گنا: اید ہندوؤں کے ساتھ رہنے کے باوجود مسلمان، ہندو کا لباس تک نہ اپنا سکا۔ ایک ہزار سال کی اس عام مدت میں کئی بار ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک معاشرتی رنگ دینے کی کوشش کی گئی لیکن کبھی کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ سولہویں صدی میں شہنشاہ اکبر نے اس مقصد کے لئے دیہی الٹی ایجاد کیا، ہندو عورتوں سے شادیاں کیں۔ لیکن اس نے نہ صرف اس عظیم اور مضبوط بنیاد کو نظر انداز کرنا چاہا جس میں خدا کی وحدانیت، مرکزیت اور اسلام کی عالم گیریت کا سینٹ لگا گیا تھا بلکہ ہندو عورتوں کو اپنے حرم میں داخل کر کے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ ہندو کا جنم موقع پرستی، ابن الوقتی اور مصلحت پرستی کے بغیر ہے۔ وہ مطلب برابری کے لئے سلطان بادشاہ کو اپنی بیٹی تو دے سکتا تھا مگر اس کے پھیرے ایک بچی کے ساتھ نہیں بلکہ اقتدار اور قوت کے ساتھ ہوتے تھے۔ انگریز اور ہندو کی طرف سے بچائے جانے والے کانٹوں نے مسلمانوں کو اس حد تک آبل پا کر دیا کہ وہ ذہنی، جسمانی، معاشی اور روحانی اعتبار سے ڈوٹے لگے تھے۔ سرسید احمد خاں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی اس حالت زار کو شدت سے محسوس کیا۔ انہیں اس بات کی نزاکت کا شدید احساس تھا کہ انگریز زیرِ سرست کے ذریعہ مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے پر تیار ہوا ہے۔ چنانچہ وہ میدان عمل میں اترے تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس تباہی بنا دیا جانے کو وہ پھر ایک باوقار اور باعزت قوم کی طرح زندگی گزار سکیں۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے اور حالات کے تیزی سے بدلتے ہوئے تقاضوں کا مقابلہ

کرنے کے لئے مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج کا پر زور دیا۔ علی گڑھ تحریک کے معاشرتی تنظیم و تربیت کی عکاسی کرتی تھی۔ مولانا محمد علی میدانِ عمل میں آئے، انہوں نے مسلمانوں کو صف آرا کیا۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو ایک ہی نصیحت کی۔ یہ کہ مسلمان کانگریس سے دور دور رہیں۔ سرسید احمد خاں نے ہندو کی ذہنیت کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور بخوبی جانتے تھے کہ ہندو آزادی کے نام کی آڑ میں پہلے تو مسلمان کو اپنی جہ و جہد میں اس لئے تباہ کرے گا کہ اس کی قوت میں اضافہ ہو مگر منزل پر پہنچنے کے بعد مسلمان پر مکمل غلبہ حاصل کر کے اسے ہمیشہ کے لئے اپنی مضبوط گرفت میں لے لے گا۔ سرسید احمد خاں نے برسوں قبل جس اندیشے کو محسوس کیا تھا، وہ ایک ٹھوس حقیقت بن کر اس وقت سامنے آیا جب کانگریس نے ہندوستان کے چاروں صوبوں میں اپنی وزارتیں قائم کیں اور مسلمانوں کو نشانہٴ مہم بنایا حالانکہ اس حکومت کی ذمیت عارضی تھی۔ ہندو کی تنگ دلی اس کا اتنا ساتھ بھی نہ دے سکی کہ وہ مستقل حکومت کے قیام تک ہی اپنے نپاک اور ذلیل عوام کو اٹھائے رکھتا۔ سرسید احمد خاں بلاشبہ یہ چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان باہمی تعاون اور دوستانہ فضا قائم رکھیں لیکن ہندوؤں کی مختلف تحریکوں، مسلمانوں کے خلاف اقدامات اور مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبہ سے خارج کرنے کی کوشش نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کبھی اور کسی حالت میں مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا۔

مولانا محمد علی جو ایک عرصہ کانگریس کے ساتھ منسلک رہے، انہی وجوہات کی بنا پر علیحدہ ہو گئے۔ اسی فکر کو علامہ اقبال نے اپنایا اور اسی فکر کے تحت قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ ملک کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ علامہ اقبال نے ۲۸ مارچ ۱۹۰۹ء کو اس خیال کا اظہار کیا کہ کبھی میں خود اسی خیال کا حامی تھا کہ برصغیر میں مذہبی اختلافات ختم ہونا ضروری ہیں۔ میں اب بھی ذاتی زندگی میں اس اصول پر عمل پیرا ہوں، لیکن اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکا ہوں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی فوری صفات اور الگ الگ قومی تصور کا تحفظ ضروری ہے۔ ہندوستان کے لئے مشترکہ قومیت کا تصور بلاشبہ بڑا غریب و رت تصور اور شاعرانہ جمال کا حامل ہے۔ لیکن سبب موجودہ حالات پر نظر ڈالی جائے تو اس تصور کا تاج محل اپنا نور کھو بیٹھا ہے اور اس شاعرانہ جمال میں ثقالت پیدا ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ یہی وہ وجوہات تھیں کہ مسلمانوں نے علیحدہ سیاسی تنظیم مسلم لیگ قائم کر لی۔

معاشری اور سیاسی مسائل کے علاوہ ہندوستانی معاشرہ میں تقسیم کی ایک اور

ریاست چلائی وہ بد مذہب مسلمان ثقافت کے خلاف ایک سیاسی بغاوت کے مترادف تھی۔ دراصل یہ تحریک مسلمانوں پر ہر اعتبار سے سیاسی تسلط کو ختم کرنے کے لئے چلائی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان اور اس کے عقائد کے وجود کو ہندوستان سے نیست و نابود کر دیا جائے۔ ہندو، مسلمانوں کو غیر شعوری طور پر ایک ایسے اتحاد میں دیکھنا چاہتا تھا جہاں اس کا وقار، اس کا عقیدہ اور اس کی انا ختم ہو کر رہ جائے۔

یہ آپ اسلام کو صرف ایک اخلاقی اور سیاسی منزل کی سطح پر دیکھنا پسند کریں گے۔ اس کا انجام عالم اسلام میں وہی مہر و مغرب میں عیسائیت کا ہوا ہے۔ دنیا یہ کہی ہے کہ اسلام کو محض ایک قصور اخلاقی کے طور پر اپنا یا جائے اور اسے اس فوجی سیاست کے حق میں، جہاں مذہب کو اپنا کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، ایک نظم حکومت کے طور پر مسترد کر دیا جائے۔

علامہ اقبال کی ریاست اس ہندوستان میں خاص اہمیت کی حامل تھی جہاں مسلمان ایک اقلیت کے طور پر رہے تھے۔ اسلامی معاشرے کی بنیاد بہر حال مذہب اسلام پر ہے اور دونوں باہم مربوط ہیں۔ اگر ان میں کسی ایک کو مسترد کر دیا جائے تو دوسرے کا وجود خود ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا قومی خطوط پر نظم حکومت کی تعمیر۔ اور اس صورت میں کہ اسلام کے اصول سالمیت پر زور آتی ہو، مسلمان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔

قائد اعظم نے فکر اقبال کو ایک عملی صورت دینے کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا۔ انہوں نے بار بار اس خیال کا اظہار کیا کہ:

”یہ رہے متبادل کیا جائے تو ہندوستان کی دو بڑی اقوام — ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات ختم کر گنا زیادہ ہیں۔ ہندوستان کوئی قومی ریاست نہیں ہے۔ ہندوستان کسی ملک کا نام نہیں بلکہ ہندوستان ایک ترجمہ ہے جس میں مختلف اقوام آباد ہیں اور ان میں دو بڑی اقوام — ہندو اور مسلمان ہیں۔ ان کی تہذیب، ان کی ثقافت، ان کی زبان، ان کا ادب، ان کے فنون، ان کا طرز تعمیر، ان کے نام، ان کے قوانین، ان کی معاشرتی اقدار اور ان کے ضابطہ ہائے اخلاق، ان کے رسم و رواج اور ان کے کیلنڈر،

مسلمان — ہندو کی ظاہری دوستی اور باطنی عناد کو کیسے اور کب تک نظر انداز کر سکتا تھا۔ وہ ہزار سال ہندو کے ساتھ رہا۔ کیا اس لئے کہ اس کے وجود کو ختم کرنے کے لئے شرعی کی رسم چلائی جائے؟ آریہ سماج قائم ہو؟ ہندو ماسیما مسلمانوں کی عزت، آبرو و جان و مالی سے کھل کیلے۔؟ مسکین عیسائی نیم فوجی تعلیم قائم ہو۔؟ کیا ان تمام تحریکوں کے سرب راہوں نے اپنی زبان سے یہ نہیں کہا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ کیا گاندھی نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان یا تو وہاں لوٹ جائیں جہاں سے آئے ہیں۔ اور وہ جو ہندو سے مسلمان ہوئے، دوبارہ اس خدیب کی طرف لوٹ آئیں۔؟ ہندو نے تقسیم بنگال کی مخالفت کیوں کی۔؟ اس لئے کہ مسلمانوں کے اکثریت حصے میں مسلمانوں کی خواہشات، ان کی امنگیں پر راج نہ چڑھنے لگیں۔ اگر ہندو فرائض اور اخلاق اس مظلوم حصے کی ضرورت کئے؟ کیا اسی دور میں 'ہندو ماترم' کا ترانہ نہیں گایا گیا اور کیا اس موقع پر بخود کانگریس کے دم آٹھ نمک و عدار ساتھی ابوالکلام آزاد نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ تقسیم بنگال کے مظہروں میں مسلمانوں کے خلاف زبردست مذہبی تعصب سے کام لیا گیا۔؟

مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی کون کون سی حرکت پر یہ وہ پریشی کی جاسکتی ہے اور تاریخ کو دیا بُرد کیسے کیا جاسکتا ہے؟ ہنگال میں بالخصوص ہندو مہاجنوں اور زمینداروں نے مسلمانوں پر کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے؟ مسلمان ایک ہزار سال تک ہندو کے ساتھ رہا۔ لیکن ہندو اور مسلمان ایک برتن میں نہ کھا سکتے نہ پی سکتے۔ ہندو مدرسوں میں مسلمانوں کے بچے پانی پینے کے گلاسوں پر علیحدہ شناختی نشان بنا ہوا تھا اور اسے ہندوؤں کے گلاس سے دُور رکھا جاتا تھا۔ ہندو کی رسوائی میں گنا داخل ہونے سے نہیں۔ البتہ مسلمان کے داخل ہوجانے سے رسوائی بھرپور ہوجاتی تھی، تمام برتن پھینک دیئے جاتے۔ پوجا کے دن غریب مسلمانوں کو دیوہی کی جھپٹ کھانے کے لئے بلکے لانے پرمجبور کیا جاتا۔ ہندو زمیندار، اپنے مسلمان مزدوروں پر کراچی پیش کرنے کا فرض مائد کوٹتا۔ اگر مسلمان یہ حکم بجالانے سے انکار کر دیتا تو اس کے لئے لاتعداد مسائل پیدا کر دیئے جاتے۔ مسلمانوں کو بے دردی کے ساتھ محض اس لئے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا کہ وہ گائے کی قربانی کیوں دیتے ہیں۔۔۔ یعنی جو لوگ گائے کا خون ہزاشت نہ کر سکتے تھے، وہ انسان کا خون بے دریغ بہاتے۔ ہندو، مسلمانوں کی مساجد کے سامنے اس وقت باجے بجاتے، جب وہ نماز میں مصروف ہوتے۔ غرضیکہ ہندو قدم قدم پر یہ کوشش کرتے رہے کہ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا جائے اور ان کے وجود کو ہندوستان سے ختم کر دیا جائے۔

اندازہ کیجئے اگر مسلمان۔ ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ نہ کرتے تو کیا کرتے؟ پہلی بار سرستیا احمد خاں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت سے منع کیا اور دوسرے مسلمانوں نے اپنے بھائیوں کو تقاریر اور تحریروں کے ذریعہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ ہندو ان کے خلاف زبردست سازش کر رہا ہے۔ چنانچہ ہندو متلن کے ہندوؤں میں فتنہ پھیلنا پیدا ہو گیا۔ ہندوؤں کو تیر بات ناگوار عزت تھی کہ مسلمان۔ اپنی روایات کو فروغ دینے پر آمادہ کیوں نہیں اور وہ تعداد کے اعتبار سے اپنے سے زائد ہندوؤں میں اسلام کی بات کیوں کرتا ہے!

۱۹۳۷ء میں جب مسلم لیگ نے کانگریس کے ساتھ مخلوط وزارتیں بنانے کی پیشکش کی تو کانگریس نے نہ صرف اس پیشکش کو ٹھکرا دیا بلکہ یہ مطالبہ بھی کیا کہ اسمبلیوں کے مسلم ممبرانے الگ الگ کے نمائندوں کی حیثیت سے فرائض انجام دیں اور کانگریس کے جزو لاینفک کی حیثیت

اختیار کر لیں۔ کانگریس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کو توڑ دیا جائے اور پھر اس بورڈ کی طرف سے ضمنی انتخابات میں کسی مسلمان امیدوار کو کھڑا نہ کیا جائے۔ قائد اعظم کے الفاظ میں ان شرائط سے کانگریس کا مقصد یہ تھا کہ "اپنی پارٹی کو ختم کر دو، اپنی پالیسی کو قبول جاؤ اور اپنے پروگرام اور مسلم لیگ کو قبول الیہ کر دو۔"

ظاہر ہے کہ کوئی بھی سیاسی جماعت جسے اپنے وفادار کا احساس ہو، ایسی بے مقصد اور معاندانہ مشرانہ طبعیت رکھنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ دراصل کانگریس ۶ صوبوں میں عارضی وزارتیں بنانے کے بعد فتح کے نشہ میں چور ہو کر رہ گئی تھی اور اس لئے تہمت کو بیا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو مسلمانوں کے وجود کو ختم کر دیا جائے۔ انہی وزارتوں کے دوران کانگریس نے ہندو اس میں بند ماتیم کا تہانہ ضروری قرار دیا اور دیتا مندرسی کم نافذ کی۔ اس سیکم کے تحت ہندوؤں کے دم و رواج اور طرز زندگی کو مسلمانوں پر ٹھونسنے کی سازش کی گئی۔ مسلمان طلبہ کو ہاتھ جوڑ کر کھسار کرنے کا حکم دیا گیا۔ غرضیکہ اس مختصر دور حکومت میں کانگریس نے ایک طرف مسلمانوں کا خون بے دریغ بہایا اور دوسری طرف ان کے تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت پر کاری ضرر پہنکانے کی بھرپور کوشش کی۔ مسلمانوں اور مسلمان طلبہ کو گاندھی ٹوپیاں پہنا کر کانگریسی جھنڈے کے سامنے سرنگوں ہونے اور ہاتھ جوڑنے پر بھی مجبور کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کانگریس کا یہ دو سالہ چنگیز خانی دور ۱۹۳۹ء میں اپنے انجام کو پہنچا تو مسلمانوں نے ۲۱ دسمبر کو ملک بھر میں "یوم شجاعت" منایا۔ دراصل یہی وہ دور تھا جس میں ہندوستان کے ان بچے کچے مسلمانوں نے جواب تک کانگریس کے ساتھ تھے، یہ محسوس کیا کہ وہ کسی صورت بھی ہندو کے ساتھ گزارہ نہ کر سکیں گے۔ دراصل ہندو یہ چاہتے تھے کہ جس مسلمان نے ان پر ۱۰۰ سال تک حکومت کی انہیں یا تو نیست و نابود کر دیا جائے یا انتظام کے طور پر ان پر حکومت کی جائے۔ حالانکہ ان سات صدیوں میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ انصاف اور رواداری کا جو سلوک کیا، وہ محتاج بیان نہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان کی حد سے متجاوز رواداری اور جذباتیت ہی نے نہ صرف انگریز کو برصغیر میں قدم بھانے کا حوصلہ دیا بلکہ ہندوؤں کو بھی مسلمانوں پر چھا جانے میں بہت حد تک مدد دی۔ ہندو مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتا تھا اور مسلمان یہ جانتا تھا کہ اگر ایسا ہو گیا تو ہندوستان سے مسلمان کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ جائے گا۔ اسی لئے مسلمانوں نے ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں بڑے وہ تاریخی قرارداد منظور کی جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت یعنی پاکستان کے

قیام سے متعلق مطالبہ پر مبنی تھی اور جس ملکیت میں وہ قرآن کریم اور سنت کے اتباع میں زندگی گزار سکتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کسی نفرت کے فلسفہ پر مبنی نہ تھا۔

پاکستان مسلم قومیت کے بنیادی اصول پر قائم کیا گیا جس مسلمانوں کو ہر قسم کا تحفظ اور اپنی ثقافت کو پروان چڑھانے کا حق اور آزادی حاصل ہے۔ اس اعتبار سے پاکستان کی تشکیل ایک اسلامی ریاست کی بنیاد پر کی گئی۔ پاکستان کے مسلمانوں کا مقصد اپنی ریاست کو مسلمان کی حیثیت میں قائم کرنا اور اس کے اندر مسلمان کی حیثیت میں زندہ رہنا تھا۔ ایسی ملکیت جہاں مذہبی اخوت تمام مسلمانوں کو ایک لڑی میں تیسیر کے دائروں کی طرح پرو کر رکھتی ہے۔ پاکستان میں مذہب اور ریاست دو مختلف چیزیں نہیں لیکن اگر اکٹھے تجارت میں مسلمانوں کو مہذ فوں کے ساتھ رہنا پڑتا تو یقیناً اسلام کو ریاست سے خارج کر دیا جاتا، جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ مسلمانوں کی علیحدہ قومیت ختم ہو کر رہ جاتی۔ قائد اعظم نے واضح طور پر کہا تھا کہ پاکستان سے ان کی مراد وہ ملکیت ہے، جہاں کے رہنے والے مسلمان اپنی زندگی قرآن کریم اور سنت کے سانچے میں ڈھال سکیں۔

مذہب ہماری ریاست کا جزو لاینفک ہے۔ یہ کوئی عیسائی ریاست نہیں جہاں روحانی اور مذہبی معاملات اور سیاسی اور ملکی معاملات دو مختلف باتھوں میں منقسم ہیں۔ یہ اسلامی ملکیت ہے جہاں ہر مسلمان کے ہاتھ میں قرآن بھی ہے اور تلوار بھی۔ پاکستان میں ہندو یا عیسائی فلسفہ اور طرز حکومت کے لئے کوئی گنجائش نہیں باس لئے کہ پاکستان کی بنیاد اسلامی نظریہ پر ہے اور اسلام ریاست اور مذہب کو کسی قیمت پر دو الگ چیزیں تسلیم نہیں کرتا ورنہ اس کے نظام کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔

# استفان

۱. سید حسن ریاض پاکستان لا کزیر تھا
۲. سید شریف الدین پیر زادہ پاکستان منزل بہ منزل
۳. سید نور احمد مارشل لاء سے مارشل لاء تک
۴. سید اکرام باد کار فیلی
۵. مرزا سید دہلوی عہد حاضر کے بڑے لوگ
۶. سید علی چوہدری ظہور پاکستان
7. Afzal Iqbal ... Select Writings & Speeches of Qaid-e-Azam
8. Ali K.. ... A New History of Indo- Pakistan
9. Allana, G., ... Our Freedom Fighters
10. Ambedkar, B. R. ... Pakistan or The Partition of India
11. Azad, Abul Kalam ... India Wins Freedom
12. Bolitho. Hector ... Jinnah, Creator of Pakistan
13. Campbell-Johnson ... Mission with Mountbatten
14. Coatman, John ... The Road to Self-government
15. Fazl-e-Haque ... Muslim Suffering Under Congress Rule
16. Gandhi. M.D.K.C., ... An Autobiography
17. Graham. G.F. I., (Col) The life and Works of Syed Ahmad Khan



- |                       |     |  |
|-----------------------|-----|--|
| 18. Hameed            | ... | Muslim Separatism  |
| 19. Hunter W.W.       | ... | The Indian Muslims                                       |
| 20. Ikram. S.M., Dr.  | ... | Modern Muslim India                                      |
| 21. Ishwari Prasad    | ... | A Short History of Muslim Rule<br>in India               |
| 22. Jamiluddin Ahmad  | ... | Muslim Political Movement                                |
| 23. Joshua. Fazluddin | ... | Separate Electorates                                     |
| 24. Khaliqzaman, Ch.  | ... | Pathway to Pakistan                                      |
| 25. Menon, V.P.,      | ... | The Transfer of Power in India                           |
| 26. Mujamdar, R. C.,  | ... | Advance History of India                                 |
| 27. Mujamdar, R. C.,  | ... | History of Freedom Movement<br>in India                  |
| 28. Nehru. J.W.,      | ... | An Autobiography   |
| 29. Phillips          | ... | Select Documents on the His-<br>tory of India & Pakistan |
| 30. Prasad, Dwarka.,  | ... | Sharimad Bhagawet Geeta                                  |
| 31. Qureshi, I.H.,    | ... | A Short History of Pakistan                              |
| 32. Rajput A.B.,      | ... | Muslim League Yesterday and<br>Today                     |
| 33. Ram Gopal         | ... | Indian Muslims, A Political His-<br>tory                 |
| 34. Thompson, I.E.W., | ... | History of India   |
-

افکار سیاسی : مشرق و مغرب کے مفکرین و متفکرین کے سیاسی افکار پر مبنی ایک مضبوط  
(مشرق و مغرب) مفکرین کے افکار کو نہایت عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب عام قاری  
کے علاوہ ایم۔ اے سیاسیات کے طلبہ و طالبات کے لئے بالخصوص مفید ہے

لہذا نہایت سادہ، انداز بیان قابل فہم، مترادفات کا خاص اہتمام، کپڑے  
کی جلد، آفٹ پلمت، سفید کاغذ۔ ۶۲ صفحات، قیمت ۵۰/۵۰، اردو  
پاکستان کے حصول کی جدوجہد اور نظریاتی تاریخ پر یہ کتاب نہایت  
محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں طلوع اسلام و مکرور عرب

۱۹۴۷ء تک کے حالات کا خلاصہ جازہ لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے  
مصنف صلاح الدین ناسک کی یہ کتاب منفرد حقیقت رکھتی ہے۔ کتاب  
کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ صرف ایک بار پڑھ لینے کے بعد ہر بات نقش  
ہو جاتی ہے۔ ایم۔ اے کے طلبہ و طالبات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ  
بہت ضروری ہے۔ مضبوط جلد مع پلاسٹک گور، آفٹ پلمت

سفید کاغذ۔ ۵۸ صفحات قیمت ۵۰/۵۰، اردو

جدید عالم اسلام : جدید عالم اسلام پر مصنف کے گہرے مطالعہ اور محنت و شوق کی  
تصویر۔ اس کتاب میں مصنف نے ترکی، ایران، مصر،  
(ترکی، مصر، ایران، سعودی عرب، شام، اردن اور عراق کے تاریخی پس منظر،  
سیاسی حالات، خارجی اثرات، جدوجہد اور ترقیات کا تفصیلی  
سعودی عرب، شام، اردن، عراق) جائزہ دیا ہے۔ اردو میں ان خاکے پر اتنا محسوس مواد شاید ہی کسی دیگر  
کتاب میں میسر ہو۔ عام قارئین اور بالخصوص طلبہ اور صحافیوں کے لئے

اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ جلد است اور خوبصورت  
انداز بیان اس کتاب کی غیر معمولی خوبیاں ہیں۔ سفید کاغذ و

آفٹ پلمت قیمت

۹۹ ۵۹۵

۱۶. ۲. ۸۳

(معیاری مکتب کے باذوق ناشر)

پتہ : لاہور



